نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے صحبت یافتہ ہیں، وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں، آپس میں مہربان ہیں۔

ھُدیۃ الشیعہ

تصنیف لطیف:

حجۃ اللہ حجۃ الاسلام، آیت من آیات اللہ، رئیس المتکلمین

استاذ الاساتذہ، منبع الحکمۃ و معدن العلوم

حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نور اللہ

ضریحہ و برد مضجعہ (بانی دار العلوم دیوبند)

ناشران

نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور

مکتبہ نعمانیہ اردو بازار گوجرانوالہ

قیمت: چھتیس روپے/36

- شیعہ کے حافظ قرآن نہ ہونے کے اسباب ص ۱۶،۱۷ - آیت استخلاف خلفائے راشدین کی شان میں ص ۹۶ -
- امیر معاویہؓ امام عادل تھے ص ۴۷ - حبّ اہلبیت ص ۲۲ -
- اصطلاح چار یاران ص ۷۷ - [illegible] ص ۲۱۱ -
- انکار امامت حضرت امیرؓ موجب کفر و فسق نہیں ص ۱۵۸ -
- اصحاب امام معاویہؓ ہم پر لعن طعن کرتے ہیں (قول سیدنا علیؓ) ص ۷۸
- جو کچھ اس کتاب میں انبیاءؑ و اہل بیت و اصحاب رسولؐ کی شان میں کوئی حرف ناشناسہ لکھا ہوا ہے میری اس سے ہزار بار توبہ [illegible] ص ۱۱ (قول مولانا نانوتوی)

نام کتاب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہدیۃ الشیعہ

مصنف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ

ناشر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور۔

تعداد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پانچ صد (۵۰۰)

صفحات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۳۸

پریس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ معارف پرنٹنگ پریس ۔ لاہور

ملنے کا پتہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اُردو بازار لاہور

〃 〃 ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مکتبہ نعمانیہ ۔ اُردو بازار گوجرانوالہ

سائز ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۰ × ۲۶ / ۸

قیمت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۶ روپے

فہرست مضامین ہدیۃ الشیعہ

اعتذار

از

ناشر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔

نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّيۡ عَلٰى رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ۔

اَمَّا بَعۡدُ! زیر نظر کتاب "ھدیۃ الشیعہ" کے بارہ میں کچھ لکھنا غیر ضروری بلکہ بے ادبی ہے کیونکہ اس کتاب کے مصنف حجۃ الاسلام استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرّہٗ بانی دار العلوم دیوبند ہیں اور ان کا نام نامی اس کے مستند ہونے کی پوری ضمانت ہے۔

دراصل یہ کتاب ایک شیعہ عالم مولوی عمّار علی صاحب کے خط کا مفصل جواب ہے جس میں مسئلہ خلافت اور مسئلہ فدک کے موضوع پر بحث فرما کر حضرتؒ نے اہلسنّت کے موقف کو خوب واضح فرمایا ہے۔ یہ کتاب حضرت نانوتویؒ کے وہبی علوم کا مظہر ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۲۸۴ھ میں تصنیف ہوئی اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوئے۔ لیکن اس وقت کی طباعت میں پیراگراف اور عنوانات نہیں تھے جس کی وجہ سے استفادہ مشکل تھا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے حضرت مولانا محمد اسلم صاحب سابق خطیب مسجد ہیڈ کوارٹرز کراچی کو کہ انہوں نے پوری کتاب میں پیراگراف اور عنوانات اس خوبی سے لگائے کہ کتاب کے سارے مضامین فہرست کے آئینے میں نظر آنے لگے اور کتاب کی ذاتی جاذبیت نمایاں ہو گئی۔ نیز مولانا موصوف نے اس بات کی بھی پوری کوشش فرمائی کہ حضرت مصنفؒ کی اصل عبارت میں تصرّف بھی نہ کیا جائے۔

مولانا موصوف نے عربی عبارات کے تراجم بھی ساتھ دے دیئے ہیں تاکہ اُردو خواں حضرات کے لئے بھی استفادہ آسان ہو جائے۔

عنوانات صرف اصل مضمون کی مناسبت سے لکھے گئے ہیں اور پوری کتاب کی اصل عبارت جوں کی توں ہے۔ یہ فہرست والا ایڈیشن مولانا محمد اسلم صاحب نے تقریباً سنہ ۱۹۶۲ء میں اپنے مکتبہ حقانیہ کراچی سے شائع کیا تھا لیکن اب عرصے سے نایاب تھا اس لئے اس کو جدید طباعت کے ذریعہ اب "نعمانی کتب خانہ لاہور" سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ اس کو قبول و منظور فرمائے آمین۔

بندۂ ناچیز بشیر احمد ناظم نُعمانی کتب خانہ، لاہور

تائید و ترغیب خادمِ اہلسنّت مولانا شبیر محمد علوی

وحدت روڈ۔ لاہور

۱۵ ذی الحجہ سنہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۲۷ نومبر سنہ ۱۹۷۷ء

تقدیم الکتاب

:- از ناشر -:

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے محض اپنے فضل وکرم سے میرے جیسے بے بضاعت اور کم سواد طالب علم کو اس عظیم الشان علمی یادگار کے احیاء کی توفیق بخشی۔ ایک مدت تک تو طباعت کا خیال ہی خیال رہا کیونکہ طباعت سے پہلے خود کتاب کا موجود ہونا بھی ضروری ہوا۔ اور کتاب کا کہیں پتہ نہ تھا کأن لم یکن۔ اچانک ایسا ہوا کہ ایک علم دوست بزرگ تشریف لائے۔ اور کچھ کتابیں میرے سامنے رکھدیں۔ کہ ان کی جلد بندی مطلوب ہے۔ کتابیں دیکھیں، تو ان میں وہ مقصود بھی موجود تھا جس کی خلش عرصہ دراز سے دل میں رہتی تھی۔

اس وقت تو ان کو بہت اچھا کہہ کر رخصت کیا، اور پھر مختلف تدابیر عمل میں لانی پڑیں جن سے وہ بزرگ بہت منت سماجت کے بعد کتاب دینے پر آمادہ ہو گئے۔ کام بڑا تھا۔ جس کے لئے بڑی ہمت درکار تھی۔ اور یہاں ضعف ہی ضعف تھا کتاب پڑی رہی اور سوچ بچار میں کافی وقت گذر گیا۔ اس درمیانی وقفہ میں ایک بڑے ادارہ نے طباعت کا ارادہ کیا۔ اور کتاب بھی لے لی مگر کچھ عرصہ بعد مصروفیت کا عذر کرکے واپس کردی گویا

ع :- قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

جس طرح کتاب ہاتھ آئی۔ ہاتھ سے نکلی نکل کر پھر ہاتھ آئی۔ اس سے صاف ظاہر تھا۔ کہ اب پس وپیش کی مزید گنجائش نہیں۔ کام شروع ہونا چاہیئے۔ لیکن جب کتاب کا مطالعہ شروع کیا۔ تو معلوم ہوا۔ ع۔ کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا۔

کیونکہ کتاب مسلسل تھی۔ کوئی پیراگراف کوئی عنوان یا فصل اور باب وغیرہ اس میں موجود نہ تھا۔ جیسا کہ متقدمین کا طریقہ تھا۔ اور یہ طریقہ اس وقت کے لئے ناموزوں بھی نہ تھا، وہ لوگ محنتی تھے۔ کتابوں کے کیڑے تھے علوم کے قدردان تھے عالی ہمت تھے مطالعہ اور کتب بینی ان کے لئے تفریح ونشاط کے ذرائع تھے۔

مگر اب جبکہ ہمتیں پست ہو چکیں۔ ذہنی سکون واطمینان بجائے علمی مشاغل کے جھوٹی روایتوں اور قصوں میں تلاش کیا جانے لگا۔ تو ضروری ہوا کہ اب علوم کو سہل وخوبصورت بنا کر پیش کیا جائے تاکہ شائقین کو استفادہ میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اس لئے ایک صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں کہ وہ کتاب کی تبویب وتصحیح کریں۔ مگر شرمندگی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا عن ظہر الغیب ہی لکھا۔ یعنی کتاب دیکھے بغیر اپنی علمی قوت اور زور سے لکھا۔ یہ ایک نئی مشکل تھی جس سے بچاؤ کی یہی صورت نظر آئی۔ کہ دست خود دہان خود پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ تبویب کا کام خود کرنا پڑا مضامین کی مناسبت سے چند ابواب قائم کئے۔ اور ان کے ذیل میں عنوانات لکھے۔

مگر اس کے باوجود بھی کتاب کے مضامین کا احاطہ نہیں ہو سکا۔ کیونکہ کتاب کی علمی شان کچھ اتنی وسیع اور عالی ہے۔ کہ ہر دو سطر کے بعد ایک نیا استدلال، نیا نکتہ، نیا مضمون موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کثرت سے عنوانات نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ اس لئے کتاب کی وسعت اور جامعیت کو فہرست بھی تمام وکمال پیش نہ کر سکے گی ہاں تشویق وترغیب کا کام ضرور دے گی

کتاب میں مصنف قدس سرہ کی اپنی ایک خاص شان جلوہ گر ہے۔ سوز وگداز اس درجہ ہے۔ گویا تڑپ رہے ہیں، کہ مخاطبین حق کو کیوں قبول نہیں کرتے، یا مصنف خود ہی ان کے قلوب میں کسی طرح یہ حقائق کیوں نہیں ڈال سکتے۔ علوم عالیہ کی اس رفعت کے باوجود تنزل کا یہ حال ہے کہ بے انتہا بلندیوں سے اتر کر مشقت کے ساتھ ایک بات کو عام فہم اور سادہ بنا کر پیش فرما رہے ہیں۔ آمد کا یہ حال ہے کہ مضامین ہاتھ باندھے چلے آرہے ہیں۔ اور بات سے بات پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مگر اس اعلیٰ علمی شرف کے باوجود ہر جگہ تواضع اور انکسار کھلا ہوا نظر آتا ہے۔ کہیں تعلّی اور ادّعا نہیں ہے۔ پھر خاص بات یہ ہے کہ اہل بیت اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق تمام مباحث میں ادب واحترام بہت ہی نمایاں ہے۔ ورنہ آج کل تو

کتاب کی خصوصیات کے بارے میں اگر کچھ عرض کیا جائے۔ تو سب سے پہلی اور بڑی خصوصیت تو یہی ہوگی۔ کہ بانیٔ دار العلوم قدس سرہٗ کی تالیف ہے۔ اور یہ کسی عقیدت مندی کا اظہار نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت ہے کیونکہ مولانا کی علمی اور تحقیقی رفعت و امتیاز کے اپنے اور پرائے سب ہی قائل تھے۔ اور ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے۔ کہ استدلال میں دونوں پہلوؤں کا لحاظ کیا گیا ہے۔ یعنی روایت کے ساتھ درایت اور نقل کے ساتھ عقل کا سلسلہ پوری کتاب میں قائم ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ عرف اور محاورہ بھی مدنظر ہے۔

تیسری خصوصیت صحابہ کرام سے متعلقہ آیات کی تفسیر و تشریح ہے جو سراپا الہامی ہے۔ آیات کے لفظی اور معنوی فوائد ایسے عجیب و غریب ہیں۔ کہ بڑی بڑی تفاسیر ان سے خالی ہیں۔ اور ما لا عین رأت ولا اذن سمعت کے مصداق ہیں۔ چوتھی خصوصیت بعض ایسی آیات اور احادیث پر محققانہ بحث ہے۔ جن کو فریق ثانی استدلال کے طور پر پیش کرتا ہے۔ مگر اس بحث کا امتیاز یہ ہے۔ کہ مصنف قدس سرہ کی تحقیق کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث یا آیت کو فریق ثانی نے اپنی دلیل کیسے سمجھ لیا ہے، یہ تو ہماری دلیل ہے۔ نکات و حکم کا بیان اس پر مزید ہے۔ جو انسانی علم و ادراک کا شکار نہیں بلکہ محسوس طور پر عطائے ربانی ہے۔

پانچویں خصوصیت کتاب کے مباحث و مضامین کا تنوع اور توسع ہے جس کے ضمن میں ذیلی علوم و معارف کافی مقدار میں آگئے ہیں جو بے حد قیمتی اور نادر و نایاب ہیں۔ جن سے کتاب کی افادی حیثیت بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہ کا یہ ارشاد بالکل بجا اور درست ہے۔ کہ ھدیۃ الشیعہ میں تحفہ بمع زوائد ہے۔ چھٹی خصوصیت کتاب کی سلاست اور سادہ بیانی ہے۔ جو مولانا قدس سرہٗ کی باقی کتب کے مقابلہ میں بالکل نمایاں ہے۔ کتاب کا اکثر حصہ روزمرہ کی زبان ہے۔ بعض مقامات میں (جو بہت قلیل بلکہ اقل ہیں) علمی زبان کی وجہ سے کچھ دشواری پیدا ہوئی ہے۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ کہ خالص فنی مسائل کے بیان میں یہ دشواری ہر ایک

کو پیش آتی ہے۔

آخر میں اپنی اس حقیر کاوش کے متعلق یہ عرض ہے۔ کہ اس امر کی کوشش تو پوری پوری کی گئی۔ کہ عنوانات کو کتاب کے ساتھ کامل ارتباط و مناسبت ہو۔ اور کتاب کی علمی شان کا عکس اور پرتو ہوں۔ مگر چہ نسبت خاک را بعالم پاک؟۔ کہاں یہ کتاب اور اس کی رفعت اور کہاں ہم اور ہماری کاوش؟ بس مقصد اتنا تھا کہ پڑھنے والے کو کچھ اندازہ ہو جائے۔ کہ کتاب میں کیا ہے۔ وہ کسی قدر انشاء اللہ ضرور حاصل ہو جائے گا۔ اس کے بعد یوں جی چاہتا ہے۔ کہ سوانح قاسمی میں سے سرسید کا وہ بیان نقل کر دیا جائے۔ جس میں مولانا سے اظہار عقیدت کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا نانوتویؒ سرسیدؒ کی نظر میں

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی وفات پر سرسید مرحوم نے "علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" کی اشاعت مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں حضرت نانوتوی کے متعلق سرسید نے اپنے تاثرات کا جن الفاظ میں اظہار کیا ہے، وہ الفاظ معاصرانہ چشمک سے مبرا ہونے کے علاوہ حضرت نانوتویؒ کے علم و عمل اور صلاح و تقویٰ کا جو مقام متعین کرتے ہیں، اس کے متعلق یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ وہ عقیدتمندانہ جذبات کے غلو سے قطعاً پاک ہیں

کسی ایسے شخص کا اپنے کسی ایسے معاصر کے بارے میں اظہار رائے کرنا جو اس شخص کے عقائد و افکار اور رجحانات سے شدید اختلاف رکھتا ہو، ظاہر ہے کسی بے لاگ حیثیت کا حامل ہو سکتا ہے، یہ حضرات ایک دوسرے کو ذاتی حیثیت سے کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کا اندازہ تصفیۃ العقائد کی اس مراسلت سے ہو سکتا ہے۔ جو ان حضرات کے مابین ہوئی ہے۔ اس مراسلت میں سرسید اپنے ایک دوست (منشی محمد عارف صاحب) کو خط میں لکھتے ہیں۔

"اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں تو میری سعادت ہے میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا"[1]

[1] تصفیۃ العقائد صفحہ ۳ مکتوب سرسید بنام منشی محمد عارف

مذکورہ بالا مکتوب کے جواب میں سرسید کے ان ہی دوست کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تحریر فرمایا تھا کہ

"ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب (سرسید) کی اولوالعزمی اور دردمندیٔ اہل اسلام کا معتقد ہوں۔ اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں، تو بجا ہے مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فساد عقائد کو سن سن کران کا شاکی اوران کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں[1]۔"

اس مختصر تقریب کے بعد سرسید کا متذکرۂ صدر مضمون درج ذیل ہے۔

"افسوس ہے کہ جناب ممدوح (حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ) نے ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا، زمانہ بہتوں کو رو رہا ہے۔ اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آوے۔ نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلّی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقوے اور ورع میں معروف اور مشہور تھے، ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے۔ لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحٰق صاحب کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے۔ مگر مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلّی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحٰق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔

بہت لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمر میں دلّی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے انہوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں، ابتداہی سے آثار تقوے اور ورع اور نیک بختی اور

[1] تصفیۃ العقائد صفحہ ۶ مکتوب حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بنام منشی عارف صاحب ۱۲

خدا پرستی کے ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا؂

بالائے سرش ز ہوشمندی ٭ می تافت ستارۂ بلندی

زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے، ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے، ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا۔ اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلےٰ رتبہ کا دل بنا دیا تھا، خود بھی پابند شریعت اور سنت تھے۔ اور لوگوں کو بھی پابند شریعت اور سنت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا۔ انہیں کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے۔ وہ کچھ خواہش پیر و مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو، خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفسانی یا ضد اور عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے بلاشبہ للّٰہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے۔ اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے۔ اس کی پیروی کرتے تھے، ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا۔ اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا۔ کسی شخص کو مولوی محمد قاسم اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے

کام کرتا ہے یا بری بات کہتا ہے۔ خدا کے واسطے برا جانتے تھے۔ مسئلہ حب للّٰہ اور بغض للّٰہ کا خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے۔ اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو۔ بلا شبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔ اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں۔ اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے۔ ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبد العزیز رح سے کچھ کم ہو۔ الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحٰق سے بڑھ کر نہ تھا۔ تو کم بھی نہ تھا۔ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے۔ اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لئے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے۔ زبانی عقیدت اور ارادت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت و افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کر لیں بلکہ ان کا فرض ہے۔ کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں،

دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگاری ہے۔ اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے۔ اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے۔

(نقل باصلہ از علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ

مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء صفحہ ۴۶۷ و ۴۶۸)

نوٹ :- فہرست کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ وَاٰلِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَاَهْلِ بَيْتِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

سبب تالیف بعد حمد و صلوٰۃ کے بندہ ہیچمدان گمنام محمد قاسم نام متخلص بخاکپاء علماء ناظران اوراق کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ اواخر رجب ۱۲۸۳ھ بارہ سو تراسی ہجری میں مخدوم العلماء مطاع الفضلاء مجمع الکمالات منبع الحسنات زیب طریقت حامی شریعت فخر احباب افتخار اصحاب ملجاء انام مرجع خاص و عام معلم قوانین اطاعت و انقیاد محرک سلسلہ رشد و ارشاد جامع کمالات ظاہری و باطنی مخدوم و مناد مولانا مولوی رشید احمد گنگوہی دام رشدہ و ارشادہٗ نے ایک خط متضمن بعضے خرافات شیعہ جو مولوی عمار علی صاحب کی طرف سے بنام میر نادر علی صاحب ساکن کرتھل نواح الور تھا، ملک ہیچمدان کے پاس بایں غرض بھیجا کہ ان خرافات کے جوابات لکھ کر روانہ خدمت مولانا ممدوح کروں۔ اتفاقات سے ان ایام میں حسب ایماء بعض احباب کہ ان سے اشتراک نسبی بھی حاصل ہے اوقات فرصت میں در بارہ اثبات توحید و رسالت بدلائل عقلیہ اوراق سیاہ کرتا تھا، سو کچھ تو اس وجہ سے، اور کچھ بوجہ کاہلی طبع زاد، اس کے جوابات کا لکھنا سخت دشوار معلوم ہوا اور پھر بوجہ ہیچمدانی اور بے سرو سامانی اور کثرت مشاغل روزمرہ اس خیال سے اور بھی دل تنگ ہوتا تھا، القصہ بہر طور یہ کار دشوار تھا مگر مولانا ممدوح کے ارشاد سے ناچار تھا لہٰذا تحریر مضامین توحید و رسالت کو اور وقت پر موقوف رکھ کر خط مذکور کے پہنچنے سے دو تین روز ہی بعد تحریر سابق کے عوض میں خط مذکور کے جوابات لکھنے شروع کئے۔ مگر کچھ تو ہیچمدانی اور بے سرو سامانی اور کچھ قلت فرصت اور کچھ سرگردانی اس لئے ایک دفعہ تو نہ بن پڑا، پر اوقات متفرقہ میں لکھ لکھ کر پانزدہم صفر ۱۲۸۴ھ بارہ سو چوراسی میں تمام کیا اور بعد اختتام۔ ھدیۃ الشیعۃ، اوراق کا نام رکھا۔

انتخاب نام کا راز اور وجہ اس نام رکھنے کی حالانکہ یہ رسالہ بظاہر موید اہلسنت ہے اور اس وجہ سے ہدیہ اہلِ سنت کہنا مناسب تھا، یہ ہے کہ بہ نسبت اہلِ سنت شیعوں کے حق میں یہ رسالہ زیادہ تر مفید ہے، اہلِ سنت کے لئے تو اس میں اتنا ہی فائدہ ہے کہ کچوں کے لئے مفید یقین اور پکوں کے لئے باعث اطمینان ہے، پر شیعوں کے حق میں اگر انصاف کریں تو ذریعہ حصولِ ایمان ہے، کیونکہ ان اوراق میں اگر استدلال ہے تو تین چیزوں سے استدلال ہے۔ قرآن مجید یا احادیث صحیحہ کتب معتبرہ شیعہ یا دلائل عقلیہ واضحۃ الدلالات سو ان تینوں کا مسلّم ہونا شیعوں کے نزدیک مسلّم

کتاب کی کھلی صداقت مگر یہ سنکر بوجہ گمنامی احقر شاید کسی کو یہ بدگمانی ہو کہ استدلال سبھی کرتے ہیں، پر استدلال کرنا کسی کسی کو آتا ہے، سو اس کا جواب یہی ہے کہ یہ رسالہ موجود ہے۔ ہمارا کہنا باور نہ کیجئے۔ اس رسالہ ہی کو دیکھ لیجئے۔ صاحبو دیوانہ ہوں ولیکن بات کہتا ہوں ٹھکانے کی۔ ببرکت اہل بیت کرام اور صحابہ عظام امیدیوں ہے کہ انشاء اللہ منصفان فہمیدہ آفریں ہی کہینگے اور کوئی کہے تو یہ کہے گا

گاہ باشد کہ کودکِ نادان
بغلط بر ہدف زند تیرے

سو یہ سب سچ ہے۔ اپنے آپ کو کون نہیں جانتا۔ غرض اپنی نسبت جو کچھ کہئے بجاہے پر اس رسالہ کے مضامین کی حقانیت کا دعوےٰ بھی بیجا نہیں۔ انشاء اللہ بعد ملاحظہ معلوم ہو جائے گا۔

کتاب کے جواب کی صحیح راہ ہاں نادان متعصب اگر دو چار باتوں میں تکرار کریں، تو نادانوں کا کام یہی ہے، ان کی زبان سے قرآن تو چھوٹا ہی نہیں یہ ہیچمداں تو کس شمار میں ہے۔ البتہ دانشمند ذی علم ایسا کریں، تو ہمیں بھی شکایت ہے کیونکہ کسی رسالہ یا کسی کتاب کے جواب کے یہ معنی ہیں کہ تمام استدلالات کو باطل کر دیجئے۔ جیساکہ اس ہیچمداں نے بہ نسبت خط مولوی عمار علی صاحب کیاہے چنانچہ انشاءاللہ واضح ہو جائے گا ورنہ ایک دو بات تو ہر کسی کی قابل گرفت ہوتی ہے۔ جناب من بشر ہوں اور بشر بھی سب سے کمتر، خدا نہیں ہوں نہیں جو غلطی کا احتمال نہ ہو، بھول چوک سے انکار نہیں کیا جاتا، پر کتاب کی صحت اور اعتبار باعتبار اکثر کے ہوتی ہے۔

سو اگر کسی صاحب کو خیال جواب ہو تو بندہ ہیچمداں کی روش پر چلیں یعنی ہر مضمون کے ہر پہلو پر گرفت کریں نہیں تو اس سے بھی کیا کم کہ موافق قواعد علم مناظرہ ہر دعوے کے استدلال پر اعتراض

کریں ورنہ دو چار باتوں کی تغلیط سے کام نہیں چلتا۔ اس کا تو میں بھی خود مقر ہوں کہ خطا و نسیان سے مبرا نہیں کیا عجب ہے کہ کچھ غلطی ہو گئی ہو القصہ اہلِ انصاف سے امید تو یہی ہے کہ قطع نظر پریشانی تقریر اس رسالہ کے دعووں اور دلائل پر حرف گیر نہ ہوں۔ بلکہ آفرین و تحسین ہی سے پیش آئیں۔

ایک شبہ کا ازالہ اور اگر بہ نسبت انبیاء و مرسلین یا بزرگان اہل بیت و اصحاب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اس رسالہ میں کوئی حرف نامناسب دیکھ کر الجھیں تو مجھے اس سے بری الذمہ سمجھیں ایسا مذکور کہیں کہیں ناچار ہی بغرض الزام شیعہ آگیا ہے اس کا بار انہی کی گردن پر ہے۔ یہ سب انہوں نے ہی کرایا ہے خدا شاہد ہے کہ ایسے عقائد سے میں بہزار جان و بہزار زبان بیزار ہوں۔ محبت بزرگان مذکور کو اپنی سعادت اور ان کے حسنِ اعتقاد کو ذریعہ نجات سمجھتا ہوں مگر مردمان فہمیدہ سے یوں امید ہے کہ میرے عذر سے بیشتر ہی بشہادت مذہب مجھے معذور سمجھیں۔

نقل روایات میں مصنف کا رویہ ہاں بوجہ بے سروسامانی احقر کسی شیعہ کو نقل روایات میں کچھ تامل ہو تو البتہ چند وجہ سے بجا ہے، اول تو کتب شیعہ کسے میسر سنیوں کو کیا غرض جو فراہم کریں شیعوں کو بحکم مثل مشہور "اہل البیت ادری بما فیہ" یعنی گھر والے گھر کی بات کو خوب جانا کرتے ہیں۔ بلحاظ خوبیٔ مضامین سنیوں کے دینے ہیں دار و گیر اور طعن و تشنیع اور مضحکہ کا اندیشہ پھر کوئی سنی لائے تو کہاں سے لائے۔ جو کوئی روایت مفید مطلب سنیاں کسی رسالہ میں درج کی جاتے دوسرے یہ کتابیں اگر فرض کرو ملیں بھی تو مجھ سے بے سر و سامان کے ملنے کی تو کوئی صورت ہی نہیں کیونکہ اپنی کتابیں جب پاس نہ ہوں تو دوسروں کی کتابیں کیا ہونگی تیسرے نقل مشہور ہے۔ "المرء یقیس علی نفسہ" شیعوں کی دروغ مذہبی نے شیعوں کے نزدیک سنیوں کا اعتبار بھی نہیں رکھا پھر حسب مثل مذکور اگر شیعہ اس سنی مشرب کو بھی جھوٹا سمجھیں تو سمجھ کی بات ہے۔ بالجملہ بوجوہ مذکور خاص کر وجہ اول اس بات میں کسی شیعہ کو تامل ہو تو بجائے خود ہے

تحفہ اثنا عشریہ پر اعتماد سو اس لئے یہ استبعاد بھی عرض پرداز ہے کہ "الصِّدقُ یُنجی والکِذبُ یُھلِکُ" یعنی سچ میں نجات ہے اور جھوٹ میں تباہی، واقعی اس کمتر بے سر و سامان کے پاس اس قسم کا سامان کچھ نہ تھا، پر ایک تحفہ اثنا عشریہ تھا اور جب تحفہ تھا تو جاننے والے جانتے ہیں کہ سب کچھ تھا۔ موافق مصرعہ مشہور

کافی ہے تسلی کو تری ایک نظر بھی

اور کتابیں نہ سہی۔ ایک تحفہ ہی بہت ہے کیونکہ مؤلف تحفہ حجۃ اللہ فی العالمین خاتم المحدثین و المفسرین

[illegible] کے نام کے سنی تو ذی لوائے ہیں پر علمائے شیعہ
بھی رجالوں کو بین نہیں گنتا۔ ان کے تبحر و تحقیق کو بہ نسبت دونوں مذہبوں کے اپنے دل میں تو
خوب ہی جانتے ہیں۔ زبان سے کہیں یا نہ کہیں۔ سو جو روایت روایاتِ کتب شیعہ میں سے اس رسالہ
میں منقول ہوئی ہے ماخذ اس کا یا متن تحفہ مطبوعہ دہلی ہے، یا اس کے حواشی ہیں جو غالباً منہیہ معلوم
ہوتے ہیں۔ سو تحفہ کا حوالہ اہل انصاف کے نزدیک خود ان کتب کے حوالے سے کم نہیں جن کا نام اس رسالہ
میں لکھا گیا۔ اسی وجہ سے اس احقر نے بے تامل ان کتب کا حوالہ رقم کر دیا ہے۔

شیعہ کو ہمدردانہ مشورہ اور صاحب تحفہ کی راست بازی اور تبحری کے بھروسے منصفان شیعہ کی خدمت
میں عرض پرداز ہوں کہ فقط میری بے سر و سامانی کے خیال سے بے دماغی نہ فرمائیں نقل کو اصل سے
مطابق کر دیکھیں، اکثر کتب منقول عنہا کتب مشہورہ معتبرہ شیعہ ہیں: نادر الوجود کمیاب نہیں اس کا اندیشہ
نہ کریں کہ مطابقت ہوئی تو ماننا پڑے گا۔ خدا نے خود فرمایا ہے "مَن يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ"۔
پھر کیا اندیشہ ہے، خدا کی فرمائی ہوئی باتوں میں تو یہ بات پائی نہیں جاتی۔ کہ سمجھ میں آ جائے۔ تو ماننا ہی
پڑے۔؟ اس گنہگار ہیچمداں کی بات میں یہ بات کہاں۔؟

معہذا حق تو ماننے ہی کے لئے ہے۔ اگر حق کو تسلیم ہی کر لیا تو کیا نقصان ہے۔ الغرض
تطبیق میں کاہلی نہ کریں، بعد مطابقت اگر فرق نکلے تو وہ میرے ذمہ

شیعہ کی دلیرانہ غلط بیانی مگر میں جانتا ہوں کہ میرے بے کہے شیعہ اس بات کو جانتے ہونگے، کون نہیں
جانتا کہ اہلسنت کے نزدیک جھوٹ بولنا خصوصاً دین کے مقدمہ میں سخت ممنوع اور منجملہ کبائر ہے ہم
وہ نہیں کہ مثل مولوی عمار علی صاحب مشار الیہ پیشوا و پیش امام شیعہ کہ وہ بظاہر مولوی عمار علی صاحب
سونی پتی معلوم ہوتے ہیں غلط اور موضوع کو صحیح اور ضعیف کو قوی اور غیر معتبر کو معتبر کہدیں یا محض بے اصل
کے جھوٹ سچ کوئی اصل گھڑ دیں چنانچہ ناظران رسالہ ھٰذا پر واضح ہو جائے گا کہ مولوی صاحب موصوف
نے خط مذکور میں کیا کیا ستم کیے ہیں۔ ہم کو یہ گمان تھا کہ شیوۂ دروغ بندی زمانہ سابق کے علمائے شیعہ پر
ختم ہو چکا، مگر غنیمت ہے کہ انکے خلف الرشید اب تلک بہت باقی ہیں۔ دعوے ہبہ فدک حضرت زہراؓ کی
طرف سے سنیوں کی معتبر کتابوں کے حوالے سے بیان کرنا اور حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم اور حضرت
زینب رضی اللہ عنہن دختران رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کو آنحضرت صلی اللہ سے منقطع

کرنا یہ مولوی عمار علی صاحب جیسے مقتدا و پیشوا شیعہ ہی سے ہو سکتا ہے کیونکہ متابعت بزرگان ایسے ہی
بزرگواروں کا کام ہے۔

اگر جھوٹ ہی بولنے کو جی چاہتا تھا تو ایسا بولنا تھا کہ پیش جا سکتا اور کسی کے خیال میں آ سکتا
مگر ایسا طوفان کہیں نہیں سنا تھا کہ ایک شخص کے سنی ہو جانے کے اندیشہ سے نہ خدا تعالےٰ اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے شرمائے اور نہ آئمہ معصومین کا کچھ پاس و لحاظ کیا حضرت ام کلثوم بنت
سیدۃ النساء کے خلیفہ ثانی سے نکاح کو ذکر نہ کرنا تو اس پر بھی تبکلف محمول ہو سکتا ہے کہ اگر ایک کو ذکر
نہیں کیا تو باقیوں سے انکار بھی تو نہیں کیا، پر یہ بات کہ حضرت رقیہ وغیرہا رضی اللہ عنہن دختران سرور
عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہ تھیں اور حضرت زہراء کا دعوائے ہبہ فدک کرنا اہلسنت کی معتبر کتابوں میں ہے
ایسا دروغ صریح ہے کہ کسی احتمال صحیح پر کسی طرح منطبق نہیں ہو سکتا چنانچہ بعد ملاحظہ رسالہ ھٰذا انشاء اللہ
میرے اس قول کی صحت بخوبی معلوم ہو جائے گی۔ یہ وہی مثل ہے "دروغ گویم برروئے تو"۔

مولوی صاحب کی دروغ گوئی کا ایک دلچسپ پہلو لیکن بغور دیکھئے تو مولوی صاحب کی بھی اس میں کچھ تقصیر نہیں،
آخر مذہب اہل سنت بشہادت کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحیح اور مذہب شیعہ بشہادت
کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سراسر غلط ہے۔ اور باوجود اس کے پھر اپنے پیشواؤں کو
دیکھا کہ مذہب شیعہ کو حق اور مذہب اہل سنت کو باطل کہتے ہیں، تو مولوی صاحب موصوف بحسن اعتقاد بزرگان
یہ سمجھ بیٹھے کہ حق غلط ہی باتوں کو کہا کرتے ہیں، اور کیونکر نہ سمجھیں۔ آخر مولوی صاحب عمدۂ علمائے شیعہ ہیں۔

بعد ازیں کلام اللہ کی تلاوت کا جو بھولے چوکے اتفاق ہوا تو سورہ احزاب میں یہ آیت نکل آئی۔
واللہ لا یستحیی من الحق یعنی اللہ تعالےٰ حق بات سے شرم نہیں کرتا چونکہ مولوی صاحب کو بزعم خود
کمال اتباع خداوندی مدنظر ہے تو اپنے عندیہ میں غلط باتوں سے پرہیز کرنا خلاف اخلاق خداوندی سمجھ کر جھوٹ
بولنے کی شرم طاق میں اٹھا دھری اور بے ساختہ مثل پیشوایان قدیم (کہ ان کی متابعت بھی بزعم مولوی
صاحب موجب سعادت ہے اور حضرات آئمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان کے حق میں بددعائیں کی ہیں
اور ان کو جھوٹا بتلایا ہے اور ان کی باتوں سے رنج اٹھایا ہے) انہوں نے بھی افترا پردازیوں پر کمر باندھی
تاکہ ان کی متابعت کے صدقے حضرات آئمہ رضوان اللہ علیہم کی دعا نہیں تو بددعا ہی میں شریک ہو جائیں)۔

رس کی رس کی اے سکھی تیرے دونوں سدا سہائے ✽ ٹھنڈی تتی نیر جوں دونوں آگ بجھائے

...نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

باب

مذہب اہلسنت موافق قرآن مجید وحدیث پاک ہے، اور مذہب شیعہ مخالف ہر دو

اہل سنت اہل حق اور شیعہ اہل باطل ہیں۔ دلائل

تفصیل اس بات کی کہ اہل سنت کا مذہب موافق ثقلین یعنی کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہے اور شیعوں کا مذہب مخالف ثقلین، اور یہ بات کہ پیشوایان شیعہ کے حق میں حضرات ائمہ نے کیا کیا کچھ کہا ہے اس رسالہ مختصر میں سما نہیں سکتی لیکن بطور نمونہ ایک ایک دو دو باتیں عرض کرنی ضرور پڑیں، اہل انصاف اسی سے سمجھ جائیں گے، مشتے نمونہ خرواری بعدازاں اس خط کی تردید مناسب وقت کی جائیگی۔ مخدوم من کلام اللہ میں سورہ بقر میں پہلے سیپارہ میں یہ آیت ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ؕ	حاصل اس کا یہ کہ جن کو ہم نے دی ہے کتاب وہ اسکو پڑھتے ہیں جو حق ہے پڑھنے کا وہی اس پر یقین لاتے ہیں اور جو منکر ہوگا اس سے سوا نہیں کو نقصان ہے

اس آیت کے مضمون کے دیکھنے کے بعد تصور میں نہیں آتا کہ کسی کو دربارہ حقیقت مذہب اہل سنت شک رہے اور جب اس میں شک نہ رہا۔ تو اس کا پہلے یقین ہو جائے گا کہ مذہب شیعہ باطل ہے۔

مضمون آیت پر تفصیلی نظر اور حق تلاوت میں ایمان کا انحصار

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ آیت ہر چند بعض اہل کتاب کے حق میں نازل ہوئی ہے لیکن اس آیت میں گو کسی کی شان میں نازل ہو کتاب اللہ پر ایمان لانے کو انہیں میں منحصر کر دیا ہے جو اسے خوب پڑھتے ہیں حق پڑھنے کا جب یہ بات انہیں میں منحصر ہوئی تو معلوم ہوا کہ کتاب اللہ پر ایمان کی علامت یہی ہے کہ اس کو خوب تلاوت کیا کرے کوئی سی خدا کی کتاب کیوں نہ ہو توراۃ ہو یا انجیل یا قرآن شریف۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی ذہین آدمی کی مشکل بات جلد سمجھ جائے اور خوب سمجھے۔ اور دوسرا اس کی تعریف میں یوں کہیں کہ بات کو ذہن سے سمجھتے ہیں تو گویہ تعریف اسی کے سنانے کے لئے کی گئی ہے پر حقیقت میں سارے ہی ذہینوں کی تعریف ہے

سو نسبت قرآن شریف کے یہ نشانی سوا اہل سنت کے اور کسی فرقے میں پائی نہیں جاتی خصوصاً شیعہ کہ ان کا تلاوت کرنا تو سب ہی جانتے ہیں۔

اہل سنت سے ادائیگی حق تلاوت اور شیعہ کی اس سے قطعی محرومی

یہاں تک کہ کلام اللہ کے یاد نہ ہونے میں ضرب المثل ہو گئے ہیں سو اس کا باعث بجز اس کے اور کیا ہے کہ جیسی تلاوت چاہیئے ان سے ویسی تلاوت نہیں ہو سکتی۔ جبقدر کلام اللہ کے پڑھنے میں محنت چاہیئے ان سے محنت نہیں ہو سکتی باقی اہل سنت کا ایسا تلاوت کرنا، جیسا تلاوت کا حق ہے۔ عیاں ہے اور عیاں راچہ بیان، اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ پڑھتے پڑھتے برزبان ہو جاتا ہے۔

بروئے آیت قرآنی قرآن کا حفظ ہونا حق ہونے کی نشانی

اس آیت سے اشارتاً معلوم ہوا کہ جتنے فرقے اہل اسلام میں معدود ہیں ان میں سے جونسا فرقہ حقانی ہوگا۔ اسی کو کلام اللہ یاد ہوگا۔ اور دنکو یاد نہیں ہو سکتا، ورنہ لازم آئے کہ باطل پر ہو کر ممدوح خداوند کریم ہوں۔ سو بحمد اللہ تعالیٰ یہ دولت نصیب اہل سنت ہوئی۔ ماسوا ان کے اور سب فرقے اس نعمت عظمٰی سے محروم رہے چنانچہ آج تک مسموع نہیں ہوا، کہ سوائے اہل سنت کے کسی اور کو روافض وخوارج میں سے یاد ہوا ہو اور فرقوں کا تو ہندوستان میں وجود ہی نہیں، پر سوائے اہل سنت، روافض البتہ بکثرت ہیں کوئی قصبہ اور کوئی شہر نہ ہوگا کہ وہاں ان کے غول کے غول نہ ہوں، علاوہ بریں نواح لکھنؤ اور اطراف دکن اور اضلاع سندھ میں باوجود کثرت کے تسلط بھی انہیں کا ہے یہاں تک کہ اسی باعث سے تشیع کو ہندوستان میں کمال درجہ کو شیوع حاصل ہوا، ہزاروں عالم شیعہ مذہب موجود، پر حافظ نام کوئی نہ دیکھا نہ سنا اور کسی کے ذمہ اگر شیعوں نے حفظ قرآن کی تہمت لگا بھی دی تو اسے یوں ہی کہتے ہوئے سنا کہ یاد تو تھا پر آج کل کچھ کچا ہو گیا ہے اسلئے فی الحال سنانے سے معذور رہوں۔ اور جو سنانے پر آتیں بھی تو ایک ایک سیپارہ کے سنانے پر آتے ہیں، یہ نہیں کہ ایک جلسہ میں یا دو جلسہ میں پڑھ کر ادھر سے ادھر کر دیں۔

شیعوں کے حافظ نہ ہونے کا واقعات سے ثبوت

منجملہ حفاظ شیعہ مولوی جعفر علی صاحب پیش امام دہلی جو ورع و تقوے و علم و فضل میں مجتہد زمانہ نہیں تو مجتہد ثانی تو بیشک و شبہ ہیں ان کے حفظ کی یہ کیفیت ہے کہ رمضان شریف میں غدر سے پہلے بچشم خود اس احقر نے دیکھا ہے کہ جلسہ تلاوت قرآن میں جو دن کو نواب حامد علی خاں کی مسجد میں ہوا کرتا تھا۔ مثل دیگر حضار شیعہ مذہب حمائل میں

[illegible] پر بھی دو جگہ غلط پڑھ گئے۔ اور خداوند کریم کی حق نمایاں دیکھئے کہ
اسی جلسہ میں حفاظ اہلِ سنت جو بطور سیر آجاتے تھے اور اہل تشیع ذب کران کو بھی پڑھنے
کے لئے کہتے۔ تو وہ بَرزبان ہی پڑھتے تھے۔ مگر تاہم دیدہ عبرت شیعہ کشادہ نہیں ہوتا تھا۔
ایک شخص سنی المذہب مولوی حافظ عبدالعزیز نام ساکن نجیب آباد کہتے تھے کہ میں کچھ کتب
درسیہ میں سے مولوی جعفر علی صاحب سے پڑھا کرتا تھا۔ اتفاقاً کچھ اس کا مذکور آگیا۔ کہ شیعوں کو
کلام اللہ یاد نہیں ہوتا، سنکر فرمانے لگے کہ تم سنوگے؟ میں نے عرض کیا کیا مضائقہ ہے، اگر ایک دو جلسہ
میں ہو، یا یوں کہا کہ زیادہ زیادہ پڑھیے تو کیا مضائقہ ہے مگر پھر مولوی صاحب کہاں تھے۔ بجز
اس کے نہ بن پڑی کہ ایک ایک سیپارہ ہر روز سن لیا کرو، جائے غور ہے کہ ایک ایک سیپارہ روز تو بعضے
بعضے بندگان خدا از سر نو یاد کر سکتے ہیں؟ وہ حافظ ہی کیا ہوا کہ جس نے ایک جلسہ میں کلام اللہ
نہ پڑھ لیا، اور میں جانوں کہ مولوی صاحب سے ایک ایک سیپارہ بھی نہ سنایا جاتا، یہ بھی ایک دھمکی
تھی، مولوی عبدالعزیز صاحب مذکور یوں سمجھ کر کہ شاید اب یاد کر کر سنادیں اور پھر یاد نہ رہے، ہو
اتنی بات میں سردست میرا دعویٰ تو غلط ہو جائے گا یا دو چار سیپارہ ان کو یاد ہوں اور ان کو جوں
توں سنا کر پھر کچھ حیلے بہانے لے دیں، اور ان کو کہنے کو جگہ ہو جائے اس بات پر پکے نہ ہوئے اور نیز
یہ بھی مرکوز خاطر ہوگا کہ سب پر عیاں ہو جائے کہ مولوی صاحب کو یاد نہیں، ان کا حافظ کہنا ایک حرف
غلط ہے کہ منجملہ اور دروغوں کے زبان زد شیعہ ہو گیا۔ اور اگر مر مار کر ایک دو نے بالفرض بفرض محال
کچا پکا یاد بھی کر لیا، تو غیرت مندان شیعہ کے لئے تو یہی بات ڈوب مرنے کو بہت ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ایک
ایک شہر بلکہ بعضے بعضے ایک قصبہ میں اہل سنت میں سو سو بلکہ زیادہ زیادہ حافظ ہوتے ہیں اور طرفہ
یہ ہے کہ بعضے بعضے قصبات میں اہلسنت ہی کے برابر برابر شیعی ہوتے ہیں، لیکن اہل سنت میں سینکڑوں حافظ
ہوتے چلے جاتے ہیں اور شیعوں میں ایک بھی نہیں ہوتا، چنانچہ سہارنپور اور پانی پت اور کرانہ میں یہی
حال ہے اور وجہ اس یاد نہ ہونے کی (حالانکہ متقضاء طعن اہل سنت یہ تھا کہ کلام اللہ چھوڑ شیعی تفسیر کبیر
بھی یاد کر لیتے) یہی بات ہے کہ جیسا تلاوۃ کا حق ہوتا ہے ان کو میسر نہیں آتا۔

شیعہ ادائیگی حق تلاوت سے کیوں محروم ہیں
شیعوں کو کلام اللہ سے طبعی لگاؤ نہیں

اور باعث اس کا واللہ اعلم یا تو یہ ہے کہ طبائع انسانی وحیوانی
باعتبار غذا کے جیسے مختلف ہیں کہ کسی کو میٹھا بھاتا ہے۔ کسی کو نمکین

کسی کو ایک چیز کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ کسی کو نفرت۔ انگریزوں کو عطر لینڈر سے تنفر اور گیلی کے
اچار سے جسے سونگھ بھی لیجئے تو دماغ چھوڑ جان کی خیر نہیں رغبت پاخانہ کے کیڑے گندگی
میں خورم وشاد وعیش وآرام سے رہیں اور خوشبو سونگھیں تو مرجائیں۔ ایسے ہی باعتبار امور دینی
کے جو غذا ارواح ہیں۔ ارواح بنی آدم مختلف ہیں۔ کسی کو رغبت ہے کسی کو نفرت، کسی کو لذت
آتی ہے کسی کی جان نکل جاتی ہے۔ سو حضرات شیعہ کو بھی کلام اللہ پر محنت کرتے موت نظر آتی ہے

شیعہ اپنے اساتذہ کے حق میں گستاخ اور بے ادب ہیں

اور یا یہ ہے کہ جو شاگرد استاد کی خدمت میں گستاخ
ہوتا ہے عادت الٰہی یوں جاری ہے کہ علم سے بہرہ ور نہیں ہوتا، وجہ اس کی شاید یہ ہو کہ شکر پر وعدہ مزید
نعمت ہے، چنانچہ فرمایا ہے لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ یعنی اگر شکر کروگے تو البتہ ہم اور زیادہ دیں گے۔
تو اس صورت میں بشہادت عقل کفران پر زوال نعمت متفرع ہونا چاہیئے ادھر حدیث میں ہے مَنْ
لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللهَ یعنی جو کوئی آدمیوں کا شکر نہ کریگا وہ اللہ کا بھی شکر نہ کرے گا،
اور ظاہر ہے کہ ہر چند منعم حقیقی خداوند کریم ہے پر دولت علم بواسطہ استاد ہی حاصل ہوتی ہے اور
نعمت عظمیٰ کلام اللہ کے استاد حضرات صحابہ ہیں جنمیں سے خلیفہ اول اور ثالث کو تو بوجہ تالیف
مصنف مجازی کہیئے تو بجا ہے پھر ان گستاخوں کو یہ نعمت عظمےٰ عطا ہو تو کیوں کر۔؟

تلاوت کا حق ادا کرنے والوں کے سیرو بھی حصر ایمانی میں شامل نہیں

مگر جیسے اشارہ خداوندی سے یہ نکتہ مذکورہ معلوم ہوا یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ ایمان
کا ان لوگوں میں منحصر ہونا جو خوب ہی تلاوت کرتے ہیں اور جو
حق تلاوت ہے وہ بجالاتے ہیں، تو یہ نسبت ان لوگوں کے ہے جو کلام اللہ کی تلاوت میں تو مقصر ہیں
اور باینہمہ اپنی ہی سمجھ کے موافق اس پر عمل کرتے ہیں، یا ان لوگوں کے حق میں جو ان کے اتباع و توابع
ہیں اور مطلق کم پڑھنے والوں کی یا بالکل نہ پڑھنے والوں کی نسبت حصر نہیں۔ کیونکہ وجہ اس حصر کی ان
لوگوں میں جو حق تلاوت ادا کریں۔ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ جو کسی کتاب کو کثرت سے دیکھے بھالے گا۔
وہی اس کو خوب سمجھے گا اور اس کی حقیقت کو پہنچے گا۔ اور کتاب اللہ پر ایمان اسی کا نام ہے کہ اس کے
احکام اور مضامین کو حق سمجھے جو لوگ ان لوگوں کے متبع ہوں گے کہ وہ جیسا تلاوت کا حق ہے تلاوت
کیا کرتے تھے اور اس سبب سے اس کی اصل حقیقت کو پہنچ گئے ہیں اور ان کے تلانے موافق عمل کرینگے
وہ بھی ایمان سے محروم نہ ہوں گے اور فرقہ مشار الیہا بلفظ وَمَنْ يَكْفُرْ میں داخل نہ ہونگے، ہاں جو

شخص اس کی تلاوت میں مقتصر رہا اور بے تقلید کسی اور کے اپنی ہی سمجھ کے موافق اس پر عمل کرنے کا ارادہ کیا تو ایسی محنت والے تو قانون انگریزی میں بھی بہکتے ہیں، جس میں چنداں دقائق نہیں ہوتے، کلام اللہ کو جو مخزن تمام علوم اور مجموعہ جملہ دقائق ہے کیا خاک سمجھیں گے بلکہ بالیقین کچھ کا کچھ سمجھ جائیں گے، سو ایسے لوگ جو کتاب اللہ کچھ کہے اور وہ کچھ کہیں، گو اپنے عندیہ میں کتاب اللہ پر ایمان رکھتے ہوں کتاب اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور ان پر یہ قول خداوندی سراپا مطابق ہے وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ یعنی جو لوگ کتاب اللہ پر ایمان نہ لائے۔ سو وہی ٹوٹے میں ہیں اور اس آیت میں بھی ان کی طرف اشارہ ہے يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا یعنی خدا تعالے اس قرآن سے بہت لوگوں کو بہکا بھی دیتے ہیں۔

آیت کے شان نزول سے بیان مذکور کی شہادت

اور اس تقریر کی صحت کا موید قطع نظر اس کے ظاہر ہے ایک یہ بھی ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے جو کتاب اللہ کو خوب تلاوت کیا کرتے تھے اور اس سبب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علامتیں جو اس کتاب میں تھیں خوب یاد ہوگئی تھیں اور انکے مطالب کے سب پہلو ان کے ذہن نشین ہوگئے تھے اسی سبب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہ وہی ہیں ہر طرح کے ان اوصاف کو آپ کے مطابق پایا اسمیں اختلاف ہے کہ وہ کتاب کونسی تھی توریت یا انجیل؟ اور وہ لوگ ن تھے یہود یا نصاریٰ۔

ادائیگی حق تلاوت میں سنی اور شیعہ فرقوں میں اکثریت کا لحاظ

بایں ہمہ یہ بھی اہل فہم پر روشن ہے کہ ہیئت مجموعی کی رو سے تمام فرقہ اہلسنت اور علی ہذا القیاس تمام فرقہ شیعہ ایک گنا جاتا ہے۔ سو ہیئت مجموعی اہلسنت کو جدا لحاظ کیجئے اور ہیئت مجموعی شیعہ جدا پیش نظر رکھئے۔ اور دیکھئے کہ اس فرقہ میں کثرت تلاوت اور تلاوت کا جیسا حق ہے پائی جاتی ہے یا فرقہ شیعہ میں اور ہیئت مجموعی کی رو سے سب کا ایک ہی حال ہوتا ہے ایک کی بات سب ہی کی طرف منسوب ہوتی ہے تھوڑی ہے تو تھوڑی اور بہت ہے تو بہت ہاتھ پاؤں آنکھ ناک کے احوال کو تمام عالم مجموعہ کی طرف یعنی اپنی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ ہاتھ میں کچھ تکلیف ہو تو یوں کہا کرتے ہیں کہ میں بیمار رہوں، یا فلانا بیمار رہے، علی ھذا القیاس، میں نے کسی کو مارا یا مجھکو کسی نے مارا یا میں نے کسی کو دیکھا یا مجھکو کسی نے دیکھا یہ ساری اضافتیں جزء کی کل کی طرف باعتبار مجموعہ کے ہوتی ہیں، یعنی مجموعہ کو ایک سمجھ کر جزء کے حال کو کل کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ معہذا للاکثر حکم الکل سب ہی کا سنا ہوا جملہ اور سب ہی کے نزدیک مسلم ہے اکثر کی بات وصفات کل ہی طرف منسوب ہوتی ہے سو اکثر دیندار ان اہلسنت بکثرت تلاوت میں مشغول رہتے ہیں بخلاف شیعہ کہ ان کا حال

خود عیاں ہے۔

شیعوں کی ایک راہ گریز اور اس کا انسداد

اس تقریر کے بعد شاید فاضلان شیعہ اپنے بچاؤ کی یہ سبیل کریں کہ حق تلاوت کے ہمارے نزدیک یہ معنے ہیں کہ بخشوع و خضوع و حضور قلب و تدبر آیات تلاوت کی جائے۔ سو اس بات کی سنیوں میں ہونیکی اور شیعوں میں نہ ہونے کی کیا دلیل ہے اس لئے بندہ کمترین بھی بطور پیش بندی یہ گذارش کرتا ہے کہ موافق مثل مشہور ہمارا ادھر بھی لکھا ہے اس بات کے تسلیم سے بھی ہمیں انکار نہیں کیونکہ خشوع و خضوع کا باعث بجز حسن عقیدہ یا کثرت تلاوت بہ نسبت کلام اللہ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا حسن عقیدت کا باعث خشوع خضوع ہونا تو ظاہر ہے رہی کثرت تلاوت سو اس کی یہ وجہ ہے کہ اکثر بنی آدم خدا سے غافل دنیا کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ساعت دو ساعت کے ذکر یا تلاوت سے ان کی غفلت اور رغبت زائل نہیں ہوتی، ہاں مدتہا دراز تک اگر ذکر کی مشق کیجئے تو مثل اور کاموں کے البتہ بعد دیر یادداشت اور حضور کا ملکہ پیدا ہو جائے گا اس وقت خشوع و خضوع آپ پیدا ہو جائے گا مگر ان فرقوں کو ذکر کرنے والے اور تلاوت کرنیوالے ہی جانیں تو جانیں شیعی کیا جانیں۔؟

اہل سنت کو کلام اللہ سے حسن عقیدت ہے، شیعوں کو نہیں

خیر غرض یہ ہے کہ باعث خشوع و خضوع یا حسن عقیدت ہے یا کثرت تلاوہ، بلکہ دونوں مل کر باعث حصول خشوع و خضوع ہوتے ہیں۔ سو حسن عقیدت کا اُن لوگوں کے دلوں میں ہونا معلوم جو کلام ربانی کو بیاض عثمانی سمجھتے ہوں ہاں اہلسنت کے لئے جو کلام اللہ کو بلا کم و کاست و تغیر و تبدل حرفاً حرفاً بجنسہ کلام اللہ منزل سمجھتے ہیں، جتنا کہیئے تھوڑا ہے معہذا موافق نقل عربی الْإِنَاءُ يَتَرَشَّحُ بِمَا فِيهِ یعنی برتن میں سے وہی چیز چھلک کر نکلے گی جو اس کے اندر ہوگی۔ احوال شیعوں اور سنیوں کو مطابق کر کے دیکھ لیجئے کس کو اس کلام سے زیادہ اعتقاد ہے اہلسنت کا حال تو ظاہر ہے اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ حرز جان سمجھتے ہیں اور جہاں شیعی جزدانوں اور مکانوں میں رکھتے ہیں سنی بوجہ محبت سینوں میں اور جانوں میں رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کلام اللہ کی تعلیم و تعلم سے زیادہ اور کسی چیز کی تعلیم و تعلم کا اہتمام نہیں۔ سب میں پہلے بچوں کو کلام اللہ ہی پڑھاتے ہیں اور تا مقدور حفظ ہی کراتے ہیں، کلام اللہ کے سامنے کسی کی نہیں سنتے یہاں تک کہ احادیث کو بھی اس پر مطابق کر کے دیکھتے ہیں اگر موافق نکلی تو فبہا ورنہ موافق مثل مشہور کالائے زبون بریش

خاوند اس کو راویوں کے سر مارتے ہیں اور جان لیتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ راوی کا قصور ہے القصہ عقل و نقل کی کسوٹی اور دین و دنیا میں امام سمجھتے ہیں چنانچہ سب جانتے ہیں۔ باقی رہے حضرات شیعہ ان کی بے اعتقادی بھی اسی درجہ کی ہے اور کیونکر نہ ہو علامہ کلینی اپنی کتاب کافی میں جو شیعوں کے نزدیک اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے، وہ وہ روایتیں رقم فرماتے ہیں کہ جن کے دیکھنے سے کلام اللہ کی طرف سے نعوذ باللہ بالکل جی ٹھنڈا ہو جاتا ہے شائقین کی نظر سے انشاء اللہ جلد ہی گذرتی ہیں

شیعوں کی نظر میں کلام اللہ کی حیرت ناک بے وقعتی

بالجملہ کلام اللہ کی بے اعتباری تورات و انجیل کی بے اعتباری سے بھی چند نمبر زیادہ ہے ناظرین روایات مشار الیہا انشاء اللہ اس قول کو آپ تسلیم کریں گے غرض نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ کلام ربانی کا نام ہی ان کی اصطلاح میں بیاض عثمانی ہو گیا ہے۔ اور اپنے آپ بے کہے سنے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ منجملہ ثقلین کلام اللہ کے ساتھ تو ہمیں تمسک میسر نہیں ادھر تلاوت کلام ربانی کے انداز اور مجلس مرثیہ و کتاب خوانی کی تعظیم و توقیر کے موازنہ سے خود ظاہر ہے کہ شیعوں کے دل میں کلام اللہ کی مرثیوں کے برابر بھی قدر و منزلت نہیں گو زبان سے نہ کہیں ورنہ اس کے کیا معنی کہ کلام اللہ کے پڑھنے والے کو بھی حقہ پی لینے میں کچھ دریغ نہ ہو اور محفل مرثیہ و کتاب میں کیا مقدور جو کوئی حقہ کی طرف دیکھ بھی سکے، بہر حال اکثر شیعہ اس بات پر شاہد ہیں کہ کلام اللہ کی عظمت ان کے دلوں میں چنداں نہیں گو اقل قلیل اہل سنت میں بھی ایسے ہوں کہ ان کا حال ان کے قال کے موافق نہ ہو ایسی ہی کثرت تلاوت اس کے کہنے کی کچھ حاجت نہیں یہ تو شیعوں کے اقرار سے بھی بفضلہ تعالیٰ نصیب اہلسنت ہی ہوا ہے۔

حق تلاوت سے خشوع و خضوع مراد لینے میں شیعہ کی مطلب براری ہے اور نہ یہ احتمال آیت شریفہ پر چسپاں ہوتا ہے

القصہ اگر علماء شیعہ حق تلاوت کو بمعنی خشوع و خضوع رکھیں تو ہمیں تو کچھ انکار نہیں کیونکہ خشوع و خضوع بھی اگر ہے تو اہل سنت ہی میں ہے پر اس کو کیا کیجیے کہ نظم و نسق کلام اللہ اسی طرف ہے کہ حق تلاوت سے کثرت تلاوت ہی مراد ہے کیونکہ اول تو حق تلاوت یتلونہ کا مفعول مطلق ہے اور مفعول مطلق سب جانتے ہیں کہ بمعنی فعل مذکور یا اس کے اقسام میں سے ہوتا ہے سو کثرت تلاوت تو بیشک اقسام تلاوت میں سے ہے پر خشوع و خضوع داخل تلاوت نہیں بلکہ امور خارجیہ میں سے ہے، کون نہیں جانتا کہ تلاوت زبان کا کام ہے اور خشوع و خضوع دل کے احوال میں سے ہے اور یہ بھی نہ سہی اُولٰئِکَ

یُؤمِنُونَ بِہٖ کا اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ پر محمول کرنا اس بات کو مقتضی ہے کہ ایمان تلاوت موصوف پر متفرع ہو چنانچہ جو لوگ فنون بلاغت سے آشنا ہیں وہ اس بات سے بھی آشنا ہیں اور اسی واسطے یؤمنون بصیغہ استقبال فرمایا آمنوا نہ فرمایا۔

حق تلاوت سے خشوع و خضوع مراد لینے کی صورت میں ترتیب معانی کا الٹ جانا

طرفہ یہ ہے کہ در صورتیکہ حق تلاوت بمعنی خشوع و خضوع ہو معاملہ برعکس ہو جائے گا تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایمان سے یا تو معنے مشہور مراد لیجیے یا بمعنی کمال انقیاد و تسلیم جسے ایمان کامل کہتے ہیں رکھیے یا بتصدیق معانی مقصودہ جو مراد خداوندی ہی قرار دیجیے سو بہر صورت معاملہ برعکس ہے ایمان بمعنی مشہور یعنی تصدیق لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا خضوع و خشوع سے پہلے ہونا تو کسی پر مخفی ہی نہیں سب جانتے ہیں کہ ایمان ہی سے بقدر ایمان خضوع و خشوع پیدا ہوتا ہے نہ کہ برعکس۔ رہا ایمان بمعنے کمال انقیاد سو وہ بھی اسی طرح خضوع و خشوع تلاوت سے مقدم ہے کیونکہ وہ سبب ہے، اور یہ مسبب معہذا آیت

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔	وہ لوگ جو ایمان لائے اور چین پاتے ہیں انکے دل اللہ کی یاد سے سن لو اللہ کی یاد ہی سے چین پاتے ہیں دل

بھی اسی طرف مشیر ہے کہ ایمان کامل باعث کثرت ذکر اور موجب حصول اطمینان قلب جو عین توجہ الی اللہ و حضور قلب ہے، ہوتا ہے کیونکہ اطمینان قلب کا حاصل ہونا بجز نفوس مطمئنہ کے جو کامل الایمان ہوتے ہیں متصور نہیں چنانچہ بدیہی ہے باقی رہا ایمان بمعنی تصدیق و علم مراد خداوندی، سو وہ بھی بشہادت آیت

اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ تَرٰٓی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ	اور جب سنتے ہیں اس کو جو اترا رسول پر تو دیکھے تو ان کی آنکھوں کو ابلتی ہیں آنسووں سے، اس وجہ سے کہ انہوں لیا پہچان حق بات کو۔

حال خضوع سے جو اس آیت میں بضمن تَرٰٓی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مذکور ہے مقدم ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ جب سنیں وہ لوگ کہ جن کا اوپر ذکر ہے اس کلام کو جو رسول پر نازل کی گئی ہے تو دیکھے تو ان کی آنکھوں کو کہ آنسووں سے بہہ رہی ہیں بسبب اس کے کہ جان لیا انہوں نے حق بات کو۔ سو اس سے یہ بات صاف روشن ہے کہ انہوں نے کلام اللہ کو سنکر مضامین حق دریافت کئے اس سبب ان کا یہ حال ہو گیا کہ آنسووں کا تار بندھ گیا ہے یعنی بسبب حق کے دریافت

ہو جانے کے انکے دلوں میں خشوع وخضوع پیدا ہو گیا، نہ یہ کہ رونے اور خشوع وخضوع کے باعث ان کو حق بات معلوم ہو گئی ہو غرض در صورتیکہ حق تلاوت بمعنی خشوع وخضوع ہو تو بہر طور ترتیب بالعکس ہوئی جاتی ہے۔

حق تلاوت سے کثرت تلاوت مراد لینے کی صورت میں ترتیب معانی کا ٹھیک اور درست رہنا

ہاں اگر حق تلاوت سے کثرت تلاوت مراد ہو، تو تینوں صورتوں میں ترتیب بطور خود رہے گی۔ کیونکہ بے ایمانوں اور ضعیف الایمانوں کو تو کثرت تلاوت موجب آگاہی حقائق ودقائق کلام ربانی ہی ہوتی ہے اور باعث ہدایت اور رفع شکوک اور سبب حسن عقیدت جو عین ایمان ہے ہو جاتی ہے۔ سو اگر ایمان سے بمعنی مشہور مراد ہو تو بایں طور کثرت تلاوت باعث حصول ایمان ہے اور اگر کمال ایمان مراد ہے تب بھی یہی بات ہے۔ کیونکہ کثرت تلاوت سے دم بدم غفلت زائل ہوتی جاتی ہے اور لمحہ بلمحہ ملکۂ یاد داشت اور حضور قلب ترقی پکڑتا ہے اور صفا آئینہ قلب کی زیادتی اور انوار تجلیات کے ہجوم کا باعث ہو جاتی ہے اس وجہ سے تصدیق قلبی محکم اور مستحکم ہو جاتی ہے اور کمال انقیاد پیدا ہوتا ہے، باقی رہا ایمان بمعنی علم مراد خداوندی سو اس کا کثرت تلاوت پر متفرع اور مترتب ہونا تو سب ہی پر ظاہر ہے، کون نہیں جانتا کہ ایک کتاب کا کثرت سے مطالعہ کرنے والا اس کے مطلب کو بہ نسبت ان لوگوں کے جو اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اکثر صحیح ہی سمجھتا ہے

آیت مذکورہ میں ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اب ایک شبہ باقی رہا وہ یہ ہے کہ آیت اَلَّذِیْنَ آتَیْنٰهُمُ سے ایمان کا تلاوت موصوف پر متفرع ہونا ہر چند ظاہر ہے چنانچہ مبتداء کو بقید مذکور مقید کرنا اور اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ کا اس پر محمول کرنا اور یُؤْمِنُوْنَ کہنا اور آمَنُوْا نہ کہنا سب اسی طرف مشیر ہیں مگر احتمال یہ بھی تو ہے کہ بطور معلوم تلاوت کرنا ایمان کی فقط علامت ہو۔ اور ترتب اور تفرع کا کچھ لحاظ نہ ہو اور ظاہر ہے کہ بعضی اشیاء کی علامتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ ان اشیاء ہی کے سبب پیدا ہوتی ہیں جیسے دھواں دور سے جہاں سے آگ نظر نہ آتی ہو، آگ کی علامت ہے اور اسپر آگ ہی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا وجود آگ کے وجود کی فرع ہے آگ کا وجود اس کے وجود کی فرع نہیں۔ سو ایسے ہی اگر تلاوت موصوف ایمان کی علامت بھی ہو اور پھر ایمان ہی سے پیدا بھی ہوتی ہو اور بغرض بیان علامت ہی جناب باری نے یہ فرمایا ہو تو کیا ہرج ہے، اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ عمدہ توجیہ کو چھوڑ کر ایسے احتمال ضعیف کو لینا اول تو یہی دلیل کم فہمی ہے خصوصاً خدا کے کلام میں کہ اس میں بالاتفاق اگر ہو گی تو عمدہ توجیہ مراد خداوندی ہو گی دوسرے

یَتْلُوْنَهٗ لیکن اس کا کیا جواب کہ بیان علامت سے تو غرض یہی ہوتی ہے کہ وہ شے جس کی یہ علامت ہے متمیز اور متبین ہو جائے، سو جب تک علامت خود متمیز و متبین نہ ہو گی تب تک یہ بیان علامت بیکار ہے خدا کے کلام میں بیہودہ بیکار باتوں کا ہونا منجملہ محالات ہے، اور چونکہ خشوع وخضوع امر مخفی ہے اس کو علامت ایمان مقرر کرنا تعریف مجہول بالمجہول اور تشریح مخفی بالمخفی کی قسم میں سے ہے البتہ کثرت تلاوت ایک امر محسوس ہے اس کو اگر علامت کہیئے تو زیبا ہے اور پھر قطع نظر اس کے مفید ترتیب مذکور معہذا خضوع و خشوع کو باعتبار عادت کے مستلزم، چنانچہ مذکور ہوا۔ سو اس صورت میں علامت ہونا بھی صحیح ہو گیا اور خضوع وخشوع کی طرف بھی اشارہ ہو گیا اور ترتیب وتفریع بھی ہاتھ سے نہ گئی اور حق تلاوت کا مفعول مطلق ہونا بھی صحیح و درست رہا اور کسی طرح کی تکلیف کی ضرورت نہ پڑی،

آیت مذکورہ کے ذیل میں ایک اور فائدہ

جب اس شبہ کی تردید سے فراغت پائی تو ایک اور فائدہ گوش گذار اہل فہم ہو وہ یہ ہے کہ قید آتَیْنٰهُمُ سے یوں خیال میں آتا ہے کہ جن لوگوں کو کتاب نہیں دیگئی یعنی اس کو مانتے ہی نہیں، چہ جائیکہ مانکر غلط سمجھ جانا، ان لوگوں میں سے اگر کوئی حافظ ہو جائے تو مضائقہ نہیں، یا یوں کہیئے کہ اس کو ایسی تلاوت جسے تلاوت کا حق کہتے ہیں میسر آجائے تو آجائے، پر ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب ملی ہے یعنی انہوں نے اسکو تسلیم کیا، کثرت تلاوت وہاں ہی ہو گی جہاں حق ہی حق ہو گا کچھ کبھی نہ ہو گی کیونکہ کثرت تلاوت جسے تلاوت کا حق کہتے ہیں، علامت ایمان ہے تو فقط انہی کی نسبت ہی جو اس کو تسلیم بھی کرتے ہیں، نہ کہ ہر کسی کے حق میں، اس صورت میں یہ جو مشہور ہے کہ برنس نصرانی کو کلام اللہ یاد تھا۔ کیا عجب ہے کہ صحیح ہو سو بہر حال بعلامت یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بشارت اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ فرقہ اہلسنت کے لیے ہے اور حضرات روافض منجملہ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ہیں جس کے یہ معنے ہیں اور جو لوگ کتاب اللہ سے پھر گئے سو وہی ٹوٹے میں ہیں۔

اس ایک آیت کی طرح اور بھی آیت قرآنیہ مذہب اہلسنت کو حق اور مذہب شیعہ کو باطل قرار دیتی ہیں بغرض اجمال فقط ایک پر اکتفا کی گئی۔

اب التماس یہ ہے کہ سوا آیت مذکورہ آیات کثیرہ حقیقت مذہب اہل سنت، اور بطلان مذہب شیعہ پر دلالت کرتی ہیں۔ اور کیونکر دلالت نہ کریں جسقدر عقائد مخصوصہ مذہب شیعہ اور فروع خاصہ مذہب مذکور ہیں، تمامہا مخالف کلام اللہ ہیں۔ اور مذہب اہلسنت سراپا کلام اللہ پر مطابق، اور وجہ اس کی یہی ہے کہ بسبب تلاوت کے حق ادا کرنے کے اہلسنت تو مغز سخن ربانی کو پہنچے اور شیعہ بسبب

اس لئے کہ کثرت تلاوت کے باوجود ان کو میسر آئی، دقائق کلام اللہ کو نہ سمجھے مگر چونکہ آیت مذکورہ کے ذکر کرنے سے یہ بحث معلوم ہوگیا۔ تو اہل عقل بالاجمال سمجھ جائیں گے کہ بیشک آیات ربانی مخالف مذہب شیعہ ہونگی اور مذہب اہل سنت تمامہا موافق قرآن مجید تو قطع نظر اس کے کہ آیت مذکورہ حقیت مذہب اہلسنت و بطلان مذہب شیعہ پر جداگانہ بھی دلالت رکھتی ہے چنانچہ ملاحظہ تقریر بالا سے واضح ہو جائیگا اور یہ آیت کے ذکر سے بھی حقیت مذہب اہلسنت اور بطلان مذہب شیعہ پر دلالت کرتی ہے چونکہ اس وجہ سے یہ آیت اور آیات کی بھی نیابت کرتی ہے تو اس کو کیا بیان کیا گویا سب ہی کو بیان کر دیا اسی وجہ سے اور آیات کے بیان سے مقصر ہوں معہذا اگر تمام آیات مخالف مذہب شیعہ کو لیجئے تو ایک دو نہیں جو سہل ہو بکثرت بلکہ اکثر آیات کلام اللہ عقائد و احکام دا صول و فروع مذہب شیعہ کو رد کرتی ہیں اور مذہب اہلسنت کی حقیت اور حقانیت پر شاہد ہیں، اس رسالہ مختصر میں سب کی گنجائش کہاں؟ خصوصاً جبکہ بقدر فہم انکی شرح بھی کیجئے اور ان سے اہلسنت کی حقانیت اور ان کے مذہب کی حقیت اور اہل تشیع کے مذہب کے بطلان پر استدلال بھی لائیے۔

استدلال آیت مذکورہ پر شیعوں کی طرف سے ایک پر شکوک شبہ

لہٰذا ایک ہی آیت پر کہ وہ ایک ہی سب کے قائم مقام اور مفید خاص و عام ہے اکتفا کر کے اس قدر اور گذارش کرتا ہوں کہ شاید کسی شیعی المذہب کو اس آیت کی ہدایت کو سنکر بسبب کجی طبیعت اور ضلالت طبع زاد اور تعصب نہاد یہ شبہ ہو کہ یہ آیت ہے تو کیا ہوا ایک جملہ قرآنی ہے سو قرآن کا نعوذ باللہ منہ کیا اعتبار ہمارے اعتقاد کے موافق کمی کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ بیشی اور افزائش اور تبدیلی الفاظ بھی ظہور میں آئی ہے۔ پھر عجب نہیں کہ یہ آیت بھی منجملہ الحاقات اہل سنت ہووے

شبہ کا ایک پہلو سے جواب

سو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ مذہب محققین شیعہ اس بات میں یا تو یہ ہے کہ کلام اللہ میں نہ کمی ہوئی نہ بیشی، چنانچہ استاد علامہ کلینی حضرت صدوق اس کے قائل ہیں یا یہ ہے کہ کمی تو ہوئی ہے زیادتی نہیں ہوئی۔ غرض زیادتی کا نہ ہونا اجماعی۔ اور آیت مرقومہ سے انکار نہیں ہو سکتا مگر یہ چونکہ دونوں مذہب مخالف مرویات کلینی ہیں جو اصح الکتب شیعہ ہے۔ اور نیز ذہن نشین اکثر شیعہ بھی یہی ہے کہ کلام اللہ میں کمی زیادتی دونوں ہوئی ہیں۔ ادھر ہمارے بعض مطالب مذکورہ بھی اسی پر مبنی ہیں اس جواب پر قناعت نہیں ہو سکتی۔

شبہ کا دوسرے پہلو سے جواب

اس لئے دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ اور شیعوں کے مذہب کے بطلان

ہی کی دلیل ہے۔ بحمد اللہ باقرار شیعہ اتنا تو معلوم ہوا کہ مذہب تشیع کا اعتبار نہیں کیونکہ ماخذ احکام دین سب میں اول کلام اللہ ہی تھا جب اس کا اعتبار نہیں تو جو باتیں شیعی بزعم خود کلام اللہ سے ثابت کرتے ہیں اگر بفرض محال ثابت بھی ہو جائیں تو بدرجہ اولی قابل اعتبار نہ ہوں گی۔

کلام اللہ پر بے اعتباری ظاہر کرنا خود اپنے خیال کی بیخ کنی ہے

معہذا ثقلین جو متفق علیہ طرفین ہیں اس بات پر شاہد ہیں کہ کلام اللہ اور عترت دونوں کے ساتھ تمسک رہے گا تو گمراہی پیش نہ آئے گی۔ پھر جب کلام اللہ سے جو موافق حدیث مذکور دونوں میں اعظم ہے تمسک میسر نہیں تو بہ شہادت عقل سلیم ہدایت بھی نہیں سراپا گمراہی ہے۔ غرض حضرات شیعہ اگر یہ احتمال پیش کریں تو یہ تو اور الٹے اپنے ہی پاؤں میں تیشہ مارنا ہے۔

کلام اللہ پر سے اعتبار اٹھ جانا احادیث پر سے اعتبار کو پہلے کھو دیتا ہے

ادھر بالبداہت اور بالاجماع کسی فرقے کی کوئی حدیث اس درجے کو شائع و ذائع نہیں ہوئی جس درجے کو کلام اللہ شائع ذائع ہوا ہے اور نہ اس طرح سے کسی حدیث کے سارے راوی اس کی روایت میں متفق اللفظ پھر جب کلام اللہ کا اعتبار نہیں اس کا کاہے کو ہوگا۔ پھر جیسں راویان احادیث شیعہ کے احوال کو اور ان احادیث کے تعارض کو دیکھئے تو بے اعتباری میں نہایت ہی کو پہنچ جائیں گی بہرحال اگر یہ شبہ علماء شیعہ پیش کریں اور اکثر مواقع میں پیش کرتے ہیں تو ہمارے لئے بہت تخفیف تصدیع ہے۔

ع۔ عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

کلام اللہ میں کمی و بیشی کا خیال تلاوت اور حفظ قرآن کا خاتمہ کر دیتا ہے

معہذا شیعوں ہی کے اقرار سے ہمارا وہ دعوےٰ جو تقریر شرح آیت مسطورہ میں گذرا ہے۔ خدا ساز ثابت ہوگا کیونکہ جب قرآن میں اس درجہ کمی و بیشی ہے تو پھر جسے قرآن کہتے ہیں۔ قرآن ہی نہ ہوا۔ اب اگر شیعی اسے یاد بھی کرلیں۔ اور تلاوت کا جیسا حق ہے ویسی طرح تلاوت کریں تب بھی فی الواقع تلاوت قرآن اور حفظ قرآن نہ ہوگا

حضرات اہل بیت کا عمل قرآن میں کمی و بیشی کے خیال کو لغو ثابت کرتا ہے

دوسرے تمام روایات امامیہ میں موجود ہے کہ تمام اہلبیت اسی قرآن کو پڑھتے تھے اور اسی کے عام و خاص سے تمسک کرتے تھے اور بطور استدلال اسی قرآن کی آیات کو پیش کرتے تھے اور اسی کی آیات کی تفسیر کرتے تھے اور حضرت امام حسن عسکری کی طرف جو تفسیر منسوب ہے، تو اسی قرآن کی ہے لفظاً لفظاً اور اہل بیت اپنے لڑکوں اور نوکروں اور خادموں اور

اہل و عیال کو بھی قرآن تعلیم فرماتے تھے ۔ اور اسی قرآن کے پڑھنے کا نمازوں میں حکم فرماتے تھے

قرآن کا حد درجہ شائع ہونا خود اس میں کمی و بیشی کے خیال پر قرب کاری لگتا ہے

معہذا قرآن مجید کا موافق نزول کے لوگوں کو پہنچانا اور ان کو سکھانا باجماع امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ فرض تھا اور یقیناً معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو کوئی مشرف باسلام ہوتا تھا، اول کلام اللہ سیکھتا تھا بعد ازاں لوگوں کے سکھانے میں مشغول ہوتا تھا یہاں تک کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی ہزاروں نے کلام اللہ سیکھ لیا تھا، چنانچہ بعضے بعضے غزوات میں ستر ستر حافظ شہید ہوئے ہیں بعد ازاں آج تک تمام اطراف میں یہاں تک کہ دیہات میں اہل اسلام کلام اللہ کی تلاوت کو سب عبادتوں میں بڑھ کر سمجھتے ہیں اور رات دن نماز میں اور نماز سے باہر کلام اللہ کے پڑھنے میں مشغول رہتے ہیں ۔ اور ہر لڑکے کو اول جو مکتب میں بٹھلاتے ہیں تو سب سے پہلے کلام اللہ ہی یاد کرانا شروع کراتے ہیں ۔ بالجملہ قرآن مجید مثل کلینیؒ و تہذیب نہیں کہ براہ تقیہ کسی کونے میں صندوق میں مقفل بند رہے کبھی تنہائی میں ڈرتے ڈراتے کہ مبادا کوئی سنی نہ آجائے ایک دو صفحہ مطالعہ کر لیا اور پھر ایسے کثیر الوجود کہ ہر شہر و دیار میں سینکڑوں ہزاروں ہیں ۔ کلینی تہذیب کو ہندوستان میں تلاش کیجئے تو کہیں کہیں نکلے گی علیٰ ہذا القیاس ایران میں سمجھئے کیونکہ اول تو رعایا سلطانی میں اہل سنت بکثرت ہیں سنا تو یوں ہے کہ شیعوں سے زیادہ ہوں ۔ آئندہ خدا جانے، اور شیعوں میں سے بھی کلینی و تہذیب نہ ہر کسی کے کام کی نہ ہر کوئی اسے سمجھے جو خواہ مخواہ بہم ہی پہنچائے، باقی سوا ان کے اور ممالک میں کلینی و تہذیب کا پتہ تو کیا ملے نام بھی کوئی نہیں جانتا ہوگا ۔ بایں ہمہ اگر ایک دو نسخہ کہیں مل بھی جائے تو بیشتر غلط ملتے ہیں، صحیح تو قسمت ہی سے ملتا ہے بخلاف کلام اللہ کے ہر دیار میں بکثرت موجود ۔ یہاں تک کہ کوئی کتاب کسی مذہب کی ہو یا کسی علم عقلی کی ایسی کثیر الوجود نہیں پھر عام و خاص کو اس کی ضرورت ایک ایک گھر میں متعدد کلام اللہ رکھے ہوئے ہیں ۔ حفظ و تصحیح کا یہ اہتمام کہ ہزاروں حافظ حرف حرف گنا ہوا زبر زیر کی تعداد معلوم رسم خط میں بیسیوں کتابیں موجود، پھر بایں ہمہ کسی عاقل کی عقل میں آسکتا ہے کہ کلینی اور تہذیب میں تو الحاق نہ ہونے پائے اور شیعوں کے نزدیک من کل الوجوہ معتبر اور معتمد رہے اور اصح الکتب کہلائے اور کلام اللہ میں الحاق ہو جائے ۔ اور اس کا کچھ اعتبار نہ رہے ۔

قرآن مجید کی بے پناہ شہرت عقل کے نزدیک خلیفہ ثالث کے دامن کو الزام سے پاک کر دیتی ہے

جس زمانہ فرض کیجئے

کہ اس میں فلانے شخص نے کلام اللہ میں سے کم کر دیا یا اس میں کچھ بڑھا دیا ۔ جیسے شیعوں کو خلیفہ ثالث کی طرف بدگمانی ہے تو ایک دو کلام اللہ میں بڑھا یا گھٹا یا ہوگا تمام ملک عرب اور ملک روم اور ملک ایران اور یمن کے مصاحف میں (کہ ان کے خلیفہ ہونے سے پہلے یہ تمام ممالک تحت تصرف اسلام آچکے تھے اور سوائے ملک عرب کے کہ وہ سارا کا سارا مسلمان ہو چکا تھا اور ممالک کے باشندوں میں سے بھی لکھو کھا آدمی مسلمان ہو چکے تھے اور قرآن کو فرمان خداوندی سمجھ کر ہر کوئی حرز جان سمجھتا تھا اور مجموعہ ایمان تصور کر کے اس کی یادگاری اور تلاوت میں مشغول تھا کمی و بیشی ہرگز قرین عقل نہیں، علاوہ بریں اس زمانہ میں حفاظ کی نوبت لکھو کھا کو پہنچی تھی خلیفہ ثالث نے ان کے سینوں سے کیونکر نکال دیا ہوگا ۔ کہ تمام عالم میں قرآن محرف ہی مروج ہو گیا ان وجوہ کے نظر کرنے کے بعد اہل عقل کا تو یہ کام نہیں کہ قرآن مجید کی نسبت اس بات کے قائل ہوں کہ اس میں کچھ کمی یا بیشی وقوع میں آئی ہو اور جب قرآن مجید اس درجہ کو صحیح اور معتبر ہوا، کوئی کتاب اس کے ہمسنگ نہیں اور تفسیر امام حسن عسکری میں اول سے آخر تک تمام آیات بجنسہا موجود ہوئیں تو اول تو آیت اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنَاھُمُ الْکِتٰبَ الخ سے استدلال کرنا صحیح اور درست ہوا ۔

قرآن کی حفاظت کا ثبوت خود قرآن کی زبانی

دوسرے اگر کلام اللہ ہی کی آیات سے کلام اللہ کے بجنسہٖ محفوظ ہونے پر استدلال کریں تو درصورتیکہ طریقہ استدلال صحیح ہو واجب التسلیم ہوگا ۔ اس لئے کلام اللہ کو جو ہم نے تجسس کیا تو آیات کثیرہ اس پر شاہد نکلیں کہ کلام اللہ تا ہنوز موافق نزول کے بجنسہٖ باقی ہے کسی قسم کا تغیر یا تبدل اس میں وقوع میں نہیں آیا ۔ نہ کمی ہوئی اور بیشی ہوئی ۔ نہ کسی لفظ کے عوض میں دوسرا لفظ مشہور و معروف ہو گیا ۔ سب کو لکھ کر اس مضمون کو ثابت کیجئے ۔ اس کی تو گنجائش نہیں ۔ فقط ایک آیت کا لکھنا ضروری سمجھ کر ایک ہی پر اکتفا کرتا ہوں سورہ حجر میں ارشاد ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔ یعنی ہم نے آپ اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں ۔ فقط اب جائے غور ہے کہ باوجود اس پختہ وعدہ کے جو مؤکد بچند تاکید ہے ۔ چنانچہ واقفان علم معانی واقف ہیں ۔ پھر نہ جانے خلیفہ ثالث نے کیا ستم کئے ہیں ۔ کہ قرآن اصلی کا بالکل نام و نشان مٹا دیا ۔ اللہ اللہ کیا کچھ قدرت و طاقت تھی کہ نعوذ باللہ خدا کی بھی نہ چلنے دی ۔ سورتیں کی سورتیں نکال ڈالیں اور آیتیں کی آیتیں بدل دیں ۔ زہے نصیب اہلسنت جن کے ایسے پیشوا ہوں ۔

شیعوں کے غلط خیال کے شرمناک نتائج

باقی رہا یہ احتمال کہ خداوند ذوالجلال وعدہ کرکے پھر گئے ہوں۔ سو یہ خیال خود محال ہے۔ خداوند صادق القول ایسی تاکیدوں سے وعدہ محکم فرمائے اور پھر پھر جائے اور حفاظت نہ کرے معہذا کلام اللہ ہی میں یہ بھی آیت ہے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد ـــــــــ یعنی۔ اللہ تعالےٰ ہرگز خلاف وعدہ نہیں کرتا

مگر شاید کسی شیعہ مذہب کو یہ احتمال پیش آئے کہ خلیفہ ثالث کے زمانے میں یا جس کو یوں کہئے کہ اس نے کلام اللہ میں کمی و بیشی کی ہے اس کے زمانہ میں خداوند کریم سو گیا ہو یا اپنے وعدہ کو بھول گیا ہو، سو اس کا جواب خداوند کریم نے اپنے آپ کلام اللہ میں فرمادیا ہے۔ آیت الکرسی تو شیعوں کو بھی یاد ہوگی اس میں یہ جملہ موجود ہے۔ لَاتَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَانَوْمٌ یعنی نہ اونگھ ہی خدا کو آ دباتی ہے اور نہ نیند ہی ادھر سورہ مریم میں فرماتے ہیں وَمَاکَانَ رَبُّکَ نَسِیًّا۔ یعنی تیرا رب بھولنے والا نہیں۔ سورہ طٰہٰ میں یوں ارشاد ہے لَایَضِلُّ رَبِّیْ وَلَایَنْسٰی۔ نہ بہکتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے۔ اس آیت نے اس احتمال کو بھی مرتفع کردیا کہ خداوند کریم نے نگہبانی قرآن کا قصد تو کیا ہو، پر تدبیر میں غلطی ہوئی ہو یا بوجہ غلطی قرآن کے بدلے کسی اور چیز کی حفاظت کر بیٹھے ہوں۔ جب یہ سب احتمالات مرتفع ہوچکے تو اب اس غلام خاندان نبوی کی علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام حضرات شیعہ کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ بعد اس وعدہ محکم اور عدم موانع کے جو خداوند کریم سے حفاظت نہ ہوسکی تو بجز اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے نزدیک خلیفہ ثالث میں نعوذ باللہ من ہذا القول خدا سے بھی زیادہ زور اور بل تھا کہ خدا کا ارادہ پیش نہ گیا درحالیکہ تم خلیفہ ثالث کے اس قدر معتقد ہو کہ خدا کو بھی اتنا نہیں سمجھتے تو خلیفہ ثالث ہی کے ساتھ ہی کیوں نہیں ہو لیتے (نعوذ باللہ نقل کفر کفر نباشد) اگر یہی تمہارے خیال ہیں تو خدا تعالےٰ کے ساتھ ہوکے کیا پورا پڑے گا مبادا قیامت کو خلیفہ ثالث تمہیں بھی خدا تعالےٰ کی حفاظت سے نکال کر کبھی کبھی کے بدلے لینے لگے اور خدا کو شیعان علی سے شرمانا پڑے۔

اسی سلسلے میں کلینی کی افترا پردازی اور مرتبہ قرآن میں خلل اندازی

یا یوں کہو کہ یہ ہمارا عقیدہ غلط ہے اور کلینی جو تمہارے نزدیک اصح الکتب ہے، اس کی یہ روایت سراسر بہتان اور دروغ ہے۔

عن ھشام بن سالم عن ابی عَبْدِ اللّٰہ اِنَّ القُرْاٰنَ الَّذِیْ جَاءَ بِہٖ جبرئیل الی محمّد	یعنی ہشام بن سالم حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ وہ قرآن جو حضرت جبرائیل رسول اللہ

صلی اللّٰہ علیہ وعلٰی اٰلہٖ وسلّم سبعۃ عشر الف ایاتٍ	صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے۔ اس کی سترہ ہزار آئتیں تھیں فقط

اب دیکھئے کہ یہ کلام اللہ جو اب موجود ہے اسمیں کل قریب چھ ہزار آئتوں کے ہیں تو شیعوں کی اس روایت کے موافق کوئی دو تہائی کلام اللہ چوری گیا، اس سے بہتر تو یہی تھا کہ خداوند کریم ذمہ کش حفاظت نہ ہوتے۔ اس کی حفاظت کے بھروسے اُمتیانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی بے فکر ہو بیٹھے، ورنہ بہت ہوتا تو اتنا ہی نقصان ہوتا جتنا توراۃ و انجیل میں ہوا تھا۔ سو جو لوگ کہ توراۃ و انجیل کی تحریف کے اثبات کے درپے ہوئے ہیں وہ بھی یوں نہیں کہتے کہ توراۃ و انجیل میں اتنا کچھ نقصان ہوا ہے بلکہ بعد تحقیق یوں معلوم ہوتا ہے کہ علماء یہود و نصاریٰ نے قدر قلیل کمی بیشی کی ہے۔ سو وہ بھی جہاں کہیں کوئی بات مسلمانوں کے مفید مطلب دیکھی ہے یا کوئی ایسا حکم ہوا ہے کہ اس کے مروج رہنے میں امراء کو دشواری ہوئی ہے ایسی جگہ امراء سے کچھ لے دیکر بدل دیا ہے واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ القصہ حسبِ مقولہ شیعہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس اہتمام اور اس انتظام کے کہ قرآن مجید کی خداوند کریم نے خود حفاظت کی۔ قرآن مجید غیر محفوظ اور غیر معتبر ہونے میں توریت و انجیل سے بڑھ گیا۔ حالانکہ ان کا حافظ محافظ نہ خدا تھا نہ کوئی پیغمبر، ہاں علماء دنیا پرست کہ آیات خداوندی کا بیچ دینا، اور احکام کا بدل ڈالنا۔ اور تحریف کا کرنا ان کا کام ہی تھا، اس کے فقط پڑھنے پڑھانے والے اور جاننے پہچاننے والے تھے۔ حافظ و نگہبان ہونا کجا۔ شاید اس فرقہ کے نزدیک کلام اللہ کے توراۃ و انجیل سے بڑھ کر ہونے کے یہی معنی ہیں۔ کہ بے اعتباری میں ان سے بڑھا ہوا ہے۔

حفاظت قرآن کے دو لچر احتمالات اور انکے دندان شکن جوابات

یہاں علماء شیعہ دو احتمال پیش کریں۔ تو کریں۔ ایک تو یہ کہ کلام اللہ لوحِ محفوظ میں محفوظ ہے، دوسرا یہ احتمال کہ غار سرمن رأے میں حضرت امام مہدی حافظ قرآن موجود ہیں۔

سو اوّل احتمال کا پوچ ہونا تو ظاہر ہے اول تو یہ ہے کہ اگر بالفرض اِنَّالَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کا یہی مطلب ہے، تو ہمیں کیا۔ ہم سے اس وعدہ کرنے کے کیا معنے، ہمارے مفید مطلب تو یہ بات ہے کہ اس قرآن کی حفاظت کرتے جو ہمارے پاس ہے۔ تاکہ احکام خداوندی کے معلوم ہونے میں

کچھ شک و شبہ نہ تھا تو دوسرے وہاں کی حفاظت کرنے کی کیا ضرورت تھی اگر لوح محفوظ تک کسی بے دین کی دسترس ہوتی تو البتہ حفاظت کا موقع بھی تھا تیسرے آیت مذکورۂ اول تنزیل کا ذکر فرمایا بعدازاں حفاظت کا وعدہ کیا ہے اس ترتیب سے بلاغت شناسان قرآنی کو خود معلوم ہے کہ قرآن منزل کی حفاظت مدنظر ہے نہ کہ اس قرآن کی جو لوح محفوظ میں محفوظ ہے چوتھے اگر یہی مطلب ہے تو یہ فضیلت تو توراۃ و انجیل میں بھی موجود ہے۔ قرآن میں کیا فوقیت ہوئی معہذا یہاں حفاظت کا وعدہ کیا وہاں نہ کیا۔ اس کا کیا ثمرہ نکلا۔ پانچویں یہ ہے کہ اس آیت میں اسماء قرآنی میں سے ذکر کو ذکر کیا۔ لفظ قرآن یا کتاب وغیرہ ذکر نہ فرمایا تو یہ بھی اسی غرض سے ذکر فرمایا ہے کہ قرآن میں ان کا کمی وبیشی تغیر و تبدل کا کسی کو احتمال باقی نہ رہے۔

قرآن مجید کے نام ذکر کا موقع استعمال اور اس کی مفید تشریح | چونکہ بات تمہید طلب ہے تو ہمیں لازم ہے کہ اس کی تمہید بیان کرکے اصل مطلب کو روشن کر دکھلائیں، اس لئے یہ گذارش ہے کہ بسبب اعتبارات اور اوصاف مختلفہ اور حیثیات متعددہ کے ایک ایک چیز کے متعدد نام ہوا کرتے ہیں۔ اور پھر وہ نام اپنے اپنے موقع ہی میں استعمال ہوتے ہیں، ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرنا صحیح نہیں ہوتا مثلاً ایک شخص کسی کا باپ بھی ہوتا ہے اور کسی کا بیٹا بھی اور علیٰ ھٰذا القیاس کسی کا بھائی کسی کا بھتیجا کسی کا چچا کسی کا بھانجا کسی کا ماموں ہوتا ہے۔ غرض ایک شخص ہو اور اس کے القاب بہت ہیں، پر وہ سب القاب یکساں برابر نہیں بولے جاتے اپنے اپنے موقع میں مستعمل ہوتے ہیں بیٹا اپنے باپ کو بیٹا کہکے نہیں پکار سکتا۔ گو وہ کسی کا بیٹا ہے، اور اسی طرح باپ بیٹے کو باپ کہکر نہیں پکار سکتا اگرچہ وہ اپنے بیٹے کا باپ ہے دوسری مثال یہ ہے کہ ایک حاکم کلکٹر بھی ہوتا ہے، مجسٹریٹ بھی ہوتا ہے، مگر چونکہ کلکٹری، مجسٹریٹی کا کام مختلف اور جدا جدا ہے تو کلکٹری کے کاغذات میں بلقب کلکٹر لکھتے ہیں اور مجسٹریٹی کے کام کاغذات میں بلقب مجسٹریٹ اور برعکس نہیں کر سکتے۔ اسی طرح قرآن شریف کے بھی بہت سے القاب اور اسماء ہیں اور ہر ایک لقب کا مدار ایک جدا اعتبار اور نئے نئے اوصاف پر ہے، قرآن تو بلحاظ مقروء ہونے کے کہتے ہیں، یعنی قرآن کو قرآن اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ اس کی قرأت کا اتفاق ہوتا ہے اور مصحف اور کتاب بایں لحاظ کہتے ہیں کہ اس میں صحف یعنی اوراق ہوتے ہیں۔ اور ان اوراق میں اس کو لکھتے ہیں، علیٰ ھٰذا القیاس ذکر بایں وجہ کہتے ہیں، کہ غافلوں اور جاہلوں کیلئے

مذکر اور گنہگاروں کے واسطے پند دلبند ہے یعنی باعث یادگاری یاری ہے اور پند خداوند ہے سو اس لقب کا استعمال جب ہی صحیح ہوگا، کہ مقابل میں غافل و جاہل اور گنہگار ہوں مگر سب جانتے ہیں کہ موصوف بوصف غفلت و جہل و گناہ اگر ہیں تو انسان ہیں ملائکہ ان عیوب سے مبرا ہیں تو جب تک کلام اللہ لوح محفوظ میں تھا، اس لقب کا بولنا صحیح نہ تھا کیونکہ اس موقع میں نہ کوئی غافل تھا نہ جاہل تھا نہ گنہگار تھا وہاں تک اگر رسائی تھی تو فقط ملائک کو تھی۔ سو ان کو ان باتوں سے کچھ سروکار ہی نہیں ہاں جب نوبت تنزیل کی پہنچی اور معاملہ حضرت انسان سے پڑا تو البتہ اس لقب کا استعمال صحیح ہوا کیونکہ غرض انزال و تنزیل سے یہی ہے کہ غافلان نوع بشر کے لئے مذکر اور واعظ ہو۔ پھر جب اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ فرمایا، تو ضمیر اسی لفظ کی طرف راجع فرمائی اس لئے لازم پڑا کہ حفاظت بھی اسی موقع میں ظہور میں آئے کہ جہاں اس لقب کا استعمال صحیح ہو۔

دوسرے سوال کا مسکت جواب | باقی رہا دوسرا احتمال، اس کا یہ حال ہے کہ اول تو حضرت امام مہدی کا غار سرمن رائے میں مخفی ہونا ہی ایک افسانہ غلط ہے جب کلام اللہ کا باوجود اس قدر تواتر کے کچھ اعتبار نہ رہا ایسی روایات بے سروپا کا جن کے راوی فقط دو چار مکار ہوں کیا اعتبار اور درصورتیکہ وہ بات بھی قرین قیاس نہ ہو تب تو قابل قبول عقل کسی عاقل کے نزدیک بھی نہیں اور جن روایات سے حضرت امام مہدی کا یہ افسانہ مروی ہے وہ کچھ ایسی ہی ہیں، بلکہ اس سے بھی کمتر با اینہمہ یہ بات تو ہرگز متصور ہی نہیں کہ حضرت امام مہدی کو کلام اللہ یاد ہو، یہ کام تو اہلسنت جماعت کا ہے حضرت امام مہدی کو ان کا تشبہ کا ہے کو گوارا ہوگا مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ ہاں ان کے پاس کلام اللہ ہو۔ اور حضرت امام اس کلام اللہ کو لیکر اسی اندیشے سے اس غار میں جا چھپے ہوں کہ مبادا ان کے پاس کا کلام اللہ معتقدان خلیفہ ثالث کی نظر نہ پڑ جائے تو البتہ ایک ٹھکانے کی بات ہے لیکن اہل فہم سے سوال ہے کہ یہ احتمال پہلے احتمال سے اس بات میں کیا کم ہے کہ ہمارے حساب سے ویسا ہی لوح محفوظ میں ویسا ہی غار سرمن رائے میں، نقل مشہور ہے ویسا ہی کنواں ویسی ہی کھائی، بلکہ بلحاظ وجہ پنجم اس کلام اللہ کی حفاظت کا وعدہ ہی نہیں جو بزعم شیعہ حضرت امام کے پاس ہو اہل فہم کے نزدیک اس کا ذکر کہنا ہی صحیح نہیں ذکر کہنا تو جب صحیح ہو کہ امتی اسے پڑھیں پڑھائیں غار سرمن رائے میں کون جائے اور کون اس سے فائدہ اٹھائے بلکہ وعدہ ہے تو اسی کلام اللہ کی حفاظت کا ہے

کیونکہ اس کا ذکر جتنا ظاہر ہے پھر حضرت امام کا کلام اللہ اگر ایسی کلام اللہ کے موافق ہے تو فبہا ورنہ اس صورت میں حضرت امام ہی کا کلام اللہ غلط ہوگا بالجملہ ایسے لغویات کو خداوند کریم کی طرف نسبت کر کے مفت دین اسلام کو بٹا لگاتے ہیں۔ سبحان اللہ یہ عجب تماشہ ہے کہ جناب باری نے وعدہ حفاظت تو اس لئے کیا تھا کہ امت محمدی کو کل کو دربارہ علم احکام کچھ دقت نہ پیش آئے دین محمدی میں کوئی رخنہ نہ پڑے یہ دین قیامت تک برابر روشن رہے۔ مگر افسوس کہ تاہم وہی خرابی کی خرابی برسر رہی نعوذ باللہ غار سر من رائے میں محفوظ ہونے کے یہ معنے ہوئے کہ خداوند کریم حفاظت کے وقت اتنا بھی نہ سمجھے کوئی اجنبی آدمی سنے گا تو کیا کہے گا۔

شیعوں کا لغو خیال یہود اور نصاریٰ کے لئے مقابلے کے لئے ایک راہ کھولتا ہے

ہماری صلاح یہ ہے کہ اس بات کو شیعہ کسی یہودی نصرانی کے سامنے تو زبان پر بھی نہ لائیں، ہمارے سامنے کہیں تو شاید ہم بپاس اتحاد کلمہ گوئی یوں سمجھکر کہ شیعوں کی خفت فی الجملہ اپنی ہی خفت ہے سکوت بھی کر جائیں کیونکہ اول تو یہودیوں کو اس قسم کی خرافات کو سن کر اس بات کے کہنے کی گنجائش ملے گی کہ ہماری تورات بھی آخر لوح محفوظ میں محفوظ ہے۔ سوائے اس کے سورہ احقاف سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جنات کے پاس تورات بجنسہ موجود تھی اور اس میں بنی آدم کی طرح انہوں نے کچھ تغیر و تبدل نہ کی تھی ورنہ وہ یوں نہ کہتے

اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ	"یعنی بیشک ہم نے سنی ہے ایک کتاب جو نازل کی گئی ہے موسےٰ کے بعد تصدیق کرنیوالی ہے اس کتاب کی جو اس سے پہلے ہے۔ یعنی تورات کی تصدیق کرتی ہے،،

سو اس بات کا یقین کہ کلام اللہ تورات کی تصدیق کرتا ہے جب ہی ہو سکتا ہے کہ ان کو تورات کے بجنسہ ہونے کا یقین ہو یا کلام اللہ تورات محرف کا مصدق ہو سو دوسرا احتمال تو شیعوں کے نزدیک بھی غلط ہے کیونکہ جنات نے جو کلام اللہ سنا تھا تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ حضرت عثمان رضؓ سے یا ایسے ہی کسی اور سے نہ سنا تھا۔ اور اگر یہودیوں کی پرخاش کا کچھ اندیشہ نہ ہو۔ اور یہ سمجھکر کہ کچھ تورات بجنسہا باقی ہو اور فقط اس میں تحریف نہ ہونے کا ان کو ایسا یقین ہو جیسے امامیہ کو الحمد اور قل ہو اللہ کے بجنسہ ہونے کا یقین ہے فخریہ یوں کہنے لگیں کہ ہمارا قرآن تو غار سر من رائے میں محفوظ ہے تمہاری توراۃ بتلاؤ کہاں محفوظ ہے یا اتفاقات سے وہ آیات سنی ہوں

جو تورات کی ان عبارات کے جواب تک صحیح و سالم ہیں۔ موافق اور مطابق ہیں اور فقط اسی توافق اور تطابق کے باعث انہوں نے کلام اللہ کو مصدق تورات سمجھا ہو تو اس صورت میں ہو سکتے ہے کہ تورات محرف بھی ہو اور کلام اللہ غار سر من رائے میں محفوظ ہو اور اس وجہ سے کلام اللہ کو تورات پر فوقیت ہو اور یہود سے نہ شرمائیں لیکن قطع نظر اس کے کہ یہ فوقیت کس درجہ کو ناکارہ فوقیت ہے مشکل ہی رہے گی۔

اگر یہود سے بالاجیت بھی گئے تو نصاریٰ ان کی نہیں چلنے دینگے

یہودیوں سے بالاجیت بھی گئے۔ تو انگریزوں سے کس منہ سے بات کرینگے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حافظ انجیل باتفاق شیعہ و سنی آسمان چارم پر زندہ موجود ہیں۔ غار سر من رائے میں تو حضرت امام کو اس بات کا بھی شاید اندیشہ ہو کہ مبادا کوئی معتقد خلیفہ ثالث رضی اللہ عنہ پھرتا پھراتا یہاں نہ آنکلے اور ان کے کلام اللہ کو چھین کر جلادے یا معاذ اللہ دشمنان امام کو شہید کردے اور جو مصلحت کہ اخفا اور خفا سے تھی ہاتھ سے نکل جائے حضرت عیسیٰ السلام تو بے کھٹکے ہیں چوتھے آسمان تک کس کے مقدور جو جا کے بھٹکے ہاں البتہ ایک بات ہو سکتی ہے کہ ان سے یوں کہا جائے۔ حضرت عیسیٰ کا اول تو حافظ انجیل ہونا غیر مسلم ہو۔ مگر یہی بعینہ احتمال بہ نسبت حضرت امام موجود ہے بلکہ بدرجہ اولیٰ کیونکہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام پر خود انجیل نازل ہوئی، ان کو یاد نہ ہونا نہایت مستبعد بخلاف حضرت امام کے کہ قرآن ان پر نازل نہیں ہوا معہذا کلام اللہ کے یاد ہونے میں اہلسنت کی مشابہت لازم انجیل کے یاد ہونے میں کوئی خرابی نہیں، دوسرے ہم نے مانا حضرت عیسےٰ علیہ السلام نازل بھی ہوں گے اور ان کو انجیل یاد بھی ہو لیکن چونکہ انجیل منسوخ ہو [illegible] بعد نزول عیسےٰ علیہ السلام وہ یاد ہونا کچھ مفید نہ ہوگا بخلاف حضرت امام کے کہ ان کا کلام اللہ یاد رکھنا بعد ان کے خروج کے کام دے گا۔ اور شیعان علی کو جو مدت دراز سے بناچاری بیاض عثمانی پر عمل کرتے ہیں کلام اللہ ہاتھ آئے گا اور دیرینہ تمنا پوری ہوگی۔

عیسائیوں سے نبرد آزمائی کے لئے اس عقیدہ سے دست برداری لازم ہے کہ حلت و حرمت کی تبدیلی ائمہ کے دست قدرت میں ہے

مگر یہ تدبیر جب مفید ہے کہ شیعہ ہمارا کہنا سر دھریں اور اس اعتقاد سے کہ اماموں کو تبدیل احکام حلت اور حرمت وغیرہ کا اختیار ہے اول اس سے دست بردار ہوں

دربارہ کی اس روایت پر قلم پھیر دیں

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِنَانٍ عَنْ اَبِیْ جَعْفَرٍ قَالَ کُنْتُ عِنْدَہٗ فَاَجْرَیْتُ اخْتِلَافَ الشِّیْعَۃِ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَمْ یَزَلْ مُتَفَرِّدًا بِالْوَحْدَانِیَّۃِ ثُمَّ خَلَقَ مُحَمَّدًا وَعَلِیًّا وَفَاطِمَۃَ وَالْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ فَمَکَثُوْا اَلْفَ دَھْرٍ ثُمَّ خَلَقَ الْاَشْیَاءَ وَ اَشْھَدَھُمْ خَلْقَھَا وَاَجْرٰی طَاعَتَھُمْ عَلَیْھَا وَفَوَّضَ اَمْرَھُمْ اِلَیْھِمْ یُحِلُّوْنَ مَا یَشَاءُوْنَ وَیُحَرِّمُوْنَ مَا یَشَاءُوْنَ۔

حاصل اس روایت کا یہ ہے، محمد بن سنان بیان کرتا ہے کہ میں حضرت امام ابوجعفر یعنی امام محمد باقر کے پاس تھا اتفاق سے میں نے شیعوں کے باہم مختلف ہونے کا ذکر چھیڑا یعنی یہ پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ شیعان علی دین میں باہم مختلف ہو گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ محمد بن سنان اللہ تعالے پہلے تو ہمیشہ سے اکیلا تھا کوئی دوسرا تھا ہی نہیں پھر پنجتن کو پیدا کیا پھر ہزار دھر کے اور اشیاء کو پیدا کیا اور پنجتن کے سامنے سب کو موجود کیا اور پنجتن کی اطاعت ان کے ذمہ رکھی اور ان کے کاروبار سب پنجتن کے حوالے فرمائے۔ سو وہ جو چاہیں حلال کر دیں اور جو چاہیں حرام کر دیں۔ فقط۔

الغرض اس روایت کے سیاق سے اختلاف شیعہ کی وجہ یہ نکلی کہ پنجتن میں کسی نے ایک بات حلال رکھی تو دوسرے نے اسے حرام کر دی سو کوئی ان کا مقلد ہو گیا کوئی ان کا۔

دوسری روایت کلینی کی بھی اسی روایت سے ہمزبان ہے اس سے بھی دست برداری لازم ہے۔

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ الْمِیْثَمِیِّ عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ سَمِعْتُہٗ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰہَ اَدَّبَ رَسُوْلَہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی قَوَّمَہٗ عَلٰی مَا اَرَادَ ثُمَّ فَوَّضَ اِلَیْہِ دِیْنَہٗ فَقَالَ مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا فَمَا فَوَّضَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اِلٰی رَسُوْلِہٖ فَقَدْ فَوَّضَہٗ اِلَیْنَا۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ محمد بن حسن میثمی امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ میں نے انکو یہ کہتے ہوئے سنا کہ خدا تعالے نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ادب سکھایا اور سیدھا جیسا اپنا جی چاہے تھا بنایا پھر اپنا دین ان کے سپرد کیا اور کلام اللہ میں سورۂ حشر میں سب کو حکم دیا کہ جو کچھ رسول دے یعنی جو کچھ فرمائے اسے قبول کرو اور جس سے منع کرے اس سے ہٹ رہو سو جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا تھا وہی ہمارے بھی سپرد کیا

پہلی روایت سے فقط پنجتن ہی کا اختیار درباب تبدیل احکام معلوم ہوتا تھا اور اس روایت سے ثابت ہوا کہ وہ اختیار اور اماموں کو بھی حاصل ہے اس لئے کہ جو تفویض اول روایت میں تھی وہی اس روایت میں بھی ہے سو وہی معنے بلاشک مراد ہوں گے۔

پہلی روایات کی بے بنیاد توجیہ

مگر شاید کوئی شیعہ مذہب آئمہ کی یہ توجیہ کرے کہ اس تفویض اور تحریم اور تحلیل کے یہ معنی ہیں کہ وہ اجتہاد کر کے لوگوں کو احکام بتلا دیں آخر اہل سنت بھی تو انبیاء اور علماء کے اجتہاد کے حجت ہونے کے قائل ہیں۔ شیعہ اگر چاردہ معصوم کے اجتہاد کے معتبر ہونے کے قائل ہو گئے تو کیا گناہ ہوا۔ یا یہ توجیہ گھڑیں کہ خداوند کریم نے ان کو سب کی استعدادیں اور قابلیتیں دکھلا کر، چنانچہ ظاہر عبارت روایت اول یہی ہے۔ پنجتن کو حکم دیا ہو کہ ان کی استعداد کے موافق جو کچھ سمجھ میں آئے احکام مقرر کر دو۔ سو اگر یہ ہو تو کیا خرابی ہے لیکن اہل عقل پر پوشیدہ نہ ہو گا کہ اجتہاد کی تاویل کرنی تو بعینہ ایسی ہے جیسے کہا کرتے ہیں من چہ میگویم وطنبور من چہ میگوید چنانچہ استعداد والے خود سمجھتے ہیں کہ اس توجیہ کو عبارت روایت اول سے کچھ علاقہ نہیں۔ نیز مخالف مذہب شیعہ ہی کہ وہ ائمہ کی نسبت اجتہاد کی تہمت لگانی موجب منقصت سمجھتے ہیں ان کی فرمائی ہوئی باتیں سب منجملہ وحی آسمانی سمجھتے ہیں، باقی رہا استعدادوں کو دکھلا کر کارخانہ دین کا سپرد کر دینا اگر ہم تسلیم بھی کر لیں تو شیعہ تو تسلیم نہ کریں گے اثنا عشریہ چھوڑ تمام امامیہ اس بات پر متفق ہیں کہ امام کو تمام احکام کی تبدیلی کا اختیار رہے۔ اگر استعداد ہی پر مدار کار ہے تو تبدیل کے اختیار کے کیا معنے، جیسی استعداد ہو ویسا ہی حکم ہونا چاہیئے بدلا کیوں چاہیئے بہرحال کوئی توجیہ بن نہیں پڑتی

تفویض کے خیال کی قرآن بیخ کنی کرتا ہے

اگر جواب مذکور سے سرخرو ہونا مدنظر ہے تو اس روایت کو زیر قلم کریں اور ہرگز کچھ اندیشہ نہ کریں۔ کیونکہ جناب باری کا بھی یہ حکم اسی طرف ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کلام اللہ کی شان میں کلام اللہ ہی میں یوں فرماتے ہیں "تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ"۔ مطلب یہ ہے کہ کلام اللہ میں ہر چیز کا بیان ہے ہم نہیں سمجھتے تو کیا ہوا سمجھنے والے سمجھتے ہوں گے خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پھر جب کلام اللہ ہی میں سب کچھ آ گیا تو تفویض کہاں رہی بلکہ اس صورت میں تو لازم ہے کہ جو کچھ حضرت نے یا ائمہ نے فرمایا ہو وہ شرح قرآن مجید ہو، اپنے اختیار سے کچھ نہ فرمایا ہو۔

تفویض کا خیال قرآن کو کتب منسوخہ کی حیثیت دیتا ہے

القصہ ہماری صلاح یہ ہے کہ ان دونوں روایات پر قلم پھیر کر پھر جواب مذکورہ بالا سے انگریزوں وغیرہ اعداء دین کے مقابل میں امید سرخرو ہونے کی رکھیں نہیں تو ان کے منہ میں بھی زبان ہے سنیوں کو تو بوجہ اتحاد ملت کے کچھ لحاظ بھی ہو گا۔

انہیں کیا لحاظ ہے ایسا نہ ہو کہ وہ یوں کہنے لگیں کہ ہماری انجیل اگر کلام اللہ سے منسوخ ہو گئی ہے تو سارے احکام تو منسوخ نہیں ہوئے آخر اخلاق کی باتیں اور بہت سے احکام حلت اور حرمت کے بدستور باقی ہیں اور عقائد میں تو مسلمانوں کے مقولہ کے موافق کچھ فرق پڑا ہی نہیں حضرت آدم کے وقت سے لے کر اب تک وہی عقائد چلے آتے ہیں چنانچہ کلام اللہ میں سورۂ مائدہ میں خود موجود ہے

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ الْکِتَابِ

یعنی نازل کی ہم نے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تیری طرف سچی کتاب کہ وہ پہلی کتابوں کی بھی تصدیق کرے ہے

سو تمہارے کلام اللہ کا بھی یہی حال ہے کہ اماموں نے مناسب وقت دیکھ کر بہت سے احکام تبدیل و تغیر کر دیئے چنانچہ پہلی روایت سے یہ خوب طرح واضح ہوا ہے کیونکہ اختلاف شیعہ کی وجہ حضرت امام باقر علیہ السلام نے یہی بیان کی ہے پھر حضرت امام مہدی کے پاس اگر وہ کلام اللہ محفوظ بھی ہو تو کیا حاصل وہ دین تو بدل ہی گیا کوئی اور ہی کلام اللہ بنانا چاہئے نہیں تو آیسا ہی قصہ ہے جیسا حضرت عیسٰی تمہارے عقیدے کے موافق آخری زمانہ میں نازل ہوں گے اور باوجودیکہ انجیل کے حافظ ہیں پھر بسبب اپنے دین کے منسوخ ہو جانے کے انجیل پر عمل نہ کرینگے بلکہ کلام اللہ پر عمل کرینگے

تفویض کی شکل میں ظہور حضرت امام مہدیؑ کے وقت قرآن کی وہی حیثیت ہو گی جو انجیل کی بوقت نزول حضرت عیسٰی ہو گی۔

باقی رہا یہ احتمال کہ شاید حضرت امام مہدی انہیں احکام پر عمل کریں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ محمد بن بابویہ قمی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کرتے ہیں

وَعَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ اَنَّہٗ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی اٰخٰی بَیْنَ الْاَرْوَاحِ فِی الْاَزَلِ قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ الْاَجْسَامَ بِاَلْفَیْ عَامٍ فَاِذَا قَامَ قَائِمُ اَھْلِ الْبَیْتِ وَرِثَ الْاَخُ مِنَ الَّذِیْنَ اٰخَا بَیْنَھُمَا فِی الْاَزَلِ وَلَمْ یُوْرِثِ الْاَخَ مِنَ الْوِلَادَۃِ۔

یعنی حضرت امام ابو عبد اللہ نے جو حضرت امام جعفر علیہ السلام کا لقب ہے یوں فرمایا کہ اللہ تعالٰی نے ازل میں روحوں کے پیدا کرنے سے دو ہزار برس پہلے روحوں میں آپس میں بھائی بندی کرا دی ہے۔ سو جب امام مہدی نکلیں گے ازل کی بھائی بندی کے حساب سے وراثت جاری فرمائینگے اور جو نسل کی رو سے بھائی ہو گا اسے وراثت نہیں دلائیں گے۔

اب دیکھیے کہ اس روایت سے صاف یوں ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت امام مہدی کلام اللہ کے احکام کے موافق بالکل عمل نہ کرینگے اور یہ حکم جو نسبی بھائی کے وارث ہونے کا ہے اسے موقوف کر دینگے اور اس روایت سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ بھائیوں کی وراثت کا حکم جو سورۂ نسا میں یوصیکم اللہ کے رکوع میں ہے وہ کوئی خلیفہ ثالث کی نعوذ باللہ کچھ کرتوت نہیں بلکہ عین حکم الٰہی ہے ورنہ اس کے موقوف ہونے کی حضرت امام مہدی کے وقت پر کیا تخصیص تھی الغرض جب تک اثنا عشریہ اس مذہب کے ہیں کہ امام کو سب احکام منسوخ کر دینے کا اختیار ہے دست بردار نہ ہوں گے تب تک انگریزوں کے سامنے اپنے کلام اللہ کے محفوظ ہونے کے مقدمہ میں جو آیت اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ سے مستفاد ہوتا ہے منہ نہ کر سکیں گے۔

تفویض سے انکار میں نصاریٰ و یہود سے گلوخلاصی ملنے کے علاوہ ختم نبوت پر ایمان پختہ ہوتا ہے۔

اور ہماری اس صلاح کے ماننے میں فقط ان کا یہی فائدہ نہیں کہ نصاریٰ اور یہود سے جیت جائیں نہیں بلکہ لفظ خاتم النبیین جو سورۂ احزاب میں ہے اس پر بھی ایمان درست ہو جائے گا نہیں تو یہودیوں کی طرح یہ عتاب ان پر بھی رہے گا اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتَابِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ یعنی کیا تم تھوڑی سی کتاب پر تو ایمان لاتے ہو اور تھوڑی پر نہیں لاتے وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ بات تو انبیا میں سے بھی کسی کسی کو میسر آتی ہے کہ نئی شریعت لائے اور پہلے احکام بدل جائیں بنی اسرائیل میں حضرت موسٰی کے بعد حضرت عیسٰی تک جتنے نبی ہوئے سب تورات ہی پر عمل کرتے رہے اور پھر حضرت موسٰی علیہ السلام اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کو بھی یہ بات میسر نہیں ہوئی کہ خدا نے دین کا مقدمہ انہیں سپرد کر دیا ہو بلکہ جو کچھ انہوں نے احکام مقرر کیے سب حسب فرمان خداوندی مقرر کیے۔ حضرت موسٰی اور حضرت عیسٰی تو درکنار کلام اللہ سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ خود سید المرسلین محمد رسول اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی یہ اختیار نہ تھا کیونکہ سورۂ انعام میں یہ آیت موجود ہے قُلْ لَّا اَجِدُ فِیْمَا اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا الآیۃ جس کا حاصل یہ ہے کہ کہہ دے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ نہیں پاتا ہوں بیچ اس چیز کے جو میری طرف وحی کی گئی ہے کوئی چیز حرام کسی کھانے والے پر مگر فلانی اور فلانی اس آیت کے مضمون سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حرام کرنے اور حلال کرنے کا اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہ تھا حلت حرمت کا مدار وحی پر تھا دوسرے کی جگہ آیا ہے اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ حاصل اس کا یہ ہے کہ سوا خدا کے اور

ان کا کام نہیں اور اگر بالفرض خدا نے امت کے احکام ان کے سپرد بھی کر دیئے ہوں تب بھی ہمارے امام کچھ ان سے اس بات میں کم نہ رہے اور یہی احکام کی تبلیغ کے لئے رسول اور نبی ہوا کرتے ہیں چنانچہ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے۔

یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ | یعنی اے رسول پہنچا دے جو کچھ تیری طرف نازل کیا گیا ہے

الغرض اس طریق سے یہود اور نصاریٰ کی پرخاش سے بھی نجات ہو جائے گی اور اپنا ایمان بھی درست ہو جائے گا

حق کے زور سے ابن بابویہ آخر سنیوں کا ہمزبان ہوگیا

اور شاید کچھ یہی سوچ سمجھ کر شیخ صدوق یعنی ابن بابویہ نے کتاب الاعتقادات میں اس عقیدے سے ہاتھ اٹھایا اور ہمارے نزدیک اس حساب سے وہ صدوق اسم بامسمیٰ ہو گئے۔ مگر سنیوں سے دامن چھڑانے کے لئے سب اہل تشیع کی طرف سے نیابتہً یوں کہہ اٹھے مَنْ نَسَبَ اِلَیْنَا اَنَّا نَقُوْلُ اِنَّہٗ اَکْثَرُ مِنْ ذٰلِکَ فَھُوَ کَاذِبٌ۔ یعنی جو یوں کہے کہ شیعہ یوں کہیں ہیں کہ کلام اللہ اس سے زیادہ تھا جو اب لوگوں کے پاس ہے اور جس کی ایک سو چودہ سورتیں ہیں وہ جھوٹا ہے، انہوں نے چاہا تھا کہ سنیوں کو جھوٹا بنائیں پر خدا سچوں کو سچا ہی کرتا ہے خدا ساز علامہ کلینی نے اس دروغ کا بار اپنے سر اٹھایا یا یوں کہیئے علامہ صدوق کو جھوٹا بنایا چنانچہ ان کی روایت کلام اللہ کے سترہ ہزار آیت ہونے کے باب میں اوپر مرقوم ہو چکی۔ کسی نے سچ کہا ہے حق بر زبان جاری شود۔ خیر کہاں تک حضرات شیعہ کی ناانصافی اس باب میں بیان کیجئے مضمون کے لئے اس قدر بھی بہت ہے ہمیں کوئی عاقل منصف ایسا نظر نہیں آتا جو اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ۔ سے بجز اس کے کچھ اور معنی سمجھے کہ اس میں ہرگز کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ خلیفہ ثالث ہو یا خلیفہ اول و دوم۔

آیت مذکورہ سے سنیوں کی فضیلت کا انکشاف

بلکہ انصاف سے دیکھیے تو بشہادت صرف اس آیت ہیں سنیوں کی بڑی فضیلت نکلتی ہے۔ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ جو کام کسی کے اہتمام اور انتظام اور حکم سے ہوا کرتا ہے اگرچہ حقیقت میں اسے اور ہی کوئی کرے پر عرف میں وہ مہتمم ہی کی طرف اور منتظم اور حاکم ہی کی جانب منسوب ہوا کرتا ہے۔ مثلاً کوئی بادشاہ کسی رسالہ یا پلٹن کو خزانہ کی حفاظت کے لئے مقرر کرے۔ سو رسالدار یا صوبہ دار دس پانچ سپاہیوں کو پہرہ پر

مقرر کر دیتے ہیں اور پھر نوبت بنوبت اور زنجیر بزنجیر دار اس پہرہ کو بدلتے رہتے ہیں اور آپ آرام کرتے ہیں اور سپاہی پہرہ دار چوروں قزاقوں کو دفع کرتے رہتے ہیں اب دیکھئے کہ حقیقت میں محافظت سپاہی پہرہ دار کرتے ہیں پر چونکہ رسالدار اور صوبہ داروں کے حکم سے کرتے ہیں۔ تو بڑی سرکاروں میں رسالداروں اور صوبہ داروں ہی کا نام ہوتا ہے اور سپاہیوں کا کیا ہوا رسالداروں اور صوبہ داروں ہی کا کیا سمجھا جاتا ہے۔ اس واسطے اگر کہیں ایسے موقع پر کوئی معرکہ کا کام بن پڑتا ہے تو گو سپاہیوں کو بھی قدر قلیل انعام ملے پر رسالداروں اور صوبہ داروں کو بیش قرار انعام ملتا ہے۔ اور عہدوں کی ترقی ہوتی ہے اسی طرح سنی بھی موافق حکم الٰہی کے اس خزانہ بیش بہا کی محافظت کرتے ہیں اور چونکہ اوراق میں فقط خوب حفاظت نہ ہو سکتی تھی تو اس لئے اس کو اپنے سینوں میں گویا جان کے ساتھ رکھتے ہیں تاکہ بے دینوں اور شیاطین کو اس کے چرانے کی دسترس نہ ہو سوائے چور کو توال کو ڈانڈیں۔ شیعہ سنیوں ہی کو چور بتانے لگے سو یہ وہی مثل ہے نیکی برباد گناہ لازم اگر شیعوں سے سنی کچھ انعام و اکرام اس خدمت کا مانگتے جب ہی یہ تہمت لگائی ہوتی خدا کے دینے میں اتنا بخل کیوں ہے تیل جلے سرکار کا کلیجہ پھٹے مشعلی کا۔ ہم جو دنیا میں دیکھتے ہیں تو کلام اللہ کی محافظت سنی ہی کرتے ہیں ایک ایک بستی میں بعضی بعضی جا بیان سو حافظ موجود ہیں مگر چونکہ یہ ان کی حفاظت موافق ارشاد خداوندی کے ہے تو یہ ان کا کیا خدا ہی کا کیا سمجھنا چاہیئے اور سنیوں کو ملازم خاص اور محکوم باختصاص سمجھئے اس لئے خداوند کریم نے اس محافظت کو اپنی طرف نسبت کیا اور یہ فرمایا وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ یعنی ہم ہی اس کے محافظ ہیں لیکن شیعوں کو محکومان نافرمان کی مانند جانئے بلکہ بمنزلہ باغیوں کے یا چوروں کے قرار دیجئے کیونکہ یہ فرقہ محافظان کلام ربانی کے جو ایک خزانہ بے بہا ہے دشمن ہیں اور خزانوں کے محافظوں کے قزاق اور باغی اور چور ہی دشمن ہوتے ہیں غرضکہ یہ آیت اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ بھی بآواز بلند یہی کہتی ہے کہ مذہب اہل سنت حق ہے اور مذہب شیعہ باطل۔ پر سننے کے لئے کان شرط ہیں، جن کانوں پر خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ کی مہر لگی ہوئی ہو یعنی یہ مضمون ان پر صادق آتا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگائی ہے وہ کیا سنیں اور کس کی سنیں مگر ہمیں اپنی طرف سے سمجھانے میں قصور نہ کرنا چاہیئے جیسے شیخ صدوق

ایک بات مان اٹھے ہیں ایسے ہی شاید مولوی عمار علی صاحب یا کوئی اور عالم یا جاہل اس بات کو بھی مان جائے مگر چونکہ متعصب کو حق بات کا ماننا ہر چند کتنی ہی صاف و روشن کیوں نہ ہو بہت دشوار ہوتا ہے تو اس تقریر کو سنکر شاید کوئی شیعہ مذہب یوں کہنے لگے ہم نے مانا کہ کلام اللہ سارا کا سارا صحیح اور سنیوں کی روش کی خوبی بھی اس سے ہویدا پر یہ تو کہیں نہیں کہ ابوبکر کو بھی ماننا ہی چاہیئے۔ اس لئے یہ آیت سوم مع اپنے ماحصل کے لکھی جاتی ہے۔ تیسری آیت

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا	یعنی تم لوگ اگر ہمارے پیغمبر کی مدد نہ کرو گے تو کیا ہوگا اللہ اس کی مدد کرنے والا ہے پہلے بھی اس کی اس نے مدد کی ہے جب کہ کافروں نے اسے نکال دیا تھا جبکہ ایک دو تھا اور ایک اس کے ساتھ اور تھا جب دونوں غار میں تھے کب جس وقت وہ اپنے ساتھ دینے والے سے یوں کہتا تھا کہ تو غمگین مت ہو ہمارے ساتھ تو اللہ ہے

اس آیت میں بنظر انصاف غور کیجئے۔ اور منہ زوری کو چھوڑیئے دیکھئے یہ آیت کدھر کو لئے جاتی ہے سنیوں کی طرف کھینچتی ہے یا شیعوں کے گھر کا راستہ تبلاتی ہے ہمیں اس جگہ مرزا کاظم علی صاحب لکھنوی کا مقولہ جو بڑے متبرک علماء شیعہ میں سے تھے اور قدوۃ الزماں مولوی دلدار علی صاحب مجتہد بھی ان کے معتقد تھے یاد آتا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اور کسی کو تو جس کسی کا جو کچھ جی چاہے سو کہے پر خلیفہ اول کا برا کہنے والا تو ہمارے نزدیک بھی کافر ہے اہل محفل میں سے کسی نے عرض کی کہ قبلہ آپ کیا فرماتے ہیں، مذہب تو اس کے خلاف ہے انہوں نے جواب دیا کہ میں کیا کہتا ہوں خدا کہتا ہے صحابی اور صاحب کے معنے میں کچھ فرق نہیں۔ سو خدا بھی خلیفہ اول کے صحابی ہونے کا گواہ ہے کیونکہ صاحب کے لفظ سے جو اس آیت میں موجود ہے شیعوں سنیوں کے اتفاق سے ابوبکر صدیق ہی مراد ہیں سبحان اللہ اہل انصاف ایسے ہوتے ہیں جیسے مرزا کاظم علی صاحب تھے اور وہ کچھ ایسے ویسے نہ تھے علم و زہد میں شیعوں کے نزدیک وہ بھی شہرۂ آفاق تھے کونسا عالم شیعہ مذہب ہے جو ان کو نہیں جانتا اور ان کو نہیں مانتا اور ان کا بھی اس بات میں کچھ قصور نہیں اس آیت کو جس پہلو سے پلٹ کر دیکھئے کہیں گنجائش گفت و شنود کی نہیں ہر طرف

سے سنیوں ہی کا مطلب نکلتا ہے۔

آیت سوم کی بصیرت افروز تشریح

شرح اس معما کی یہ ہے کہ اول تو لفظ صاحب جو لصاحبہ میں ہے وہ عربی زبان میں صحابی کے ہم معنے ہے دوسرے لفظ لاتحزن جس کا یہ مطلب ہے کہ غمگین مت ہو۔ وہ اسی پر دلالت کرتا ہے کہ ابوبکر صدیق عاشق صادق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومن با اخلاص تھے ورنہ ان کو غمگین ہونے کی کیا ضرورت تھی بلکہ محل خوشی تھا کہ ان کے دشمن موافق عقیدہ شیعہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خوب قابو میں آئے ہوئے تھے کفار جو اس وقت پاس آگئے تھے پکار کے بھی نہیں تو کسی قسم کی کھڑکے ہی کو نہیں مطلع کر دیتے تاکہ نعوذ باللہ منہا وہ اپنا کام کرتے اگر کہیں انصاف کی آنکھیں مول ملیں تو ہم حضرات شیعہ کے لئے مول لیں اور ان کو دیں تاکہ وہ کچھ تو پاس رفاقت خلیفہ اول کریں

ع۔ جو پاس مہر و محبت یہاں کہیں ملتا تو مول لیتے ہم ایک اپنے مہرباں کیلئے

اور جو یہ بھی نہ ہو تو یہی سمجھیں کہ ان کو اس وقت اپنی جان کا خوف نہ ہوا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنہائی کا افسوس رہا اور غم ہوا تو اس بات کا کہ دیکھئے یہ دشمن حق یعنی کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا کر بیٹھیں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی فرمائی اور فرمایا کہ غم کی کیا بات ہے اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے تو غمگین مت ہو۔

حزن کے معنی سمجھنے میں بعض غیر منصفوں کی فاش غلطی

اس جگہ بعضے ناانصاف یوں کہتے ہیں کہ ابوبکر صدیق کو اس وقت اپنی جان کا ہراس تھا کچھ پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھا غور کرنے کی جگہ ہے اس بات کا یہ مطلب ہوا کہ خداوند کریم کو نعوذ باللہ عربی بولنی بھی نہیں آتی فصاحت و بلاغت تو در کنار اور یہ جو کلام اللہ کے اعجاز بلاغت کا شہرہ ہے یہ فقط یاروں کی گھڑی ہوئی بات ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ جو کچھ بھی عربی جانتے ہیں وہ بھی اتنی بات تو جانتے ہیں کہ عربی زبان میں حزن کا لفظ غم کی جگہ اور فراق محبوب یا تمنا کے فوت ہو جانے کے محل میں استعمال کرتے ہیں اور جہاں جان پر بنتی ہے اور ڈر کا مقام ہوتا ہے خوف کا لفظ استعمال کرتے ہیں کلام اللہ سے زیادہ تو کوئی کتاب عربی زبان کی فصیح اور بلاغت آمیز نہیں دیکھئے حضرت موسیٰ جب کوہ طور پر گئے اور خداوند کریم نے پوچھا کہ موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا ہے انہوں نے عرض کی کہ یہ میری لاٹھی ہے چلتے پھرتے اس پر

ہمارا رکھوں ہوں اور بکریوں کے لئے اس سے پتے جھاڑوں ہوں اور اس میں میرے اور بھی بہت سے فائدے ہیں ادھر سے حکم ہوا کہ اسے ڈالیو انہوں نے جو ڈالا تو وہ ایک اژدھا تھی یہ الٹے پاؤں ایسے بھاگے مڑکے بھی نہ دیکھا۔ اس وقت خداوند کریم نے فرمایا۔

اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ۔	یعنی تو ادھر آ اور ڈر مت میرے پاس رسول ڈرا نہیں کرتے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو اس اژدہا سے اپنی جان کا اندیشہ ہوا تب بھاگے اسی لئے خدا نے تسلی فرمائی۔ کہ ڈرمت یوں نہ فرمایا لَا تَحْزَنْ یعنی رنجیدہ نہ ہو اور اسی طرح جب انہوں نے ایک قبطی کو مار ڈالا اور فرعون کے لوگوں نے ان کے مار ڈالنے کا ارادہ کیا تو یہ وہاں سے ڈر کے بھاگے اس موقع میں فرماتا ہے فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا یعنی نکلے موسیٰ وہاں سے ڈرتے ہوئے اور سوا اس کے اور بیسیوں جگہ خوف کا لفظ کلام اللہ میں موجود ہے جہاں کہیں ہے یہی معنی ہیں اور جہاں غم کا مقام دیکھا وہاں یہی حزن کا لفظ استعمال کیا ہر سورہ یوسف میں جس موقع میں حضرت یعقوب غم فراق یوسف میں ہائے یوسف ہائے یوسف کہا کرتے تھے اور انہیں یاد کیا کرتے تھے اور حضرت یعقوب کے اور بیٹوں نے یوں کہا۔ کہ تم یوسف کو یاد ہی کرتے کرتے مرجاؤ گے۔ حضرت یعقوب کی طرف سے یہ جواب منقول ہے۔ اِنَّمَا اَشْکُوْ بَثِّیْ وَحُزْنِیْ اِلَی اللّٰہِ یعنی میں اپنے رب سے اپنی پریشانی اور اپنا غم کہوں ہوں بلکہ بہت سی آیات سے یوں ثابت ہوتا ہے کہ حزن کے اور معنی ہیں اور خوف کے اور معنے ہیں ایک دوسرے کی جگہ نہیں بولا جا سکتا۔ تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَنْ لَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا یعنی جب پکے مسلمان مرنے لگتے ہیں تو فرشتے رحمت کے ان پر اترتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ نہ تم ڈرو اور نہ تم غمگین ہو اگر خوف اور حزن کے دونوں کے ایک معنی ہوتے تو مکرر کہنے کی کیا ضرورت تھی، صحیح یہی ہے کہ غم اور چیز ہے اور خوف اور چیز ہے خوف اسے کہتے ہیں کہ کچھ آگے کو اندیشہ ہو اور غم یہ ہے کہ بالفعل دل کی تمنا ہاتھ سے نکل جائے غم خوشی کے مقابلہ میں بولتے ہیں خوف اطمینان کے مقابلے میں خوشی اور اطمینان اور غم اور خوف کے معنی بیان کرنے میں مجھے یہ شرم آتی ہے کہ کوئی کیا کہے گا یہ کونسی مشکل مخفی باتیں ہیں جنہیں کوئی

نہ سمجھتا ہو پر کیا کیجئے ایسے ناانصافوں سے پالا پڑا ہے کہ شاید اب بھی ان کی سمجھ میں نہ آئے لہٰذا اتنا اور کہنا پڑا کہ جب کسی کا کوئی مرجاتا ہے تو اس پر جو حالت پیش آتی ہے اسے غم تو کہتے ہیں پر خوف اور ڈر کوئی نادان بھی نہیں کہتا، ہاں مرنے سے پہلے جس موقع میں موت کا اندیشہ ہوتا ہے اس اندیشہ کو البتہ خوف کہتے ہیں پر رنج کوئی نہیں کہتا اگر کسی کا لڑکا کسی دیوار پر چڑھ جائے اور وہاں سے اندیشہ گر کر مرجانے کا ہو تو اس اندیشہ کو البتہ خوف کہتے ہیں لیکن کوئی نادان بھی اسے غم نہیں کہتا۔ القصہ غم عین مصیبت کے وقت جو حالت ہوتی ہے اسے کہتے ہیں اور خوف مصیبت کی آمد آمد کی کیفیت کا نام ہے۔ ایک کو دوسرے سے کچھ لگاؤ نہیں جو حضرات شیعہ ہٹ دھرمی کر کے لَا تَحْزَنْ کے معنے لَا تَخَفْ گھڑ لیں۔

شیعوں کی کج فہمی کی ایک پُرمذاق توجیہ مگر ایک طرح وہ بھی سچے ہیں ان کے یہاں تو قاعدہ کلیہ ہے کہ الٹے معنے سمجھتے ہیں مولوی عمار علی صاحب نے ناحق کے معنے حق سمجھے چنانچہ اس کا بیان گذر چکا اور تمام شیعوں نے محافظوں کا نام چور رکھا علی القیاس یہاں بھی اگر وہ ایسا کریں۔ تو سنیوں کو کیا شکایت ہے بلکہ خوش ہونے کی جگہ ہے کیونکہ اصل مطلب میں تو شریک ہی نکلے لفظوں اور اصطلاح ہی کا فرق رہا سو یہ کیا بڑی بات ہے مصرع

ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم۔

حاصل تمہارے ان کے اختلاف کا یہ نکلا حق کا نام ان کی اصطلاح میں ناحق ہے اور محافظ کا نام ان کی اصطلاح میں چور اور حزن کا نام ان کے نزدیک خوف ہے مگر جیسے کوئی انگریز نابینا مسلمانوں کی محفل میں کسی کو کسی کی نسبت بابا کہتے ہوئے سنتا ہے تو اپنی اصطلاح کے موافق اس وقت انگریز بیٹی کے معنے اور ننیا دادا کے معنے سمجھتا ہے ایسے ہی حضرات شیعہ نے اگر لَا تَحْزَنْ کے معنے لَا تَخَفْ کے سمجھ لئے تو ان کا کچھ قصور نہیں سنیوں کو لازم ہے کہ ان کی اصطلاح کے موافق ان سے باتیں کریں آخر حدیث میں تو یہ مضمون ہے کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ یعنی لوگوں سے ان کی عقل و فہم کے موافق گفتگو کیا کرو اور اگر بپاس خاطر شیعہ لَا تَحْزَنْ کو بھی ہم معنے لَا تَخَفْ ہی سمجھیں تب بھی ہمارا چنداں نقصان نہیں ہمارا ادھر بھی لیکھا ہے اس لئے کہ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ اے ابوبکر مت ڈر۔ سو ظاہر ہے کہ ابوبکر جو خوفناک ہوئے

اور ان کو اپنی جان کا کھٹکا ہوگا تو اسی سبب سے ہوگا کہ کفار کو ان کے ساتھ دشمنی ہوگی اور وہ دشمنی بھی بوجہ اسلام اور ایمان ہوگی نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے کیا معنے اور وہ بھی پھر اسقدر کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ خدا تو مسلمانوں کی طرفداری اور حمایت کرتا ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُؤمِنِیْنَ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ اور اس قسم کے کلمات سے کلام اللہ بھرا ہوا ہے سب کا ماحصل یہی ہے کہ اللہ اچھوں کے ساتھ ہے مومنوں کے متقیوں کے اچھے کاموں کے کرنیوالوں کے ساتھ ہے کہیں اوّل سے آخر تک کلام اللہ میں یہ نہیں کہ اللہ کافروں کے مرتدوں کے منافقوں کے ساتھ ہے۔

اللہ کی معیت کی وضاحت اور کوئی کہے کہ اللہ سب کے ساتھ ہے مومن ہو یا کافر کلام اللہ میں موجود ہے اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ۔ یعنی اللہ ہر چیز کو محیط ہے۔ جب ہر چیز کو محیط ہوا تو ہر چیز کے ساتھ بھی ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ساتھ ہونا دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو یہی اکھٹے ایک مکان میں رہنا اس میں فقط تن بدن کا ساتھ ہوتا ہے اگرچہ دلوں میں فرق ہو، اس قسم کی ہمراہی تو طوطے اور زاغ کی سی ہے۔ دوسرا دلوں سے ساتھ رہنا جیسے کوئی بادشاہ کسی بیکس کو جس کے سب دشمن ہوں یوں کہے کہ تو اندیشہ نہ کر ہم تیرے ساتھ ہیں اس کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ ہمیں تیرا خیال ہے ہمارے دل میں تیرا دھیان رہے گا ہم تیری حمایت پر ہیں۔ اس صورت میں کچھ لازم نہیں کہ بادشاہ اور وہ ایک مکان میں ہوں تو وہ اس کے ساتھ ہو نہیں تو نہیں ہاں البتہ تا مقدور امداد و اعانت چاہیئے۔ سو جہاں کہیں اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ یا اسی طرح اور کچھ آیا ہے تو اس سے دوسرے معنے مراد ہیں چنانچہ سب جانتے ہیں نہیں تو اس میں متقیوں ہی کی کیا تعریف نکلی اور انہیں کی کیا تسلی ہوگی۔ سنو خلاصہ کر اس آیت میں تو محض تسلی ہی کے لیئے یہ کہا گیا ہے اور اوپر سے مددگاری ہی کا بیان ہے۔

آیت معیت سے حضرت ابوبکرؓ کی مدد کا ثبوت باقی یہ کوئی شبہ کرے کہ اوپر سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنے کا بیان ہے، ابوبکر صدیق کی مدد تو نہیں۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اتنی بات تو بازاری بلکہ جولاہے کی لونڈیاں بھی جانتی ہیں کہ غلام کی اہانت اور اس کی رسوائی وہ میاں ہی کی رسوائی گنی جاتی ہے انگریزوں کی رعیت کو اور ملازموں کو اگر ان کے غنیم ستاتے ہیں تو انہیں کیوں اتنا برا معلوم ہوتا ہے کہ فوج کشی کرتے ہیں اور ہزاروں آدمیوں کا خون کراتے ہیں معہذا ہم نے غدر کے

ایام میں دیکھا ہے کہ جس نے تحصیلدار یا پولیس دار کو بچا لیا تھا وہ خیر خواہ سرکار گنا جاتا تھا سو ابوبکر صدیق کی مددگاری بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی مددگاری ہے اسی لیئے ہمارے سنانے وقت تو یوں فرمایا فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰہُ اور مدد کے وقت دونوں ہی کی مدد کی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق کو جو خدا کی مدد کی اطلاع کی تو یوں کی اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا یعنے خداوند کریم خبر رسانی میں اس قصہ کی تو فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا ذکر فرماتے ہیں اور یوں کہتے ہیں فقد نصرہ اللّٰہ یعنی اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی فلانے وقت مدد کی اور جس وقت کہ مدد کی تو دونوں کی مدد کی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مدد کی اطلاع کی تو یوں کی اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا یعنی اللہ تعالےٰ ہم دونوں کے ساتھ ہے اور چونکہ ایک لفظ یعنے معنا سے دونوں کی مددگاری کا بیان فرمایا اور دو لفظ نہ کہے یعنی مَعِیَ وَمَعَکَ نہ فرمایا جس کے یہ معنے ہوتے کہ خدا میرے بھی ساتھ ہے اور تیرے بھی ساتھ ہے تو اس سے اور بھی واضح ہوگیا کہ جس طرح سے خدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا اسی طرح حضرت صدیق اکبر کے ساتھ تھا سو اس میں تو ہم جانتے ہیں کہ شیعہ بھی بناچاری ہمارے شریک ہوں کہ خداوند کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امداد اور عنایت اور محبت اور اعانت سے تھا تو حضرت صدیق کے ساتھ بھی اسی انداز سے سمجھنا چاہیئے معہذا لفظ ثَانِیَ اثْنَیْنِ جس کا یہ مطلب ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اکیلے نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ ایک اور بھی تھا یعنے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ضمیر مفعول لا تنصروہ سے حال واقع ہوا ہے۔ سو اس صورت میں یہ لفظ بھی بآواز بلند یہی کہتا ہے کہ حضرت صدیق بھی مددگاری خداوندی میں شریک ہیں۔

آیت معیت میں شیعوں کی طرف ایک عبارتی دھوکا اور اس کا جواب اور اگر شیعہ یوں کہنے لگیں، کہ یہ لفظ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ کے ساتھ مربوط ہے اور اس کی ضمیر مفعول سے حال واقع ہوا ہے اور یہ مطلب ہے کہ جس وقت کفار نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ معظمہ سے نکالا تھا اس وقت وہ اکیلے نہ تھے ان کے ساتھ ان کا ایک رفیق بھی تھا اور اس کو نصرت سے کچھ تعلق نہیں نصرت سے تعلق جب ہو کہ اس لفظ کو لفظ نَصَرَهُ اللّٰہُ سے علاقہ ہو تو اس تقدیر پر ہماری طرف سے یہی جواب ہے

شکر یزدان تو بچشم یار دشمن دل ماشاد

اگر یہ مطلب ہو تو ہماری عین تمنا ہے کیونکہ اتنا تو شیعوں کو معلوم ہوا کہ کفار کو جیسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت تھی ویسے ہی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی عداوت تھی باقی کوئی یوں کہے کہ ابوبکر صدیق کو تو کفار نے نہیں نکالا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمراہ لے لیا تھا۔ سو اس کا جواب شیعہ دیں کیونکہ یہ معنی تو ہم نے انھیں کی طرف سے بیان کئے ہیں اور اگر ہمیں سے پوچھتے ہو۔ تو ہمیں سے سنئے۔ جناب من بشہادت کلام اللہ کفار نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس طرح سے نہیں نکالا کہ ہاتھ پکڑ کر باہر کر دیا ہو یا دھکے دینے کا اتفاق ہوا ہو مثلاً

دار الندوہ کے واقعہ کی اصل شکل بلکہ صورت یہ ہوئی تھی کہ دار الندوہ میں جو ابو جہل کی بیٹھک کا نام تھا اور وہ خانہ کعبہ کے پاس تھی جہاں اب حنفی مصلے بنا ہوا ہے اور اب وہ جگہ داخل حرم محترم ہو گئی ہے وہاں کفار مجتمع ہوئے اور اس بات کا مشورہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قید کرنا چاہیئے یا مار ڈالنا مناسب ہے یا کہیں انہیں نکال دیجئے اس مشورہ کی اطلاع خداوند کریم نے اپنے حبیب مکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو کر دی آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو رفیق دلی سمجھ کر ساتھ لیا اور غار ثور میں تشریف لے گئے پھر تین دن کے بعد سواری اور راہ کا بندوبست کر کے دونوں صاحب مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے چنانچہ اس بات کی طرف بطور اختصار سورۂ انفال میں جناب خداوند کریم اشارہ فرماتے ہیں

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ	یعنی وہ بھی یاد ہے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ کفار تیرے ساتھ مکر کرنا چاہتے تھے ان کا یہ ارادہ تھا کہ تجھے قید کرلیں یا قتل کر دیں یا نکالدیں ادھر وہ یہ مکر کر رہے تھے ادھر خدا ان کے ساتھ مکر کر رہا تھا یعنی تجھے اطلاع کر دی پھر غار میں تیری حفاظت کی یہاں تک کہ مدینہ منورہ خیریت سے پہنچا دیا اور کیوں نہ ہو اللہ تو سب سے زیادہ مکر جانتا ہے۔

اس قصہ کو غور کیجئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہاتھ پکڑ کے نہیں نکالا تھا اور اگر یوں کہئے کہ ایذا کے درپے ہونا نکالنا ہی ہے تو ابوبکر صدیق کے ہوتے کی انہیں کونسی راحت تھی بلکہ اس سے پہلے بھی انہیں تو نکال دیا تھا ابن دغنہ انھیں ہٹا کے لائے۔ اور کفار سے ان کے باب میں گفت وشنود کرے نہ وہ ہٹیں یہ روایت سنیوں کی کتابوں میں تو موجود ہی ہے پر عقل بھی یوں ہی کہے ہے کہ یوں ہوا ہو تو کچھ عجب نہیں کیونکہ خداوند کریم نے اِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا کے ضمن میں اس بات سے متنبہ کر دیا کہ ابوبکر صدیق سے بھی کفار دشمنی رکھتے تھے نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کیوں تسلی کرتے اور خدا کیوں ان کے ساتھ ہوتا اور ہمیں تو اتنا بھی بہت ہے کہ خدا ان کے ساتھ اسی طرح ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اس تقریر کے سننے کے بعد یقین یوں ہے کہ شیعہ اس احتمال کو زبان پر بھی لائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو اس لئے ساتھ لیا تھا کہ وہ کہیں کفار کو اطلاع نہ کر دے کیونکہ اس احتمال کی جڑ بنیاد تو اس آیت کے ہر ہر لفظ نے ایسی اکھاڑی ہے کہ شیعہ اپنے سر کو قیامت تک پیٹیں تو نہ جمے گی معہذا جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ کچھ ایسے کم فہم نہ تھے انکی عقل کا تو ایک عالم دیوانہ ہے کیا وہ اتنی بھی نہ سمجھے کہ اس اندیشہ کے سو دفیعہ ہیں کہ ابوبکر صدیق کو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کی اول سے اطلاع ہی نہ کرتے کہ میں غار ثور میں جا کر چھپوں گا تو ابوبکر صدیق رضی کچھ شیعوں کے امام تو نہ تھے کہ ان کو علم ما کان وما یکون یعنی ازل ابد کے سب وقائع کی خبر تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبلاتے یا نہ تبلاتے اُن کو آپ اطلاع ہو جاتی ماسوا اس کے تقیہ تو ایسے وقت میں ضرور ہی ہو جاتا ہے چنانچہ شیعوں کے نزدیک ایک تقیہ کی اصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غار میں چھپ جانا بھی ہے خیر یہ قصہ تو تقیہ کی اصل جیسی ہو سو ہے انشاء اللہ آگے معلوم ہو جائے گا۔ پر شیعوں کے مذہب کے موافق تو ایسے وقت میں تقیہ فرض ہو جاتا ہے اور جھوٹ بولنا مباح، بلکہ ضرور چنانچہ اماموں نے جو اصحاب ثلثہ یا اور صحابہ کی تعریف کی ہے اور وہ ان کی کتابوں میں موجود ہے اس کو شیعہ یوں کہتے ہیں کہ اماموں نے بوجہ تقیہ جھوٹ کہدیا تھا نعوذ باللہ منہا۔

القصہ حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جھوٹ بول کر ابوبکر کے دل سے غار ثور کی طرف جانے کا احتمال نکال دیا ہوتا کہ اس کی کیا ضرورت تھی کہ ان کو ساتھ لیا۔ اور ایک جان کا وبال خریدا تنہا ہوتے تو بے کھٹکے ہوتے ان کے ساتھ وہ اندیشہ جس اندیشہ کے لئے انہیں ساتھ لیا تھا اور دو بالا ہوگیا اگر وہ کسی بہانہ سے وہاں سے نکل کر کفار کو اطلاع کر دیتے تو بظاہر کون مانع تھا یا جس وقت کفار وہاں آکھڑے ہوئے اس وقت بول اٹھتے تو وہی مثل ہو جاتی کہ مینھ سے بھاگے پرنالے کے نیچے جا کھڑے ہوئے دھوپ سے بچے پر آگ میں گر پڑے، القصہ اگر ابوبکر کے ساتھ لینے میں یہی مصلحت تھی تو یہ تو مصلحت سے کوسوں دور ہے

ملا عبداللہ مشہدی کی بے اختیارانہ حق گوئی

اسی واسطے ملا عبداللہ مشہدی نے اظہار الحق میں لاچار ہو کر انصاف کی راہ سے یہی کہا کہ نفس الامر تو یوں ہے کہ یہ احتمال بہت ہی بعید ہے مگر وہ نقل مشہور ہے کہ ستر برس کا رام جی میں بیٹھا ہوا نکلتے ہی نکلے ہے اتنی توفیق نہ ہوئی کہ حق بول اٹھیں اور اپنے بیگانہ کا کچھ لحاظ نہ کریں اب ہم سے سنئے کہ ملا عبداللہ مشہدی کا کہنا سب بجا اور درست اور اس کے حق ہونے میں کچھ شک نہیں اور اس وجہ سے اگر ان کی کتاب مذکور کو اظہار الحق کہیں تو پھبتے ہے اور ہم کو بھی اس بات کی تسلیم سے انکار نہیں اگرچہ ملا مذکور شیعہ مذہب ہیں۔ ع

متاع نیک ہر دو کان کہ باشد

مگر ستم تو یہ ہے کہ شیعہ حتی کہ علما بھی باوجودیکہ ملا عبداللہ مذکور کو اپنا مقتداء دین سمجھتے ہیں اس بات میں ان کی بھی نہیں سنتے ہر چند ملا مذکور آخر کو یہی کہہ اٹھے کہ عجب کیا ہے جو خلیفہ اول کو جناب سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمرہی و ہمدمی کے لئے اس لئے اختیار کیا ہو کہ انہوں نے اپنی بیٹی کا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکاح کر دیا تھا اور اکثروں سے پہلے مسلمان ہوئے تھے اور اکثر ملازم خدمت نبوی صلے اللہ علیہ وسلم رہتے تھے لیکن کیا امکان جو حضرات شیعہ رو براہ ہوں بلکہ عجب نہیں کہ مجتہد الزماں کے یہاں سے ان کے لئے بھی حکم تبرا صادر ہو

سفر ہجرت کی حقیقت حال

خیر کوئی مانے یا نہ مانے پر دل سب کا سنی ہوں یا شیعہ یہی گواہی دیتا ہے کہ ابوبکر صدیق کا ہمراہ لے جانا فقط اس وجہ سے تھا کہ ان کو کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وزیر و مشیر اور معین اور مددگار سمجھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا محب

خاص اور ہمدم باختصاص جانتے تھے اور کیوں نہ سمجھیں شیعہ سنی کون نہیں جانتا کہ انہوں نے ابتدا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفاقت سے کفار کے ہاتھ سے کیا کیا ایذائیں سہیں۔ اور کسقدر جفائیں اٹھائیں اور کس قدر مال لٹایا اور کیا کیا کر دکھلایا۔ بلال رضی اللہ عنہ کو مول لیا اور قید کفار سے چھڑا کر آزاد کیا اور علی ہذا القیاس اللہ اور رسول کی خوشنودی کی اور سب اپنا خانماں برباد کیا پس درصورت ان کے مکہ میں چھوڑ جانے کے ایک تو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بہ یقین کامل تھا کہ کفار ان کو اور مجھے یکساں سمجھتے ہیں جو کفار نابکار نے میرے لئے تجویز کیا ہے ان کے لئے ہے انہوں نے بیشتر کفار سے مقابلہ کیا ہے اور ان کو بارہا یہ وعظ و پند کیا ہے کہ دین اسلام دین حق ہے بت پرستی چھوڑ دو اگر سعادت مدنظر ہے اتباع نبوی اختیار کرو اگر ان کو یہاں ہی چھوڑ گیا تو کفار ان کو ہرگز زندہ نہ چھوڑینگے۔ ہاں عمر کو اگر ساتھ نہ لوں تو کچھ مضایقہ نہیں کہ ان سے کفار کو چنداں پرخاش نہیں اور بایں ہمہ ان کے طرح طرح کے لحاظ پاس ہیں منجملہ ان کے یہ بھی ہے کہ ابوجہل کے جو رئیس کفار ہے بھانجے ہیں باقی اور اصحاب کو کفار نگونسار کچھ راس و رئیس دین و ایمان نہیں سمجھتے پھر تیسرا ان کے بچاؤ کے اور بہت وجوہ ہیں پر ابوبکر کی رفاقت کفار کی آنکھوں میں خار ہے ان کو دیکھ دیکھ لہو کے گھونٹ پیتے ہیں یہ اگر مارے گئے تو بڑا رکن ایمان و اسلام ڈھہ جائے گا۔ اور ایسا رفیق شفیق اور ایسا مخلص کہ اس کا اخلاص و محبت دل میں اثر کرتا ہے ہاتھ سے جاتا رہیگا۔ بایں ہمہ ایسے سفر پر خطر میں بے رفیق کے نہیں گذرتی پھر رفیق بھی ایسا چاہیئے کہ نہ جان سے دریغ ہو نہ پاس آبرو ہو زن و فرزند کی محبت سے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کے دل پر غالب ہو اور تیسر گرم و سرد زمانہ دیکھے ہوئے تجربہ کار سیر و سفر مرد ہوشیار یگانہ روزگار بلند ہمت عالی فطرت یار بے تکلف محب صمیم رازدار قدیم ہو جس سے دل کی بات کھلے، دل خالی ہو غم و حیرانی و وحشت و پریشانی اس کی صحبت سے دور ہو۔ سو مجموعہ ان اوصاف کا سوا جناب صدیق کے کسی اور میں نہ پایا اسی لئے عین دوپہر کے وقت آپ ان کے گھر تشریف لائے اور حاضری پکوا کر دونوں مخدوم عالم اور خادم ہمدم رونق افروز غار ثور ہوئے اور عبداللہ بن ابی بکر کو کہ فرزند ارجمند پسر کلاں حضرت صدیق کے تھے جاسوسی کے لئے مقرر کیا کہ مشورہ کفار سے جو کچھ وہ در باب طلب و تلاش حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کریں شب کو آگاہ کرتے رہیں

واقعہ سے شیعہ کی خام خیالی کا جواب اگر خاندان صدیقی کو کچھ بھی عداوت ہوتی تو یہ معاملے کہیں ہو سکتے اور اگر بالفرض والتقدیر بفرض محال ایسے مشورے پیش بھی آتے تو اس سے بہتر کینہ کشی کا وقت ان کے پھر کونسا ہاتھ آتا انعامِ کفار جدا لیتے اور اپنا کام جدا کرتے حضرات شیعہ ہی اپنی کتابوں کو دیکھ کر فرمائیں کہ ہیں نے اس قصہ میں کیا جھوٹ ملا دیا ہے بسر مو اگر فرق پائیں تو جو چاہیں سو کریں۔ منصفوں کو تو بے اس کے کہے نہیں بن پڑتی کہ ایسے وقت کی ہمدمی اور ہمرہی اور اس اہتمام اور انتظام سے ان کا ساتھ لینا ایسی بڑی فضیلت ہو کہ حضرت علی رضی اللہ تعالے عنہ کا اس شب بستر پر سو رہنا بھی اس کے ہمسنگ نہیں ہو سکتا۔

غدر میں سب نے دیکھا ہوگا کہ تلاشی کے وقت اگر مجرم نہیں ملا تو حکام نے ان لوگوں سے کچھ پرخاش نہیں کی جو اس مقام پر ملے ہاں جس کو رفیق و مددگار مجرم دیکھا اس کو بھی مجرم ہی سمجھا ہائے افسوس کہ خدا تعالے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت حضرت صدیق کے حق میں مقبول نہ ہو، فقط اس شرم سے کہ مسلمان کہلاتے ہیں اگر خدا کے کلام کو نہ مانیں گے تو جواب کیا دیں گے۔ اس آیت کو جبراً کرہاً اگر سر دھرتے ہیں تو ہزار طرح کی نامعقول تاویلیں گھڑتے ہیں پر چند مفتریان سیہ باطن تیرہ دروں کی گھڑی گھڑی باتوں کو ایسا دل و جان سے بے حیلہ و حجت قبول کرتے ہیں کہ اگر اس کے قبول کرنے کو کلام اللہ کے قبول کرنے سے موازنہ کریں تو کلام اللہ کا تسلیم کرنا اسکے پاسنگ بھی نہیں ہوتا۔

آیت معیت کی منصفانہ ترجمانی ہمیں اس میں شک بھی نہیں کہ حضرات شیعہ کے دل میں اس آیت سے اول وہلہ یہی معنی آتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق کو اگر اس وقت رنج تھا تو یہی تھا کہ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بے بس و بیکس ہیں میں ایک تن تنہا کیا کر سکتا ہوں مبادا دشمنان دین جو پاس پاس کو پھرتے ہیں اس طرف کو جھانک اٹھیں اور حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو ہلاک کر جائیں اور ہماری حسرتیں اور تمنائیں سب دل کی دل میں رہ جائیں مگر چونکہ کمال درجہ کی بے بسی اور بے سرو سامانی کو امداد و اعانت لازم ہے چنانچہ کلام اللہ میں ہے۔

حَتّٰی اِذَا اسْتَیْأَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ کُذِبُوْا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا

یعنی جب کہ ناامید ہوگئے رسول اور انھیں یہ وہم ہوا کہ یہ وعدہ جو درباب نصرت اور مددگاری کے ہم سے تھے مبادا خیال شیطانی ہوں ہم اپنی غلط فہمی سے اسکو وعدہ خداوندی سمجھتے ہوں۔ آئی ان کو ہماری مدد۔

اس مایوسی میں جو حضرت ابوبکر کو باعتبار ظاہر کے پیش آئی تھی نزول امداد ہوا اور یہ بشارت ہوئی کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا اے ابوبکر مایوس اور غمگین نہ ہو تسلی رکھ ہمارے ساتھ خدا ہے القصہ اس وعدہ صادق نے ظہور فرمایا اور کفار نگونسار کے شر سے ان دونوں بندگان خاص کو بچا کر بحفظ تمام مدینہ میں پہنچایا اور پھر دین کو یہ رونق دی کہ اظہر من الشمس ہے سو دعا دینی چاہیئے ابوبکر صدیق کی جان کو کہ نہ وہ اتنے غمگین ہوتے نہ اس کا یہ ثمرہ مترتب ہوتا کہاں ان کے صدقہ سے یہ نصرت ہو کہاں ملک ایران وغیرہ قبضہ کفار سے چھوٹیں اور شیعوں کو ٹھکانہ ملے مگر اس نااہلی کو دیکھئے کہ شکرانہ کے بدلے ان کے ساتھ وہ کرتے ہیں کہ کوئی اپنے محسن کے ساتھ نہ کرے

ع۔ مرا بخیر تو امید نیست بد مرسان

آیت معیت میں شیعوں کی ایک اور مضحکہ خیز تاویل اور اس کا بطلان اس مقام میں بعضے متعصب لاچار ہو کر بہت پیچ و تاب کھا کر شاید کہیں تو یہ کہیں کہ واقعی اس زمانہ تک تو ابوبکر ایسے ہی تھے جیسے خدا کے کلام سے سمجھا جاتا ہے مگر وہ بات پھر نہ رہی ہوگی، یہ شبہ اس قابل نہیں کہ کوئی اس کے جواب کی طرف متوجہ ہو بلکہ شیعوں کو لازم ہے کہ اس بات کو منہ پر نہ لائیں، مبادا کوئی ہندو انگریز سن کر یوں بکنے لگے کہ ایسے خدا ہی کو سلام ہے جسے چار دن کے بعد کی خبر نہ ہوا اور اگر بفرض محال حسب گفتار شیعہ نقل کفر کفر نباشد خدا کو ابوبکر صدیق کے ان اطواروں کی جو ان سے بعد میں ظہور میں آئے خبر نہیں بھی تھی اور بھولے چوک کے منہ سے یہ بات نکل گئی تھی تب لازم تھا کہ اپنی اس بات کی پچ کرتا اور جبراً ابوبکر صدیق کو راہ راست پر لاتا خدا تھا کچھ ناخدا تو نہ تھا۔ کہ باد مخالف میں لاچار ہو کر بیٹھ رہے بندوں کو تو اپنی بات کی پچ ہوتی ہی خدا تو خدا، ابوبکر صدیق کے حق میں تو یوں کہا کہ ہم اسکے ساتھ ہیں اور ادھر یوں سنایا کہ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰهِ یا مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ دونوں آیتوں کا یہی مطلب ہے، کہ خدا کی بات بدلی نہیں جاتی اور پھر بسیر ابوبکر کا ساتھ چھوڑ دیا یہاں تک کہ شیطان نے اسے آ دبایا، یا یوں کہیئے نعوذ باللہ خدا ساتھ تو تھا پر خدا سے شیطان کے مقابلہ میں کچھ نہ ہو سکا تعالی اللہ عن ذلک علواً کبیراً بجز شیعوں کے اور کسے یہ دلیری ہے کہ ایسی بات منہ پر لا سکے۔

آیت معیت کے الفاظ بھی شیعوں کو منہ توڑ جواب دے رہے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ اول تو اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا یہ ایسا جملہ ہے کہ عربی کے محاورہ کے موافق اس میں سے ہمیشگی کی بو آتی ہے جو لوگ عربی جانتے ہیں اور فن بلاغت کے قواعد سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں بلکہ اتنی بات تو یقین یوں ہے مولوی عمار علے

صاحب بھی جانتے ہوں دو سرے ہم نے مانا اس جملہ سے کچھ ہمیشگی نہیں نکلتی پر اتنی بات تو شیعوں کو
بھی تسلیم کرنی ہی پڑے گی کہ اس وقت خاص میں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر
صدیق رضہ اس خدا کی ہمرہی اور ہمدمی میں شریک تھے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم سے خدا کبھی علیحدہ ہوگئے ہوں اور ان کی ہمرہی اور طرفداری چھوڑ دی ہو سو اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔
میں رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا حصہ تو دائمی نکلا اس صورت میں ابوبکر صدیق کا حصہ بھی دائمی ہوگا
کیونکہ دونوں کے حصے رلے ملے ہوئے ہیں بٹے ہوئے نہیں ایک مع کا لفظ دونوں کے واسطے ہے
دو لفظ جدا جدا نہیں یعنی مَعِیْ و مَعَکَ نہیں فرمایا تیسرے ہم اس سے بھی درگذرے۔ ہم
یوں کہتے ہیں کہ شیطان کا مقولہ سورۂ صٓ میں یوں منقول ہے

فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ	یعنی شیطان قسم کھاکے کہتا ہے کہ اے اللہ مجھے قسم ہے تیری عزت کی میں سب ہی بنی آدم کو بہکا دوں گا مگر جو تیرے چھٹے ہوئے بندے ہیں تو نے انہیں اپنے لئے چھانٹ لیا ہے۔

کیونکہ وہ میرے دست قدرت سے باہر ہیں وہ تیری پناہ میں آگئے ہیں سو جبکہ تو ان کے
ساتھ ہے اور وہ تیری پناہ میں ہیں وہاں میرا کچھ قابو نہیں چل سکتا اور سورۂ حجر میں اِلَّا عِبَادَکَ
مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ کے بعد بطور تصدیق کے شیطان کے مقولہ کے جواب میں خداوند کریم کی طرف سے
یوں ارشاد ہو اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ یعنی شیطان کو کہا جاتا ہے کہ تو اس بات
میں سچا ہے جو میری پناہ میں آگئے ہیں ان پر تیرا بس نہیں چل سکتا اب بعد اس کے غور فرمائیے
کہ حضرت ابوبکر صدیق کا پناہ خداوندی میں آجانا تو اس آیت ہی سے ثابت ہے یعنی اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا
سے صاف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک دفعہ تو صدیق اکبر پناہ خداوندی میں آگئے اور خدا کے
دربار میں اور حرم میں گویا داخل ہوگئے پھر بعد اس کے جو وہاں سے نکلے تو شیطان کے نکالے
تو نکل ہی نہیں سکتے اور کس نے نکالا اور اگر یوں کہیئے کہ خدا ہی نے اپنی پناہ سے نکال دیا تو یہ خیال
خود غلط ہے کیونکہ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ	یعنی اللہ تعالےٰ اپنی راہ و رسم کو کسی قوم کے ساتھ جب تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنے طور و انداز کو نہ بدل دیں

معیت حق صدیق کی ذات کے ساتھ تھی اور خود حضرت ابوبکر صدیق بے اغوار شیطانی اور بے استدراج
خداوندی اپنی روش بدل لیں یہ محالات میں سے ہے اس واسطے کہ یہ بدیہات میں سے بلکہ
اظہر من الشمس ہے کہ ہر قسم کے کام کے لئے ایک استعداد ہے۔ داد و دہش کے لئے سخاوت چاہیئے مارنے
مرنے کے لئے شجاعت چاہیئے سو ایسے ہی برے کام اور گناہ کی باتوں کے لئے بھی ایک استعداد اور
قابلیت چاہیئے۔ سو وہ قابلیت اگر تھی تو خدا نے چھانٹا ہی تھا کس خوبی پر نعوذ باللہ خود کلام
ربانی ہی میں موجود ہے۔

اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ۔	یعنی بری چیزیں بروں کے لئے اور برے بری چیزوں کے لئے۔ اور اچھی چیزیں اچھوں کے لئے اور اچھے اچھی چیزوں کے لئے۔

بلکہ اس موقع میں جو یوں ارشاد ہوا اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ یعنی اللہ ہمارے ساتھ ہے اس سے
یہ ثابت ہوگیا کہ اللہ ان سے جدا نہ ہوگا۔ سو وجہ اس کی یہ ہے اگر اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔
یعنی اللہ مومنوں کے ساتھ ہے بعد لفظ لَا تَحْزَنْ کے فرماتے تو یوں بھی گمان ہوتا کہ اللہ کی ہمرہی
ایمان کے ساتھ مشروط تھی۔ جب ایمان گیا ہمرہی بھی ساتھ گئی اور درصورتیکہ بے کسی شرط کے
ہمرہی ہو تو وہ دائمی ہوگی اس میں زوال کا احتمال نہیں۔ قرابت کی وجہ سے جو ارتباط ہوتا ہے
وہ قابل زوال نہیں ہوتا اور آپس کی دوستی میں جو بوجہ اخلاق اور احسانات باہم دگر کے ہوتے
ہیں وہ جب ہی تک رہتے ہیں کہ اخلاق اور احسان باقی رہیں اسی واسطے دوستی ٹوٹ جاتی ہے
رشتہ نسبی نہیں ٹوٹتا القصہ نسب کے حقوق جان کے ساتھ ہوتے ہیں اور دوستی کے حقوق احسان
کے ساتھ سو جونکہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا فرمایا ہے اور اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ وغیرہ جو کسی وصف پر
دلالت کرے نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ ابوبکر کے ساتھ خدائے تعالےٰ کی ہمرہی جان کے ساتھ ہے
کسی وصف کے ساتھ نہیں پھر اگر خدا کی ہمرہی بدل جاتے تو موافق آیت مذکورہ بالا اِنَّ اللّٰہَ
لَا یُغَیِّرُ الاٰیۃ کے کسی وصف میں تغیر آنا ضرور ہی اور جب اوصاف کے تغیر اور تبدل پر معیت

اور ہمرہی میں بھی تغیر آیا تو معلوم ہوا کہ وہ معیت اور ہمرہی ان اوصاف ہی کے سبب تھی بے وجہ نہ تھی اس صورت میں لازم آوے گا کہ خدا سے بڑی چوک ہوئی کہ اُس وصف کا نام نہ لیا یا خداوند کریم بھول گیا اور اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُؤمِنِیْن کی جگہ مثلاً اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا فرمایا نعوذ باللہ من سوء الفہم خداوند کریم اور چوک جائے یا بھول جائے خدا کی تو یہ شان ہے جیسے کلام اللہ میں آیا ہے لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسیٰ یعنی حضرت موسےٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میرا رب نہ چوکے نہ بھولے،

آیت میں معنا کا لفظ حضرت ابوبکر صدیق کے رتبہ کا آئینہ دار ہے

انصاف اگر ہو تو اس لفظ مَعَنَا سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ ابوبکر صدیقؓ کا رتبہ کچھ لگ بھگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رتبہ کے ہے جو ایک قسم کی معیت اِن دونوں کے واسطے خداوندکریم نے بیان فرمائی۔ سو یہ بات بجز اس کے نہیں ہو سکتی کہ صدیق اکبر ان کو کہا جائے اور تمام اُمت محمدی اور سوا اُس کے اور امتہائے ماسبق سے ان کو افضل سمجھا جائے۔ جب کہیں ان کے رتبہ اور مقام کی حد اعلےٰ مقام نبوت کی سرحد اسفل سے متصل ہو اور یہ لیاقت بہم پہنچے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کسی بات میں شریک ہوں سو یہ بات شیعہ سنی سب جانتے ہیں کہ ایسا مقام جو مقام نبوت سے متصل ہو بجز صدیقیت اور کوئی نہیں کیونکہ کلام اللہ میں بعد انبیاء کے صدیقین ہی کو ذکر کرتے ہیں سو اس سے معلوم ہوا کہ ہر نبی کی امت کے صدیق اکبر کا رتبہ اس نبی کے رتبے سے متصل ہی نیچے ہوتا ہے سو چونکہ حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت تو اور نبیوں کی نبوت سے بالاتر ہے تو اس امت کے صدیق اکبر کا رتبہ اپنی امت کے صدیقوں کے مرتبہ سے تو بڑھ کر ہی ہے اور امتوں کے صدیقوں کے مرتبہ سے بھی بالاتر ہوگا۔ اب بس کیجئے کہ منصفوں کے لئے یہ بھی بہت ہے اور متعصبوں کو خداوند کریم اگر سمجھائے تو شاید مانیں ہم حبیبوں کی کا ہے کو مانیں گے مگر ہمیں بطور نصیحت اس قدر کہنا لازم ہے کہ خداوند کریم جس کے ساتھ ہوتا ہے اس کے دشمنوں کی خیر نہیں ہوتی۔

شیعوں کی ایک اور راہ گریز اور اس کی ردک تھام

اس کے بعد کوئی کہے گا تو یہی کہے گا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا حقیقت میں خدا کا مقولہ نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقولہ ہے خداوندکریم فقط ناقل اور راوی ہے کچھ اپنی طرف سے نہیں فرماتے جو کچھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اس وقت صادر ہوا اسے بعینہ نقل کر دیا جیسے فرعون کا اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلیٰ کہنا یعنی میں تمہارا بڑا رب

ہوں یا ابلیس کا اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ کہنا یعنی میں آدم سے بہتر ہوں بعینہ نقل کر دیا ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہرچند رسول ہیں لیکن پھر بھی انسان ہیں اور یہ مثل مشہور ہے اَلْاِنْسَانُ مُرَکَّبٌ مِّنَ الْخَطَاءِ وَالنِّسْیَانِ سو اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کچھ غلطی ہو گئی ہو تو کیا بعید ہے جواب اس کا یہ ہے کہ واقعی شیعوں کیلئے یہ بات بڑی مایۂ افتخار ہے لازم تو یوں ہے کہ عید بابا شجاع سے اس کی خوشی کم نہ ہو اگرچہ کسی سنی ہی کی تبلائی ہے مطلب کے وقت تو گدھے کو بھی باپ بنا لیا کرتے ہیں۔ سنی تو ان کے قدیمی استاد ہیں اور استاد بھی کونسے جن سے کلام اللہ سیکھا جس کا رتبہ حقیقی باپ سے بھی بڑھ کر ہے بات بھی اگر ان سے سیکھ لی تو کیا مضائقہ ہے مگر اتنا کہنا میرا بھی ماننا چاہیئے کہ سورہ نجم کو ساری کی ساری نہیں تو اتنے ہی کلمہ کو ساقط کر دو۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ | یعنی ہمارا پیغمبر جو کچھ ہمارے حوالہ سے کہے ہے وہ کچھ اپنے جی سے نہیں تراش لیتا بلکہ وہ نری وحی ہے

اس میں کسی طرح کا راوہ نہیں نہ کچھ دخل فصل ہے نہ وہم کا یا عقل کا کچھ دخل ہے خلیفہ ثالث نے امیرالمومنین علی مرتضٰے وصی رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے فضائل کے کلمات اور آیات کیا سورتیں کی سورتیں جو خلافت پر دلالت کرتی تھیں کلام اللہ سے نکال دیں تم اس کی پاداش میں ایک آیت جو فی الجملہ اثبات فضیلت خلیفہ اول میں کارآمد ہے اگر نکال ڈالو تو از قبیل جَزَآءُ سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا کے ہوگی بلکہ اس سے بھی کم کیونکہ اس آیت کے معنے تو فقط اتنے ہی ہیں کہ بدی کا بدلہ ویسی ہی بدی ہے سو یہاں برابری کیا۔ آدھوں آدھ کی بھی نسبت نہیں تقریباً گیارہ ہزار آیت کے بدلے میں ایک آیت کو کون برابر کرے گا اور پھر وہ بھی ایسی کہ اس کے جاتے رہنے سے کوئی حق تلف نہیں ہوتا خلیفہ ثالث نے تو یہ کمال کیا کہ اتنی آیتیں بھی نکال دیں اور آیتوں کو نکال کر عوام کی آنکھوں میں حضرت علی رض کا حق بھی نہ رکھا۔ خیر یہ بات تو دور جا پڑی حاصل یہ ہے کہ آیت وَمَا یَنْطِقُ الخ صاف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کہا خدا ہی کا کہا ہے خاص کر ایسی بات کہ جو منجملہ اخبار غیب ہے کیونکہ خدا کی معیت تو کچھ آنکھوں سے نظر نہیں آتی بلکہ اخبار غیب میں سے بھی اول قسم۔ اس لئے آیت اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ہمسنگ آیات متشابہات ہے ان میں عقل کو کسی طرح دخل نہیں ہو سکتا جو کوئی یونہی کہے کہ عقل کے وسیلے سے بہت سے وقائع آئندہ کی اطلاع ہو جاتی ہے

خسوف کسوف اکثر واقفان علم ہیئت کو معلوم ہو جاتے ہیں سو اگر ایک واقعہ بالفعل کی کچھ اطلاع عقل کے وسیلے سے ہو گئی ہو تو کیا عجب ہاں اگر کوئی حکم حلت حرمت کا ہوتا تو البتہ اسمیں اجتہاد کی گنجائش بھی احتمال ہو سکتا تھا کہ جیسے پچھلے اماموں نے اجتہاد کئے ہیں اگر کسی بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کیا ہو تو کیا عجب، چنانچہ سنی اجتہاد نبی کے قائل ہیں مضمون اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا میں کوئی احتمال بجز اس کے نہیں کہ جو کچھ آپ کی زبان پر جاری ہوا وہ سب القائے ربانی تھا کوئی احتمال مفید مطلب شیعہ اس آیت کے پاس کو بھی نہیں پھٹکتا چسپیدگی تو چیز دیگر، حق یہی ہے کہ اگر ابوبکر حسب اعتقاد شیعہ مقبولان بارگاہ الٰہی میں سے نہ ہوتے اور انجام ان کا ارتداد اور کفر پر ہوتا تو اول تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کی تسلی ہی نہ فرماتے کیا ضرورت پڑی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر جھوٹ بولتے۔

تقیہ کا عذر لنگ | اور تقیہ کو کوئی کہے تو اول تو تقیہ وہاں ہوتا ہے جہاں اندیشہ کسی قسم کا ہو۔ ابوبکر صدیق کچھ پہلوان نہ تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ کمزور نہ تھے ان میں تو یک پہلوان کیا بہت سے پہلوانوں کا زور تھا۔ تنہائی میں ابوبکر کے مار ڈالنے کا بہت عمدہ موقع ہاتھ آگیا تھا وہاں کون پوچھتا تھا مار کر کہیں چلدیتے۔ دوسرے تقیہ کرنا تھا تو تلطف اور اخلاق زبانی کفایت کرتے تھے۔ سو وہ کچھ تسلی اور تشفی ہی کے الفاظ میں منحصر نہیں ہم جیسے جنہیں گفتگو کا سلیقہ نہیں بہت سے تلطف کے الفاظ تراش سکتے ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو افصح العرب والعجم تھے اور اگر تسلی ہی کے الفاظ کی ضرورت تھی تو اور بہت سی صورتیں تھیں اس جھوٹ کی کیا ضرورت تھی اور نعوذ باللہ منہا ہم سے تو نہیں کہا جاتا۔ اگر شیعوں کے کہے موافق جھوٹ ہی بولنا تھا تو کچھ توریہ کر لینا تھا۔ اگر ان اللہ معنا کی جگہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ فرما دیتے تو تسلی کی تسلی ہو جاتی بات کی بات بن جاتی ان کی تسلی ہو جاتی آپ جھوٹ سے بچ جاتے۔ ابوبکر نعوذ باللہ اگر منافق تھے تو یوں سمجھ جاتے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مومن اور اپنا رفیق سمجھتے ہیں اور اگر مومن تھے اور پھر مرتد ہو گئے تو اپنے کلام میں سچے رہتے خدا کی طرف بھول چوک کا احتمال نہ ہوتا کیونکہ جب تک وہ مومن رہے جب تک اللہ تعالے بھی ان کے ساتھ رہے۔ جب ان کے دل سے ایمان نکل گیا۔ خدا نے بھی ان کی ہمراہی چھوڑ دی۔

لفظ صاحبہ سے متعلق لطیف و دقیق تشریح اور صحابی و صاحب کا مفہوم | اس تقریر کے بعد ایک تنبیہ پر خاتمہ کرتا ہوں۔ اتنا یاد رہے کہ شاید بعضے عقل کے دشمنوں کو یہاں یہ خلجان پیش آئے۔ کہ کلام اللہ میں یوں ارشاد ہے

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ۔ | یعنی نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس کی زبان وہی تھی جو اس کی قوم کی زبان تھی

سو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی موافق اس قاعدہ کے عرب کے محاورہ میں گفتگو کرتے ہوں گے اور چونکہ اس بات کی علت یہ معلوم ہوتی ہے کہ تفہیم مطالب میں فرق نہ ہو تو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ کلام اللہ بھی عرب کے محاورے میں ہو اور یہ ظاہر ہے کہ صاحب عربی زبان میں فقط بمعنی ہمراہی ہے اس کو صحابی کے ہم معنی سمجھنا ایک طرح کی ناانصافی ہے کیونکہ صحابی تو اصطلاح شرع میں اس شخص کو کہتے ہیں کہ ایمان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھوڑی دیر یا بہت دیر رہا ہو اور بعضے علماء کا یہ مذہب ہے کہ طول صحبت بھی شرط ہے بہر حال ایمان داخل مفہوم صحابی ہے سو لفظ صاحب اول تو اصطلاح میں معروف نہیں۔ بلکہ اصطلاح شرع میں لفظ صحابی مستعمل ہوتا ہے دوسرے مسلمنا کہ صاحب بھی مستعمل ہو لیکن کلام اللہ تو عرب کے محاورہ موافق اترا ہے اصطلاح کے موافق نہیں اترا تیسرے ہم نے مانا کلام اللہ سے ابوبکر صدیق کا صحابی ہونا بھی ثابت ہوا اور اس وجہ سے بدلالت التزامی ان کے ایمان کا بھی پتہ لگا مگر کوئی یہ تو بتلائے کہ اس آیت سے تا دم مرگ ان کا ایمان پر قائم رہنا کہاں سے نکلا۔ سو جو شخص ان کے ارتداد کا قائل ہو اس آیت سے اس کا الزام معلوم۔

صاحب بمعنی صحابی نہ ہو تو بھی کچھ قدح نہیں | جواب اس وہم کا یہ ہے ان کا ایمان اور پھر ایمان پر قائم دائم رہنا تو بایمائے کلمات طیبات اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ اور اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ اوپر مرقوم ہو چکا۔ حاجت تکرار نہیں پھر جب ایمان تو یوں ثابت ہوا اور ہمدمی اور مصاحبت لفظ صاحبہ سے ثابت ہوئی تو صحابیت میں کیا کسر باقی رہ گئی جس کا انتظار ہے اس صورت میں اگر صاحب مرادف صحابی بھی نہیں تو نہ ہو بمعنی اللفظ صاحب کا مشہور ہونا اور صحابی کا اصطلاح شرع میں مشہور ہونا تو باعتبار اس زمانہ کے ہے

اور اگر اس زمانہ میں بھی یوں ہی تھا تو یہ ایسا قصہ ہی جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنام محمد مشہور تھے اور حضرت عیسٰے علیہ السلام نے جو آپ کی بشارت دی تو احمد کے نام سے بشارت دی۔ چنانچہ سورۂ صف میں مذکور ہے القصہ جب دو لفظ مرادف اور ہم معنے ہوا کرتے ہیں گو ایک مشہور ہو مگر گہہ بے گاہ اس کی جگہ دوسرا لفظ بھی بول دیا کرتے ہیں، باقی یہ کہنا کہ کلام اللہ عربی محاورہ میں ہے اس کا کسے انکار ہی پر اس کے یہ معنے نہیں کہ جو لفظ کلام اللہ میں ہے اس کے وہی معنی مراد ہیں جو عرب کی زبان میں اس کے معنی تھے۔ صلوٰت زکوٰۃ صوم حج یہ جتنے اس قسم کے الفاظ ہیں سب کے سب اپنے معانی اس سے منقول ہیں اور اصطلاح شرعی مراد ہے سو ایسے ہی لفظ صاحبہ کو سمجھنا چاہیے

نقل معنی کی حقیقی صورت | اور قاعدہ کلیہ اس کا یہ ہے کہ جب کوئی رسول آتا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ نئے احکام لاتا ہے اور ایک کارخانہ ہی نیا ہو جاتا ہے اور اکثر ایسے نئے نئے مضمون پیش آتے ہیں کہ اس کو اور اس کے توابع کو ان کی تفہیم کی اکثر ضرورت پڑتی ہے مگر چونکہ وہ احکام اور وہ مفہلین پہلے سے معلوم نہیں ہوتے تو ان کے مقابلہ میں کوئی لفظ موضوع اس زبان میں نہیں ہوا کرتا ناچار آپ وضع کرنا پڑتا ہے لیکن ہر زبان کا دستور ہے کہ جب اس زبان کے مشاقوں کو کسی نئی وضع کی ضرورت ہوتی ہو تو پہلے ہی الفاظ مستعملہ میں سے کسی ایسے لفظ کو مقرر کر لیتے ہیں کہ اس کے معنئ اول سے نئے معنے کو کچھ مناسبت ہو۔ چنانچہ واقفان فن عربیت کو لفظ صوم صلوٰۃ کے دونوں معنوں قدیم اور جدید کے تصور سے یہ عقدہ اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔ سو ایسا ہی لفظ صاحب اور لفظ صحابی کو سمجھئے مگر چونکہ لفظ صاحب کے اصلی معنی کی تفہیم کی بھی اکثر ضرورت پڑتی ہے اور علیٰ ہذا القیاس اس لفظ کے معنے شرعی کی بھی اہل زبان کو اکثر ضرورت ہوتی ہے تو بایں لحاظ فرق کے لیے صاحب کو اکثر پہلے معنوں میں بولتے ہیں اور صحابی کو اکثر دوسرے معنوں میں گو باینہمہ صاحب دوسرے معنوں میں بھی اطلاق کیا جاتا ہے لیکن اضافت کے وقت چونکہ توہم التباس نہیں رہتا تو لفظ صاحب ہی کو اصطلاح شرع میں استعمال کرتے ہیں چنانچہ جو لوگ احادیث پر اور خطب ائمہ پر عبور رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں۔ القصہ اصطلاحات شرع سے کلام اللہ خالی نہیں بلکہ جو لفظ کہ شرع میں کسی معنے کے لیے مقرر ہے جب وہ کلام اللہ

یا حدیث میں پایا جائے گا تو معنی شرعی ہی مراد ہوں گے احتمال معنی اصلی کا کرنا محض سفاہت ہوگی صوم صلوات زکوٰۃ سے کلام اللہ میں معنی شرعی کے مقابل میں مستعمل ہوا ہے اور اس سے معنی لغوی مراد لینے درایت سے بہت دور ہیں اور سلمنا کہ لفظ صاحب سے جو صاحبہ میں ہے معنی شرعی مراد نہ ہوں تب عرفی معنے اس لفظ کے وقتیکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف ہو معنی شرعی کے مطابق ہوں گے کیونکہ کفار زمانہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں جو اہل زبان تھے جب اس لفظ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف کرتے تھے اور اس سے کسی کی طرف اشارہ کرنا مدنظر ہوتا تھا تو یہی معنے مراد لیتے تھے کہ فلانا شخص ہمارے ساتھ سے نکل گیا اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو لیا۔ اور ان کے زمرہ میں داخل ہو گیا ہمارے دین سے نکل بھاگا محمدی دین اختیار کر لیا۔ اس مضمون کا ماحصل علماء شیعہ فرمائیں کہ کیا ہوتا ہے۔ پھر جائے حیف ہے کہ کفار تک اس لفظ سے وقت اضافت یہی معنے سمجھتے ہوں حالانکہ ان کی اصطلاح نہیں۔ نہ سمجھیں تو حضرات شیعہ نہ سمجھیں محرم جانیں بزعم خود اچھا کرتے ہیں۔ کفار سے مطابقت اور موافقت تو آخر ممنوعات شرعی میں ہے اور یہ کیا ابھی تو شروع ہے رفتہ رفتہ کفار سے یہ خلاف پیدا کریں گے کہ برخلاف ان کے صوم و صلوٰۃ وغیرہ الفاظ سے بلکہ سارے کلام اللہ سے حتی المقدور کچھ اور ہی معنے سمجھا کریں گے اور ہم اس سے بھی درگذرے صاحب کے لغوی ہی معنے ہیں اور کسی طرح معنی شرعی کے مراد لینے کی گنجائش نہیں تب لفظ لَا تَحْزَنْ اور اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا کو کہاں کھوئیں گے صاحب کے لفظ سے نہیں ان دونوں سے ایمان ثابت ہو گیا چنانچہ اوپر مذکور ہو چکا بہر حال ان کا صحابی ہونا بطور اصطلاح شرع کے اس آیت سے ثابت ہو گیا

لفظ صاحبہ میں بہ نسبت لفظ صحابی زیادہ فضیلت ہے۔ | بلکہ ہمارے نزدیک اس صورت میں اور دُونی فضیلت ہو جائے گی۔ لفظ صاحب سے اصطلاح شرعی مراد ہوتی تو وہ بات ہرگز نہ ہوتی شرح اس کی یہ ہے کہ اس صورت میں صاحب کے لفظ سے جو ہمرہی مراد ہوگی تو اسی ہمرہی کی طرف اشارہ ہوگا جو اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ سے ثابت ہوتی ہے چنانچہ لفظ اِذْ جو اِذْ يَقُولُ میں ہے وہ پہلے اِذْ کا جو اِذْ هُمَا میں ہے بدل ہے مطلب یہ ہوا کہ یہ ہماری نصرت اس وقت ہوتی جب وہ دونوں غار میں تھے اور پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ہمراہی سے یوں کہہ رہے تھے اور یہ تو ظاہر ہے۔ کہ

ایسے وقت کی ہمراہی اسی کا کام ہے کہ اس سے زیادہ کوئی مخلص نہ ہو اور سچ بھی تو ہے۔ ابوبکر صدیق کی جانبازی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حق میں خاص کر اس وقت دشوار کی ہمراہی اور رفاقت ایسی نہیں کہ اس کا انکار کیا جائے۔ اگر خداوند کریم اس کی طرف اشارہ نہ فرماتے تب کچھ حاجت نہ تھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کی یہ رفاقت اور ان کا اخلاص ایسا شہرۂ آفاق ہوا ہے کہ ضرب المثل ہو گئے ہیں شیعہ زبان سے انکار کریں تو کیا ہوا دل میں ان کے بھی یہی ہے کہ ابوبکر صدیق کے برابر دنیا میں کوئی کسی کا رفیق نہیں ہوا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے رفیقوں میں کچھ ان کا رتبہ بڑھ کر نہیں دیکھتے نہیں بلکہ جس کی رفاقت اور اخلاص نہایت کو پہنچ جاتے ہیں تو عرف میں اسے شیعہ سنی ہندو مسلمان سب یار غار کہتے ہیں رفاقت میں یہ رتبہ کہ ضرب المثل اور مشبہ بہ ہو جائے بجز اس کے نہیں ہو سکتا کہ اوروں کی رفاقت کو ان کی رفاقت کے ساتھ ایسی نسبت ہو جیسے نور چہرہ کو نور قمر یا نور خورشید کے ساتھ نسبت ہو کون نہیں جانتا کہ کجا آفتاب کجا آدمی کا چہرہ۔ آدمی کیسا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو آفتاب کے نور سے لاکھوں درجہ کم اس کا نور رہتا ہے اس کے شرف کے لئے یہی بہت ہو کہ اس کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ ایسا ہی اوروں کی رفاقت اور دوستی کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رفاقت اور دوستی سے بمدارج کم سمجھنا چاہیئے ان کو یہی شرف بہت ہے کہ ان کے ساتھ اوروں کو تشبیہ دیتے ہیں اور جس کی رفاقت اور دوستی کی تعریف کرتے ہیں تو اس کو یار غار کہتے ہیں القصہ اس تقدیر پر وہ صحابہ میں بھی فرد اکمل ہوں گے اور کیوں نہ ہوں۔ زبان خلق نقارۂ خدا، ان کا یار غار ہونا اور صدیق ہونا سب عام و خاص پر روشن ہے دوست و دشمن سب ان کو اسی لقب سے پکارتے ہیں اب یہاں بس کیجئے۔

شیعوں کی طرف سے خلافت صدیقی پر نکتہ چینی مگر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اگر افضل بھی ہوئے تو کیا ہوا خلافت تو بظاہر علی مرتضی رضی اللہ عنہ ہی کا حق تھا کیونکہ وہ چچا کے بیٹے اور داماد تھے اور مشہور ہے کہ داماد بمنزلہ فرزند ہوتا ہے تو اس صورت میں خلافت بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اگر پہنچتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہنچتی ابوبکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کون ہوتے تھے جو خلافت دبا بیٹھے اور اس سے بھی قطع نظر کیجئے اپنے بعد ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ

کر دینا تھا وہ بھی نہ ہوا وصیت کی تو خلیفہ ثانی کے لئے کی۔

جواب سو اس توہم کا جواب اول تو یہی ہے کہ خلافت کو سلطنت پر قیاس کیجئے۔ تو البتہ یہی توہم پیدا ہوتا ہے لیکن اہل فہم پر پوشیدہ نہ ہو گا کہ خلافت نبوت ارکان دین میں سے بھی رکن عظیم اور سلطنت دنیا کے امور میں سے بھی نہایت درجہ کو قبیح پھر جب حقیقت دنیا اور دین ہی میں اتنا تفاوت ہو کہ اس سے زیادہ اور کیا ہو گا تو اس کے اعلے درجہ اور اس کے اعلے درجہ میں کچھ لگاؤ ہی نہ ہو گا جو ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جائے

ع۔ ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ہاں خلفائے انبیا کو اگر خلفائے علماء اور خلفاء فقرا پر قیاس کیا جائے تو البتہ قیاس کا موقع بھی ہے علم و فقر بھی امور دینی میں سے ہیں مگر یہ بھی سب جانتے ہیں کہ خلافت علم اور خلافت فقر میں یگانگت اور قرابت کی وجہ سے ترجیح نہیں ہوتی فضیلت اور کمالات کے باعث ترجیح ہوتی ہے چنانچہ لفظ خلافت ہی خود اس بات پر دلالت کرتا ہے اسلئے خلافت بمعنی نیابت ہے اور نیابت کا استحقاق اس کے لئے ہوتا ہے جو کہ منیب کا کام دے سکے اور اگر چند آدمی موصوف بایں صفت ہوں تو وہ ان میں مقدم ہو گا جس میں کمالات اور فضائل منیب اوروں سے زیادہ تر ہوں گے بموجب حضرت صدیق اکبر کی فضیلت مابعد انبیا کے سب پر ثابت ہو گئی تو پھر حضرت علی مرتضے رضی اللہ عنہ کے حق کے ہونے کے کیا معنے، ہاں یہ مسلّم کہ خلافت کی لیاقت حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی رکھتے تھے لیکن افضل پھر افضل ہے باقی رہا دبا بیٹھنا ہم پوچھتے ہیں کہ جب سب میں زیادہ استحقاق خلافت حضرت ابوبکر صدیق رضی ہی میں ہوا تو خلافت کو اگر دبا ہی لیا تو کیا بیجا کیا؟ اپنا حق تھا دوسروں کا حق چھینتے تو جائے گرفت بھی تھی۔ معہذا واقفان فن سیر جنکو حضرت ابوبکر صدیق کے خلیفہ ہونے کے قصے کی خبر ہے خود جانتے ہیں کہ انہوں نے خلافت خود دبائی تھی یا بجبر و اکراہ ان کو سر دھرنی پڑی۔ باقی رہا حضرت عمر کا خلیفہ کر دینا اس کا جواب بھی یہی ہے کہ خلافت میں قرابت کو مداخلت نہیں ورنہ حضرت فاطمہ زہرا اور حسنین رضی اللہ عنہم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مقدم تھے۔ رہا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا عورت ہونا امد علی ہذا القیاس حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا لڑکا ہونا موافق آئین سلطنت کچھ مانع جانشینی حضرت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نہ تھا سلطنت

ہیں بوقت ضرورت اکثر عورتوں اور لڑکوں کو قائم مقام کر دیتے ہیں کوادر ہی کوئی نگران حال رہتے
القصہ اگر حال نبوت مثل حال سلطنت دنیا ہے اور قرابت باعث ترجیح ہے تو حضرت علی رضی اللہ
عنہ پھر بھی مستحق نہ تھے نہ وقت وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کا حق تھا نہ اپنی خلافت
کے وقت اس وقت حق تھا تو حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا تھا اور اگر حال نبوت مثل حال سلطنت
نہیں اور قرابت کو اس میں کچھ دخل نہیں بلکہ افضلیت باعث تقدیم ہونی چاہیے تو پھر حضرت
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر کو خلیفہ کر دیا تو کیا بیجا کیا۔ کسی اپنے کو کر دیتے یا حضرت عمر انکے
نزدیک اوروں سے افضل نہ ہوتے تو البتہ جائے اعتراض تھی۔

بابِ

وعدہ خلافت و استخلاف

معہذا کلام اللہ سے بھی یہی نکلتا ہے کہ جو کچھ ہوا بجا ہوا اور یہی عین صواب تھا اگر یقین
نہ ہو تو یہ آیت چہارم موجود ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ
فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ
الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ
مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ
لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ
بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ

یعنی وعدہ کیا ہے اللہ نے بعضے ان لوگوں سے
جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور اچھے اچھے عمل کئے
البتہ ان کو زمین کا خلیفہ اور بادشاہ
بنا دے گا جیسا ان سے پہلوں کو اور ان کے لئے
اس دین کو جو ان کے لئے اللہ تعالے نے چھانٹ
رکھا ہے اور پسند کر رکھا ہے خوب جما دیگا اور انکو
بعد اسکے کہ اندیشہ اور خوف رہا کرتا تھا امن دے گا
کہ وہ پھر میری ہی عبادت کیا کرینگے اور کسی کو ذرہ
برابر عبادت میں میرا شریک نہ کرینگے اور جو لوگ
بعد اس نعمت کے کفران نعمت کریں اور ناشکری
کریں وہی ہیں اصلی فاسق طاعت سے نکلے ہوئے

اس آیت کا حاصل یہ ہوا جو کلام اللہ کو سمجھتے ہیں وہ تو سمجھتے ہی ہیں۔ اور جو نہیں سمجھتے وہ
ترجموں سے مطابق کر دیکھیں آج کل سینکڑوں ترجمے کلام اللہ ملتے ہیں کچھ کمی نہیں۔

آیۂ تمکین معتقدات شیعہ کے کسی طرح مطابق نہیں

اب میری سنیئے یہ وعدہ ہر کسی سے نہیں ہوا اس
زمانہ کے مومنوں سے ہوا ہے یعنی صحابہ سے ہوا ہے کیونکہ الَّذِيْنَ آمَنُوْا کے بعد مِنْكُمْ بھی
بڑھایا ہے۔ اس کا حاصل یہی ہوا کہ یہ وعدہ انہیں سے ہے کہ جو تمہارے زمانے میں مومن ہیں
پچھلوں کو اس لفظ کے ذکر کرنے سے اس وعدہ سے علیحدہ کر دیا ہے تو اب حضرت امام مہدی
کا تسلط روئے زمین پر اس وعدہ سے علیحدہ ہے اور پھر تس پر یہ وعدہ بھی اس زمانہ کے تمام
مومنوں سے نہیں ہوا بلکہ بعضے سے چنانچہ لفظ مِن جو مِنْكُمْ میں ہے اس کا محصل یہی ہے
بلکہ جب لفظ مِن ضمیر کے اوپر داخل ہوگا۔ اس کا یہی مطلب ہوگا یا ابتدا کے معنی ہوں گے۔ جو
اس جگہ ابتدا کے معنے کسی کے نزدیک بن ہی نہیں سکتے۔ تو بیشک بعض ہی کے معنی ہوں گے کیونکہ
بیان کیلئے تو فصحاء کے کلام میں ضمیر پر آتا ہی نہیں اور اگر بالفرض بفرض محال یوں ہی کہیں کہ مِن
یہاں بیان کے لئے ہے اور اس کا ہم ہرگز خیال نہ کریں کہ کلام اللہ خدا کا کلام ہے اور وہ بھی معجز
نظام کسی ایسے گنوار ہندوستانی کا نہیں کہ ہدایت النحو وغیرہ رسالے عربی زبان کے پڑھ کر عربی کی
ٹانگ توڑنے لگے تب بھی شیعوں کی مشکل ہی رہے گی اس صورت میں تمام صحابہ مراد ہونگے حتی
کہ خلفاء ثلثہ بھی اس لئے کہ جب تک تو وہ بھی مسلمان ہی تھے مرتد نہ ہوئے تھے اور اگر وہ منافقین
میں سے تھے اور کبھی مسلمان ہوئے ہی نہ تھے تب بھی وہ تو داخل ہی رہیں گے جو ان کے عقیدہ کے
موافق بعد وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مرتد ہوئے ہیں اور جو آیات مرتدین کے بیان میں
آئی ہیں شیعوں کے نزدیک ان کے حق میں وارد ہوئی ہیں اس صورت میں اول تو یہ لازم آئے گا
کہ جو جو مرتد ہو گئے ان سے اس بات کا وعدہ تھا کہ ان کے لئے دین پسندیدہ کو جما دینگے وعدہ
کر کے خدا نے خلاف وعدہ کیا کیونکہ اگر خدا دین کو جما دیتا تو پھر نفس اور شیطان سے کہیں اکھڑ سکتا
جو وہ مرتد ہو گئے۔ معہذا ان کے حال میں یوں بھی بیان فرماتے ہیں کہ جب ان سے یہ وعدہ پورا
ہوگا اس وقت وہ میری ہی عبادت کرینگے یہاں تک ذرہ برابر کسی کو میری طاعت میں شریک نہ
کرینگے یا یوں کہیئے کہ یہ بھی ایک وعدہ ہے اخبار نہیں بہرحال اس صورت میں لازم آئے گا کہ تادم

بازپسین وہ اسی حال پر تھے جن کے انعام میں یہ وعدہ ہوا تھا یعنی ایمان اور عمل صالح چنانچہ اہل فہم وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے یہی معنی سمجھتے ہیں کہ باعث اس وعدہ کا ایمان اور عمل صالح ہیں پھر نہ معلوم کہ باوجود ان سب باتوں کے وہ کیونکر مرتد ہوگئے دو حال سے خالی نہیں یا یوں کہو کہ خدا نے خلاف وعدہ کیا یا خدا سے آئندہ کی خبر میں غلطی ہوئی۔

جن سے وعدہ تھا ان کو تمکین ہی حاصل نہ ہوسکی لہٰذا وعدہ پھر بھی غلط نکلا

اور یہ سب سہی اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ سے وہ چار پانچ صاحب ہی مراد ہیں جو بزعم شیعہ بعد وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مسلمان رہے اور مثل دیگر صحابہ مرتد نہ ہوئے اس صورت میں مِنْ اگر مِنْكُمْ میں بیان کے لئے ہوگا تو بیشک ان سب کے ساتھ اس وعدہ کا پورا ہونا چاہیئے کیونکہ وہ سب صاحب اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے مسلمان ہولئے تھے حالانکہ ان میں سے یہ سب وعدے سوا حضرت امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ کے اور کسی کے لئے پورے نہیں ہوتے حضرت ابوذر غفاری اور سلمان فارسی اور حضرت بلال بلکہ حسنین رضی اللہ عنہم تک یہ بات نصیب نہیں ہوئی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا حال تو ظاہر ہی ہے اور حضرت امام ہمام سبط اکبر کا حال یہ ہے کہ چھ مہینہ کے لئے وہ خلیفہ تو ہوگئے پر چاہیئے ان کو کسی طرح کی تمکین دین حاصل ہوئی ہو ہرگز ظہور میں نہیں آئی۔ خاصکر شیعوں کے نزدیک کیونکہ امیر معاویہ جو ان کے نزدیک بالاتفاق کفار اور منکرین امامت ائمہ میں سے ہیں تمام خلافت پر غالب اور مستولی تھے اور پھر امن تو ہرگز میسر ہی نہیں آیا نہیں تو خلافت ہی کیوں ان کے حوالہ کرتے اور کیوں ساری عمر تقیہ میں گذارتے اور حضرت علی مرتضے رضی اللہ عنہ کو بھی سنیوں کے نزدیک خلافت اور تمکین کچھ حاصل تھی شیعوں کے نزدیک تو ہرگز حاصل نہیں کیونکہ دین شیعہ اس زمانہ میں بھی مخفی ہی رہا اور حضرت کو تقیہ ہی کئے بنی۔ شیخین کی تعریف ہی کیا کئے یہ کبھی نہ ہوا کہ کھل کھیلیں اور بے کھٹکے ہو کر خلوت جلوت میں برابر یکساں گذاریں چنانچہ اس کی سند آگے انشاء اللہ تعالیٰ معلوم ہوجائیگی۔ اور علے ہٰذا القیاس امن موعود یعنے کفار کے شر سے حضرت امیر کو بھی بطور شیعہ حاصل نہیں ہوا وہی امیر معاویہ ہمیشہ تنگ کرتے رہے اور آپ کے ہاتھ سے اکثر ملک نکال لیا بہرحال سبے اگر وعدہ ہو تو کلام

بالکل لغو ہوجائے گا۔

استخلاف بمعنی توطن کسی طرح موزوں نہیں

اور اگر مِنْ کے بیانیہ ہونے کے ساتھ استخلاف کو بھی بمعنی توطن لیجئے جیسا کہ بعض علماء شیعہ نے تاویل کی ہو اور بمعنی تسلط نہ لیجئے تو قطع نظر اس کے کہ مِنْ کا ضمیر پر بیانیہ ہونا خلاف استعمال عرب ہے اول تو یہ مشکل ہے کہ استخلاف کے ساتھ جب لفظ فِي الْاَرْضِ ہوتا ہے تو تسلط ہی کے معنے مراد ہوتے ہیں دوسرے اس صورت میں قید وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ محض بے معنی ہو جائے گی زمین میں توطن تو صالح اور فاسق کو برابر حاصل ہوتا ہی بلکہ فساق کو بوجہ احسن بلکہ اٰمَنُوْا کی قید بھی بیکار ہی نظر آتی ہے کیونکہ کفار کے توطن میں کیا کمی ہے القصہ ان لغویات سے کلام اللہ کی تفسیر کی جاتی ہے یہ نہیں جانتے کہ لغو کلام کا کلام اللہ میں ہونا منجملہ محالات ہے۔

استخلاف بمعنی تسلط ہے بدلالت فی الارض

اور بعضے علماء شیعہ بہت کوشش کرکے یہ بات نکال کر لائے ہیں کہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے حضرت امیر مراد ہیں اور جمع کا صیغہ تعظیم کے لئے ہے یا حضرت امیر اور ان کی اولاد مراد ہیں مگر ہم کہتے ہیں کہ قطع نظر اس بات کے کہ جمع سے واحد مراد لینا بے ضرورت بیجا ہے اور باوجودیکہ جمع کے معنی بن سکیں واحد کے معنی مراد لینے اہل سخن کے نزدیک بالقطع ممنوع ہے شیعہ اس کا کیا جواب دینگے کہ تمکین دین اور زوال خوف تو کسی کو بھی میسر نہیں آیا اس لئے ضرور ہوا کہ مِنْكُمْ کے مِنْ کو تبعیضیہ قرار دیجئے اور استخلاف سے تسلط مراد لیجئے مگر چونکہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا جمع ہے تو کم سے کم تین تو ہونے ضرور ہوئے اور زیادہ ہوں تو فبہا۔

القصہ ابتداء اس آیت کے اتنی بات نکلی کہ صحابہ سے خداوند کریم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ تم میں سے کم سے کم ایسے تین شخصوں کو کہ وہ ایمان اور عمل صالح رکھتے ہوں گے ضرور ہم خلیفہ بنا کر روئے زمین کو انکے تسلط میں کردینگے اور اس دین کو جو علم الٰہی میں اس سے بہتر کوئی دین نہیں اور خدا نے ازل سے انہیں کے لئے چھانٹ کر رکھا ان کے واسطے جمادیں گے کہ ان کے جیتے جی اس میں رخنہ نہ پڑے گا اور ان کے خوف و ہراس کو کہ جو کفار سے رکھتے تھے بالکل امن اور اطمینان سے بدل دینگے پھر بعد اس کے یا تو وعدہ میں داخل ہے یا فقط بطور اخبار بالغیب کے

بیان کرتے ہیں کہ وہ باوجود ان خرخشوں کے جو ایسی خلافتوں کو لازم ہیں ہرگز عبادات میں سستی نہ کریں گے اور پھر وہ عبادت بھی ایسی اخلاص کی ہوگی کہ ہرگز اس میں بوئے شرکت اور ملاوٹ ریا کا نہ ہوگا

آیت استخلاف کی صحیح تفسیر

اب اس کمترین کی التماس حضرات شیعہ کی خدمت میں یہ ہے کہ وعدہ الٰہی میں تو تخلف ہو ہی نہیں سکتا سو جن کے ساتھ اس وعدہ کا ایفا ظہور میں آئے وہی مصداق ان اوصاف مذکورہ کے ہوں گے اور وہ بیشک بشہادت خداوندی ایمان کامل اور اعمال صالح رکھتے ہوں گے بلکہ سب اقران وامثال میں ان دو باتوں میں بڑھے ہوئے ہوں گے کیونکہ جب ایمان اور عمل صالح کے انعام میں یہ نعمتیں ملی ہیں تو انہیں کو ملی ہوں گی جن کا ان دو کمالوں میں نمبر اول ہو گا ورنہ نعوذ باللہ خدا کے یہاں بھی بڑا اندھیر ہے کہ استحقاق کسی کا ہو اور انعام کسی کو مل جائے سنیوں کے طور پر تو خدا کو اختیار بھی ہی کہ کسی کا حق کسی کو دیدے لیکن اسکی حکمت کی شان یہی ہے کہ جس چیز کو کسی کے لائق دیکھے اسے ہی دے اور یہی معنے ہیں اس کے کہ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا اور اس آیت کے معنی بھی محققین کے نزدیک یہی ہو سکتے ہیں۔ اَعطیٰ کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی۔ یعنی ہر چیز کو اسی کے مناسب طور پر پیدا کیا پھر آئندہ مناسب ہی مناسب کاموں کی انہیں سوجھائی لیکن شیعوں کے نزدیک خدا کو اختیار نہیں کہ کسی کا حق کسی کو دیدے اس لئے کہ ان کے نزدیک خدا پر عدل واجب ہے اس صورت میں ممکن ہی نہیں کہ جن کو خدا نے خلیفہ بنایا وہ اوروں سے خلافت کے استحقاق میں کم ہوں بلکہ ان کا فائق ہونا استحقاق خلافت میں ضرور پڑا۔

نہ صرف استحقاق خلافت بلکہ ترتیب خلافت کا پتہ بھی اس آیت سے چلا

اور نیز اسی تقریر سے یہ بھی نکل آیا، کہ ان میں سے جو ایمان میں اور عمل صالح میں دوسروں سے بڑھ کر ہو گا وہ اس انعام میں مقدم رکھا جائے گا کیونکہ تقسیم انعام کی خوبی یہ ہے کہ اول نمبر والے کو اول دیں مگر چونکہ یہ انعام خلفائے راشدین پر ہوا اور یہ وعدہ خلفائے اربعہ کے ساتھ بترتیب معلوم وفا میں آیا تو بشہادت خداوندی معلوم ہوا کہ یہ اصحاب اربعہ ایمان اور عمل صالح میں اوروں سے بڑھ کر تھے اور وہ بھی اسقدر کہ ان کے ہوتے قابلیت اس انعام خاص کی ان کے سوا کسی میں نہ تھی اور باہم ترتیب

خلافت ایک دوسرے سے ایمان اور عمل صالح میں مقدم تھا اول اول اور دوم دوئم اور سوئم سوئم اور چہارم چہارم

آیت استخلاف کا مصداق صرف خلفاء اربعہ ہیں

اور بعد اس کے ہرچند حضرت سبط اکبر امام ہمام امام حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ خلفاء راشدین میں معدود ہیں مگر ان کو جو خلافت پہنچی تو اس وعدہ کے سبب نہیں پہنچی کیونکہ انکو قبل نزول اس آیت کے کسدن خوف ہوا تھا وہ زمانہ انکے لڑکپن کا تھا دشمنوں سے اندیشہ بڑوں کو ہوتا ہے لڑکوں کو نہیں ہوتا بلکہ وصول اس نعمت کا ان تلک زائد از قدر وعدہ تھا اسی لیے ان کی خلافت کے لئے تمکین اور جماؤ لازم نہ ہوا باقی رہے امیر معاویہ ہرچند ان کو بظاہر تمکین میسر آئی لیکن حقیقت میں وہ تمکین دین نہ تھی تمکین ملک و سلطنت تھی چنانچہ واقفان فن سیر پر پوشیدہ نہیں کہ خلفاء اربعہ کے اطوار اور انداز اور امیر معاویہ کے اطوار اور انداز میں زمین آسمان کا فرق تھا ان کی گزران فقیرانہ اور زاہدانہ تھی اور امیر معاویہ کا طور ملوک کا سا تھا اس لئے اہل سنت ان کو باوجودیکہ صحابی سمجھتے ہیں خلفا میں نہیں گنتے ملوک میں شمار کرتے ہیں لیکن ملوک ملوک میں بھی فرق ہی ایک نوشیرواں تھا ایک چنگیز خاں۔ سو یہ ہرچند ملوک میں سے تھے لیکن اس کے یہ معنے ہیں کہ خلفاء راشدین کے مقابلے میں دنیا دار معلوم ہوتے تھے۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اور انبیا کے مقابلہ میں مالدار معلوم ہوتے ہیں نہ یہ کہ ظلم و ستم کے روادار تھے غربا کے حق میں ستمگار تھے ان کا حلم اور رعایا پروری اور دلجوئی خلائق شہرہ آفاق ہی معہذا ایسا ان لوگوں میں سے نہیں کہ جن کو قرار واقعی کفار سے کبھی خوف ہوا ہو، یہ بات فقط مہاجرین اولین کے حق میں صادق آتی ہے نہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو یہ بات پیش آئی کہ امیر معاویہ کو اور مہاجرین اولین میں سے بھی جیسا خوف خلفاء اربعہ کو ترتیب ہوا ہے اور کسی کو پیش نہیں آیا چنانچہ کتب تاریخ سے خوب واضح ہے یہی وجہ معلوم ہوتی ہی کہ انعام مذکور خاص انہیں کو ملا اور یہ وعدہ انہیں کے ساتھ ظہور میں آیا کیونکہ یہ خوف اصل سے بوجہ ایمان اور عمل صالح تھا کفار کی دشمنی کی بنا۔ دیکھیے وہ انہیں دو باتوں پر تھی پھر جس میں ایمان اور عمل صالح زیادہ ہو گا دشمنی کفار بھی اسی کے ساتھ زیادہ ہو گی خوف کفار بھی اسی کو زیادہ ہو گا دوسرے محبت اور اخلاص جو ایمان اور عمل صالح کا خلاصہ ہیں خوف ہی کے وقت معلوم ہوتے ہیں اور خوف ہی سے پرکھے جاتے ہیں تو جس کو اس قسم کا خوف زیادہ ہو گا اسی

ہیں ایمان لاؤ [illegible] کفار مہاجرین اولین کو ہوا تھا حضرت امام
ہمام امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو کفار سے کیا اندیشہ تھا حضرت
امام ہمام رضی اللہ عنہ اس زمانہ تک لڑکے تھے امیر معاویہ جب تک مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے۔

آیت استخلاف کی بنیاد مہاجرین کی قربانیاں ہیں اس آیت کے مضامین میں غور کیجیے تو یوں معلوم ہوتا ہے
کہ باعث اس وعدہ کا فقط یہ ہوا ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصًا مہاجرین اولین
نے باوجود بے سروسامانی اور ذلت اور خواری کے جو ابتدائے اسلام میں تھی ایک جم غفیر اور گروہ اعظم
کفار کی مخالفت محض خدا کی رضامندی اور دین کی ترویج کے لئے اختیار کر کے اپنی جانیں جلائیں
اوران کو اپنا دشمن بنا کر طرح طرح کی ایذائیں ان کے ہاتھ سے اٹھائیں سالہا سال خوف و خطر میں
گذارے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ نوبت اس کی آئی کہ گھر سے بے گھر ہوئے زن و فرزند سب کو چھوڑ کر
جلاوطن ہوئے پھر اس پر بھی چین نہ ملا نوبت قتل قتال کی پہنچی مدتہائے دراز تک کفار نگونسار
فوج کشی کرتے رہے اور جو چڑھ کر نہیں آئے تو مسلمانوں کے فکر سے تو خالی بھی نہیں رہے اسمیں
بہت سے مہاجرین میں سے اور نیز ان کی ہمراہی میں بہت سے انصار شہید ہوئے جب خداوند
کریم عالم الغیب والشہادت کو ان کا کامل امتحان ہو گیا تو رحمت الٰہی کو ان کی اس جان کاہی
اور جان گدازی پر جوش آیا لازم پڑا کہ ان کی اس جاں نثاری اور جانبازی کی مکافات اس دار
دنیا میں بھی کی جائے اس لیے جس جس قسم کی کلفتیں انہیں پیش آئی تھیں اس کے مقابل کی
نعمتیں اُن کو ملیں اور اس کے مکافات کی راحتیں ان کو عطا ہوئیں تسلط کفار جو ان کے حق میں
باعث تمام آزار اور سبب ہمہ تکلیفات تھا استخلاف سے مبدل ہوا کفار کے تسلط کے باعث جو
نماز روزہ ادا نہیں کر سکتے تھے اور ذکر خداوندی سے ممنوع تھے اور اس سبب سے حسرتہا گوناگوں
دل میں رکھتے تھے بلکہ باعث جلاوطنی کا بھی حقیقت میں یہی تھا اس کے عوض میں تمکین دین ملی
اور خوف کے عوض میں امن عطا ہوا اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ اہل بیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ
آلہ وسلم ہرچند شرف گوناگوں رکھتے ہیں لیکن فقط اس شرف کو استحقاق خلافت میں دخل نہیں
یہ اس جان کاہی اور جان گدازی کا ثمرہ ہے جس کا مذکور ہوا۔

آیت مذکورہ سے سنت خلافت قریش کا راز بھی کھل گیا اور خلافت کے مخصوص ہونے کی وجہ بھی نسبت

قریش کے معلوم ہو گئی یعنی یہ جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ خلافت حق قریش ہے انصار کو اس
میں کچھ دخل نہیں وجہ اس کی یہی ہے کہ خلافت حقیقت میں انعام اور مکافات میں مہاجرین کی
جانفشانیوں کے ملی ہے چونکہ مہاجرین قریش میں سے ہیں اس لئے انہیں میں منحصر رہنی چاہیے ہاں جو
کہ انصار اور اعوان خلفاء ہوا کرتے ہیں جیسے قاضی وغیرہ وہ البتہ نصرت کے صلہ میں انصار میں سے
ہونے چاہئیں اور یہ بھی مکرر روشن ہو گیا کہ حضرت امام حسن رض اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ
عنہما کو جو خلافت ملی ہے۔ تو وہ خلافت نہیں جو وعدہ کے سبب ملی ہے اور نیز یہ بھی اہل
فہم و انصاف پر صاف روشن ہو گیا کہ ان کے زمانے میں ان کے ہاتھوں سے جو کچھ دین کے
مقدمہ میں ظہور میں آیا اور اس نے رواج پایا جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ
زہرا رضی اللہ عنہا کو فدک کا نہ دینا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا متعہ کا منع کرنا اور تراویح کی تاکید اور
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جمعہ میں ایک اذان کا بڑھا دینا وہ سب منجملہ دین پسندیدہ اور مصداق
مضمون ارتضٰی لھم ہے علیٰ ہٰذا القیاس جس مسئلہ پر ان کے زمانہ میں ان کی وجہ سے اجماع
و اتفاق ہو گیا وہ لاریب حق و صواب ہے اس سے جو منحرف ہے وہ دین پسندیدۂ خداوندی سے
منحرف ہے اور جو اس کا منکر ہے وہ حق کا منکر ہے۔

آیت مرقومہ حضرت فاروق کی نزاہت کی دلیل ہے اور نیز قطع نظر اس کے کہ جملہ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ حقیقت خلافت خلفاء ثلثہ پر بوجہ
احسن دلالت کرتا ہے اور شیعوں کے اس توہم کو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو ایام مرض
وفات میں کاغذ قلم دوات منگایا تھا اور حضرت عمر رض نے نہ آنے دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ
کی خلافت کے فرمان ہی کے لکھنے کو منگایا تھا بیخ و بنیاد سے اکھاڑتا ہے جملہ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ
دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ سے بھی اہل فہم کے نزدیک یہ توہم زائل ہو گیا کیونکہ خلافت
خلفاء ثلثہ جب خلافت موعودہ ہوئی تو ان کی خلافت کی تمکین بھی منجملہ تمکین دین پسندیدہ
ہو گی، ہاں اگر خلافت امور دینی میں سے نہ ہوتی تو البتہ اس استدلال کی گنجائش نہ تھی سو
شیعہ اس کا انکار نہیں کر سکتے ورنہ حضرت امیر اور ان کی اولاد رضوان اللہ علیہم اجمعین کو طالب
دنیا کہنا پڑے گا نعوذ باللہ منہا غرض یہ طعن اور نیز اور بہت سے مطاعن جو شیعی اور خارجی

بسبب اپنی تیرہ درونی کے حضرات خلفاء راشدین پر کرتے ہیں مندفع ہو گئے اگرچہ طعن اور سوا اس کے اور مطاعن بنظر غور اہل بصیرت کے نزدیک معترضوں کی تیرہ درونی سے پیدا ہوتے ہیں چنانچہ دربارہ فدک تو اوراق مابعد سے انشاء اللہ یہ حال واضح ہو جائے گا تفصیل اس اجمال کی بہ نسبت جملہ مطاعن کے اس جا پر اگر بے موقع اور بے جا نہ ہوتی تو بقدر گنجائش وقت درج اوراق کرتا مگر چونکہ کاغذ دوات قلم کے نہ آنے دینے کا طعنہ بھی بزعم شیعہ کلانترین مطاعن خلفاء راشدین ہے تو بنظر تسکین خاطر بعض بنی نوع اگرچہ اس بحث میں بے موقع ہے مختصر مختصر عرض کرتا ہوں تاکہ اس بڑے طعن کا اندفاع موجب اندفاع دیگر مطاعن صغیرہ ہو جائے۔

| فرمان نبوی کی تعمیل نہ ہوسکنے کے اسباب | حضرت من اول تو کسی روایت میں یہ نہیں کہ کاغذ

قلم دوات کے آنیکے مانع اول حضرت عمر ہی تھے البتہ جب سرور کائنات علیہ وعلی آلہ الصلوات و التسلیمات نے کاغذ دوات قلم منگانیکو فرمایا تو حضرت عمر بھی اس محفل میں موجود تھے حاضرین مجلس کی رائے اس وقت مختلف ہوئی کسی نے کہا کہ امتثال امر ہی کیجئے کوئی بولا کہ اس شدت مرض میں یہ تکلیف نہ دیجئے۔ اس ردّ و کد میں ایک شور برپا ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے میں یہ آیا کہ یہ ارشاد مربیانہ اور مشفقانہ ہے بطور ایجاب نہیں جس کی تعمیل واجب ہو کیونکہ خداوند کریم اس سے پہلے فرما چکا ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ

یعنی حجۃ الوداع کے دن خداوند کریم کی طرف سے یہ بشارت آئی کہ آج کے دن میں نے اپنے دین کو تمہارے لئے پورا کر دیا اور تمام کر دی میں نے تم پر اپنی نعمت

پھر جب خداوند کریم دین کو کامل کر چکا ہو تو اب یہ امر کسی نئے امر دینی کے لکھوانے کے لئے تو نہیں ہی ہو نہ اسی کی تفصیل ہو گی سو یہ بات چنداں ضروری نہیں جو اس امر کی تعمیل واجب ہو بلکہ بوجہ شفقت کاملہ آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں سو جب باوجود شدت مرض کے آپ نے ہمارے لئے یہ تکلیف گوارا فرمائی تو کیا اس کی مکافات یہی ہو کہ ہم بھی آپ کے لئے اس تکلیف کو

گوارا کریں بلکہ مقتضے ادب یہی ہے کہ آپ کے فرمانے کا کچھ خیال نہ کیجئے اور اس تعدہ کو جانے دیجئے اور سچ بھی تو ہے اگر کسی کا باپ بھوک کی شدت میں آپ تو نہ کھاتے اور بیٹے کو بوجہ شفقت اپنے حصہ کے کھانے کو فرماتے تو کیا مناسب ہے کہ فرزند عاقل دیدہ دانستہ پدر مہربان کو بھوکا چھوڑ کر سب نگل جائے بلکہ ایسے وقت میں مقتضے ادب یہی ہے کہ والد مہربان کا کہنا نہ مانے اور اس نافرمانی ہی کو اپنی سعادت جانے غرض حضرت عمر نے بوجہ مذکور اور نیز بایں غرض کہ کسی طرح یہ شور موقوف ہو جائے حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ کہا یعنی کافی ہے ہم کو قرآن شریف پھر اس تکلیف کے دینے کی کیا ضرورت؟ اور اگر کسی کتاب نادر الوجود کی کوئی ایسی روایت جو حضرت عمر کے مانع اول ہونے پر اس طرح دلالت کرے کہ اس میں گفت و شنید کی گنجائش باقی نہ رہے کوئی شیعہ پیش بھی کرے تو قطع نظر اس کے کہ وہ روایت واقعی صحیح ہے۔ کوئی جعلسازی نہیں تب بوجہ مذکور کوئی گرفت کی بات نہیں بہرحال منشاء اس اعتراض کا قلت فہم و فراست اور نقصان عقل و درایت ہے اور انجام کو دیکھا تو حضرت عمر کی رائے ٹھیک تھی۔ آخر جب یہ شور ہوا تو خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس تمام مجمع کی نسبت یہ ارشاد فرمایا کہ یہاں سے کھڑے ہو جاؤ اگر کاغذ دوات قلم کے منگانے کا ارشاد پیام خداوندی ہوتا اور ضروری اور واجب ہی ہوتا تو مکرر آپ تاکید فرماتے اور علے ہذا القیاس اگر یہ شور جیسا حضرت عمر نے سمجھا موجب آزار خاطر حضرت سید الابرار صلے اللہ علیہ وسلم نہ ہوتا تو کھڑے ہو جانے کو نہ فرماتے۔

| حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کا وزن | بلکہ یوں کہئے کہ جیسے اور بہت مواقع میں باوجود رسول اللہ صلے اللہ

علیہ وسلم کی مخالفت کے حضرت عمر کی رائے خدا کی مرضی کے موافق نکلی ہے اور اسی وجہ سے ان مواقع میں ان کی رائے کے موافق وحی آئی اگر وحی نہ آتی تو بوجہ مخالفت رائے نبوی اہل اسلام کے نزدیک حضرت عمر سے برا کوئی نہ تھا یہاں بھی حضرت عمر کی رائے خداوند کریم علیم حکیم کی مرضی کے موافق تھی ورنہ جیسے کفار کی تکذیب کے وقت وحی آسمانی شاہد صدق رسول ربانی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوتی تھی یہاں بھی وحی آتی اور آپ کی رائے کی تصدیق ہو جاتی، ہاں اتنی کمی رہ گئی کہ بعد اس واقعہ کے حضرت عمر کی تصدیق کے لئے وحی نازل نہ ہوئی غالباً پندرہ سولہ واقعہ کی تصدیق کو کافی سمجھ کر ایک اس واقعہ میں بغرض تصدیق عمری وحی نازل نہ فرمائی اور نیز یہ واقعہ بدلالت آیت

مذکورہ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ چنداں ضروریات دینی میں سے نہ تھا چنانچہ مذکور ہوا۔ اور یاں ہمہ آخر زمانہ حیات نبوی میں جو وقت کمال توجہ الی اللہ اور استغراق تام کا ہے کیا مناسب تھا کہ ایسے امور غیر ضروریہ کی طرف اپنے نبی کو مصروف کیا جائے بایں وجہ غالباً اس واقعہ میں وحی ربانی جو مصدق عمر اور شاہد حقیقت قول خلیفہ دوئم ہو جائے نہ آئی ورنہ یہ توہمات خود مندفع ہو جاتے بالجملہ یہ حضرت عمر کا بولنا تو عقل سلیم کے نزدیک قابل تعریف ہے اور اس پر بھی بوجہ تیرہ درونی اور بغض ذاتی کے اگر کوئی برا کہے جائے تو اس کا جواب بجز اس شعر کے اور کچھ نہیں

؎ چشم بداندیش کہ برکندہ باد عیب نماید ہنرش در نظر

کاغذ قلم دوات نہ لانے میں سبھی شریک تھے صرف فاروق کیوں؟

اور اگر ارشاد نبوی کو در بارہ طلب کاغذ و قلم و دوات شفقت پر محمول کرنا کسی تعصب کو بحکم المرء یقیس علیٰ نفسہٖ کے تعصب نظر آئے اور باوجود اس توضیح کے اس ارشاد کو ارشاد وجوبی ہی کہے جائے تو یہ اعتراض فقط حضرت عمر ہی پر نہ ہوگا بلکہ اس کے یہ معنے ہوئے کہ تمام اہل بیت اور تمام صحابہ اس جرم میں حضرت عمر کے شریک نکلے اور وہ قصہ ہو گیا مرگ انبوہ جشنے دارد بلکہ اہل بیت اس تقصیر میں اول درجہ کے تقصیر دار ہوئے کیونکہ اول تو مریض کی امر و نہی کے مخاطب اس کے گھر والے ہی ہوا کرتے ہیں دوسرے حضرت عمر تو غیر تھے عیادت کے لئے ساعت دو ساعت کے لئے آگئے تھے اگر ان کی نشست کے وقت کچھ اندیشہ تھا تو جب وہ اٹھ کھڑے ہوئے پھر کون مانع تھا آخر اس قصے کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کئی روز زندہ رہے بلکہ غور سے دیکھئے تو درصورتیکہ اس ارشاد کو ارشاد ایجابی اور امر وجوبی کہیئے جیسے شیعوں کا جی چاہتا ہے تو پھر جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی نعوذ باللہ اس جرم کے شریک ہوئے کیونکہ جس قدر ہم پر اطاعت خدا و رسول واجب ہے اس سے زیادہ نبی پر تبلیغ احکام واجب ہے چنانچہ آیت

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ	اس پر دلالت کرتی ہے اس لئے کہ حاصل اس آیت مذکور کا یہ ہے کہ اے رسول پہنچا دے جو کچھ تیری طرف نازل کیا گیا ہے اور اگر یہ کام نہ کرو گے تو پھر تم نے کوئی پیغام بھی خدا کا نہ پہنچایا۔ انتہی

اور ادھر سب لے سنا ہوگا کہ نزدیکاں را بیش بود حیرانی چنانچہ اشارات کلام اللہ و حدیث بھی اس پر شاہد ہیں تو اب لاجرم یہی کہنا پڑے گا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر تبلیغ احکام اس سے زیادہ واجب ہے کہ ہم تم پر تعمیل احکام اور ادھر یہ بھی ظاہر ہے کہ تبلیغ جب ہی کہہ سکتے ہیں کہ احکام کا بیان بھی کیا جاتے اتنی بات کو کہ کاغذ دوات قلم لاؤ میں تمہیں وہ باتیں لکھ دوں کہ اگر ان پر عمل کرو تو گمراہ نہ ہو تبلیغ حکم کہنا اسی کا کام ہے جو برائے نام ہی انسان ہے اور عقل سے محروم اور دانش سے ناکام ہے الغرض اس صورت میں حضرت عمر سے اگر تقصیر بھی ہوئی تو اتباع نبوی پھر بھی ہاتھ سے نہیں گیا اگر حضرات شیعہ جناب سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوات والتسلیمات اور اہل بیت کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی نسبت اس تقصیر کو نعوذ باللہ منہ تجویز کر سکیں تو ہمیں بھی حضرت عمر کے اس قدر گناہ گاری کا چنداں رنج نہیں اول تو مرگ انبوہ جشنے دارد۔ دوسرے

؎ شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتے گو مشت خاک ماہم برباد رفتہ باشد

شیعوں کو یہ خواب کہاں سے آگیا کہ منشاء نبوی تحریر مسئلہ خلافت حضرت علی تھا

معہٰذا دوات قلم کاغذ کے منگانے سے یہ کہاں لازم آگیا کہ فرمان خلافت حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ ہی تحریر فرماتے ظاہر عبارت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تو اس کو تقاضا کرتا ہے کہ دین اسلام کی باتوں کا خلاصہ جو تمام ارکان کی جڑ ہو تحریر فرماتے یا احکام دین میں سے وہ احکام کہ ان کی تعمیل کو تمام احکام کی تعمیل لازم ہو لکھواتے چنانچہ آپ کا یہ فرمانا کہ ان پر عمل کرو گے تو گمراہ نہ ہو گے اس بات پر گواہ ہے سو کسی ایک کی خلافت معین کرنے میں یہ بات ظاہر ہے کہ حاصل نہیں ہوتی یوں تاویلیں گھڑنے کو ہر کسی کے منہ میں زبان ہے اور اگر بتکلف اس مضمون کو حضرت علی کی خلافت کو لازم بھی سمجھتے تو پھر کب تک؟ حضرت علی کے بعد پھر کچھ نہیں حالانکہ روایت کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ پھر کبھی گمراہی پیش ہی نہ آئے گی اور یہ بھی نہ سہی بپاس خاطر شیعہ ہم نے اس پر بھی خاک ڈالی اور اسی کو تسلیم کیا کہ فرمان خلافت کی تحریر ہی مدنظر تھی لیکن پھر بھی یہ کہاں سے نکل آیا کہ حضرت علی ہی کی خلافت کی تصریح کے لئے حضرت سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اضطراب تھا کہ بدلیل نقلی و عقلی فرمان خلافت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مرکوز خاطر حضرت سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم تھا نقل کی بات پوچھتے تو صحاح اہل سنت میں کچھ ایسا موجود ہے کہ حضرت سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم

خلفاء نعمت خلافت سے اصالۃً نوازے گئے اور دوسرے ان کے طفیلی تھے

مگر تنبیہ کے لئے اس قدر اور گذارش ہے کہ اس آیت میں اوّل کلمہ لَھُمۡ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اصل حقیقت میں دین پسندیدہ انہیں اشخاص کے لئے جمایا جائے گا جو خلیفہ بنائے جائینگے اور یہ نعمت عظمیٰ اولاً بالذات انہیں کو عطا ہوگی جو خلیفہ ہوں گے مقصود اصلی وہی محبوب ہوں گے اوروں کو وہ دولت اگر ملیگی تو انہیں کے تصدق ملیگی مگر استخلاف اور تبدیل خوف میں ان کا اصل الاصول ہونا عام فہم سمجھکر الفاظ موجودہ پر اکتفا فرمایا پر دین کا ایک کے لئے اصلی ہونا اور باقیوں کیلئے اُس کا تصدق ہونا چونکہ ایسا عام فہم نہ تھا کہ شیعہ بھی مان جائیں تو یُمَکِّنَنَّ کے بعد لفظ لَھُمۡ بھی بڑھایا غرض اُس عہد میں اور بھی اگر اُس دین پر ہونگے تو وہ انہیں کی جوتیوں کا صدقہ ہوگا اس سے یہ ثابت ہوا کہ تسلط اہل اسلام اور تمکین دین پسندیدہ اور ازالہ خوف اور تبدیل امن جو کچھ تھا سب کا سب اصل میں انہیں چار یار کے لئے تھا لیکن جیسے کسی امیر کی کوئی دعوت کرتا ہے تو اُس امیر کے اقربا اور اُسکے حشم خدم کی دعوت بھی اُس امیر کے طفیل میں کر دیتا ہے پھر بوجہ امیر مذکور کو کھلاتے پلاتے ہیں اُس کے اقربا اور حشم خدم کو بھی وہی کھلاتے ہیں فرق ہوتا ہے تو اصالت اور تبعیت کا اور اعزاز و اکرام کا ہوتا ہے ایسے ہی یہ نعمت عظمیٰ اور دولت جلیلہ خلافت وغیرہ بھی ہرچند اصل میں انہیں چار یار کے لئے ہیں لیکن انکے طفیل میں اس نعمت عظمیٰ سے تمام اصحاب بہرہ ور ہوئے جو صحابہ کہ کبھی غربا عرب اور فقرا صحابہ میں معدود تھے وہ بھی مناصب حکومت پر مامور ہوتے تھے اور کفار پر تحکم اور حکمرانی تو ہر کسی کو حاصل تھی ادنیٰ ادنیٰ صحابی کا ناز امرا اہل کتاب کو اٹھانا پڑا القصہ نعمت خلافت ہرچند بالاصالت چار یار ہی کے لئے تھی مگر سب ہی اُس میں شریک تھے اور ساری نعمتوں سے جو اس آیتہ میں مندرج ہیں صحابہ اور غیر صحابہ بطفیل خلفاء اربعہ حسب لیاقت بہرہ ور ہوئے اس میں صحابہ کو بمنزلہ اقربا سمجھئے اور اُن میں بھی ان کو جو وقت نزول اس آیتہ کے مشرف باسلام و ایمان ہوئے تھے زیادہ تر قریب سمجھئے پھر مہاجرین اولین

نے یہ ارشاد فرمایا کہ میرے جی میں تھی کہ ابوبکر کے لئے لکھدوں تاکہ کسی تمنا والے کو پھر تمنا باقی نہ رہے مگر نہ خدا کو سوا ابوبکر کے کسی کی خوشی ہے نہ مومنین اُن کے سوا کسی اور کے روادار انتہیٰ۔

فرمان نبی سے خلافت صدیقی کی طرف اشارہ سمجھا جائے تو عین قرین قیاس ہے

غرض اس روایت کا ماحصل اسی پر دلالت کرتا ہے کہ اگر لکھنے کا ارادہ تھا۔ تو ابوبکر صدیق کے لئے تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے نہ تھا اور عقل سے پوچھتے ہو تو سنئے کہ دستور کے موافق آپ کو غالبا یہ اندیشہ ہوگا کہ حضرت علی کو بوجہ قرابت شاید خیال جانشینی ہو۔ اور اُنکے احباب و اقارب اس باب میں ساعی ہوں تو اس صورت میں حق حقدار یعنی ابوبکر کو نہ پہنچے گا اور اس قسم کا خیال بہ نسبت ابوبکر اہل عقل کے نزدیک متصور نہیں نہ قرینہ ہے نہ احتمال وراثت ہی ہو تو حضرت علی ہی کی نسبت ہو بالجملہ اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پیچ و تاب تھا اور اس قدر اسکی مدافعت میں اضطراب تھا سو بحمد اللہ بزعم شیعہ آپ کا یہ خیال بھی راست ہوا حضرت علی رضی اللہ عنہ خواستگار خلافت رہے پھر اُس پر آپ کی پیشین گوئی بھی صحیح ہوئی خدا تعالیٰ کو اور مومنوں کو کو سوا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اور کوئی پسند ہی نہ آیا القصہ اگر لکھنے کا ارادہ تھا تو حضرت ابوبکر کے لئے تھا حضرت عمر کی شکایت کریں تو صدیقی کریں شیعیان حضرت علی کو کیا کام مگر وہ نقل ہے کہ بھوکے کو دو اور دو چار روٹیاں ہی سمجھ میں آتی ہیں اور بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر پڑتے ہیں کوئی بات کیوں نہ ہو حضرات شیعہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور اماموں کی امامت ہی نظر آتی ہے۔ خیر اس جگہ یہ بات اتفاقی تھی مطلب اصلی یہ تھا کہ جملہ وَلَیُمَکِّنَنَّ سے بالاجمال تمام مطاعن خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کا جواب نکلتا ہے اب یہاں بس کیجئے کہ خلافت خلفاء ثلثہ بوجہ احسن اس آیتہ سے ثابت ہوگئی اور ان کا فضل و کمال اور اُنکی بزرگی کما ینبغی اس آیت سے ظاہر ہوگئی ادھر سنیوں کے مذہب کی حقیت اور اُنکی حقانیت اور شیعوں کے خیال و گمان کا بطلان اور ان کے طریقہ کی مذمت بخوبی روشن ہوگئی۔

کو سب سے اقرب بلکہ بمنزلۂ حقیقی بھائیوں کے مقرر رکھئے اور تابعین کو بجائے اتباع اور خدام کے تصور کیجئے اس صورت میں یہ نعمت گو سب میں مشترک ہو گی لیکن اعزاز و اکرام میں درجہ بدرجہ فرق ہوگا۔

وَمَنْ كَفَرَ سے شیعہ کے کفران نعمت کی طرف اشارہ ہے جو اعجاز قرآنی ہے

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ خویش و اقارب اگر بطفیل امیر کے نعمت سے کامیاب ہوتے ہیں تو امیر کچھ ان سے خواستگار شکر گذاری یا طالب خدمت گاری نہیں ہوتا ہاں غلام اور خدام اور بمنزلہ برداروں کی طرف البتہ جو یہ نظر رہتی ہے سو ان میں سے قدر شناس اور عاقل اور سلیم الطبع ہوتے ہیں وہ خدمت گذاری اور شکر گذاری سے پیش آتے ہیں اور بد اصل اور ناقدر ہوتے ہیں وہ شکر گذاری تو در کنار الٹے اپنے آقائے نعمت اور وسیلہ راحت کی جڑ کاٹنے کے درپے ہوتے ہیں۔

سو اس نعمت عظمیٰ خلافت کا حال بھی یہی ہوا کہ ہرچند خلفاء اربعہ کے صدقہ میں اس زمانہ تک کے اہل اسلام کامیاب ہیں جس قدر دین کو وسعت اور شوکت ہوئی یا ابہے حقیقت میں سب انہیں کی خلافت کا پھول پھل ہے لیکن صحابہ کے زمانہ سے لیکر آجتک جیسے اس نعمت کے شکر گذار ہیں ویسے ہی اس زمانہ سے لیکر آجتک کافر نعمت بھی برابر چلے آتے ہیں مگر چونکہ علم الٰہی تو وقائع گذشتہ اور وقائع آئندہ کو برابر محیط ہے تو بطور اخبار بالغیب کے ان کافران نعمت کی طرف بھی اشارہ کرنا ضرور پڑا تاکہ خلفاء اربعہ کی بزرگی اور ان کے اعداء کی برائی قرار واقعی ثابت ہو جائے اور ان کا اور ان کے اعداء کے مرتبہ کا حال سب کو بخوبی واضح ہو جائے اسی واسطے بعد اتمام وعدہ اور بیان حال خلفاء اور صحابہ کے جو آگے ہونے والا تھا ارشاد فرمایا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ یعنی جو طفیلی اور تابع خلفا کے اس نعمت میں ہوں اور پھر حق نعمت نہ پہنچائیں اور خدمت گاری اور اطاعت فرمان تو در کنار زبان سے شکر گذار تک نہ ہوں بلکہ الٹے بدی سے پیش آئیں تو وہ اصل فاسق ہیں کہ کوئی فاسق ان کے برابر نہیں اور یہ تو خود ظاہر ہے کہ اس آخر آیتہ کے مصداق بجز شیعہ اور نواصب اور خوارج

اور قاتل خلیفہ ثانی اور قاتلان خلیفہ ثالث اور قاتل حضرات امیر رضی اللہ عنہم کے اور کوئی معلوم نہیں ہوتا مگر چونکہ شیعی ان کے دشمن ہیں جو اس نعمت کے حق میں اصل اصول ہیں تو اس فسق میں جو اس ناشکری کا ثمرہ ہے سب میں پیشرو ہوں گے اگرچہ کسی اور وجہ سے وہ دو فرقے اوروں سے بڑھ جائیں۔

اور امیر معاویہ اور بعضے اور صحابہ گو مخالف حضرت امیر رضی اللہ عنہ رہے لیکن ان کا بگڑنا ایسا تھا جیسا بھائیوں کا بگڑنا کیونکہ وہ اور چار یار اس نعمت خلافت میں بمنزلۂ امیر اور غریب بھائیوں کے ہیں کہ باوجودیکہ سب اپنے امیر بھائی کے طفیلی ہوتے ہیں پھر اس سے بگڑتے رہتے ہیں غرض شکر رنجی برادرانہ کو ہرچند ایک دوسرے کا طفیلی ہو کفر نعمت نہیں سمجھا جاتا اس کو عرف میں ناز کہتے ہیں اسی واسطے اگر ایک بھائی کو دنیا میں ثروت ہو جاتی ہے اور اس کے اور بھائیوں کو اس کے طفیل سے ہمچشموں میں عزت اور گونہ ثروت حاصل ہو جائے تو خوبی اسی کی سمجھتے ہیں کہ وہ بھائی جس کے سب طفیلی ہوتے ہیں اپنے اور بھائیوں سے منت اور سماجت پیش آیا کرے نہ کہ غرور اور تکبر کیا کرے بلکہ اس کے بھائی اگر الٹے تحکم کریں تو سب سہے اور مدارات سے پیش آئے اور مکافات کے درپے نہو اور نہ ان سے انتقام لے بلکہ اگر کوئی شخص اس کے متوسلوں میں سے ان سے کسی قسم کی پرخاش کرے تو یہ سمجھا دے کہ میرے بھائی ہرچند مجھ سے منحرف ہیں پھر بھائی ہیں اور تم ہرچند دوست ہو پھر غیر ہو۔

القصہ حق شناسوں کا دستور یہی ہے کہ باہم کی شکر رنجیوں کی وجہ سے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ غیر (خاص کر اپنے نوکر غلام) انکو ایذا پہونچائیں بلکہ خدا اگر کچھ لیاقت دین یا دنیا کی دیتا ہے تو اسکی جفا اٹھاتے ہیں اور زبان پر نہیں لاتے بلکہ الٹے احسان کیا کرتے ہیں ہاں اگر اپنا نوکر یا غلام ان کی اہانت یا ایذا کے درپے ہوتا ہے تو اسکو البتہ سزا دیا کرتے ہیں۔

شیعوں کا شیوۂ تبرا بازی امیر کی اتباع سے نکال کر ان کا قدم امیر معاویہ کی تقلید پر جماتا ہے

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جب حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے یہ سنا کہ اصحاب امیر معاویہ پر لعن طعن کرتے ہیں تو آپ نے اپنے لشکریوں کو انکی لعن کرنے سے منع فرمایا چنانچہ شیعوں کی معتبر کتابوں میں موجود ہے افسوس کہ شیعوں نے امیر معاویہ کی تقلید اختیار کر لی اور تبرا اپنا شیوہ بنایا حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا اتباع نہ کیا کہ کسی کو برا نکہیں گمران کے کہاں نصیب جو حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اتباع اختیار کریں، اس نعمت کے لائق سنی ہی تھے ؎

شہپر زاغ و زغن زیبائے صید و قید نیست ✽ ایں کرامت ہمرہ شہباز و شاہین کردہ اند

سبحان اللہ کیا کلام معجز نظام ہے کہ کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ صحابہ سے وعدہ کیا اور ان کے فضائل اشارت اور نیز صراحت سے بیان کر کے منکران صحابہ کی جدا خبر لی پھر وہ بھی کچھ ایسی طرح کہ دشمنان صحابہ پر سر سے لے کر پاؤں تک برابر مطابق آئے۔

| الفاظ آیت تحفظ فضیلت صحابہ کے لئے سنگین حصار کھینچتے ہیں |

ہاں اگر یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا نہ ہوتا یا وَمَنْ کَفَرَ کے پیچھے لفظ بَعْدَ ذٰلِکَ نہ ہوتا تو بظاہر تاویل کی گنجائش رہتی کہہ سکتے کہ صحابہ بعد وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمارے عقیدہ کے موافق مرتد ہو گئے تھے وَمَنْ کَفَرَ سے وہی مراد ہیں اور کفر سے کفر حقیقی مقصود ہے کفران نعمت مراد نہیں مگر خدا سے کہیں کوئی بات رہ سکے ہے اہل فہم تو پہلے ہی سمجھتے تھے کہ ایسا ایمان اور عمل صالح جو خداوند کریم کو بھی پسند آئے اور اس کے امتحان میں عمدہ نکلے یہاں تک کہ اس پر انعام ہے مبدل بکفر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسا ایمان اور عمل صالح بجز ان لوگوں کے میسر نہیں آتا۔ جن کے حق میں شیطان تو یوں کہے اِلَّا عِبَادَکَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ یعنی اے خدا میں سب کو گمراہ کر دوں گا۔ سوا تیرے چھٹے ہوئے بندوں کے اور خداوند کریم کا یوں ارشاد ہوا اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ یعنی اے ابلیس میرے جو کامل اور چھٹے بندے ہیں ان پر تیرا قابو نہیں بلکہ کلام اللہ سے تو یوں ثابت ہوتا ہے کہ مخلصین یعنی چھٹے ہوئے مومنوں کا گناہوں سے محفوظ ہونا یا معصوم ہونا لازم ہے کیونکہ آیہ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ میں حضرت

یوسف علیہ السلام کے گناہوں سے بچا دینے اور بچے رہنے کی وجہ یہی فرمائی کہ وہ مخلصین میں سے تھے پھر جب خلفاء اربعہ جن کا مخلصین میں سے ہونا ابھی مرقوم ہوا محفوظ یا معصوم ہوئے تو مصداق وَمَنْ کَفَرَ کیونکر ہو سکیں گے۔

اس کے بعد جو لوگ کچھ قلیل مایۂ فہم رکھتے ہیں ان کے لئے وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ بڑھایا۔ تاکہ صحابہ کی نسبت اپنی زبان و دل کو آلودۂ گستاخی نہ کریں اور اس طرح اپنے دین و ایمان کو برباد نہ کریں اور ان کی لعنت کی سزا میں ہماری لعنت کے مستحق نہوں لیکن اغبیاء اور جہال کے سمجھانے کے لئے بھی کوئی بات ضرور چاہیئے تھی اسلئے جملہ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا زیادہ فرمایا تاکہ احتمال ارتداد بھی باقی نہ رہے اور بسبب اپنی تیرہ درونی اور کم فہمی کے اپنی ہجو کو جو وَمَنْ کَفَرَ سے شروع ہے صحابہ کے اوپر مطابق نہ کرنے لگیں واقعی یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا نے احتمال ارتداد کو جو بطور فرض محال پیش آتا تھا بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا کیونکہ اس میں ان کے آخر حال تک کی خبر دیدی، سو جو کچھ خداوند کریم نے ارشاد فرمایا وہ سب خلفاء اربعہ میں بوجہ اتم ظہور میں آیا۔ یہاں تک کہ شیعہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ خلفاء ثلثہ خصوصاً حضرت عمر ظاہر شریعت کی پاس داری اور ترویج دین اور زہد و تقوی کی رعایت بہت کرتے تھے چنانچہ شریف مرتضیٰ نے تنزیہ الانبیاء والائمہ میں بلکہ اور علما نے بھی اس بات کو واضح لکھا ہے اگرچہ اپنی بدی سے باز نہیں آئے اور موافق مثل مشہور المریض یقیس علی نفسہ کے وجہ اس کی یہ تراشی ہے کہ یہ سب لوگوں کے دکھانے کو تھا لیکن جملہ یَعْبُدُوْنَنِیْ اور نیز اس جملہ کا ماقبل جب ان کے اخلاص پر دلالت کرے تو پھر موافق مثل مشہور الرافضی فوارہ لعنت اندمی خیزد و بر دمی ریزد یہ سرائی اور بدگوئی انہیں کے سر رہے گی۔

| خلفائے ثلثہ پر ارتداد کی تہمت خداتعالیٰ پر دروغ گوئی کی تہمت ہے |

معہذا لفظ بَعْدَ ذٰلِکَ نے امامیہ کے مونہہ کو بالکل سیاہ ہی کر دیا ہے کیونکہ اگر بالفرض بفرض محال خلفاء ثلثہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرتد بھی ہوئے تو نعوذ باللہ خدا نے اتنا بھی نہ سمجھا جتنے شیعہ سمجھے چاہیئے تھا وَمَنْ کَفَرَ بعد وفات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتا اور کہہ دیا وَمَنْ کَفَرَ

بَعْدَ ذٰلِكَ جس سے دروغ گوئی کی تہمت اپنے ذمہ لگی اور اگر وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ بجائے خود ہے تو شیعوں کے مفید مطلب نہیں بلکہ مضر ہے کیونکہ اگر وَمَنْ كَفَرَ سے اصحاب ثلثہ ہی مثلاً مراد ہیں تو ان کا کفر بعد اتمام نعمت موعودہ ہونا چاہیئے تو اس صورت میں انکار امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو شیعوں کے نزدیک بمجرد وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صحابہ خصوصاً خلفاء ثلثہ سے ظہور میں آیا کفر لازم نہ آوے سو اول تو یہ شیخ چلی کا گھر بنا بنایا ڈھ جائیگا کہ انکار امامت اور انکار رسالت دونوں سے آدمی کافر ہو جاتا ہے دوسرے خلفاء ثلثہ کے استحقاق خلافت کے انکار سے جو اس آیت سے ثابت ہوتا ہے خود کافر بننا پڑیگا خیر اس صورت میں ہمیں بھی شکایت نہیں ؎

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتے ۔ گو مشت خاک ما ہم برباد رفتہ باشد

وَمَنْ كَفَرَ کے اصلی مصداق | بالجملہ صحیح یہی ہے اور صحیح کیوں نہو، سیاق یہی کہتا ہے۔ کہ مصداق وَمَنْ كَفَرَ اعداء خلفاء ہیں خلفاء نہیں ہو سکتے اور كَفَرَ سے کفران نعمت مراد ہے کفر حقیقی نہیں گو بتکلف بن سکے کیونکہ اسوقت مطلب یہ ہو جائے گا کہ جو شخص ایسی ایسی امداد دین خدا کی طرف سے بنسبت دین محمدی کے دیکھے اور پھر بھی کفر ہی اختیار کرے تو وہ اصلی فاسق ہے لیکن نعمت کے مقابلہ میں کفران نعمت ہی ہوا کرتا ہے کفر حقیقی کا موقع نہیں ہوتا غرض صحیح یہی ہے کہ مَنْ كَفَرَ کے مصداق اعدار خلفاء ہیں لیکن ہم نے رعایت کی تھی کہ کفران نعمت مراد رکھا وہ اس کمی سے ناخوش ہیں تو اس گھاٹے کو پورا کرلیں اور اپنے آپ کو کافر حقیقی ہی سمجھیں ع رضنا و ماہمہ آنست کان رضا رشماست ۔

باب

مناقب صحابہ بدلیل تفسیرات آیۂ محمد رسول اللہ

یہاں پہونچکر شاید بعضے شیعہ مذہب یوں حجت کریں کہ ہم نے مانا اصحاب ثلثہ خلیفہ برحق اور اپنے اپنے زمانہ میں افضل الناس تھے لیکن بعد ان کے جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا وقت آیا تو اسوقت موافق اشارات آیۂ وعد اللہ الخ کے وہ افضل الناس اور خلیفۂ برحق ہوں چنانچہ اس بات کے سنّی بھی معتقد ہیں تو اس صورت میں

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن کے مخالفین کیوں کر مقبولان بارگاہ الٰہی ہوں حالانکہ اہل سنّت سب صحابہ کے خواہ انہوں نے حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی یا نہ کی معتقد ہیں خصوصاً طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ کو تو بشر بالجنتہ بھی جانتے ہیں اس لئے لازم پڑا کہ کلام اللہ کی شہادت ان بزرگواروں کے لئے ادا کی جائے اور منشاء غلطی حضرات شیعہ کا بیان کیا جائے سورۂ فتح میں خداوند کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے باب میں یوں ارشاد فرماتا ہے

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔

حاصل اس آیۃ کا یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسول ہیں ساحر کاہن نہیں اور انکے ہمراہی کافروں پر تو بڑے تیز و تند اور ایکدوسرے کے ساتھ نرم اور ایک دوسرے کے دوست تو انہیں دیکھے تو رکوع میں جھکے ہوئے سجدے میں پڑے ہوئے اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی سے غرض ہے ان کے چہروں میں علامتیں موجود ہیں سجدہ کے اثر سے۔

اس امت میں حضورؐ کے بعد صحابہ کا درجہ ہے اور رسالت کے بعد بغض فی اللہ کا | یہاں تک آیۃ کے معنوں کا بیان تھا اب اس ہیچمدان کی سنئے کہ اول جناب باری تعالیٰ نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف فرمائی بعد میں اصحاب کی تو قرینہ عقلیہ سے معلوم ہوا کہ بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس امت میں اصحاب کا رتبہ ہے علے ہذا القیاس جو وصف کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں ہوگا اس کے بعد اس وصف کا رتبہ ہوگا جو صحابہ کی مدح میں بیان ہوا ہوگا مگر ہم نے جو دیکھا تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں رسول اللہ کا لفظ ہے اور اصحاب کی مدح میں اشداء علی الکفار رحماء بینهم تو اس لف و نشر سے معلوم ہوا کہ بعد رسالت کے رتبہ بغض فی اللہ اور حب فی اللہ کا ہے کیونکہ بغض فی اللہ یعنی خدا کے سبب کسی سے

عداوت کرنی یہ بعینہ وہی شدت علی الکفار ہے اور حب فی اللہ بعینہ رحماء بینہم کا ترجمہ ہے اس اشارہ سے زیادہ تر تصدیق اس حدیث کی ہو گئی جو سنیوں کی کتابوں میں پائی جاتی ہے اور اُس کا ماحصل یہ ہے کہ جس شخص نے خدا واسطے دیا اور خدا واسطے کسی سے ہاتھ کو کھینچ لیا اور خدا واسطے کسی سے محبت اور خدا واسطے کسی سے بغض رکھا تو بیشک اُس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا واقعی سنیوں کی حدیثیں سب کلام اللہ پر مطابق آتی ہیں پر شیعوں کی حدیثوں کا حال یہ ہے کہ کلام اللہ کچھ کہتا ہے اور ان کی حدیثیں کچھ ایک دو حدیثیں جو بیان کی گئیں انکا حال ناظرین رسالہ ہذا پر پوشیدہ نہ رہے گا۔

صحابہ کی منقبت میں اشداء علی الکفار کو باقی اوصاف پر مقدم کرنیکی حکمت پر یہاں ایک لطیفہ قابل بیان ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں جہاں کہیں حب فی اللہ بغض فی اللہ کا بیان آیا ہے تو حب فی اللہ کو مقدم کیا ہے اور کلام اللہ میں بغض فی اللہ پر جو لفظ دلالت کرتا ہے یعنی اشداء علی الکفار اسے مقدم بیان کیا حکمت اس میں کیا ہے؟ اس کم فہم کے فہم میں یوں آتا ہے کہ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ دونوں آثار کمال محبت خداوندی میں سے ہیں یعنی جب کسی کو خداوند کریم سے محبت کمال درجہ کی ہو گی تو وہ محبت چاروں طرف کو پھیلے گی جہاں جہاں خدا کے ساتھ کسی چیز کو کچھ خصوصیت ہو گی تو اس خصوصیت ہی کے موافق اس چیز سے بھی محبت ہو گی۔

محبوب کے متعلقین کی محبت محبوب ہی کی محبت ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بنی آدم میں سے خدا کے ساتھ زیادہ علاقہ اور اختصاص ہے تو جس شخص کو خدا کے ساتھ محبت کامل ہو گی اور اس علاقہ کو سن لے گا تو بیشک اس کو بعد خدا کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے محبت ہو گی علی ہذا القیاس جسکو بعد رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم کے خدا سے زیادہ اختصاص ہو گا تو محب خداوندی کو بھی اس سے اسی قدر محبت ہو گی علی ہذا القیاس مکانات ہیں مثلاً خانہ کعبہ کو زیادہ تر اختصاص ہے تو محب خداوندی کو بیشک سب مکانات سے زیادہ خانہ کعبہ سے محبت ہو گی پھر اس کے بعد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد کا رتبہ ہے اسکے بعد بیت المقدس کا تو اس شخص کو بھی علی حسب المراتب محبت ہو گی اسیطرح اعمال اور اخلاق اور عادات میں خیال کر لو القصہ جتنا کسی چیز کو جناب باری سے قرب ہو گا اتنا ہی محبان خداوندی کو اس چیز سے علاقہ ہو گا۔

متعلقین محبوب کی محبت محبوب کی محبت کا جزو ہے مثلاً ظاہر کی محبت میں ظاہر ہے جب کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے اقربا اور خیر خواہوں بلکہ کوچہ کے رہنے والوں کے ساتھ بھی محبت ہو جاتی ہے سو جیسے روشندانوں میں گو دھوپ بقدار روشندان کے آتی ہے ایسے ہی محبت بھی بمقدار علاقہ محبوب متعلقان محبوب سے پیدا ہو جاتی ہے مگر جیسے جو دھوپ باہر ہوتی ہے اسی کا ٹکڑا اندر ہوتا ہے اور جو نور خارج از دیوار ہے اسی نور کا شعبہ اندر ہے ایسے ہی متعلقوں کی محبت بھی محبوب ہی کی محبت کا شعبہ ہوتا ہے اور اسی کا ٹکڑا اسکو سمجھنا چاہیئے۔

بدخواہان محبوب کی دشمنی محبت کا جزو نہیں اسکا لازم ہے۔ بخلاف بدخواہان محبوب کی عداوت کے کہ وہ محبوب کی محبت کو لازم ہوتی ہے اس کا ٹکڑا اور اس کا شعبہ نہیں ہوتی یعنی جو لوگ کہ محبوب کے بدخواہ ہوتے ہیں ان سے بتقاضاء محبت محبوب عداوت ہونی لازم ہے مگر یہ عداوت محبوب کی محبت کا ٹکڑا اور اس کا شعبہ بلکہ ہمجنس تک نہیں ہاں اسکو لازم ہے جیسے دھوپ کو بشرطیکہ دیوار وغیرہ کوئی شے نور کے روکنے والی حائل ہو سایہ لازم ہے حالانکہ اس کے ہمجنس تک نہیں اس قیاس پر جو لوگ اعداء خدا ہوں گے محبان خداوندی کو ان سے عداوت لازم ہو گی لیکن بہرحال یہ عداوت غیر محبت ہے اگرچہ اسکو لازم ہے ہاں اولیاء خدا اور مقربان الٰہی کی محبت وہ حقیقت میں خدا ہی کی محبت کا ٹکڑا ہے کوئی غیر شے نہیں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی مدح اور ثنا بیان فرمائی وہاں تو مقدم کو مقدم رکھا موخر کو موخر اور خداوند کریم حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی تعریف نہیں فرماتے بلکہ اُن لوگوں کی تعریف کرتے ہیں جن میں یہ وصف پائے جاتے ہیں

کسی کی مدح میں پہلے ہلکی پھر بڑھیا پھر اور بڑھیا خوبی بیان کرنا صحیح ترتیب ہے

اور دستور یوں ہے کہ کسی صاحب کمال یا موصوف باوصاف مختلفہ کی اگر تعریف کیا کرتے ہیں تو اُس کے کمالات میں سے کمتر کو پہلے لیا کرتے ہیں بعد میں اس سے زیادہ کو پھر بعد میں اس سے زیادہ کو تاہر وصف کی قدر اور عزت ہو ورنہ اگر ترتیب کو بالعکس کر دیجئے تو بعد عمدہ اوصاف کے سن لینے کے کمتر اوصاف کیا قدر رہ جائے گی جو محل تعریف میں بیان کیا جائے غرض یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اوصاف کی خوبی اور برائی تو اصلی ہے اور اوصاف والوں کی بھلائی بُرائی اوصاف کے سبب سے ہے درصورتیکہ اوصاف کی بھلائی بُرائی بیان کی جائے تو اول کو اول بیان کیا جائے اور دوم کو دوم اور درصورتیکہ اوصاف والے کی بھلائی بُرائی مدنظر ہو اور اُس شخص کے اوصاف بہ ترتیب ذکر کئے جائیں تو ترتیب مذکور کو منعکس کر دینا چاہیئے ہاں جہاں دو چیز کا فرق مراتب باعتبار مجموعۂ اوصاف کے دریافت کیا جائے یعنی کس میں زیادہ اوصاف ہیں اور کس میں کم اور کس میں عمدہ تر ہیں اور کس میں نہیں تو یہ حقیقت میں اوصاف ہی کی تعریف ہے اس لئے انکی ترتیب وہی ہوگی جو اوصاف کی ترتیب ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اول ذکر کیا بعد میں صحابہ کا مذکور شروع کیا القصہ صحابہ کی تعریف میں ادنیٰ وصف جو بیان کیا گیا ہے تو اشداء علی الکفار ہے یعنی وہ کافروں پر بڑے ہی تیز و تند ہیں۔

محبت کرنا آسان ہے اور دشمنی دشوار خصوصاً اقربا سے

اور چونکہ محبت کرنا آسان ہے کیونکہ طبعی بات انسان کی یہ ہے کہ جب کوئی اُس سے محبت کرے تو یہ بھی اسکی طرف مائل ہو تو اس صورت میں خدا واسطے کی محبت سے ایمان خوب نہیں پرکھا جاتا ہاں عداوت کرنی البتہ دشوار ہے کہ عداوت کے ثمرہ میں دوسرا بھی عداوت ہی سے پیش آئے گا محبت تو کر معلوم تو اگر کسی کو خدا واسطے کسی سے بغض ہو تو یہ نشان کمال ایمان ہی سمجھا جائے گا خاصکر خدا واسطے کی عداوت بھی اقربا سے کہ یہ دشوار در دشوار ہے سو درصورتیکہ مطلق عداوت نشان کمال ہو تو اقربا کی عداوت تو نشان اکملیت

سمجھنا چاہیئے۔

اور ہم جو قرینۂ مقام کو لحاظ کرتے ہیں تو محل اقربا ہی کی عداوت کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ ماسبق کی آیۃ یعنی لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا صحابہ کرام کی تسلی اور تسکین خاطر کے لئے نازل ہوئی ہے سو جس غم کے سبب تسلی کی جاتی ہے وہ غم یہی تھا کہ غزوہ حدیبیہ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ معظمہ سے صلح کر کے مراجعت فرمائی اور صحابہ کی آرزوئیں خاص کر مہاجرین کی جو در باب جہاد کفار دلوں میں لبریز تھیں دلوں کی دلوں میں رہ گئیں اور جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ابتدا میں اس سفر کے یہ خواب دیکھا تھا کہ ہم جمیع جماعت امن چین سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور اس خواب کے باعث باین خیال کہ اسی سال میں ہم مکہ میں داخل ہوں گے صحابہ کے دل میں یہ سرور بھرے ہوئے تھے کہ کچھ کہا نہیں جاتا وہ سب کا سب حسرت و غم سے بدل گیا اس وقتِ صحابہ کا یہ حال تھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ ہوتی تو آب تیغ صحابہ کفار مکہ کو غرقابِ فنا کر دیتی پاس قرابت کس کا اور شفقت نسبی کجا اُدہی مہاجرین جو مکہ والوں میں سے کسی کے بھتیجے تھے فقط جوش محبت خداوندی اور نیازمندی رسولؐ میں انہیں اپنے اقربا کے خون کے پیاسے نظر آتے تھے اور آیۃ ماسبق اور آیۃ محمد رسول اللہ الخ سب باہم چسپیدگی میں دست و گریباں ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کو یوں تو ہر کافر دشمن خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر غیظ و غضب آتا تھا لیکن اس آیۃ میں زیادہ تر اسی غیظ و غضب کی طرف اشارہ ہے جو انکو کفار مکہ پر اس قصہ میں پیش آیا سو اُن میں سے مہاجرین انہیں کفار کے اقربا میں سے تھے تو انکے حق میں لفظ اشداء علی الکفار نشان اکملیت ایمان کا سمجھنا چاہیئے اور درصورتیکہ ادنیٰ وصف اُن کا اسبات پر گواہی دیتا ہے کہ انکا ایمان کامل تو کیا اکمل ہے تو اعلیٰ اوصاف تو اعلیٰ ہیں اور چونکہ مومنان کامل الایمان گنے چنے ہوئے ہوتے ہیں کچھ ایسی سہل بات نہیں کہ دخل در معقولات کی طرح ہر کوئی کمال ایمان حاصل کرے۔

صحابہ بشہادت کتاب اللہ نفس وشیطان پر بھی اشد تھے لہٰذا ان کی گمراہی کا خیال بھی گمراہی ہے۔

معہذا قرینہ اس بات کا کہ اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر فرمایا پھر صحابہ کا اسبات پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس امت میں اول نمبر ہے اور صحابہ کا دوم تو ہم بالیقین سمجھتے ہیں کہ صحابہ کرام اول قسم کے مخلصین میں سے تھے کہ شیطان بھی اُنکے اغوا سے کانوں پر ہاتھ دھرتا تھا بلکہ بایں نظر کہ شیطان راس ورئیس کفار ہے اور صحابہ اشداء علی الکفار ہیں تو شیطان پر اور بھی اشد ہونگے علی ہذا القیاس نفس اعدا دین میں سے بلکہ سب میں بڑھ کر ہے۔ شیطان بھی اُسی کے سہارے اپنا کام کرے ہے وہ اگر نہ مانے تو شیطان کیا کرے بہرحال نفس وشیطان سے اُنکی عداوت اور بھی زیادہ ہو گی اور ان دونوں پر وہ اور بھی اشد ہونگے کیونکہ لبغض فی اللہ یعنی خدا کے دشمنوں سے عداوت بقدر دشمنی ہوتی ہے جتنی دشمنوں کی دشمنی زیادہ اتنا ہی بغض فی اللہ زیادہ ہو اور مخلصین پر شیطان کا فقط بس نہ چلتا تھا مگر کچھ اندیشہ بھی نہ تھا صحابہ سے اسکی کور بھی دبتی تھی عجب نہیں کہ اُن سے بھاگتا پھرتا ہو۔

سو یہی وجہ ہو گی کہ حضرت عمر کے سایہ سے بھی شیطان بھاگتا تھا۔ کیوں کہ وہ سب صحابہ میں کافروں کے باب میں زہر قاتل تھے ان کے حق میں اشداء علی الکفار ہونا سب میں زیادہ صادق آتا تھا بھلا شیطان جن سے خود بھاگے انہیں کیا گمراہ کرے گا شیطان کو ایسی جگہہ اپنی ہی پڑجاتی ہے اور نفس جن سے دبے وہ کس سے دبیں گے آدمی۔۔ اور دوں سے جو دبتا ہے تو اس نفس ہی کے بتے دیتا ہے اسی واسطے یہ لازم پڑا کہ ایسے لوگوں کی عبادات میں کچھ فرق نہ پڑے اعمال میں کسی قسم کا ریا اور ریا وغیرہ کا نہ ہو کیونکہ ان سب بیماریوں کی جڑ یہی دو آسیب تھے جب یہی قابو میں آگئے پھر کیا کسر باقی رہ گئی۔

نفس وشیطان کی آمیزش بغیر غلط فہمی سے کوئی غلطی ہو تو امید ثواب ہے۔

ایسے وقت اگر برا کام ہوتا ہے تو فقط بسبب غلط فہمی کے ہوتا ہے اس لئے اس میں بھی ثواب ملنا چاہیے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے جو سر کے

بال غصے میں پکڑ کر کھینچے حالانکہ حضرت ہارون کی کچھ تقصیر نہ تھی ہرگز عقل سلیم کے نزدیک داخل جرائم نہیں یہ نہیں کہ اس پر کسی قسم کا مواخذہ ہو بلکہ امید ثواب ہے کیونکہ باعث اس کا فقط خدا کی محبت اور بغض فی اللہ ہوا اور چونکہ یہ دونوں اوصاف محمودہ میں سے ہیں بلکہ اعلیٰ اقسام میں سے اور ادہر اعمال کا مدار ہے پر فقط صورت پر نہیں ورنہ سب کی نمازوں کا برابر ہی ثواب ہوتا تو ہم کو یقین کامل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اس پر ثواب ملے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ بعد اطلاع غلطی کی بوجہ غلطی ندامت ہونی ضرور ہے سو اس ندامت سے یہ نہیں لازم کہ وہ کام ایسا بُرا ہو کہ انکو اس پر عذاب ہو بلکہ وجہ اسکی یہ ہے کہ وہ کام تو حقیقت میں برا ہوتا ہے پر نیت کے غلبہ سے اچھا ہو جاتا ہے جیسے دھول دھپہ اصل سے برا ہوتا ہے لیکن یاران غمگسار کا دھول دھپہ بھی بسبب اس کے کہ از راہ محبت ہوتا ہے موجب نشاط خاطر محزون ہوتا ہے۔

مشاجرات صحابہ کا باعث نفس وشیطان نہیں بلکہ بغض فی اللہ تھا

الغرض صحابہ کرام کے سامنے جب نفس وشیطان مغلوب ہوئے تو اسوقت اگر کوئی کار بیموقع ان سے صادر ہوا ہو تو بوجہ غلط فہمی صادر ہوا ہو گا اس صورت میں گو وہ کام برا تھا لیکن چونکہ بری طرح سے نہیں ہوا اور شیطان ونفس کو جو برے کاموں کی اصل اور بنیاد باندھنے والے ہیں اس میں دخل نہیں ملا بلکہ قوت ایمانی ہی باعث اس کا ہوئی ہے تو اب بوجہ غلبہ نیت اور قوت ایمانی ان کاموں کی برائی ایسی مغلوب ہو گئی ہے جیسے ماشہ دو ماشہ برابر میٹھے یا نمک کا اثر کنوئیں یا دریا میں۔

سو جیسے حضرت موسیٰ کو حضرت ہارون پر غصہ ہونے اور انکے بال پکڑ کر کھینچنے کا باعث فقط بغض فی اللہ تھا ایسے ہی مشاجرات صحابہ بھی بغض فی اللہ پر مبنی ہوں لیکن جیسے حضرت موسیٰ سے یہ غلطی ہوئی کہ اُس بغض فی اللہ کو بیموقع صرف کر دیا ایسے ہی صحابہ سے بھی یہ غلطی ہوئی ہو کہ جوش بغض فی اللہ میں مثلاً چوک گئے اور بگاڑ بیٹھے اور حقیقت الامر نہ سمجھے تو اس صورت میں ان پر مواخذہ نہ ہو گا بلکہ ماجور ہوں گے ہاں اگر بغض فی اللہ یا کوئی اور صنف محمود باعث اس کا فعل کا نہیں ہوا کہ بلکہ کوئی ایسا

امر ہے کہ اس پر ثواب نہیں ہو سکتا دفعتاً اس قسم کے افعال مباح ہوتے ہیں تو البتہ ثواب تو مترتب نہ ہوگا لیکن بسبب غلط فہمی کے ماخوذ بھی نہ ہوں گے۔

نفس دب سکتا ہے لیکن اسکا مزاج نہیں بدل سکتا اور احتمال یہ بھی ہے کہ گہہ و بیگاہ اقل قلیل بمقتضائے بشریت کوئی حرکت ناسزا صادر ہوئے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر چند شیطان کو مخلصین پر قابو نہیں رہتا اور نفس بھی مغلوب اور مقہور ہو کر ان کا اس طرح مطیع فرمان ہو لیتا ہے جیسے ہاتھی باوجود اس عداوت کے کہ اسکو آدمیوں سے ہے مغلوب اور مقہور ہو کر آدمیوں کی ہر طرح سے اطاعت کرتا ہے لیکن جیسے ہاتھی پھر ہاتھی ہے آدمیوں کے غلبہ سے آدمی نہیں بن گیا کبھی نہ کبھی اپنی عادات اصلی پر آجاتا ہے ایسے ہی نفس گو غلبۂ ایمان اور صولتِ محبتِ الٰہی کے باعث مقہور اور مغلوب ہو گیا ہے لیکن پھر نفس ہے وہ طبع زاد بُرائی اور گناہوں کی رغبت کہاں جائے۔

نیکی کی اصل روح اور بدی کی اصل نفس ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جیسے بدن میں چاروں قسم کی کیفیات یعنی حرارت برودت یبوست رطوبت کے پائے جانے سے یہ دریافت ہوا ہے کہ بیشک بدن ان چاروں کیفیات کی اصلوں سے یعنی آگ ہوا پانی خاک سے مرکب ہے ایسے ہی بلحاظ اس بات کے کہ آدمی کے دل میں کبھی نیکی کی طرف رغبت ہوتی ہے کبھی بدی کی جانب یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی حقیقت ان دونوں کی اصلوں سے مرکب ہے لیکن جیسے اربع عناصر میں سے ہر ایک میں ایک کیفیت خاص ہے کہ اس کے مخالف اس میں نہیں پائی جاتی اور اگر پائی بھی جائے تو عارضی ہوتی ہے جیسے پانی کا گرم ہو جانا ایسے ہی نیکی اور بدی کی اصل میں بھی ان دونوں میں سے ایک ایک ہونی چاہئے اور دوسری آجائے تو وہ عارضی ہے جب یہ بات مسلّم ہو چکی تو ہم کہتے ہیں کہ نیکی کی اصل کا نام ہم روح کہتے ہیں اور بدی کی اصل کا نام نفس؛ اور روح میں کیفیت اصلی نیکی ہوگی مغلوب ہو کر اگر بدی اس سے صادر ہو تو وہ عارضی ہے اور نفس کی اصلی خاصیت بدی ہوگی اور مغلوب ہو کر نیکی کرنے لگے تو وہ عارضی سمجھی جائے گی۔

روح عالم ملائکہ کی ایک چیز ہے اور نفس طبقہ شیاطین میں سے ہے اس جگہ سے ہم یوں قیاس کرتے ہیں کہ جیسے حرارت غریزی کے وسیلے سے ہم یوں دریافت کرتے ہیں کہ آدمی کے بدن میں ایک جزو ناری بھی ہے اور پھر اس کو یوں کہتے ہیں کہ اس کی اصل کرہ ناری ہے خدا نے اپنے زور قدرت سے اسے یہاں لا کر قید کر دیا ہے ایسے ہی نیکی کے ارادہ کے وسیلے سے اول تو ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ آدمی میں کوئی چیز ایسی بھی ہے کہ اس کی اصلی خاصیت نیکی ہے اور دوبارہ یوں سمجھتے ہیں کہ اس کی اصل طبقہ ملائکہ ہے جن کی شان میں خداوند کریم یوں ارشاد فرماتا ہے لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ یعنی خدا کی نافرمانی کرتے ہی نہیں جو حکم ہوتا ہے وہی کرتے ہیں سو اس کا ماحصل یہی ہے کہ ان کی اصلی خاصیت نیکی ہے ایسے ہی انسان کے دل میں بدی کے ارادہ اور خواہش کے وسیلے سے اول تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی جز ایسا ہے کہ اس کی اصلی خاصیت بدی ہے اور پھر یوں خیال میں آتا ہے کہ اس کی اصل طبقہ شیاطین ہے جن کے حق میں جناب باری تعالےٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں وَکَانَ الشَّیْطَانُ لِرَبِّہٖ کَفُوْرًا حاصل یہ کہ شیاطین اپنے رب کے قدیمی نافرمان ہیں سو اس کا ماحصل یہی ہے کہ ان کی اصلی خاصیت بدی اور نافرمانی ہے۔ القصہ روح عالم الملکوت کی ایک چیز ہے اور نفس طبقہ شیاطین سے ہے۔ خداوند کریم نے اپنے زور قدرت سے ان کو ایک جگہ ایسا جمع کر دیا ہے۔ جیسا طوطی اور زاغ کو ایک قفس میں بند کر دیں۔

انسان میں نیکی و بدی کے مختلف دور ملائکہ اور شیاطین کی تقویت و تاثیر سے ہوتے ہیں پھر جیسے بدن کے اربع عناصر میں ہر ایک کو اس کے ہمجنس سے تقویت ہوتی ہے۔ ایسے ہی روح اور نفس کو بھی اپنے اپنے ہمجنس سے یعنی ملائکہ اور شیاطین سے تقویت ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض احادیث بھی اس پر شاہد ہیں اور بزور عقل بھی ہم یوں ہی یقین کرتے ہیں کہ اوقات مختلفہ میں یہ نیکی اور بدی کے خیال کا غلبہ بوجہ ملائکہ یا بوجہ شیاطین ہو تو ہو ورنہ جو انداز طبع زاد تھا وہی رہتا غرض طبعی کیفیت اگر جاتی ہے تو کسی خارجی شے کے غلبے سے جاتی ہے سو نیکی کے خیال کا غلبہ بظاہر سامان بجز اعانت ملائکہ متصور نہیں ہے علیٰ ہذا القیاس بدی کی جانب توجہ کی زیادتی بجز تاثیر شیاطین معقول نہیں۔

نفس دب جانے کو اسکو اشدا علی الکفار ہی کا مقام ہاتھ آتا ہے | سو اگر کسی وقت نیکی کا خیال غالب اور اس

وجہ سے اعمال صالحہ صادر ہوں اور اس ترکیب سے روح کی تاثیر نفس پر ایسی طرح
عارض ہو جائے جیسے برتن کے نیچے آگ جلانے کی ترکیب سے آگ کی تاثیر پانی پر عارض ہو جاتی ہے
اور اس کی تاثیر اصلی کو جو ٹھنڈک ہے دبا لیتی ہے تو اس صورت میں نفس بھی روح کے کام ایسے ہی
دینے لگے گا جیسے بہت گرم پانی آگ کا کام دے یعنے بدن کو جلا دے علیٰ ہذا القیاس اگر نفس روح
پر غالب آ جائے گا تو روح نفس کی تبعیت میں نفس کے کام دینے لگے گی کیونکہ ترکیب میں یہی ہوتا ہے
کہ یا یہ غالب ہو یا وہ ہو چنانچہ اجسام میں یہی حال رہتا ہو کبھی کسی خلط کا غلبہ کبھی کسی خلط کا غلبہ بہر حال اگر روح
غالب ہو گی تو ایسے وقت میں روح کو بنسبتہ نفس کے اشداء علی الکفار میں سے سمجھنا چاہیئے۔ اور
اس وقت میں شیطان کا بالکل اختیار اٹھ جاتا ہے اور وہ تسلط اور حکومت جو پہلے تھی۔ باقی
نہیں رہتی۔

نفس دب جائے تو بھی قابل اعتبار نہیں | لیکن جیسے کسی شخص پر ہمیں ایسا اختیار تو نہو، جیسے نوکر یا غلام
پر ہوتا ہے مگر تاہم اپنی طرف سے اپنے جی کی بات سوجھایا کرتے ہیں وہ مانے یا نہ مانے ایسے شیطان بھی
اپنی حسب مرضی کہنے سے یعنی وسوسہ ڈالنے سے باز نہیں آتا، بہر حال جن کا نفس مقہور اور مغلوب
ہو جاتا ہے وہ روح کی تبعیت میں اچھے کام کرنے لگتا ہے لیکن پھر نفس نفس ہی ہے۔ جیسے پانی
کتنا ہی گرم کیوں نہ ہو آخر پھر پانی ہے۔ اول تو آگ کے بجھانے میں ویسا ہی ہے جیسا ٹھنڈا پانی دوسرے
یہ حرارت عارضی ہے اور عارضی چیز کا کیا اعتبار، ابھی آگ جلانی چھوڑ دو یا چولھے پر سے اتار کر ذرا
رکھ دو پھر وہی ٹھنڈا کا ٹھنڈا ہے اسی طرح جہاں نفس کی خبرداری سے ذرا غفلت ہوئی۔ پھر
وہی اپنیوں پر آ جاتا ہے

انسان ہمیشہ ایک ہی حال میں نہیں رہ سکتا | اور ہر وقت ایک سا حال رہنا محالات عادی میں سے ہے
خصوصاً انسان سے جس کی شان میں جناب باری تعالےٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ
عَزْمًا یعنی حضرت آدم کی شان میں یوں ارشاد ہے کہ آدم بھول گئے اور ہم نے ان میں پختگی نہ
پائی۔ کیونکہ جو جو اوصاف حضرت آدم علیہ السلام میں تھے۔ تھوڑے بہت سب بنی آدم میں ہونے
چاہئیں وجہ اس کی یہ ہے کہ توالد و تناسل میں نوعیت باقی رہتی ہے اسی واسطے آدمی کے

آدمی اور گھوڑی کے گھوڑا اور گدھی کے گدھا پیدا ہوتا ہے اور جب نوعیت باقی رہے تو جو وجہ
نوعیت کے باقی رہنے میں نظر آتی ہے یعنے توالد تناسل وہی بعینہٖ اور اوصاف کے حق میں بھی
سمجھنی چاہیئے بالجملہ سب اوصاف آدم علیہ السلام نسلاً بعد نسلٍ کم و بیش سب آدمیوں میں ہوتے
ہیں چنانچہ مشہور بھی ہے اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْهِ اور جب بے ثباتی بھی سب آدمیوں میں ہوئی تو
پھر ایک حال پر رہنا کجا اس صورت میں لازم پڑا کہ ہمیشہ نفس کی محافظت یکساں نہ ہو بلکہ کبھی
کبھی اس کی نگاہداشت میں فرق پڑے اور نفس اپنی خاصیت کی طرف مائل ہو، اور کوئی نہ
کوئی قصور سرزد ہو، باقی رہی یہ بات کہ کوئی نفس کی حقیقت کو بدل کر روح بنا لے یہ خود محالات میں
سے ہے خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ یعنے خدا کے پیدا کئے کو کوئی
نہیں بدل سکتا۔

غلبۂ نفس اور مغلوبیت نفس سے سرزد ہونے والی خطاؤں میں بے حد فرق ہے | الغرض کوئی صورت ایسی نہیں
کہ انسان خطا اور قصور سے بے اندیشہ ہو جائے۔ لیکن اس حال کا قصور اس قصور کے برابر نہیں
کہ نفس اپنی خاصیت اصلی پر ہو اور اس پر روح کا ذرہ برابر اثر نہ ہو بلکہ الٹا اس کا روح پر اثر ہو
کیونکہ پہلی صورت میں آدمی کا کچھ قصور نہیں اس کا کام اتنا ہے کہ روح کو غالب کر دے اور نفس
کو مغلوب، روح کی خاصیت نفس کی خاصیت کو دبا بیٹھے یہ اس کے اختیار میں نہیں کہ نفس کو بدل
کر روح بنا دے یہ اس کے اختیار میں نہیں کہ مدام ایکساں حال رہے پھر جب اس کے اختیار میں
یہ دونوں باتیں نہ ہوئیں اور جس قدر اس کا اختیار تھا اس قدر کر گذرا، تو پھر لائق اس کے ہے
کہ معاف کیا جائے چنانچہ خداوند کریم خود فرماتا ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یعنی اللہ کسی
کو اس کی طاقت اور وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اس لئے ہمیں یقین کامل ہے کہ اس
وقت کی خطائیں ہر چند خطائیں ہیں لیکن بسبب عموم رحمت اور وعدہ مذکور کے
معاف کی جائیں۔

اب سنئے کہ انبیاء سے جو لغزشیں ہوئی ہیں تو شاید اس قسم کی ہوں جن پر عتاب ہوا ہے
اور احتمال ہے کہ بسبب ان کے علو رتبہ کے موافق مثل مشہور نیکاں را بیش بود حیرانی انکی زلات
سب از قسم غلط فہمی ہوں اور اوروں کو گو اس پر ثواب ملے پر ان کو اس پر عتاب ہو۔ لیکن

پہنچ اول ہی بات معلوم ہوئی ہے بہرحال ہرچہ بادا باد انبیاء کے اسرار کو خدا جانے یا انبیاء ...

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ سے خطا ممکن ہے لیکن شیطان کا تسلط ممکن نہیں

پر یہاں تو فقط اتنی بات سے غرض ہے کہ یہ وصف کہ جو اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ کا خدا نے معرض تعریف میں بیان کیا اور پھر تعریف بھی ایسے وصف کے ساتھ کہ بعد رسالت اسی کا رتبہ ٹھہرا۔ یہ وصف ایسا نہیں کہ صدور گناہ یا صدور خطا اس کے ساتھ محال ہو، محال التعجب ہوتا کہ اس وصف والوں کو حقیقت نفسی کے تبدیل کا اختیار ہوتا۔ سو یہ تو معلوم۔ یہ بھی اس وصف والوں کو میسر نہیں آسکتا کہ ایک حال پر برقرار رہیں اور کیونکر رہ سکیں دو چیزیں مخالف ایک دوسرے کی دشمن سے ان کو پالا پڑا ایک شے ہو تو ایک حال پر رہے۔ ان کے واسطے یہی بہت ہے کہ شیطان کا ان پر تسلط نہیں ہو سکتا خداوند کریم ان سے برائیوں کو ہٹاتا رہتا ہے، چنانچہ حضرت یوسف سے برائی اور فحش کے ہٹانے کی وجہ یہی بیان فرمائی ہے کہ وہ چنے ہوؤں میں سے ہیں۔ فرمایا ہے

کَذٰلِکَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ	یعنی یوں ہی ہوا۔ اس واسطے کہ ہٹا دیں اس سے برائی اور بے حیائی البتہ وہ ہے ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے۔

القصہ یہ لازم نہیں کہ جو اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ہوا کریں ان سے لغزش کا ہونا محالات میں سے ہو۔

اَشِدَّآءُ اور رُحَمَآءُ کے لئے اخلاص لازم اور ریا نا ممکن ہے

ہاں البتہ یہ لازم ہے کہ عبادات میں فتور نہ ہو۔ ان کے کام میں ریا کو دخل نہ ہو۔ طالب اگر ہوں تو رضا، خداوندی کے ہوں نظر ہو تو اس کے ایک افضال پر ہو۔ سو اسی لئے بعد ان دونوں وصفوں کے بطور علامات کے اور دلائل کے یوں بیان فرمایا تَرٰىهُمْ رُكَّعًا الخ

غلط فہمی کے سبب بڑوں بڑوں سے خطا ہو جاتی ہے

جب یہ بات مقرر ہو چکی تو اب ہماری عرض علماء شیعہ کی خدمت میں یہ ہے کہ اول تو بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ بڑے بڑے کسی غلطی کے سبب سے بھلی بات کو بری سمجھ جاتے ہیں خضر کی کشتی توڑنے کو حضرت موسیٰ جیسے نبی اولو العزم نے برا سمجھا اور خلاف

شریعت سمجھ کر یوں فرمایا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا حاصل یہ ہے کہ تو نے برا کام کیا حالانکہ انہوں نے کچھ برا نہیں کیا تھا بلکہ بھلا کیا تھا اگر نہ توڑتے تو وہ کشتی پکڑی جاتی۔ سو اسی طرح حضرات شیعہ بلکہ حضرات ائمہ بعض صحابہ کے افعال کو مثلاً فدک کے نہ دینے کو اور سوا اس کے اور افعال کو سرِدست اگر برا سمجھ گئے ہوں۔ اور حقیقت میں وہ برے نہ ہوں تو شیعہ حضرات ہی نقل کی رو سے فرمائیں کیا محال ہے۔

اور یہ بھی نہ سہی شاید کسی کو یہ گمان ہو کہ حضرت خضر اہل مکاشفہ میں سے تھے ان کی بات اگر سمجھ میں نہ آئی تو بجا ہے ابوبکر کو ہم اہل مکاشفہ میں سے نہیں سمجھتے۔ اس لئے یہ التماس ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی باہم جو شکر رنجی ہو گئی اور منشا اس کا یہ ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حقیقت الامر کو نہ سمجھے اور اس سبب سے دست و گریباں ہو گئے اور ایسے ہی حضرت زہرا رضی اللہ عنہا حقیقت الامر کو سرِدست نہ سمجھی ہوں تو کیا حرج ہے حالانکہ یہاں کوئی مکاشفہ کی بات بھی نہ تھی اس لئے کہ حضرت ہارون نے تو کچھ خطا کی ہی نہ تھی اگر معصوم ہونے کی وجہ سے اس بات کو مستبعد سمجھتے ہو تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا تو فقط شیعوں ہی کے نزدیک معصوم تھیں۔ حضرت موسیٰ تو بالاتفاق معصوم ہیں۔

اور سَلَّمْنَا یہ بھی نہیں تو یہ ناکارہ ابھی عرض کر کے آیا ہے کہ اولیا اور مخلصین سے چوک بھی جاتی ہے اور خطا کا ہونا کچھ ان سے محال نہیں جو اس وجہ سے ان کی بزرگی کے منکر ہو جیئے۔ بزرگی اور چیز اور صدور گناہ اور چیز۔ وہ گناہ جو مخالف ولایت ہے وہ یہ ہے کہ نفس اپنی خاصیت اصلی پر باقی ہو اور روح اس کے مغلوب ہو جائے، نہ یہ کہ بمقتضاء بشریت بھی نہ ہو۔ ورنہ ہم تو نہیں کہہ سکتے۔ حضرت آدم کی شان میں جو یہ آیا ہے وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى یا حضرت یونس کی طرف تعریض ہے۔ لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ان کے کیا معنے ہوں گے، حالانکہ یہ سب وقائع کلام اللہ میں مذکور ہیں گنجائش انکار بھی نہیں اور صحابہ کے زلات اگر زلات بھی ہوں اور از قبیل غلط فہمی نہ ہوں تب وہ کچھ کلام اللہ میں مذکور نہیں کسی حدیث متواتر میں نہیں ممکن ہے کہ غلط ہوں اور نہ سہی ہم کہتے ہیں کہ غلط نہیں لیکن جو تم جواب انبیاء کی طرف سے دو گے وہی صحابہ کی طرف سے سمجھ لو بلکہ ان کی

طرف سے یہی عذر بہت ہے کہ وہ معصوم نہیں نبی نہیں، اگر خطا ہوگئی تو بلا سے جب باینہمہ خدا نے ان کی تعریف کردی۔ تو پھر کیا حاجتِ جواب اور کیا عذر کی ضرورت۔

مصرع۔ ہر عیب کہ سلطان بپسندد ہنر است

امکان خطا کے باوجود اتنی تعریف دلیل غفران ورضا ہے

القصہ اس قسم کے قصور قابل گرفت نہیں۔ اور عقل سلیم ہرگز تسلیم نہیں کرتی کہ ان پر محاسبہ اور مواخذہ ہو بلکہ ان اوصاف کے بیان ہی میں اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا اس لئے کہ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ہونا کچھ اس بات کو نہیں چاہتا کہ ان سے کوئی خطا نہ ہوئی ہو اور جب اس بات کا التزام نہ ہوا اور خداوند کریم نے باوجود امکان صدور خطا ان کی تعریف فرمائی تو یہ معنے ہوئے کہ یہ وصف ایسے نہیں کہ ان کے سامنے اس قسم کی باتوں کا حساب کیا جائے بلکہ یہ خوبی نقط استقدر ہی ہے سب کو محو کئے دیتی ہے تو گویا ضمناً اشارہ ان کی مغفرت کی طرف ہوا اور جواب بھی وہ معذب ہوں کیں تو پھر کیا تعریف جہنمی سے تو سور ملکہ پاخانہ پیشاب بھی اچھے ہیں چنانچہ ظاہر ہے۔

القصہ نظر انصاف چاہیئے خدا کی تعریف کے بعد پھر کہیں ہوسکتا ہے کہ صحابہ جہنم میں جائیں پھر اس صورت میں ایک کیا لاکھ گناہ ان کے ذمہ لگا دو۔ جو کرے گا وہ اپنی عاقبت خراب کرے گا اور سمجھنے والے اسی کو تعریف سمجھیں گے۔

امکان خطاء کے باوجود اتنی تعریف اعدائے صحابہ کے منہ پر طمانچہ ہے

اور حق بھی تو ہے جب کوئی بادشاہ دانشمند جسے انتظام مملکت کا خیال ہو اور وہ ملازموں کے حال کا نگراں ہو اپنے چند ملازموں کو باوجود خطاؤں کے کچھ نہ کہے تو ظاہر میں یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کوئی بہت ہی پیارے ہیں کہ اس حال پر بھی ان سے مواخذہ نہیں اور جو الٹی تعریف کرے اور انکے غمازوں اور دشمنوں سے جو ان سے کینہ رکھتے ہوں۔ بری طرح پیش آئے اور ان کے ان کمالات کو جو اپنے نزدیک اور ان کے دشمنوں کے نزدیک ان کی خوبی مسلم الثبوت ہو ان کے دشمنوں کو سنا سنا کر کہے کہ ان میں سے جسمیں یہ اوصاف پائے جائیں۔ ہم نے اس کی سب خطائیں معاف کیں بلکہ اس کے لئے اور انعام قرار واقعی تیار کیا ہے تو اس صورت میں بجز اس کے اور کوئی احتمال نہیں ہوسکتا کہ بادشاہ کو ان ملازموں سے محبت ہے اور اس کو ان کی پچ ہے جو ان کا دشمن ہو وہ اس کا دشمن جو ان کا دوست، وہ اس کا دوست ہے

تعریف صحابہ کا ایک مقصد آنیوالے دشمنوں کا چڑانا اور جلانا بھی ہے

سو لفغیظ تعالیٰ پر سارا قصہ بعینہ ان آیات کے ملاحظہ سے سمجھ میں آتا ہے کیونکہ اول تو صحابہ کی تعریف ایسی بڑھ کر کرے کہ اس سے زیادہ کوئی تعریف کی صورت اقیوں کے حق میں سمجھ میں نہیں آتی، پھر بعد ازاں فرمایا لِیَغِیْظَ بِھِمُ الْکُفَّارُ۔ یعنی یہ جو کچھ صحابہ کے حق میں کہا گیا تو کفار یعنے ان کے دشمنوں کے جلانے اور چڑانے کے لئے کہا گیا ہے سبحان اللہ کیا علم محیط خداوندی ہے کہ بعد کے تمام احوال کی طرف اشارہ فرما دیا۔ خدا کو تو پہلے ہی معلوم تھا کہ شیعہ اور نواصب اور خوارج صحابہ کے حق میں عمازبان کرینگے اور ان کی قدر و منزلت کا جو خدا کی درگاہ میں ہے کچھ خیال نہ کرینگے۔

باقی رہی یہ بات کہ لیغیظ بھم کے ساتھ تو اعداءھم کا لفظ ہونا چاہیئے تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کافروں کو ہی ان سے دشمنی ہو تو ہو مسلمانوں کا کام تو یہ نہیں کہ خدا ان کی تعریف کرے اور انکی سب خطائیں معاف کرے اور پھر بھی ان سے حسد ہی کئے جائیں۔ جن کی خدا تعریف کرے اور خدا کی بات بات سے ان کی محبت ٹپکے پھر کمبختی ہے یا نہیں کہ ان کی بدی کرے اور برائیاں گائے۔ اور خدا کو اپنا دشمن بنائے

صحابہ کرام شیعوں کے بھی محسن ہیں

یا یوں کہیئے کہ منکران صحابہ کو جو نوبت کلمہ گوئی کی آئی اور بزعم خود مسلمان ہوئے تو یہ صحابہ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے نہ وہ جہاد کرتے نہ اس طرح اسلام پھیلتا اور نہ یہ کلام اللہ کا رواج ہوتا کہ شیعہ تک باوجودیکہ کلام اللہ کو ان سے کیا نسبت، کلام اللہ کی تلاوت سے مستفید ہوتے ہیں۔ پھر باینہمہ اگر ان کے شکر گذار نہوں تو پھر کس کے ہوں گے اور ان کے حق میں گستاخی کریں گے تو پھر کس کا ادب کرینگے ان سے زیادہ بڑھ کر اور کون کا نعمت ہوگا اس لئے جناب باری تعالےٰ نے دشمنان صحابہ کو کافر فرمایا۔

صحابہ کی تعریف قرآن کی پیشین گوئی ہے کہ آئندہ صحابہ کے دشمن پیدا ہونگے

پھر چونکہ علم غیبی میں صحابہ کی نسبت بدگوئی اور گستاخی کا ہونا متحقق تھا، تو جیسے مثال مذکور میں غمازوں کے لئے بیان کیا گیا تھا ایسے ہی غمازان صحابہ کو بھی سنا سنا کر یہ ارشاد فرماتے ہیں وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا یعنے حاصل اس کا اس صورت میں یہ ہوا کہ اے منکران صحابہ یہ جماعت صحابہ جن کی ہم تو تعریف کرتے ہیں اور تم پھر بھی ان کی بدگوئی سے باز نہیں آتے اور تسپر بھی نہیں سمجھتے

اگر بالفرض ایسے ہی ہیں جیسے تم کہتے ہو اور واقعی ان سے یہ خطائیں ہوئی ہیں جن کو تم گاتے پھرتے ہو تب کیا ہوگا ہم نے تو یہ وعدہ کرلیا تھا کہ ان میں سے جو ایمان رکھتا ہوگا اور اس نے اچھے اچھے عمل کئے ہونگے ہم اس کی خطائیں بھی معاف کردینگے۔ اور ان کو اجر عظیم بھی دیں گے پھر جب وہ سب کے سب کافروں کے ساتھ تیز وتند ہوں اور آپس میں محبت رکھتے ہوں نمازیں ہمیشہ مشغول رہیں سوائے خدا کی رضامندی اور اس کے افضال کے اور کہیں طلبگار نہ ہوں تو ہم ان کے گناہ کیونکر معاف نہ کریں اور انہیں کسی عذر سے ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کا اجر کیوں نہ دیں اس سے زیادہ ایمان اور اعمال صالحہ کی اور کیا صورت ہے۔

صحابہ سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ غیر مشروط ہے | اگر یہ شرط ہوتی کہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ گناہ بھی کسی قسم کا نہ کریں تب بھی ایک بات تھی۔ اس وعدہ میں تو یہ شرط نہ تھی اہل فہم اس سے سمجھ گئے ہوں گے کہ منھم جو بعد عملوا الصلحت کے بڑھایا ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ وعدہ حقیقت میں منکروں کے جواب کے لئے بیان کیا گیا ہے اور اس کی یہ صورت ہے جیسے مرقوم ہوئی۔ ورنہ یہ معنے اگر ہوں کہ کوئی ان میں سے ایمان لایا۔ اور عمل صالح کئے اور کوئی کافر ہی رہا نعوذ باللہ تو اس کو ہم جانتے ہیں۔ شیعہ بھی باور نہ کرینگے۔ اس لئے کہ خدا کے اتنے تو یہ بھی معتقد ہیں کہ خدا جسے مومن تبلادے وہ مومن ہی ہے کافر نہیں۔ سو خدا نے ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کی پہلے ہی گواہی دے دی بلکہ ایمان اور اعمال صالحہ میں سے بھی اول قسم کے ایمان اور اول قسم کے اعمال صالحہ کی گواہی دی کیونکہ ایمان میں تو اس سے بڑھ کر کوئی ایمان نہیں کہ خدا سے محبت اس درجہ کو پہنچے کہ اس کے دشمنوں سے کیسے ہی باشد اپنا ہو یا بیگانہ عداوت ہوجائے اور اس کے دوستوں سے کیسے ہی باشد محبت ہوجائے کیونکہ سب کے نزدیک بالاتفاق محبت اعلےٰ مقامات ایمان میں سے ہے اور پھر وہ بھی اس قدر۔

ایمان کے معنی اور مراتب یقین | اور وجہ اس کی ظاہر ہے اس لئے کہ ایمان کہتے ہیں کسی چیز کے یقین کرکے تسلیم کرلینے کو۔ سو اصطلاح شرع میں خاص خدا کے کمالات پر یقین کرلینا اور پھر ان کو تسلیم کرلینا یعنے مثلاً خدا احکم الحاکمین ہے تو اس کے ایمان کے یہ معنے ہوئے کہ اول تو خدا میں اس وصف کو یقینی سمجھے پھر تسلیم بھی کرلے سو حاکم کی حکومت کے تسلیم کرنے کے یہی معنے ہیں کہ اس سے منحرف

نہ ہوجائے علی ہٰذا القیاس سب کمالات کو سمجھو۔

علم الیقین | مگر یقین کے چند مرتبے ہیں۔ ایک تو علم الیقین یہ تو ادنیٰ مرتبہ ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی معتبر آدمی سے ہم سنیں کہ فلانی جگہ فلانی چیز ہے۔ ایسا یقین تو ہر ادنیٰ مسلمان کو حاصل ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو بالاتفاق سچے ہیں۔ ان کی خبر سے معلوم ہوا کہ خدا میں سب کمالات ہیں اگر اتنا یقین بھی نہ ہو تو ایمان ہی نہیں۔

عین الیقین | دوسرا رتبہ عین الیقین یعنی جو کانوں سے سنا تھا وہ آنکھوں سے دیکھ لیا سو اس مرتبہ میں یقین پہلی مرتبہ سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ سن کر گو کسی چیز کا یقین ہوجائے لیکن وہ بات نہیں ہوتی جو آنکھوں سے دیکھنے میں ہوتی ہے اسی واسطے خوبصورتوں کے قصے اکثر کانوں سے سنتے ہیں اور محبت نہیں ہوتی اور آنکھوں سے دیکھنے میں جو کچھ ہوتا ہے سب جانتے ہیں لیلے اور شیریں اور حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کے مرنے کے بعد کسی کو محبت نہ ہوئی حالانکہ شہرہ انکے حسن وجمال کا جتنا اب ہے۔ جب نہ ہوگا۔ بلکہ اس سے صاف یوں معلوم ہوگیا کہ سننے سے کسی کو محبت ہوتی ہی نہیں ورنہ حضرت یوسف علیہ السلام سے کسی کو تو محبت ہوتی اپنے زمانہ کے خوبصورتوں سے تو محبت ہوجائے اور ان سے نہ ہو، وجہ اس کی اور کچھ نہیں کہ سننے سے بوجہ صورت محبت پیدا نہیں ہوتی ورنہ حضرت یوسف علیہ السلام تو حضرت یوسف ہی تھے۔

اور جو کہیں سننے سے ہو بھی ہے تو وہ بھی دیکھنے ہی کا طفیل ہے یعنی آنکھوں سے جو خوبصورت نظر آتے ہیں اور ان کے دیکھنے سے ایک کیفیت ہوتی ہے تو پھر اگر سنتے ہیں کہ فلانا خوبصورت ہے تو اسے اپنے تجربہ سابق پر قیاس کرلیتے ہیں اور اس وجہ سے گونہ اشتیاق پیدا ہوجاتا ہے ورنہ فقط سننے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے مادرزاد اندھے کو جسے شکل وصورت کا تصور ہی نہیں ہوتا اور خوبصورت اور بدصورت کو ہرگز نہیں سمجھتا اس کو بوجہ صورت کسی سے محبت نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ سب جانتے ہیں بالجملہ عین الیقین کے درجہ میں اگر کوئی چیز جمیل و مجموعہ کمال ہوتی ہے تو اس سے بشرط مناسبت طبیعت محبت ہوجاتی ہے

حق الیقین | پھر ایک مرتبہ یقین کا حق الیقین ہے وہ یہ ہے کہ جس چیز کو آنکھوں سے دیکھا ہے اس کے استعمال اور برتنے کا بھی اتفاق ہو جیسے پانی کا ایک تو دیکھنا پھر دیکھ کر اسے پی بھی

لینا، اب پینے کے بعد یہ احتمال ہے کہ شاید سیراب ہو یا دیکھنے میں کچھ غلطی ہوئی ہو باقی نہیں رہتا غرض یہ مرتبہ یقین ہونے میں عین الیقین سے بڑھ کر ہے اس مرتبہ میں وہ محبت جو دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

محبت حق الیقین کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے

بلکہ حقیقت میں دیکھئے تو محبت اسی درجہ میں پیدا ہوتی ہے اس لئے کہ پانی سے جو محبت ہے تو اسی وجہ سے ہے کہ وہ پیاس کو بجھاتا ہے سو یہ بات تو پینے ہی سے معلوم ہوئی۔ اگر کوئی شخص ایسا فرض کرو کہ اس نے نہ کبھی پانی دیکھا ہو نہ سنا ہو نہ اس کی تاثیر معلوم ہو اور نہ اسے کبھی پانی کی ضرورت ہوئی ہو۔ پھر اسے ایک دفعہ ہی پیاس لگے اس وقت اس کے سامنے اگر پانی آجائے تو وہ کیا جانے کہ اس میں یہ تاثیر ہے اور اس سے میری پیاس بجھ جائے گی بجز اس کے کہ یا تو خدا اس کے جی میں ڈالدے کہ اسے استعمال کیجے یا کوئی اسے تبلادے اسے ہرگز پانی کی طرف یہ گمان نہ ہوگا۔ لیکن خوبصورتوں کو دیکھنا اس وجہ سے برتنا ہی ہے کہ جیسے گلزار کے دیکھنے سے جی کو راحت ہوتی ہے ویسے ہی ان کے دیکھنے سے جان و دل کو آرام ہوتا ہے۔ بالجملہ عقل سلیم یوں کہتی ہے کہ محبت حق الیقین کے مرتبہ میں ہوتی ہے چنانچہ واضح ہوگیا۔ اگر اندیشہ تطویل نہوتا تو انشاءاللہ تعالےٰ اس بحث کو پورا بیان کرتا مگر ناچار ہوں فرصت کم پھر اپنا حرج اوقات، ادھر جواب خط کی جلدی۔ لہٰذا ان ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

صحابہ حق الیقین کے مراتب پر فائز تھے اور حب فی اللہ اور بغض فی اللہ میں بھی راسخ ہے

بالجملہ محبت مرتبہ حق الیقین میں پیدا ہوتی ہے اور یہ اعلیٰ قسم یقین کی ہے اور پھر محبت میں اعلےٰ قسم یہ ہے کہ محبوب کے لواحق و توابع تک محبت پہنچ جائے اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کے دشمنوں سے عداوت ہو جائے سو جب جناب باری تعالےٰ نے سب صحابہ کے حق میں اس بات پر گواہی دی کہ ان کے دل میں ہمارے دشمنوں کی دشمنی اور ہمارے دوستوں کی دوستی ہے تو صاف واضح ہو گیا کہ ان کے دل میں خدا کی محبت پہلے ہے۔

باقی کوئی یوں کہے کہ مسلمانوں سے محبت ہونے کو کیا لازم ہے کہ خدا ہی کے سبب سے ہو، محبت کے بہت اسباب ہیں، نسب کی وجہ سے ہوتی ہے احسان اور سلوک اور دوستی

کے سبب سے ہوتی ہے، علاوہ اس کے اور بہت صورتیں ہیں۔ علےٰ ہٰذا القیاس دشمنی کی بہت وجوہ ہیں۔ جب تک یہ متحقق نہ ہو کہ وہ محبت اور دشمنی خدا کے سبب سے ہے، تب تک مطلب ثابت نہیں ہوتا۔

جواب اس کا اول تو یہ ہے کہ جب کسی وصف کے ساتھ محبت اور دشمنی کو متعلق کرتے ہیں تو عرف میں وہ محبت اور دشمنی اس وصف ہی کی وجہ سے سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی یوں کہے کہ مجھے خوبصورتوں سے محبت ہے یا عالموں سے محبت ہے، علی ہٰذا القیاس کوئی یوں کہے کہ مجھے متکبروں سے عداوت ہے یا کافروں سے عداوت ہے تو کوئی ناانصاف بھی اس کے سمجھنے میں تامل نہیں کرتا کہ یہ محبت اور یہ عداوت ان اوصاف ہی کی وجہ سے ہے اور یوں کسی کو احتمال بھی نہیں ہوتا کہ شاید کسی اور وجہ سے ہو سو خدا نے بھی اشداء علی الکفار کہا ہے یعنی کافروں پر بڑے تیز و تند ہیں اور کافر کے یہی معنے ہیں کہ خدا کا دشمن ہو تو معلوم ہوا کہ ان کی عداوت بوجہ کفر ہے کسی اور وجہ سے نہیں اور جب بوجہ کفر ہوئی تو خدا ہی کی محبت کے سبب ہوئی ایسے ہی رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کو سمجھئے۔ یعنی ایک دوسرے کو جو آپس میں محبت ہے تو فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اور آپ کے زمرہ میں داخل ہو جانے کے باعث ہے اور اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ خدا کے متعلقوں میں سے ہیں اور جب یہ سمجھ کر ہوئی تو وہی خدا واسطے کی محبت ہوئی۔

صحابہ کا مقصود صرف رضائے الٰہی تھا

معہٰذا یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا نے اس بات کو خوب ثابت کر دیا کہ ان کے ہر کام میں خدا کی رضامندی مدِ نظر ہے، سو کفار سے سختی کی باتیں اور آپس کی عنایاتیں سب خدا کی رضامندی کے لئے کرتے ہیں اور خدا کی رضامندی کی طلبگاری عین نشان محبت ہے۔ سوا محبت کے اور کوئی وجہ رضا کی طلب گاری کی ممکن ہی نہیں اور بہشت کی تمنائیں جو لوگ خدا کی مرضی کے کام کرتے ہیں تو وہ حقیقت میں مرضی کی طلب نہیں ہوتی جنت کی طلب ہوتی ہے جیسے فقیر روٹی کی وجہ سے مالداروں کی خوشامد کرتے ہیں تو وہ حقیقت میں ان کی رضا کے طالب نہیں، مقصود اصلی ان کا روٹی ہی ہوتا ہے بالجملہ رضاجوئی محب ہی کا کام ہے۔

الغرض صحابہ کرام کو جو کفار سے عداوت اور اپنے لوگوں سے محبت تھی تو وہ فقط خدا ہی کی محبت کا ثمرہ تھا۔

صحابہ کی محبت اور تسلیم سے اوپر کسی محبت و تسلیم کا درجہ ہی نہیں ہے

اور چونکہ محبت مرتبہ حق الیقین میں ہوتی ہے اور وہ اعلےٰ درجہ یقین کا ہے تو لازم آیا کہ سب صحابہ کو خدا کی عظمت اور جاہ و جلال اور کمال اور جمال کا اتنا یقین تھا کہ اس سے اوپر کوئی یقین کا مرتبہ ہی نہیں ادھر تسلیم اس درجہ کو تھی کہ اس کے آثار خود موجود تھے چنانچہ باری تعالےٰ نے خود اس کی خبر دی اور کہا تَرٰاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا الخ اگر تسلیم نہ ہوتی تو یہ اعمال کیوں کرتے اور یہی الفاظ بمعیت جملہ يَبْتَغُونَ الخ ان کے اعمال صالحہ کی بھی خبر دیتے ہیں تو اب بوجہ اکمل ان کا ایمان کامل اور اعمال صالحہ جن پر وعدۂ مغفرت اور اجر عظیم تھا ثابت ہوگیا تو پھر یہ احتمال کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہیوں میں سے کوئی مسلمان تھا اور کوئی نہ تھا اور اس وجہ سے مِنْهُمْ فرمایا تو یہ شیعوں ہی سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اگر بدیہیات کا انکار اور محال کی تسلیم ممنوع ہوتی تو سنیوں کے مذہب سے رو گرداں ہو کر مذہب شیعہ پر کیوں مستقیم رہتے اگر اندیشۂ تطویل نہ ہوتا تو اس دعوے کی دو چار دلیلیں بیان کرتا مگر سمجھنے والے اسی رسالہ میں سے اس مطلب کو سمجھ جائیں گے ان کے لئے یہی دلیل بہت ہے

حق الیقین کے مراتب میں تفاوت ہے

باقی کوئی یوں کہے کہ صحابہ کو اگر مرتبہ حق الیقین تھا اور وہ اعلےٰ مراتب یقین ہے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے انہوں نے کوئی مرتبہ ہی نہ چھوڑا صحابہ کیوں کہتے ہو رسول کہو تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ علم الیقین میں سو آدمیوں سے اگر ایک خبر سنیں اور اس پر یقین ہو جائے تو وہ بھی علم الیقین ہے اور ہزار سے سنیں تب بھی علم الیقین ہے لیکن بایں ہمہ دوسرا یقین قوی ہے۔ علی ہذا القیاس کوس بھر سے ایک شئے دیکھئے وہ بھی عین الیقین ہے اور ایک ہاتھ کے فاصلے سے دیکھئے وہ بھی عین الیقین ہے لیکن دوسری صورت میں جو وضاحت ہے وہ پہلی صورت میں نہیں، اسی طرح ایک دفعہ پانی پیجئے یا تھوڑا سا چکھئے وہ بھی حق الیقین ہے اور کئی بار چکھئے یا بہت سا پیجئے وہ بھی حق الیقین ہے بایں ہمہ دوسری صورت میں جو بات ہے وہ پہلی صورت میں نہیں ایک دفعہ میں بسا اوقات چنداں حال معلوم نہیں ہوتا ہاں کئی بار میں البتہ خوب معلوم ہو جاتا ہے۔

الغرض حق الیقین میں شریک ہونے سے مساوات لازم نہیں آئی۔ بایں ہمہ مدار فضلیت

کا محبت پر ہے معلوم ہونے پر نہیں بسا اوقات ایک خوبصورت کو دو آدمی برابر دیکھتے ہیں ایک کو محبت ہوتی ہے ایک کو نہیں اور جو ہوتی بھی ہے تو برابر نہیں ہوتی سو صحابہ کو خدا تعالےٰ سے اتنی محبت نہ تھی جتنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا سے تھی۔

باہمی مناقشات رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کے منافی نہیں ہیں

اب ایک بات قابل بیان کے اور باقی ہے وہ یہ ہے کہ شاید حضرات شیعہ کو موافق مثل مشہور۔ خوئے بد را بہانہ ہا بسیار۔ صحابہ کی بزرگی کے تسلیم کرنے میں یہ حیلہ اور باقی ہو کہ صحابہ میں باہم اکثر مناقشات ہوئے اور ان کے باہم اکثر رنج رہے اور نزاع ظہور میں آئے، چنانچہ طرفین کی کتابوں میں موجود ہے پھر ان کو رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کیونکر کہیں اور جب یہ نہیں تو پھر کس وجہ سے یوں کہا جائے کہ وہ کامل الایمان تھے بلکہ یوں احتمال ہوتا ہے کہ جن سے حضرت امیر کو رنج پہنچا یا وہ ان سے لڑے نہ وہ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کے مصداق تھے نہ ان پر اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ صادق آتا تھا اور لفظ مِنْهُمْ جو بعد عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بڑھایا ہے تو انہی کے اخراج کے لئے بڑھایا ہے اس شبہ کا جواب ہر چند فقط ہمارے ہی ذمہ نہیں کیونکہ بعینہ یہی احتمال خوارج اور نواصب بھی پیش کر سکتے ہیں شیعوں کو بھی اس اعتراض کا فکرِ جواب لازم ہے

صحابہ کی رنجش کی بنا بھی محبت تھی

مگر بغرض تسکین خاطر شیعہ و سنی یہ معروض ہے کہ رنج دو وجہ سے ہوتا ہے ایک بوجہ عداوت ایک بوجہ محبت بوجہ عداوت کی تو صورت ظاہر ہے۔ دشمنوں کو جو دشمنوں سے رنج ہوتے ہیں وہ اسی قسم کے ہیں باقی بوجہ محبت کے یہ صورت ہے کہ کسی کا دوست اس کے خلاف مرضی اور خلاف توقع کرے تو یہ رنج بوجہ محبت ہے اس لئے کہ اگر اجنبی ایسی باتیں کرتے ہیں تو ان سے کچھ رنج نہیں ہوتا۔ اس سے خوب معلوم ہوتا ہے کہ یہ رنج فقط محبت کا ثمرہ ہے اگر محبت نہ ہوتی تو یہ رنج نہ ہوتا۔ ایسے ہی اگر صحابہ کو بھی سمجھ لو تو بہت ہوگا تو یہی ہوگا کہ خدا کے کلام کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

سو نعوذ باللہ مثل زرارہ بن اعین اور احول طاق وغیرہ مقتدایان شیعہ جو بشہادت ائمہ اور کتب جھوٹے اور کذاب ہیں چنانچہ انشاء اللہ مذکور ہوگا کچھ خداوند کریم تو جھوٹا اور کذاب نہیں ہے جو اتنا دشوار معلوم ہو مگر جن کو جھوٹی باتوں کے تسلیم کرنے کی خو ہو وہ سچے کلام

اگرچہ مدائنی کا کیوں نہ ہو کیونکر تسلیم کرلیں۔

جن روایات پر تشیع کی بنیاد ہے انکے راویوں کی ثقاہت کا حال،	معہذا ہم یوں پوچھتے ہیں کہ سنی تو حسب اعتقاد شیعہ اس قابل ہی نہیں کہ ان کی کتابوں کی روایات کو تسلیم کیا جائے

باقی رہی شیعوں کی روایتیں ان کا حال یہ ہے کہ جن راویوں سے شیعہ اپنے دین ایمان کی باتیں لیتے ہیں اور مابین شیعہ اور حضرات ائمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین وہ واسطے ہیں ان کا حال یہ ہی کہ ہشام بن سالم اور میثمی اور صاحب طلق یعنی احول طلق وغیرہم جو ان کے مقتدا اور پیشوا اور احادیث معمول بہا کے راوی ہیں ان کی جو کچھ خوبیاں اور بزرگیاں ہیں اور حضرات ائمہ نے ان کے فضائل بیان کئے ہیں وہ سب تو اس رسالہ میں نہیں آسکتے پر بطور نمونہ کچھ معروض ہے کلینی جو اصح الکتب شیعہ ہے اس میں یہ حدیث ہے۔

عن ابراھیم محمد بن الحزن ارو محمد بن الحسنین قالا دخلنا علی ابی الحسن الرضا علیہ السلام فقلنا ان ھشام بن سالم والمیثمی وصاحب الطلق یقولون ان اللہ تعالی اجوف الی السرۃ والباقی صمد فخر للہ ساجدا ثم قال سبحانک ما عرفوک ولا وحدوک فمن اجل ذلک وصفوک

حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ ابراہیم بن محمد خزار اور محمد بن حسین بیان کرتے ہیں کہ ہم امام ابوالحسن رضا علیہ السلام کے پاس گئے ہمنے کہا کہ ہشام بن سالم اور میثمی اور صاحب الطلق یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالی ناف تک تو کھوکھلا ہے اور باقی ٹھوس ہے آپ سنتے ہی سجدے میں جا پڑے اور یہ فرمایا کہ الٰہی تو پاک ہے ان عیوب سے نہ ان لوگوں نے تجھے پہچانا اور نہ انہوں نے تجھے وحدہ لاشریک لہ جانا اس سبب سے جو کچھ انکے منھ میں آتا ہے بک دیتے ہیں۔

دوسری روایت بھی کلینی ہی کی ہے۔

عن علی بن حمزۃ قال قلت لابی عبد اللہ علیہ السلام سمعت ھشام بن الحکم یروی عنکم ان اللہ جسم صمدی نوری معرفتہ ضرورۃ یمن بھا علی من یشاء من عبادہ فقال سبحان من

حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ ابن حمزہ کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کہا کہ ہشام بن حکم تم سے روایت کرتا ہے کہ خدا جسم ہے ٹھوس، سو اس کے جواب میں حضرت امام ہمام رضی اللہ عنہ

لا یعلم احد کیف ھو الا ھو لیس کمثلہ شیء وھو السمیع البصیر لا یحد ولا یحس ولا یحیط بہ شیء ولا جسم ولا صورۃ ولا تخطیط

نے کچھ ایسا ہی فرمایا جیسا امام ابوالحسن رضا نے فرمایا تھا مطلب قریب قریب ہے

الغرض روایتوں کو دیکھئے کہ مقتدایان امامیہ نے کیا کیا معرفتیں تراشی ہیں پھر تیسرا اماموں کا حوالہ دیتے ہیں علی ہذا القیاس بعضے ان کے مقتدا اور پیشوا خدا کی نسبت یہ عقیدہ رکھتے تھے، کہ خدا ازل میں جاہل تھا جیسے زرارہ بن اعین اور بکر بن اعین اور سلیمان جعفری اور محمد بن مسلم وغیرہم اور کہاں تک بیان کروں۔ ایسے ایسے بزرگواروں سے دین کی باتیں روایت کرتے ہیں اور پھر ان روایتوں کو صحیح سمجھتے ہیں اور ان کا نام صحاح رکھتے ہیں اور یہ افسانے انہی کی معتبر کتابوں سے معلوم ہوتے ہیں یقین ہے کہ علماء سب تسلیم کرینگے

اور اگر موافق عادت بزرگان (دروغ پسندگی) سنیوں کے سامنے جھوٹ بول جائیں۔ اور انکار کر جائیں تو اپنے دل میں تو ضرور ہی منفعل ہونگے۔ سبحان اللہ اس بات کی رعایت تو سنیوں میں ہے کہ جن کتابوں کا صحاح نام رکھتے اور انہیں معتبر سمجھتے ہیں ان میں بجز پارساؤں اور متقیوں اور دینداروں کے اور کسی سے روایت نہیں لاتے۔ اور جو لاتے بھی ہیں تو اس غرض سے کہ کوئی اس روایت کی وجہ سے دھوکا نہ کھاجائے اسی لئے بتلا جاتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے یا موضوع یعنے بنائی ہوئی جھوٹی روایت ہے الغرض شیعوں کے دین کی روایتوں کا جب یہ حال ہے تو کتب تواریخ تو نور علی نور ہی ہوں گی اور سنیوں کی روایت خود قابل اعتبار نہیں تو اس صورت میں جو روایتیں کہ نزاع صحابہ اور باہم کی چپقلش پر دلالت کرتی ہیں۔ کلام اللہ کے مقابلہ میں کیونکہ قابل اعتبار ہونگی بہرحال کلام اللہ متواتر تو ہے۔ جس صورت میں کلام اللہ میں رحماء بینھم ہو اور اس کے تمہارے نزدیک یہی معنے ہوں کہ ان میں ہرگز کبھی رنج ہوتا ہی نہیں تو موافق قاعدہ اصول کے ان روایات کا اعتبار نہ ہوگا جو کلام اللہ کے مخالف ہیں اب بفضلہ تعالے جمیع امور متعلقہ آیت مرقومۂ بالا سے فراغت پائی لازم یوں ہے۔ کہ ایسی آیت بھی جو صحابہ کی بزرگی پر ایسے دلالت کرے کہ اظہر من الشمس ہو اور بسہولت فہم میں آجائے اور اس روایت سے ان کا حسن خاتمہ بھی معلوم ہوجائے بیان کی جائے شاید کوئی راہ پر آجائے لہذا آیت ششم معروض خدمت ہے۔

وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

حاصل اس کے معنوں کا یہ ہے کہ جو لوگ قدیم میں پہلے وطن چھوڑنے والے اور مدد کرنیوالے اور جو ان کے پیچھے آئے نیکی کو اللہ راضی ان سے اور وہ راضی اس سے اور تیار کر رکھے ہیں اللہ نے ان کے لئے باغ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں، رہا کریں وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ، یہی ہے بڑی مراد ملنی۔

اس آیت کے بعد ہم جانتے ہیں کہ اگر حق پرستی مد نظر ہوگی تو مولوی عمار علی صاحب تو کس گنتی میں ہیں شیعہ صد سالہ بھی جس کی رگ و پے میں تشیع سما گیا ہو حق بول اٹھے اور کیونکر حق نہ بولے جناب باری تعالےٰ نے اس آیت میں منکران اکابر صحابہ کے لئے حیلہ و حجت کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

آیت ہجرت میں رضائے الٰہی کا مدار صرف ہجرت پر ہے لہٰذا ردّ کا الزام بھی مفید مقصد نہ ہوگا!

اگر ایمان کا ذکر ہوتا یا اعمال صالحہ کا ذکر ہوتا تو شیعہ اور خوارج اور نواصب آنکھیں بند کر کے یوں بھی کہہ سکتے کہ صاحب اس میں مومنوں اور اچھے عمل والوں کے لئے خدا کا وعدہ ہے۔ سو ہم کہتے ہیں کہ وہ دائرہ ایمان ہی سے خارج تھے سبقت ہجرت خلفائے ثلثہ اور حضرت زبیر اور حضرت طلحہ وغیرہم مہاجرین اولین کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں جو انکار کر سکیں اور کہدیں کہ صاحب کسی نے تہمت لگا دی ہوگی خصوصًا خلیفہ اوّل کی ہجرت کہ وہ حضرت علی کی ہجرت سے بھی سابق ہے اور مہاجرین اولین تو انہیں لوگوں کی نسبت اول گنے جائیں گے جو بعد جنگ بدر کے آئے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تو مہاجرین اولین میں سے بھی مہاجر اول نکلے، اس صورت میں تو اسی آیت سے ان کی افضلیت نکل آئی۔ کیونکہ درصورتیکہ اس آیت میں جتنے وعدے ہیں وہ سب سبقت ہجرت پر (مثلاً) موقوف ہوئے۔ تو جو کوئی سبقت میں بھی سابق ہوگا وہ استحقاق وفائے وعدہ میں بھی اول نمبر ہوگا اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو البتہ ابوبکر صدیق سے اتنے پہلے گھر چھوڑ کر آئے کہ ابوبکر صدیق کے گھر تک پہنچے باقی سب ان سے پیچھے ہی نکلے۔

ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ منورہ کے درمیان عجیب و غریب فرق

اور ہجرت حبشہ اگرچہ ہجرت مدینہ منورہ

سے سابق ہے لیکن اس کی وجہ سے سابق ہونا چنداں موجب افضلیت نہیں اس ہجرت کی اباحت کا باعث تھا تو فقط قلت صبر تھا مکہ معظمہ میں رہ کر پکا رہنا اور احکام خداوندی کا بجالانا بہت دشوار تھا ثبات ایمان اور حفظ جان کے لئے ضعفا کو رخصت ہو گئی تھی اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم ہجرت حبشہ نہ ہوا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے حکم نہ ہونیکی اگر کوئی وجہ تبکلف نکال بھی لیجئے تو اس کا کچھ جواب ہی نہیں کہ جس نے حبشہ کی جانب ہجرت نہ کی اس پر کچھ عتاب نہ ہوا اور مدینہ منورہ کی ہجرت بغرض امداد دین تھی اس کو رخصت نہیں کہہ سکتے۔ عزیمت ہی کہیئے تو اول درجہ کی عزیمت کہئے اسی لئے اس کے تارکین مورد عتاب رہے ہرچند ہجرت حبشہ کا رخصت ہونا اور ہجرت مدینہ منورہ کا عزیمت ہونا قطع نظر ظاہر ہونے کے اس تقریر سے اور بھی واضح ہو گیا بمگر مزید توضیح کے لئے اسقدر اور بھی محفوظ خاطر رہے کہ ہجرت مدینہ میں جان پر کھیلنا تھا اور ہجرت حبشہ میں جان کا بچانا، اس میں دین کا بڑھانا تھا۔ اس میں اپنی نماز روزہ کا بجالانا، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد و نصرت تھی اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تنہا چھوڑ جانا۔ اس میں مارنا مرنا۔ اقربا سے رؤسا سے جہاد کرنا۔ اس میں اعدا کے ہاتھوں سے چھوٹ کر سلامت گزرنا؛ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا ؛ غرض ہجرت حبشہ کوئی فضیلت قابل تعریف نہیں خصوصًا تعریف خداوندی۔

آیت السابقون میں ہجرت سے مراد صرف ہجرت مدینہ منورہ ہے۔

اسی لئے فریقین میں سے کسی نے اس ہجرت کو مصداق آیات تاکید ہجرت یا آیات فضائل ہجرت نہیں سمجھا اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ آیت اور نیز آیات ہجرت مدینہ منورہ کی ہجرت کے بعد نازل فرمائی ہیں اور پھر اس آیت میں اور نیز اور آیات میں مہاجرین کے فضائل میں انصار کو بھی ذکر فرمایا اور سورۂ حشر میں مہاجرین کے حال میں لفظ ینصرون اللہ بڑھایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ فضیلت اسی ہجرت کے لئے ہے جو انصار کی نصرت کے ہمدوش اور ان کے کام سے ہم آغوش ہے سو ایسی ہجرت اگر ہے۔ تو مدینہ منورہ کی ہجرت ہے۔ حبشہ کی ہجرت میں نہ انصار تھے نہ نصرت تھی بہر حال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی اور حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہم کی سبقت ہجرت میں کچھ کلام نہیں۔

آیت ہجرت سے صرف رضائے الٰہی ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کا ایمان اور اعلیٰ درجہ کے اعمال صالحہ بھی ثابت ہوتے ہیں۔

پھر اس سبقت ہجرت ہی کے سبب خداوند کریم یوں فرماتا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہوا، سو اول تو یہی کفایت کرتا تھا کیونکہ رضا سے آگے کوئی مقام ارفع نہیں جب خدا ان سے راضی ہوا تو ان میں کمال ایمان بھی اس درجہ کو ہوگا کہ کہا نہیں جاتا، اور اعمال صالحہ بھی ان کے قرار واقعی صالح ہوں گے، سو اول تو موافق آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَّأَجْرًا عَظِيمًا مرقومہ بالا کے ان کی مغفرت میں کلام کی گنجائش نہ رہی کیونکہ بزرگان مذکور سب کے سب غزوہ حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔

دوام جنت کی خوشخبری سے بڑھ کر حسن خاتمہ کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے

معہذا پھر یوں بھی ارشاد فرمایا کہ ان کے لئے جنتیں تیار کر رکھی ہیں پھر وہ بھی ہمیشہ کے لئے، اس پر بھی کوئی ان کی بزرگی میں شک کرے تو بجز اس کے نہیں ہو سکتا کہ بزرگی کے معنے اس کے نزدیک یہ ہوں کہ خدا اس سے ناخوش ہو اور اس کے لئے جہنم تیار کر رکھی ہو، سو حضرات شیعہ جو ان بزرگواروں کی بزرگی میں کلام کرتے ہیں اور ان کے دشمنوں کو اکثر بزرگ سمجھتے ہیں تو شاید اسی اصطلاح کے موافق سمجھتے ہیں لیکن اس صورت میں لازم آئے گا کہ حضرت امیر سے بھی دست بردار ہوں کیونکہ وہ بھی بشارت میں داخل ہیں۔ بہرحال ان اولیاء اللہ کے برا کہنے والے ان کو کیا کہتے ہیں۔ خدا کو جھٹلاتے ہیں۔ سو ان کا کافر یا فاسق کہنا، اپنا کافر یا فاسق کہنا ہے۔ آفتاب کو کوئی بے نور بتلائے تو وہ آفتاب کو کیا اپنی آنکھوں کو بے نور بتلاتا ہے۔

آیات فضائل صحابہ میں جو شبہات شیعہ پیش کریں گے۔ وہی بعینہٖ خارجی بھی حضرت علی کے بارے میں پیش کر سکتے ہیں

اس کے بعد اتنی اور گذارش ہے کہ بعضے ہٹ دھرم شاید یوں تکرار کریں کہ خدا پہلے راضی ہو گیا ہو، اور پھر جب حضرت امیر سے مخالفت کی ہو تو ناراض ہو گیا ہو اور ان کیلئے جو جنتیں تیار کر رکھی ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو عذاب نہیں ہونے کا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اول عذاب ہو لے اور پھر وہ جنتوں میں چلے جائیں تو اس کا جواب ہر چند قابل جواب نہیں خصوصاً شیعہ کے مقابلہ میں کیونکہ خوارج بھی بنسبت حضرت امیر کے اس قسم کی آیات میں بعینہٖ یہ احتمال پیدا کر سکتے ہیں

یہاں تک کہ جن آیات میں مغفرت کا ذکر آیا ہے اسے بھی یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ مغفرت ہے جو بعد عذاب کے ہوگی۔ لیکن نقل مشہور ہے کہ "حیلہ جو را تا بدر دروازہ باید رسانید"۔

صحابہ کے لئے قیامت میں رسوائی نہیں اور کفار اور فساق کے لئے رضائے الٰہی نہیں

اس لئے کہا جاتا ہے کہ اول تو سورۂ تحریم میں یوں ارشاد ہے يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ یعنی "جس روز کہ نہ رسوا کریگا اللہ نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں" سو ان کے ایمان میں تو شیعہ بھی کلام نہیں کر سکتے اس لئے کہ کلام اللہ موجود ہے إِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْكٰفِرِينَ یعنے اللہ راضی نہیں ہوتا کافروں سے بلکہ یوں بھی آیا ہے إِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِينَ یعنے اللہ راضی نہیں ہوتا فاسقوں سے سو جب خدا ان سے راضی ہوا تو ان کے رسول اللہ کے ساتھ ایمان لانے میں تو کچھ شک نہ ہوا بلکہ اس بات میں بھی تردد نہ رہا کہ وہ ایک زمانہ میں (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زمان حیات میں سے) صالحین میں سے تھے فاسق تک نہ تھے تو بیشک موافق وعدہ الٰہی کے وہ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیامت کو معزز اور محترم رہیں گے۔ پھر عذاب آخرت کے کہ اس سے بڑھ کر کوئی رسوائی نہیں کیا معنے۔ مگر شاید ان الٹوں سمجھ کے ماروں کے نزدیک یہی معنے عذاب کے ہوں دوسرے یہ کہ سورۂ انبیاء میں یوں ارشاد ہے

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنٰى أُولٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ خَالِدُونَ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰئِكَةُ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ

"حاصل اس کا یہ ہے۔ جنکے لئے ہمارے یہاں عمدہ مرتبہ مقرر ہو لیا ہے وہ اس دوزخ سے دور رہیں گے نہیں سنیں گے اس کی آہٹ تک اور وہ اپنی جی چاہتی چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے، نہ غم ہوگا ان کو اس بڑی گھبراہٹ میں، اور لینے آدینگے انکو فرشتے یوں کہتے ہوئے یہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ تھا۔"

اب خیال کیجئے کہ جن سے خداوند کریم وعدہ فوز عظیم فرمائے اور تسلی آمیز کلام سے انکو اطمینان دلائے ایسوں کو مستحق عذاب جاننا نااہلوں کا کام ہے اور وعدہ کا پہلے سے مقرر ہونا آپ ظاہر ہے کہ ابھی سے وعدہ ہو لیا اور وہیں وعدہ کے موافق تسلیاں ہو لیں پھر ان کے لئے عذاب کا ہونا لیے

اس کے نہیں ہو سکتا کہ نعوذ باللہ خدا اپنے وعدے سے ہٹ جاوے؟ سو خدا تعالےٰ اشیعان علی کی طرح سے تو ہے ہی نہیں نعوذ باللہ منہا کہ آج تقیہ کرکے سب کچھ کہہ لیا پھر وقت پر آنکھیں بدل لیں۔

صحابہ کے مشاجرات نہ کفر تھے نہ فسق کیونکہ دونوں رضا کے منافی ہیں

اس تقریر سے یہ واضح ہوگیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محاربہ یا شکر رنجی نہ موجب کفر ہے جیسے اکثر شیعہ کہتے ہیں نہ موجب فسق نہیں تو خدا لوگوں سے کیوں راضی ہوتا اس لئے کہ وہ خود فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ بلکہ انکار امامت حضرت امیر بھی موجب کفر و فسق نہیں کیونکہ تمام جماعت مہاجرین و انصار سوا دو چار آدمیوں کے سب ان کی امامت کے شیعوں کے نزدیک منکر تھے اور اسی کی موید نہج البلاغت میں جو اصح الکتب شیعہ ہے حضرت امیر سے در بارہ محاربہ امیر معاویہ یوں مروی ہے اَصْبَحْنَا نُقَاتِلُ اِخْوَانَنَا فِی الْاِسْلَامِ عَلٰی مَا دَخَلَ فِیْہِ مِنَ الزَّیْغِ وَالْاِعْوِجَاجِ یعنی ہم اپنے مسلمان بھائیوں سے اس سبب سے لڑتے ہیں کہ اسلام میں کچھ کجی کی باتیں داخل ہوگئی ہیں" اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ منکر امامت حضرت امیر اور ان سے لڑنے والے کافر نہیں اور امیر معاویہ باوجود اس مخالفت اور انکار امامت کے چنانچہ سب کو معلوم ہے حضرت امیر کے نزدیک مسلمان ہی تھے اب اگر شیعہ مذہب کو تھامنا چاہیں تو ان روایات کی تغلیط اور تکذیب کریں جن سے محاربات صحابہ اور مشاجرات ان کے حضرت امیر کے ساتھ ثابت ہوتے ہیں۔ نہیں تو یہی کریں کہ کلام اللہ میں سے ان آیات کو بن پڑے تو اڑا دیں۔ آخر حضرت عثمان نے حضرت امیر کے استحقاق امامت کے مخفی کرنے کے لئے گیارہ ہزار آیتوں کے قریب اڑا دیں حالانکہ واجبات کا مخفی کرنا سخت گناہ ہے بشیعہ تو بزعم خود نیک ہی کام کرینگے اور جب حضرت امیر سے لڑنا اور ان کی امامت کا انکار تک موجب کفر و فسق نہ ہوا حالانکہ امامیہ کے نزدیک مثل شہادتین اقرار امامت حضرت امیر بھی جز ثالث ایمان ہے تو اور گناہ جو اس سے کمتر ہیں وہ کاہے کو موجب کفر و فسق ہوں گے اس صورت میں حضرت امیر معاویہ اور ان کے اصحاب بھی اس طعن سے شیعوں کے عقائد کے موافق بری ہونے چاہئیں۔

بہرحال آیت السابقون نے شیعوں کو جواب دندان شکن سنایا نہ یہ بن پڑے ہے

کہ اصحاب ثلثہ وغیرہم مذکورین کی نسبت یوں کہیں کہ وہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مسلمان ہوئے کیونکہ یہ آیت سورۂ توبہ میں ہے اور سورہ توبہ کل ایک دو برس پہلے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے نازل ہوئی ہے یہ سب صاحبان مکہ میں مسلمان ہو لئے تھے نیز اس کی گنجائش کہ لفظ باحسان ہی کو ملے یا نہ ملے دھینگا دھینگی سے مہاجرین اور انصار کے ساتھ ملا کر کچھ باب گفتگو کشادہ کریں، کیونکہ اتبعوا ہم کے متعلق ہے اور پھر وہ جملہ ہے اور جملہ بھی موصول ماقبل تک کیونکر لے جائیں؟

عقیدۂ تفضیل ائمہ پر آیت اعظم درجۃ کی ضرب کاری

معہذا طرفہ تماشا یہ ہوگیا کہ اس آیت اور دو تین دوسری آیتوں کے وسیلے سے جو اس آیت کے ذیل مذکور ہوئیں سنی اصحاب ثلثہ کیا بلکہ تمام مہاجرین اور انصار کا ایمان ثابت کرکے امامیہ کے ایک اور عقیدہ کو خاک میں ملا سکتے ہیں وہ عقیدہ یہ ہے کہ حضرات ائمہ سب کے سب امتیوں سے تو کیا انبیاء سے افضل ہیں اور وجہ اس عقیدہ کی پامالی کی یہ ہے کہ سورۂ توبہ ہی میں (ان صحابہ کے حق میں جو ایمان بھی لائے اور ہجرت بھی کی اور جان و مال سے خدا کی راہ میں جہاد بھی کیا) یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کا مرتبہ اور امتیوں سے اعلےٰ ہے پھر اس میں کچھ تخصیص امام اور غیر امام کی نہیں تو معلوم ہوا کہ سوائے حضرت علی کے اور ائمہ اطہار اس رتبہ کو بھی نہ پہنچے تھے جو ان صحابہ کا ہے۔ نبی کا رتبہ تو درکنار تسکین خاطر کے لئے وہ آیت مرقوم ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَائِزُوْنَ یُبَشِّرُھُمْ رَبُّھُمْ بِرَحْمَۃٍ مِّنْہُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّھُمْ فِیْھَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ خَالِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ	یعنی جو لوگ کہ ایمان لائے اور انہوں نے وطن چھوڑ دیا اور خدا کی راہ میں مال و جان سے جہاد کیا وہ سب میں بڑے درجہ والے ہیں اور وہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں بشارت دیتا ہے انکو رب ان کا، اپنی رحمت اور اپنی رضامندی اور باغوں کی جن میں ان کے لئے دوام کی نعمت ہے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے کیوں نہ ہو اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔

باب عقیدۂ بدا کی تفصیل میں!

بدا کی پر خار وادی اور علمائے شیعہ کا اضطراب اب حضرات شیعہ سے بجز اس کے کچھ نہیں بن پڑتی کہ یا تو حق بول اٹھیں یا یہ موافق مثل مشہور الضرورۃ تبیح المحظورات بحکم ضرورت پھر مذہب قدیم کی طرف رجوع کریں اور یوں کہیں کہ ہمیں کلام اللہ سے وہی ثابت ہوتا ہے جو سنیوں کا مطلب ہے لیکن خدا کا کیا اعتبار؟ جیسے اور بہت سے امور میں۔ (ہمارے عقیدہ کے موافق آج کوئی مانے یا نہ مانے) خدا کو بدا واقع ہوا ہے۔ صحابہ کی شان میں اور سنیوں کے حق میں اور کلام اللہ کی حفاظت میں بھی بدا واقع ہوا، پہلے یوں ہی ارادہ ہو جیسا کلام اللہ میں فرمایا بعد میں رائے بدل گئی ہو اور یہی معنے بدا کے ہیں۔

بدا کے ایک معنی چنانچہ نظام الدین جیلانی نے جن کو آج کل کے شیعہ شاید منافق تبلاتے ہیں رسالہ علم الہدیٰ فی تحقیق البدا میں لکھا ہے یُقَالُ بَدَا لَہٗ اِذَا ظَہَرَ لَہٗ رَأْیٌ مُخَالِفٌ لِلرَّأْیِ الْاَوَّلِ یعنی کہا کرتے ہیں کہ فلانے کو بدا واقع ہوا جب اس کو پہلی رائے کے مخالف کوئی دوسری رائے سوجھے، ملا نظام الدین جیلانی مذکور اسی رسالہ میں لکھتا ہے کہ شیخ ابو جعفر طوسی اور شیخ ابو الفتح کراجکی کا بھی بدا کے معنوں میں یہی مذہب ہے اس لئے کہ شیخ طوسی نے عدۃ میں اور شیخ کراجکی نے کنز الفوائد میں یہی تحقیق کی ہے۔

بدا کے دوسرے معنی مگر شریف مرتضےٰ نے ذریعہ میں جو کچھ تحقیق کر کے لکھا ہے۔ (اور طبرسی کے کلام میں سے بھی کچھ اسی کی بو آتی ہے) وہ اس کے خلاف ہے کیونکہ وہ لکھتے ہیں معنی قولنا بدا للہ تعالیٰ اَنَّہٗ ظَہَرَ لَہٗ مِنَ الْاَمْرِ مَا لَمْ یَکُنْ ظَاہِرًا یعنی ہم جو کہتے ہیں کہ خدا کو بدا ہوا تو اس کے یہ معنے ہیں کہ خدا کو کوئی ایسی بات معلوم ہوئی جو پہلے نہ تھی۔ پھر اس کے بعد ملا نظام الدین لکھتے لکھتے یوں لکھتا ہے کہ حاصل یہ ہے کہ خدا کو اشیاء نو پیدا کا علم ان کے وجود کے بعد حاصل ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد اپنی تحقیق لکھتا ہے۔ اور وہ تحقیق دوسرے معنوں پر منطبق آتی ہے وہ یہ ہے کہ خبر میں بھی بدا ہوتا ہے یعنی یوں بھی کبھی ہوتا ہے کہ آئندہ بات کی خبر دی کہ یوں ہوگی اور وہ اس طرح نہ ہو۔

بدا کے تیسرے معنی اب سنئے کہ متاخرین امامیہ کو کچھ بدا کے باب میں بھی ہوش آئی ہے

اور سنیوں کے اعتراضوں کو سن سنا کر کچھ فکر آبرو ہوا ہے۔ اس لئے بات بدل کر اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ یہ بات فقط خاص اس علم میں ہوتی ہے جس کی کسی کو خبر نہیں کرتے، اور جو علوم کہ انبیاء کو بھیجے جاتے ہیں۔ اس میں خدا جھوٹ نہیں بولتا سو اگر اس بات پر امامیہ جم جائیں تو سنیوں کی طرف سے ان کو مرحبا اور آفرین اس صورت میں کلام اللہ کی بات تو باون تولے پاؤ رتی کی ہوگی۔ پھر ہمیں کیا ضرورت کہ بدا کے عذر کی وجہ سے کسی اور طرح سے اثبات مدعا کریں۔

مگر مانتے ہیں ملا نظام الدین کو کہ سنیوں کے طعن اٹھانے اور مذہب کے بٹا لگجانے سے گھبرا کے مذہب کو سنبھالا، اور متاخرین کی نہ مانی اس تخصیص میں جو متاخرین نسبت علم مخصوص کے کرتے تھے ان کی تکذیب کی اور بہت سی روایات احادیث مذہب شیعہ نقل کر کے متاخرین کی بات کو خاک میں ملا دیا اور کیونکر نہ ملاتے آخر شیعوں میں بڑے محقق ہیں، یہی وجہ ہوئی کہ اس باب خاص میں رسالہ لکھا معہذا اس کا کہنا بھی سچ ہے۔ جھوٹ بولنا تو جب ہو جب خدا جان بوجھ کر کچھ کا کچھ کہدے اور جب نعوذ باللہ خدا ہی کو غلط معلوم ہو تو پھر خدا کا کیا قصور؟ جو متاخرین کہتے ہیں کہ خدا اپنے دوستوں سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔

بدا کی تین قسمیں بالجملہ ان سب روایات سے جو محقق مذکور نے اثبات مدعا کے لئے نقل کیں۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ بدا کی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو بدا فی العلم یعنی خدا نے پہلے سے کچھ جان رکھا تھا مگر بعد میں حقیقت الامر کچھ اور معلوم ہوئی دوسرے بدا فی الارادہ یعنی پہلے کچھ ارادہ تھا پھر یوں معلوم ہوا کہ یہ ارادہ ٹھیک نہیں، تیسرے بدا فی الامر یعنی پہلے کچھ حکم دیا۔ پھر بعد ازاں یوں معلوم ہوا کہ پہلے حکم میں کچھ غلطی تھی۔ اس حکم کو بدل کر دوسرا ایسا حکم جس میں وہ نقصان نہ ہو بلکہ مصلحت وقت معلوم ہوتی ہو۔ صادر فرمائیں۔

بدا اور نسخ میں ایک شبہ کا ازالہ یہ معنیٰ آخر خوب ذہن نشین رکھنے چاہئیں ایسا نہ ہو کہ نسخ سے مشتبہ ہو جائیں کیونکہ نسخ حقیقت میں اسے کہتے ہیں کہ ایک حکم کا

زمانہ آخر ہو جائے اور دوسرے حکم کا زمانہ آجائے۔ مثلاً رمضان میں روزہ رکھنے کا حکم ہے جب عید ہوئی وہ زمانہ آخر ہوا اور افطار کا زمانہ آگیا، اسے یوں نہیں کہتے کہ پہلے حکم میں کچھ غلطی تھی اس لئے موقوف کیا گیا، بلکہ وہ حکم اسی زمانہ تک تھا، اس کے بعد دوسرے حکم کا زمانہ آگیا۔ اتنا فرق ہے کہ کہیں پہلے سے زمانہ کی مقدار کی اطلاع ہو جاتی ہے۔ جیسے مثال مذکور میں اطلاع ہے اور کہیں نہیں ہوتی وقت ہی پر ہوتی ہے مثلاً حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی شریعت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک تھی یہ بات سوائے خداوند کریم کے کوئی نہیں جانتا تھا ـــــ اور جو کوئی جانتا بھی تھا۔ تو یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ زمانہ کس وقت آئے گا۔ القصہ بدا فی الامر جسے شیعہ بدا فی التکلیف کہتے ہیں اور ہے اور نسخ اور ہے بدا کی یہ صورت ہے کہ رمضان کے مثلاً روزے رکھنے کا حکم دیا اور جب تک کوئی نقصان اس میں معلوم ہوتا تھا اور اسی لئے جب تک یہ ٹھیرایا تھا کہ یہ حکم فلاں وقت تک رہے گا۔ پھر یکایک یہ سوجھی کہ مصلحت وقت اس کے خلاف میں ہے اس لئے اس کو بدل دیا

بدا کی تینوں قسمیں ایک دوسرے کو لازم ہیں جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اس ہیچمدان کی گذارش بھی سنئے کہ درصورت بدا فی التکلیف کے واقع ہونے کے بدا فی الارادہ بھی جسے بدا فی التکوین بھی کہتے ہیں لازم ہوگا کیونکہ بدا فی الارادہ تو اسے ہی کہتے ہیں کہ بسبب کسی مصلحت تازہ کے پہلے ارادہ سے پلٹ جائیں تو جب مصلحت ہی کے لحاظ سے حکم بدلا گیا۔ تو پہلا ارادہ جو اس حکم کی ہمیشگی کا تھا وہ آپ بدلا گیا اور اسی طرح بدا فی الارادہ کو بدا فی العلم جسے بدا فی الاخبار بھی کہتے ہیں لازم ہے اس لئے کہ ارادہ تو نئی مصلحت کے معلوم ہونے پر بدلتا ہے۔ پھر جب مصلحت تازہ معلوم ہوئی تو لاجرم یہ بات صحیح ہوئی کہ جو علم اب حاصل ہوا وہ پہلے نہ تھا اور جو پہلے تھا وہ اب غلط معلوم ہوا۔ اسی کو بدا فی العلم کہتے ہیں۔

سو اگر شیعوں میں سے کوئی بدا فی الامر اور بدا فی الارادہ کا تو قائل ہو اور سنیوں کے سامنے بدا فی الاخبار سے مکر جائے تو یہ مکر جانا پیش نہ جائے گا حاصل کلام یہ ہے کہ شیعوں کے

نزدیک مسئلہ بدا مجمع علیہا ہے اگر وہ آیات مذکورہ کے دباؤ سے سنیوں سے دامن چھڑانے کو یوں کہنے لگیں کہ اگر تم اپنے پیشواؤں کی بزرگی کلام اللہ سے ثابت کرتے ہو تو ہم نے مانا کلام اللہ میں ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو لیکن کلام اللہ کا نعوذ باللہ کیا اعتبار؟ خدا کی رائے گھڑی گھڑی بدلتی رہتی ہے اور نعوذ باللہ غلط صحیح رطب یابس سب اس کے کلام میں ہوتا ہے ہمارے ائمہ کو البتہ علم ما کان ما یکون تھا ان کے اقوال سے اگر ان کی بزرگی ثابت ہو۔ تو بیشک ہم تسلیم کرلیں۔

عقیدۂ بدا کے نتائج (۱) چاردہ معصوم کی مغفرت مشکوک اس صورت میں ہمیں بھی یوں لازم ہے کہ شیعوں کی اس حجت کو بھی ختم کر دیں اس لئے سامعہ خراش اہل انصاف ہوں کہ اگر یہی بدا ہے تو اوّل تو ہمیں چاردہ معصوم کی مغفرت میں کلام ہے نعوذ باللہ اور شیعوں کا تو کیا ذکر۔؟ جیسے اصحاب کرام سے وعدہ ہائے مغفرت کرکے بعذر بدا پھر گئے اگر حضرات ائمہ کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی ہو تو فرمائیے اماموں کا خدا پر کیا دباؤ ہے؟ خاص کر یہ بہانہ بھی موجود ہو کہ ان کے تقیہ اور نامردہ پن نے تمام دین کا ستیاناس کر دیا۔

امام آخر الزماں کی طویل روپوشی اندیشناک ہے پھر لیسر امام آخر الزماں نے تو نعوذ باللہ یہ ستم ڈھائے ہیں کہ باوجودیکہ دوست دشمن کی خبر ہے یہ بالیقین معلوم ہے کہ تمام ملک ایران میں مخلصان شیعہ سالہا سال سے منتظر زیارت اور مشتاق ملازمت بیٹھے ہیں۔ جان و مال فدا کرنے کو تیار ہیں ادھر ہندوستان میں روز بروز ترقی تشیع ہے امام کے انتظار میں مرے جاتے ہیں۔ اگر حسب حال ان کے یہ شعر کہا جائے تو بجا ہے۔

اے اشتیاق رویت دلہا کباب کردہ ؛ سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

معہذا اپنی موت اپنے اختیار میں ہے اور پھر یہ معلوم کہ میں فلانے وقت سے پہلے نہ مروں گا باوجود اس فراہمی اسباب اور انتظار احباب کے خدا جانے کیا نامردانہ پن ہے کہ روز بروز زیادہ ہی چھپتے جاتے ہیں اور باہر نہیں آتے اگر خدانخواستہ کچھ اندیشہ ہوتا تو کیا ہوتا رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کل تین سو تیرہ ہی آدمی مجتمع ہونے پائے تھے جو جہاد شروع کر دیا پھر وہ بھی بزعم شیعہ اکثر منافق اور منافق بھی نہیں تو ایسے مخلص بھی نہ تھے جیسے امامیہ

زمانہ امام زماں سے اخلاص و محبت رکھتے ہیں اور مخلص نہ تھے جبھی تو شہادت امامت حضرت پسر چھپائی بلکہ خلافت اور سوا اس کے اور حقوق اہل بیت دبا بیٹھے بہر حال جائے حیرت ہے کہ باینہمہ سامان و امن و اطمینان غیبت امام کا انتہا ہی نہیں کہیں اماموں کا بنسبت ماکان و مایکون کے عالم ہونا غلط ہے؟ یا شیعوں کی دوستی غلط؟ اور ہم جانتے ہیں کہ یہی صحیح ہے ایک دوستی کی آڑ میں ہزار عیب اماموں کے ذمے لگاتے ہیں چنانچہ کچھ کچھ تو اس رسالہ کے دیکھنے والوں کو بھی واضح ہو جائے گا۔

پسر امام کو امام بنانے میں بھی شاید خدا سے بدا واقع ہو گیا ہو | الحاصل امام زماں باینہمہ انتظار احباب اور فراہمی اسباب ادھر بھی ہر طرح سے بے اندیشہ غار سرمن رائے سے باہر تشریف نہیں لاتے اور دین محمدی اور امت احمدی کی خبر نہیں لیتے کہ کس گمراہی میں پھنسی ہوئی ہے دین ابوبکر بجائے دین محمدی اور بیاض عثمانی بجائے کلام ربانی دوازدہ امام کے بدلے ابوحنیفہ شافعیؒ اور اس گمراہی سے زیادہ اور کیا گمراہی ہو گی جس کا انتظار ہو گا الغرض اماموں کو تو یہی عذر تھا کہ ہم بے بس و بیکس ہیں امام زماں جو باہر تشریف نہیں لاتے تو ان کو کیا عذر ہے در صورتیکہ بدا کو ہم تسلیم کر لیں تو توجیہ اس بے انتظامی دین کی امامیہ کے عقائد کے موافق بجز اس کے سمجھ میں نہیں آتی کہ خدا سے دوازدہ امام کے مقرر کرنے میں ٹرنگ چوک ہوئی ابوبکر عثمان کو مقرر کرنا تھا جو دین کو رونق دیتے اور بے انتظامی نہونے دیتے۔ القصہ امامیہ سے بجز اس کے اور کچھ توجیہ بن نہیں پڑتی ہاں اگر اس کے قائل ہو جائیں کہ خدا کے ذمہ یہ واجب نہیں کہ جو بندہ کے حق میں اصلح ہو اسے کیا کرے تو البتہ یوں بھی کہہ سکتے ہیں لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ یعنی خدا سے کوئی یوں نہیں پوچھ سکتا کہ یوں کیوں کیا اور خدا سب سے پوچھ سکے ہے کہ تم نے یوں کیوں کیا۔

امام زماں کو شاید بدا کی وجہ سے خدا معزول کر چکا ہو | بہر حال عجب نہیں جو بدا واقع ہوا ہو اور امام زماں کی معزولی کا حکم صادر ہو چکا ہو اور شاید یہی وجہ ہے کہ تخمین سے زیادہ امام کو غیبت میں گذری اور یہ جو امامیہ کے ذہن نشین ہے کہ ابوبکر عمر وغیرہم آخر زمانہ میں پیدا کیے جائیں گے یہ بالکل غلط نہ ہو بلکہ امامِ زماں کو معزول کر کے شاید ان کو پھر نئے سرے سے پیدا کر کے

مامور کریں پر امامیہ نے باتباع خداوندی اس بات میں غلطی کھائی ہو کہ وہ سزا دینے کے لئے پیدا کیے جائیں گے خیر یہ بات تو شاید شیعوں کو ناگوار ہو۔

عقیدۂ بدا کا استیصال قرآن مجید سے | سو بپاس خاطر شیعہ اس بات سے اعراض کر کے یوں ملتمس ہوں کہ اگر خدا سے چوک ہوتی ہے تو انبیاء سے تو نہ ہوتی ہو گی اور اتنا ہم جانتے ہیں کہ شیعہ بھی کہیں گے کہ خدا اخبار گذشتہ میں بھی غلطی کھاتا ہے کیونکہ یہ تو صاف جھوٹ ہے جب یہ بات ذہن نشین ہو گئی تو ہم کہتے ہیں کہ خداوند کریم سورہ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ کے قصے میں جو جناب سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے بہت پہلا قصہ ہے حضرت موسیٰ کا مقولہ فرعون کے سوال کے جواب میں یوں نقل فرماتا ہے لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسٰی یعنی حضرت موسیٰ فرماتے ہیں کہ میرا رب نہ چوکے ہے نہ بھولے ہے اس آیت کو غور کیجئے کیا ارشاد کرتی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو ہم جانتے ہیں شیعہ بھی یوں نہ کہیں گے کہ وہ چوک جاتے تھے یہ برائی تو اس فرقہ کے پیشواؤں نے خدا ہی کے لئے رکھ چھوڑی ہے ورنہ لازم آوے گا کہ معصوم بھی خطا کرے پھر یہ طعن جو سنیوں پر کرتے ہیں کہ ان کے امام اور خلیفہ معصوم نہ تھے حالانکہ امام اور خلیفہ کو چاہیئے کہ معصوم ہو خطا نہ کرے ورنہ حق اور باطل کی تمیز محال ہو جائیگی۔ اور جو غرض کہ ان کے مقرر کرنے سے ہوتی ہے یعنے احکام شریعت معلوم ہونا اور ان کا عمل درآمد ہونا وہ حاصل نہ ہو گی سو اب یہ طعن کس منھ سے کرینگے۔

قواعد عقائد شیعہ کی رو سے خدا سے خطا ممکن معصوم سے ناممکن | الغرض قواعد عقائد شیعہ سے یوں ثابت ہوتا ہے کہ خدا سے گو خطا ہو جائے پر معصوم سے خطا نہو۔ سو حضرت موسیٰ علیہ السلام جو بالاتفاق معصوم تھے انہوں نے جو یہ فرمایا کہ میرا رب نہ بہکتا اور چوکتا ہے اور نہ بھولتا ہے تو اس میں تو ہرگز احتمال غلط نہیں اور خدا نے جو یہ قصہ نقل فرمایا تو ایک قصہ گزشتہ ہے کچھ آئندہ کی بات نہیں جو بدا فی الاخبار کی گنجائش ہو پھر کیا معنی کہ خدا بہک جائے کچھ نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ عقل و حواس میں اختلال آگیا ابوبکر عمر ہر چند صاحب رعب اور مرد باہیبت تھے مگر نہ اتنے کہ خداوند کریم کے بھی عقل و حواس میں فرق آجائے یا سوا اس کے اور کچھ سبب ہے نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات تعالی اللہ عن ذالک علوا کبیرا ایک سنیوں کے الزام کے لئے

خدا کی عظمت بھی تو ہاتھ سے دے بیٹھے۔ فدک چھینا تھا تو ابوبکر نے چھینا تھا۔ اد قرطاس و دوات کو نہ لانے دیا تو عمر نے نہ لانے دیا۔ ان پر تبرا کیا تو کیا خداوند کریم کو جو ان برائیوں میں سان لیا تو کیا اسی سبب سے کہ باوجودیکہ نصر المظلوم حق (یعنی مظلوم کی مددگاری حق) ہے اور پھر مظلوموں کی مددگاری نہ کی خیر خداوند کریم ان بیباکوں کا منھ سیاہ کرے کہ سخت بے ادب ہیں اور جس لائق یہ ہیں انہیں وہاں ہی پہنچائے، بالجملہ کلام اللہ میں بدا کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا ہے۔

بدا کا عقیدہ رکھنے والوں کے لئے حضرت جعفر کی بددعا

اور اگر شیعہ خدا کا اتنا بھی اعتبار نہ کریں اور اخبار گزشتہ میں بھی غلطی فہم کے احتمال سے نعوذ باللہ اس بات کے طالب ہوں کہ ہم کلام اللہ کی گواہی پر بدا سے انکار نہیں کرتے جبتک کہ کلینی کی کوئی حدیث اس باب میں نہ ہو تو کلینی کی حدیث بھی لیجیے

فی الکافی عن منصور بن حازم عن ابی عبد اللہ قال منصور سَأَلْتُهُ هَلْ يَكُوْنُ شَيْءٌ لَمْ يَكُنْ فِيْ عِلْمِ اللّٰهِ قَالَ لَا مَنْ قَالَ هٰذَا فَاَخْزَاهُ اللّٰهُ قُلْتُ اَرَئَيْتَ مَا كَانَ وَ مَا هُوَ كَائِنٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَيْسَ فِيْ عِلْمِ اللّٰهِ قَالَ بَلٰى قَبْلَ اَنْ يَخْلُقَ الْخَلْقَ۔

کلینی کافی میں منصور بن حازم سے روایت کرتا ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے پوچھا کوئی چیز ایسی بھی ہوئی کہ کل خدا کو معلوم نہ تھی اور آج ہو گئی ہو؟ آپنے فرمایا کہ کوئی نہیں، جو یہ کہے خدا اسے رسوا کرے پھر میں نے پوچھا کہ تو بتلایئے جو ہو لیا اور جو ہونیوالا ہے قیامت تک، کیا خدا کو معلوم نہ تھا۔؟ انہوں نے فرمایا کیوں نہیں خلق کے پیدا کرنے سے پہلے معلوم تھا۔"

اس روایت سے دو فائدے حاصل ہوئے ایک تو یہ کہ بدا ایک عقیدہ غلط ہے، کیوں کہ بدا کی آیتوں میں جو تحقیق گذر چکی اس سے صاف ثابت ہے کہ بدا بے اس کے ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی نیا علم پیدا ہو، دوسرا یہ ہے کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے بدا کے قائلوں کے لئے بددعا فرمائی، سو حضرات شیعہ کو ہماری طرف سے بھی مبارک باد۔ یہ ساری خرابیاں کلام اللہ کے نہ سمجھنے کی ہیں اور ان کا بھی کیا قصور؟ اپنی روایتوں کے معنوں کو نہیں سمجھتے اگر سمجھ ہوتی

تو پہلے انہیں ہی سمجھتے۔ کلام اللہ تو سنیوں کا ہے۔

حق واضح ہونے کے بعد ماننا ضروری ہے پھر کسی اور بات کا انتظار حماقت ہے

اس وقت لازم یوں ہے کہ منشا اس غلطی کا بیان کیا جائے تاکہ مزید اطمینان ہو جائے اور ناظرین کو یہ خلجان باقی نہ رہے کہ تمہاری وہی پیش قاضی آئی رافضی، محرر رسالہ کے طمطراق کی باتیں فقط سنکر ہم یوں کیونکر بدا سے دست بردار ہوں ہمارے علماء شیعہ بھی تو آخر کسی وجہ ہی سے کہتے ہوں گے جب تک ان کی نہ سن لیں تسلی نہیں ہوتی۔ ہر چند یہ عذر اسی قبیل کا ہے کہ مشہور ہے "عذر گناہ بدتر از گناہ" کیونکہ جب کسی آدمی کو کسی وجہ سے حق واضح ہو جائے تو پھر اسے اس کا کیا انتظار کہ دوسروں کی بھی سن لوں اگر کوئی شخص قریب شام کے در و دیوار پر دھوپ دیکھے یا خود آفتاب کو بچشم خود دیکھے اور دوسرا پردہ میں بیٹھا ہوا گھڑی گھنٹے کے وسیلے سے یوں کہے کہ دن چھپ گیا تو آفتاب کا یا دھوپ کا دیکھنے والا کتنا ہی جاہل کیوں نہ ہو اور گھڑی سے وقت کا بتلانیوالا کتنا ہی علامہ روزگار اور حساب میں پرکار کیوں نہ ہو لیکن تسپر بھی آفتاب یا دھوپ کے دیکھنے والے کو دن کے یقین ہونے میں اس کا انتظار نہ ہوگا۔ کہ میں اس کی تو سن لوں کہ جو گھڑی کے وسیلے سے رات بتلاتا ہے۔

اسی طرح جب یہ بات خوب واضح ہوگئی کہ بروئے کلام اور نیز بروئے احادیث شیعہ بدا غلط ہے پھر اس کا کیا انتظار ہے کہ بدا کے قائلوں کی بات بھی سن لینی چاہیئے بلکہ ایسے وقت میں مناسب یوں ہے کہ جیسے آفتاب کا بچشم خود دیکھنے والا باوجود جاہل ہونے کے بے تامل یوں سمجھ جاتا ہے کہ گھڑی والا ہر چند محاسب اور بڑا ہوشیار ہے اس کے علم میں کچھ شک نہیں لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اس کی گھڑی بگڑی ہوئی ہے یا اس وقت اتفاق سے بمقتضائے بشریت کچھ غلطی ہوگئی ہے ایسے ہی بدا کی غلطی کا سمجھنے والا بھی بے تامل مان اٹھے کہ ہر چند قائلین بدا بڑے بڑے عالم اور فاضل تھے لیکن تاہم آدمی تھے۔ غلطی کھا گئے نہ اس آیت پر انہیں دھیان ہوا كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا یعنی اللہ ہمیشہ سے علیم ہے اس کا علم کچھ اب پیدا نہیں ہوتا اور نہ آیت مذکورہ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسٰى ان کے خیال میں گذری اور نہ حدیث کلینی کا کچھ خیال کیا بلکہ ادب کی بات تو یوں ہے کہ یہ کہیے

ان لوگوں کو کلام اللہ تو یاد نہ تھا کیونکہ یہ تو سنیوں کا کام ہے۔ کلینی بعد میں تصنیف ہوئی۔ معہذا ان کا کیا قصور؟ سب جانتے ہیں "دروغ گو را حافظہ نباشد" القصہ یہ عذر کہ شیعوں کی دلیلیں معلوم ہونی چاہئیں (یہ عذر بعد کلام اللہ اور حدیث مذکور کے جن کے معنوں میں کچھ تاویل نہیں ہو سکتی اور خدا کے علم کے قدیمی ہونے پر مثل آفتاب روشن کے گواہی دیتی ہیں) عقلا کے نزدیک قابل سماعت نہیں۔

بدا جیسے گواہی عقیدے کی غلط بنیادیں مگر باایں ہمہ بپاس خاطر مولوی عمار علی صاحب یہ معروض ہے کہ منشاء غلطی شیعہ اس قسم کی آیتیں ہیں لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا حاصل یہ کہ خدا نے موت حیات کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ تمہیں آزمائے کہ کونسا تم میں اچھے عمل والا ہے سو اس آیت سے اور ایسی ہی مضمون کی اور آیتوں سے علماء شیعہ کو یوں دھوکہ پڑا کہ امتحان اور آزمائش تو وہاں ہوتی ہے جہاں حقیقت امر پہلے سے معلوم نہیں ہوتی پھر تسپر یہ تماشا ہوا کہ ایک جگہ خداوند کریم یوں بھی ارشاد فرماتے ہیں يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ یعنی اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اس آیت کے مضمون کو جو پہلی آیت کے مضمون سے ملا کر دیکھا تو علماء شیعہ کو بجائے خود اس بات کا یقین ہو گیا کہ خدا کو پہلے سے تو حقیقت الامر خوب معلوم تھی ہی نہیں یونہی اٹکل اور رائے سے ایک بات مقرر کر رکھی تھی سو اس میں جہاں کہیں کچھ غلطی معلوم ہوتی ہے اسے بدل دیتے ہیں اور یہی معنے بدا کے ہیں۔ الحاصل اس وجہ سے شیعوں کے نزدیک عقیدہ بدا مستحکم ہو گیا اور یہ غلطی جو اول کسی کو بوجہ کوتاہی عقل کے پڑی تھی خوب مضبوط ہو گئی اور کیوں نہ ہو۔

بے استاد کی ٹھوکریں بے استاد ہمیشہ خراب رہتا ہے اگر ماہران کلام اللہ کی کفش برداری اختیار کرتے تو اس آیت کے معنوں میں ایسے کیوں بہکتے۔ مگر یہ فرقہ تو ایسا کم نصیب ہے کہ کلام اللہ کے جاننے والوں کے دلی دشمن ہیں جناب من "ہر کارے ہر مردے" صحابہ کرام جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے شاگرد تھے۔ کلام وہ سمجھتے تھے۔ پھر جو ان سے مستفید ہو گا وہ کلام اللہ کو سمجھیگا یا شیعہ سمجھیں گے۔؟

ابتلاء و امتحان سے مقصود خداوندی قطع حجت ہے نہ کہ تحصیل علم اگر آیت لِيَبْلُوَكُمْ سے یہ بات نکالی ہے کہ

خدا کو پہلے کسی چیز کے پیدا ہونے کے علم اس کا نہیں ہوتا ہے تو اس میں تو کچھ شک نہیں کہ اس وقت تو ضرور ہی ہو جاتا ہے چنانچہ اول تو شیعہ اس کے قائل ہی ہیں معہذا کلام اللہ میں بیسیوں جگہ إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ موجود ہے۔ یعنی خداوند کریم جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے پہلے پیدا ہونے سے تو ہم نے مانا، نہیں دیکھتا تھا لیکن یہ تو فرمایئے کہ بعد پیدا ہونے کے بھی کیا کچھ اس میں تامل باقی ہے؟ نور آفتاب خدا کا محتاج نہیں شمع چراغ کی اس کو ضرورت نہیں آگے پیچھے ہونا اس کے نزدیک سب یکساں ہے کیوں کہ وہ فرماتا ہے إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ یعنے اللہ ہر چیز کو محیط ہے القصہ بعد وجود اشیاء کے ان کے پیش نظر ہونے میں کچھ شک نہیں اور پھر باایں ہمہ بھول جانے کا اندیشہ نہیں کیونکہ سورہ طٰہٰ میں لَا يَنْسٰى موجود ہے یعنی خدا بھولتا نہیں پھر کیا ضرورت ہوئی کہ کرام کاتبین مقرر کئے گئے؟ اور حساب کتاب قیامت کو ہونا ضرور پڑا اور نامہ اعمال در صحیفہائے کردار بنی آدم لکھے گئے جو علماء شیعہ اس کا جواب دینگے وہی ہماری طرف سے نوازش فرما کر قبول فرمالیں۔

اگر یوں جواب دیں کہ ہر چند خداوند عالم الغیب کو ہر لکی چھپی بڑی چھوٹی چیز کی خبر ہے لیکن شوکت اور عظمت اور حکمت خداوندی کے مناسب یہی ہے کہ یہ سارا کارخانہ برپا ہو تو ہمیں تسلیم، پر یہی جواب ہمارا ہے اور اگر شیعوں کو نسبت نامہائے اعمال اور حساب کتاب اور ہاتھ پاؤں کی گواہی کے جو قیامت میں ہوگی یہ عذر ہے کہ یہ سب تعلیم بنی آدم کے لئے ہے تو ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ امتحان خداوندی بھی تعلیم بنی آدم کے لئے ہے۔

باقی کسی کو ہاتھ پاؤں کی گواہی اور حساب کتاب اور وزن اعمال میں شک ہو تو یہ کلام اللہ کی آیتیں موجود ہیں آیت يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ جس کا یہ حاصل ہے کہ فلانے لوگوں کو اس روز عذاب ہوگا۔ جس روز ان کی زبان ہاتھ پاؤں ان پر گواہی دینگے اور آیت قَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقَنَا اللّٰهُ یعنے قیامت کو جب کفار کے کان آنکھیں کھالیں ان کے کرتوت کی گواہی دینگے تو وہ ان کو ملامت کرینگے سو اس کا بیان ہے کہ کہیں گے کفار اپنی کھالوں کو کہ تم نے کیوں ہمارے حق میں بری گواہی دی؟ تو وہ کہیں گے کہ جس خدا

نے سب کو بلایا تھا اور بولنا سکھایا تھا اسی نے ہمیں بھی بلایا۔

اور سوا اس کے اور بہت سی آیتیں وزن اعمال پر اسی طرح دلالت کرتی ہیں۔ وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ یعنی تول اس دن ٹھیک ہے وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ حاصل اس کا یہ ہے کہ رکھیں گے ہم ترازوئیں انصاف کی قیامت کے دن فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ فَھُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ حاصل یہ ہے کہ جس کے اعمال تول میں بھاری ہوں گے ان کی اچھی گزران ہوگی، ایسی ہی حساب کے مقدمہ میں کثرت سے آیتیں وارد ہیں منجملہ ایک دو لکھے دیتا ہوں اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ خواہ ظاہر کرو جو کچھ تمہارے جی میں ہے یا چھپاؤ خدا حساب ضرور لے گا وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ یعنی جو کوئی منکر ہوگا اللہ کے حکموں سے تو اللہ حساب شتاب لینے والا ہے الغرض ان باتوں سے انکار نہیں ہو سکتا اور ہمیں کسی سے کیا کام امامیہ اور اثنا عشریہ سے غرض ہے سو وہ منکر ہی نہیں اہل سنت اور وہ دونوں ان باتوں کے ایمان میں متفق ہیں زیدیہ اسمٰعیلیہ ہوتے تو یوں بھی سہی۔

الحاصل جو کچھ شیعہ تجویز فرمائیں ہمیں کچھ دریغ نہیں اگر وہ یوں کہیں کہ بنی آدم کی حجت ختم کرنے کے لئے حساب کتاب وغیرہ ہے ورنہ کچھ حاجت نہ تھی تو ہماری طرف سے بھی یہی جواب معروض خدمت ہے بلکہ اس کے ساتھ میں الٹا شکرانہ ہم سے لیں کہ ہمیں ان آیات کے معنے کی تحقیق میں تخفیف ہاتھ آئی غرض بہرحال چشم ما روشن دلِ ما شاد۔۔ صلاح ما ہمہ آں است کاں صلاح شما است۔۔

امتحان لغرض قطع حجت کی ایک قرآنی مثال

اور کسی مثال سے سمجھنا مدِ نظر ہے تو ایسی مثال لیجئے جسے مولوی عمار علی صاحب بھی مان جائیں آلم کا پہلا سیپارہ تو شیعوں کو غالباً یاد ہو؟ نہیں تو قریب یاد کے ہوگا کیونکہ اکثر دستمال اطفال رہتا ہے چہ جائیکہ بڑے بوڑھے عالم فاضل، سو پہلے سیپارہ میں رکوع وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ میں کچھ یہ بیان ہے کہ جناب باری تعالےٰ نے فرشتوں سے حضرت آدم کے زمین میں خلیفہ بنانے کی خبر دی تو فرشتوں نے یہ اعتراض کیا کہ آپ آدم اور آدم کی اولاد کو زمین میں خلیفہ بناتے ہیں جو زمین میں فساد کریں اور خونریزیاں

مچائیں حالانکہ ہم اس بات کا استحقاق رکھتے ہیں۔ آپ کی تسبیح ہم کرتے ہیں آپ کی تقدیس میں ہم مشغول رہتے ہیں تو اس کے جواب میں سردست تو جناب باری تعالےٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے، مگر ان کی حجت قطع کرنے کے لئے حضرت آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام یا حقیقت تعلیم فرما کر پھر فرشتوں سے ان چیزوں کے نام یا حقیقت دریافت کئے۔ اور فرمایا کہ اگر تم دعوائے استحقاق میں سچے ہو تو ہمارے سوال کا جواب دو، چونکہ فرشتوں کو معلوم نہ تھے تو انہیں بجز یوں کہنے بن پڑی کہ سُبْحَانَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ حاصل اس کا یہ کہ الٰہی تو پاک ہے ہمیں تو جتنا تو نے تبلا دیا اسکے سوا اور کچھ معلوم نہیں تو ہی اسرار کا جاننے والا اور حکمتوں والا ہے۔

جب ان سے نہ تبلایا گیا تو حضرت آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ تو انہیں ان چیزوں کے نام تبلا دے، جب حضرت آدم علیہ السلام نے ان کے نام تبلا دیئے تو خداوند کریم نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمان زمین کی لکی چھپی باتیں جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرو اور جو چھپاتے ہو وہ سب مجھے معلوم ہیں۔ برائے خدا علماء شیعہ اس قصہ میں غور فرمائیں یہ امتحان فرشتوں اور حضرت آدم کا جو لیا۔ تو کیا اس لئے لیا تھا کہ اپنے آپ کو حقیقت الامر معلوم ہو جائے یا فرشتوں ہی کی حجت قطع کرنے کے لئے؟ درصورتیکہ حضرت آدم علیہ السلام کو پہلے سے اپنے سوال کا جواب تبلا چکے ہوں اور فرشتوں کو نہ تبلایا ہو، تو کسی نادان کو بھی یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ جناب باری تعالیٰ کو یہ معلوم نہ تھا کہ کون استحقاق رکھتا ہے کون نہیں، ہو جیسے یہ امتحان فقط فرشتوں کی حجت قطع کرنے کے لئے اور ان کے اعتراض کو اپنے ذمہ سے اٹھا دینے کے لئے تھا ایسے ہی یہ امتحان جو لِیَبْلُوَکُمْ یا اور اسی مضمون کی آیتوں سے ثابت ہوتا ہے تو فقط اسی لئے ہے کہ بنی آدم بوجہ حسد ایک دوسرے کے درجہ بڑھانے پر خدا کے ذمہ ناانصافی کی تہمت نہ لگانے لگیں اور ان کو گنجائش گفت و شنود اور جائے اعتراض و انکار جو ان کی جبلت میں رکھی ہوئی، باقی نہ رہے۔

بعثت انبیاء اور تکالیف شرعیہ کی وجہ بھی قطع حجت بنی آدم ہے

اور واقعی اس حکم احکام کے قصہ اور رسولوں اور انبیاؤں کے بھیجنے کے سلسلہ کی وجہ اور حکمت یہی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جب ملائکہ باینہمہ عصمت اور فرمانبرداری کے جو آیت لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ سے جس کا حاصل یہ ہے کہ فرشتے خدا کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو کچھ انہیں حکم ہوتا ہے وہی کرتے ہیں" ثابت ہوتی ہے خدا کی بات میں دخل دے بیٹھے اور بوجہ حسد بنی آدم اعتراض کر گذرے۔ بنی آدم تو بنی آدم ہیں پھر باوجودیکہ گناہوں سے ان کا خمیر ہے ان کی شان میں یہ تعریف بھی آئی ہے وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا۔ یعنی انسان سب میں زیادہ جھگڑالو ہے پھر اگر خداوند کریم موافق اپنے علم ازلی کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسےٰ علیہ السلام کو جنت میں اور ابوجہل اور فرعون کو دوزخ میں داخل کر دیتا تو ابوجہل اور فرعون کاہے کو ٹھنڈے جو لھے بیٹھتے اعتراض پر اعتراض کئے جاتے اور اپنے استحقاق جنت کے دعوے میں کیا کیا کچھ نہ کرتے اسی لئے خداوند کریم علیم حکیم نے کلام اللہ میں اکثر مواقع میں وجہ اس سلسلہ ہدایت کی بھی بیان فرمائی ہے تسکین خاطر ناظرین کے لئے ایک آیت گذارش کرتا ہوں۔

وَاتَّبِعُوْا اَحْسَنَ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ کُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِیْ لَکُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ اَوْ تَقُوْلَ حِیْنَ تَرَی الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِیْ کَرَّةً فَاَکُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ بَلٰی قَدْ جَآءَتْکَ اٰیٰتِیْ فَکَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَکْبَرْتَ

حاصل اس کا یہ ہے کہ "چلو بہتر بات پر جو تم پر نازل کی گئی تمہارے رب کی طرف سے پہلے اس سے کہ پہنچے تم پر عذاب اچانک اور تم کو خبر نہ ہو کہیں کہنے لگے کوئی جان ہائے افسوس میں نے قصور کیا اللہ کے مقدمہ میں۔ اور میں ہنستا ہی رہا کوئی کہنے لگے اگر اللہ مجھکو بتاتا تو میں متقی ہوتا۔ یا کوئی کہنے لگے جب دیکھے عذاب کسی طرح مجھکو پھر جانا ملے تو میں نیکی والوں میں سے ہو جاؤں کیوں نہیں پہنچ چکے تھے تجھکو میرے حکم۔ پھر تو نے ان کو جھٹلایا اور غرور کیا۔ اور تو کافروں

وَکُنْتَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ۔ | میں سے تھا۔

یہاں تک ترجمہ تھا اب اس آیت کے مطالعہ کرنیوالے فرمائیں کہ یہ جو حکم ہوا کہ خدا نے جو تمہاری طرف عمدہ بات نازل کی ہے اس کا اتباع کرو اور اس پر چلو خدا نے اس کی کیا وجہ فرمائی ہے بجز اس کے اور بھی کچھ ہے کہ یہ اندیشہ تھا کوئی یوں نہ کہنے لگے کہ خدا اگر مجھے راہ تبلاتا تو میں متقی پرہیزگار رہتا اور یہ اندیشہ جب ہو سکتا ہے کہ اپنی طرف سے پہلے تجویز کر رکھا ہو کہ اس کو دوزخ میں پہنچائیں گے اس کو جنت میں۔ سو اسی تجویز کے موافق اگر کاربند ہوتے اور جس کو برا بھلا جیسا سمجھ رکھا تھا اس کے مناسب اسے جگہ دیتے تو بیشک دوزخی بھی اپنا استحقاق جتاتے اور دعوے اپنی بھلائی کا کر کے کہتے کہ ہمارا امتحان کیوں نہ لیا۔ ہمکو راہ دکھائی ہوتی ہم بے شک متقی اور پرہیزگار نکلتے بعد اُکُنْتَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ فرمایا اور کَفَرْتَ نہ فرمایا عربیت میں جو مہارت کَمَا یَنْبَغِیْ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر کَفَرْتَ فرماتے تو یہ معنے ہوتے کہ جب آیات آئیں اور ان کا انکار کیا تب کافر ہو گیا۔ پہلے سے نہ تھا اور اب یہ معنے ہیں کہ ازل سے تیرا چہرہ کافروں میں اور نمک حراموں میں لکھا ہوا تھا سو تو موافق اس لکھے ہوئے ہی کے نکلا باوجودیکہ ہماری آیات تیرے پاس آئیں پھر تو نے انہیں نہ مانا اور الٹا غرور کیا۔

ایسے ہی سورۂ اعراف میں ہے اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا کُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ یعنی عہد الست جو لیا گیا۔ تو فقط اسی لئے کہ تم عذاب کے وقت یوں نہ کہنے لگو کہ ہمیں تو اس کی خبر ہی نہ تھی۔ القصہ چونکہ صورت حال بنی آدم سے چنانچہ مذکور ہوا اعتراض اور جھگڑا ٹپکتا تھا جناب باری تعالےٰ نے یہ امتحانِ اعمال مقرر کر دیا۔ تاکہ ان کی حجت منقطع ہو جائے اور کل کو غل نہ مچائیں اور ناانصافی کی تہمت نہ لگائیں اسی لئے ان کے سنانے کو فرماتے ہیں لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِیْنَ مِنْکُمْ وَالصّٰبِرِیْنَ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَکُمْ حاصل یہ نکلا کہ اگر تم کو ہماری طرف سے بدگمانی ہے اور یوں سمجھتے ہو کہ خدا کو کیا معلوم کون اچھا ہے کون برا ہے آزما کے دیکھا

تو ہوتا جو اچھے برے کا فرق معلوم ہوتا، ورنہ فقط اٹکل سے کسی کو برا بھلا سمجھ لینا۔ اور پھر اس کے موافق دوزخ و جنت میں داخل کر دینا کار انصاف نہیں تو اب ہم بھی امتحان ہی لیں گے تاکہ معلوم تو ہو کون بھلا ہے کون برا ہے کون مجاہد ہے کون صابر ہے غرض یہ امتحان قطع حجت بنی آدم کے لئے ہے خداوند علیم کو تحصیل علم مدِ نظر نہیں۔

اَخْبَارَکُمْ کے تفسیری فوائد چنانچہ دوسری آیت میں جو لفظ اَخْبَارَکُمْ ہے وہ بھی باآواز بلند اس بات پر شاہد ہے کہ خداوند علیم پہلے سے بےخبر نہیں اچھے برے نیک و بد سب کے حال سے خبردار ہے کیونکہ اس صورت میں حاصل اس آیت کا یہ ہے کہ ہم کو جو تمہاری حقیقتوں کی خبر ہے اور تم کو اس میں شک ہے ہم بھی اسے جانچیں گے اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ خدا کو پہلے سے ہر چیز کی خبر ہے بھلے اور برے کو جانتا ہے ایسا نہیں جیسا امامیہ کہتے ہیں کہ جب کوئی چیز پیدا ہوتی ہے خدا کو جب ہی خبر ہوتی ہے چنانچہ ملا نظام الدین جیلانی کے حوالہ سے اوپر گذر چکا لیکن بنی آدم کی حجت قطع کرنے کے لئے یہ سارا بکھیڑا کیا جیسے فرشتوں کے ساکت کرنے کے لئے سوال جواب مذکور کی نوبت پہنچائی ورنہ جیسے خداوند کریم پہلے سے جانتا تھا کہ حضرت آدم خلافت کے لائق ہیں اور فرشتوں میں وہ بات نہیں جو حضرت آدم علیہ السلام میں ہے ایسے ہی ازل سے جنتیوں کا جنت کے لائق ہونا اور دوزخیوں کا دوزخ کے لائق ہونا خداوند کریم اس طرح جانتا تھا جس طرح ہم تم لکڑیوں کا چولھے کے لائق ہونا اور روٹی کا کھانے کے قابل ہونا سمجھتے ہیں سو اگر خداوند کریم علم ازلی کے موافق جنتیوں کو جنت میں اور دوزخیوں کو دوزخ میں پہونچا دیتا تو کچھ ظلم نہ تھا۔ لیکن بنی آدم کا جھگڑا پلے بندھا تھا فرشتوں نے تو کیا تکرار کیا تھا جو یہ کرتے؟ اس لئے یہ سارے کارخانے اور امتحان مقرر کئے۔

جیسے بعض جگہ بالاتفاق ماضی سے مجازاً مستقبل مراد ہے اسی طرح بعض جگہ مستقبل سے بھی ماضی مراد ہے اب بفضلہ تعالےٰ وہ دھوکہ جو بوجہ آیات امتحان علماء شیعہ کو واقع ہوا تھا مرتفع ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ کلام اللہ یوں سمجھا کرتے ہیں نہ یہ کہ ایک آیت کو پلے لگ گئے اور جو کچھ فی الفور سمجھ میں آگیا اس پر جم گئے اور یہ نہ دیکھا کہ اور آیات سے مل کر اس آیت کے کیا معنے ہوتے ہیں اگر یہی تفسیر دانی ہے تو ہم جانتے ہیں کہ علماء شیعہ کل کو وَنَادیٰ اَصْحَابُ الْجَنَّۃِ اَصْحَابَ النَّارِ اور وَنَادیٰ

اَصْحَابُ الْاَعْرَافِ اور وَنَادیٰ اَصْحَابُ النَّارِ وغیرہا اس قسم کی آیات کے معنوں میں فرمانے لگیں گے کہ یہ سب قصے ہو چکے ہیں۔ اس لئے کہ قطع نظر ان آیات اور احادیث کے جن سے قیامت کا آئندہ کو ہونا ثابت ہوتا ہے سردست ان آیات کے یہی معنے معلوم ہوتے ہیں کہ یہ باتیں سب ایام گذشتہ کے افسانے ہیں کیونکہ نَادیٰ ماضی کا صیغہ ہے جب تلک یوں نہ کہیں کہ جو چیز ہونے والی ہے اور اس کے ہونے میں کچھ شک نہیں ہوتا اسے عرف میں یوں ہی کہا کرتے ہیں۔ کہ ہو ہی چکی چنانچہ جو شخص لب مرگ ہوتا ہے اسے کہا کرتے ہیں اس میں کیا رہا ہے مر ہی چکا۔

جب تلک ان آیات کے معنے اور آیات کے موافق نہ ہوں گے ادنےٰ سے ادنےٰ عربی خوان بھی یوں جانتا ہے کہ باعتبار لغت کے وَنَادیٰ اَصْحَابُ الْجَنَّۃِ اَصْحَابَ النَّارِ کے یہ معنے ہیں کہ ندا کی جنتیوں نے دوزخیوں کو اب تلک دوزخ اور جنت میں گیا ہی کون ہے جو یہ سوال اور جواب ہونے لگے البتہ یہ سب سرگذشتیں بروز قیامت ظہور میں آئیں گی، چنانچہ سیاق اور سباق سے ظاہر ہے اور نیز امامیہ اور اثنا عشریہ بھی یہی فرماتے ہیں سو جیسے ان الفاظ کو بقرینہ دیگر آیات اپنے معنی حقیقی یعنی زمانہ ماضی سے پھیر کر معنے مجازی یعنی زمانہ مستقبل مراد لیتے ہیں ایسے ہی اگر لِنَبْلُوَنَّکُمْ وغیرہ کلمات کو جو زمانہ مستقبل پر دلالت کرتے ہیں ان آیات کے قرینے سے جن سے خداوند علیم کے علم کا قدیم ہونا ثابت ہوتا ہے اپنے معنے اصلی یعنی زمانہ مستقبل سے پھیر کر زمانہ ماضی مراد لیں تو کیا گناہ ہے؟

حوادثِ آئندہ یقینیہ کو ماضی اور وقائع ماضیہ مخفیہ کو مجازاً مستقبل سے تعبیر کرنا صحیح ہے اسکی مثال اور تصحیح مجاز کی وجہ درکار ہو تو سنئے جیسے امور آئندہ میں سے ان امور کو جن کا آئندہ کو واقع ہونا یقینی ہوتا ہے بایں وجہ کہ ان کا تحقق ضروری اور یقینی ہے الفاظ ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں ایسے ہی امور گذشتہ میں سے ان امور کو جن کا تحقق اور وقوع اور ان کا وجود ایک نوع سے مخفی ہو اور بایں ہمہ ان کا اثر بھی ہنوز ظاہر نہ ہوا ہو، تو بایں لحاظ کہ ایسے امور کا ہونا نہ ہونا اکثر اثر کے ہونے نہ ہونے سے معلوم ہوتا ہے الفاظ مستقبل سے تعبیر کر دیا کرتے ہیں مثال کی ضرورت ہو تو سنئے کہ اگر کوئی بیمار بوجہ امتداد مرض اور شدت بیماری ہمہ حب

فراش ہوجائے یعنی چارپائی کا سوار بن جائے۔ اور پھر شافی مطلق اس بیمار کو ایک دفعہ ہی شفا عطا فرمائے تو ظاہر ہے کہ وہ طاقت رفتہ مرض کے جاتے ہی نہ آجائے گی، بلکہ آئیگی تو رفتہ رفتہ آئے گی سو اگر بمجرد زوال مرض عطار وغیرہ قرض خواہ اگر اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگیں تو وہ مرد ضعیف ونقیہ اگر مفلس ہوتا ہے تو باوجود اطلاع اس امر کے کہ میرا مرض زائل ہوگیا اور میں اچھا ہوگیا اکثر یہی جواب دیتا ہے کہ میں اچھا ہو جاؤں تو کہیں سے فکر کر کے آپ کا حق پہونچاؤں۔

یا فرض کرو بیمار کو تو زوال مرض کی اطلاع نہ ہو، چنانچہ اکثر ہوتا ہے پر طبیب کامل آثار و دلائل سے اس کی صحت سے مطلع ہو کر خواستگار انعام ہو اور بیمار بسبب بقائے آثار مرض مثل نقاہت وغیرہ کے اعطائے انعام میں متردد ہو تو طبیب اکثر کہا کرتے ہیں کہ اچھا جب تم اچھے ہو جاؤ گے جبھی دینا۔ سو جیسے طبیب یا مریض مذکور باین لحاظ کہ اب تک ظہور اثر صحت کچھ نہیں ہوا یعنے طاقت نہیں آئی صحت کو جو واقع ہو چکی بمنزلہ غیر واقع سمجھکر صیغہ استقبال سے تعبیر کرتا ہے۔

ایسے ہی جناب باری بھی اپنے اس علم قدیم کو کہ صحابہ مجاہد و صابر ہیں اور اعداء صحابہ فاسق و فاجر، اصحاب کرام بوجہ سعادت ازلی اور شرافت لم یزلی اور خوبی ذاتی و کمال صفاتی اس لائق ہیں کہ ان سے اچھے کام لئے جائیں۔ اور اس کے ثمرہ میں کمالات کسبی دیئے جائیں اور اعداء صحابہ بسبب شقاوت ازلی اور رذالت لم یزلی اور زبونی ذاتی اور نقصان صفاتی اس قابل ہیں کہ ان سے برے کام لئے جائیں اور اس کی پاداش میں ان کے قلوب سیاہ کئے جائیں باین نظر کہ قبل تکلیف اعمال اس علم پر کوئی ثمرہ متفرع نہیں ہوا اور اس کا اثر یعنی اچھے برے کاموں کا ان سے لینا ہنوز ظاہر نہیں ہوا یا باین خیال کہ بہت سے نابکاروں کو خدا کے اس علم کے صحیح ہونے میں ایسا تردد ہے جیسا بیمار مذکور کو قول طبیب میں، اگر بصیغہ استقبال بیان فرمائے تو شیعوں کو اس قدر حیرت کیوں ہے۔؟

ازلی سعادت وشقاوت کی عام فہم مثال رہی یہ بات کہ یہ فرق نیک و بد ازلی اور خلقی ہے کسبی اور عارضی نہیں سو یہ ہرچند ایک امر دقیق ہے۔ لیکن اہل فہم کے نزدیک یہ فرق بعینہ ایسا ہی جیسا

ذکی وغبی اور حلیم و تندخو اور بخیل و سخی اور شجاع و نامرد، عالم و جاہل کا فرق ہے جیسے بادشاہانِ عاقل عالم سے کارِ علم اور جاہل سے کار جہل لیتے ہیں ایسے ہی جناب باری بھی ہر کسی سے اُسی کے لائق کام لیتا ہے۔

تینوں زمانے مجتمعۃً موجود ہیں فنا نہیں ہوئے بلکہ تحقیق تو یوں ہے کہ زمانہ تمامہ ازل سے لے کر ابد تک ایک شے موجود ہے نہ زمانہ ماضی فنا ہوا اور نہ زمانہ آئندہ معدوم ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی یوں کہے اِنَّ زَیدًا قَائِمٌ یعنی زید قائم ہے تو بمجرد اس کلام کے سننے کے ہر کوئی یہ سمجھ جاتا ہے کہ زید موجود ہے اور اس کا یہ حال ہے اور ظاہر بھی تو ہے کہ کوئی حال تو جب ہو کہ جب وہ خود پہلے ہولے جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو گذارش یہ ہے کہ قیامت کے باب میں جو وقائع آئندہ میں سے ہے خداوند کریم یوں فرماتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ خدا سچا ہے کہ اِنَّ السَّاعَۃَ آتِیَۃٌ یعنی بیشک قیامت آنے والی ہے یا دوسری جگہ یوں فرماتا ہے اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ یعنی بیشک قیامت کا زلزلہ بڑی چیز ہے، سو موافق قاعدہ مذکورہ کے ہم بھی یونہی سمجھتے ہیں کہ قیامت بالفعل موجود ہے اور اس کا یہ حال ہے کہ ہماری طرف آنے والی ہے۔ اور وہ بہت بڑی چیز ہے اور ہم اس پر بے تکرار ایمان لاتے ہیں اور چون و چرا نہیں کرتے۔ اور اگر کوئی نیم ملا یوں چون و چرا بھی کرے۔ کہ بہت اوصاف ایسے ہیں کہ ان سے اس چیز کا وجود معلوم نہیں ہوتا جس کا وہ وصف ہوتا ہے مثلاً کوئی یوں کہے کہ فلانا مر گیا یا فلانا معدوم ہو گیا۔ تو ہرچند یہ شبہ قابل جواب نہیں اور اس کا جواب بھی یہ ہے کہ یہ باتیں اوصاف نہیں بلکہ اوصاف کا نہ ہونا ہے۔ لیکن سلمنا یوں کہنا کہ فلانی چیز آنے والی ہے یا فلانی چیز بڑی ہے یہ تو ایسی نہیں جن سے ہونا معلوم نہو بلکہ یہ باتیں تو کودنوں کے نزدیک بھی وجود ہی پر دلالت کرتی ہیں سو درصورتیکہ یہ اوصاف وجود پر دلالت کرتے ہوں ہم قیامت کے بجائے خود موجود ہونے میں کیوں تامل کریں اور یوں جب مقرر ہو چکا تو ہم ایک اور بھی التماس کرتے ہیں کہ جیسے قیامت آنے والی ٹھیری اور وہ اس وصف کے قرینے سے موجود معلوم ہوئی تو زمانہ گذشتہ بشہادت تمام عالم گذرنے والا ہے اسی واسطے اس کا نام گذشتہ رکھا گیا معہذا جب قیامت وغیرہ

اجزائے زمانہ متحرک ٹھیرے تو ایک روز ہم تک پہونچکر گذر بھی جائیگی اور یوں کہنا کہ فلانا شخص جاتا ہے وجود پر دلالت کرنے میں کچھ اس سے کم نہیں کہ یوں کہیئے کہ فلانا شخص آتا ہے اور جب دونوں طرفیں زمانے کی گذشتہ اور آئندہ برابر بجائے خود موجود نکلیں۔

سب زمانے احاطۂ خداوندی میں ہیں۔

تو موافق فرمودۂ باری تعالےٰ اعنی آیہ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْئٍ مُّحِیْط سارا زمانہ اول سے لے کر آخر تک احاطۂ خداوندی میں داخل ہوا سو احاطۂ خداوندی کے جو کچھ کوئی معنے لے ہمیں کچھ انکار نہیں کم سے کم یہ معنے تو ضرور ہوں گے کہ اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے جیساکہ دوسری آیت بعینہٖ اسی معنے پر دلالت کرتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے اِنَّ اللّٰہَ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْئٍ عِلْمًا۔ یعنے اللہ کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اس صورت میں کیفیت سارے زمانہ کے وجود کی باوجود اس روانگی کے کہ ایک جزو آتا ہے اور ایک جاتا ہے ایسی ہوگی جیسے اجزاء آب رواں کہ سب کے سب بجائے خود موجود ہیں۔ لیکن جب اگلے اجزاء گذر جاتے ہیں تب پچھلے آتے ہیں۔

اور خدا کے پیش نظر اور معلوم ہونے کی ایسی مثال سمجھئے جیسے کوئی لب دریا جا کر کھڑا ہو تو ادھر سے ادھر تک تمام دریا کا پانی اور جو جو اس پانی کے اندر ہوتا ہے حباب یا خس و خاشاک اس کے پیش نظر ہوتا ہے اور اس کو سب ایک شے واحد نظر آتا ہے گو اجزاء آب اور جو کچھ ان میں ہے باہم مقدم اور موخر ہیں

ماضی و مستقبل بھی خدا کے لئے حال کا حکم رکھتے ہیں مگر باہم مقدم موخر ہیں

الغرض اجزاء زمانہ اور جو کچھ زمانے میں واقع ہوتا ہے سب کا سب تمامہا خداوند کریم کے پیش نظر ہے اور سارا مجموعہ اس کو بمنزلہ شے واحد معلوم ہوتا ہے اور معاً سب کے سب اس کو یکساں نظر آتے ہیں اس کے حساب سے سب زمانہ حال کا حکم رکھتے ہیں مگر آپس میں ایک دوسرے کی نسبت مقدم اور موخر گنے جاتے ہیں اور فرق حال اور استقبال اور ماضی کا بہ نسبت ایک دوسرے کے ہے۔ سو جیسے کوئی کسی مکان میں ہوتا ہے تو اس کے سوا جو مکان کہ جو اس کے سامنے ہوتا ہے اس کو آگا کہتے ہیں اور جو اس کے پیچھے ہوتا ہے اسے پیچھا کہتے ہیں، ایسے ہی جس زمانہ میں کوئی چیز ہوتی ہے اس کے پہلے زمانہ کو بہ نسبت اس شئے ماضی کہتے ہیں اور اس کے اگلے

زمانہ کو بہ نسبت اس کے مستقبل اور خاص اس زمانہ کو جس میں وہ چیز ہوتی ہے اس کی نسبت زمانہ حال کہتے ہیں سو ہر چند خداوند کریم کے پیش نظر ہونے میں اور اس کے سامنے موجود ہونے میں سب یکساں ہیں لیکن باہم مقدم اور موخر ہیں اور ایک دوسرے کی نسبت ماضی اور مستقبل اور حال ہے

کلام الٰہی میں ماضی و حال و استقبال کے استعمال کی ترتیب

سو خداوند کریم کبھی تو موقع دیکھ کر بلحاظ اپنے معلوم ہونے اور اپنے پیش نظر ہونے کے کلام کرتا ہے اور کبھی مناسب وقت ان وقائع کے تقدم اور تاخر کا لحاظ ہوتا ہے پہلی صورت میں تو ہمیشہ ماضی کا صیغہ یا حال کا صیغہ مستعمل ہوتا ہے اور دوسری صورت میں ماضی کے موقع میں ماضی اور حال کے موقع میں حال اور استقبال کی جگہ استقبال اور باوجود سب کے یکساں پیش نظر ہونے کے ماضی کا صیغہ جو استعمال کرتے ہیں اور حال کا لفظ نہیں بولتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی کسی فعل کے صدور اور حدوث سے خبر دینی مدنظر ہوتی ہے اور کبھی اس فعل کے استمرار وجود کی خبر سو جن افعال کی خبر دیتے ہیں وقت خبر جو وہ حاضر ہوتے ہیں تو باعتبار استمرار وجود کے حاضر اور پیش نظر متکلم ہوتے ہیں ورنہ باعتبار صدور اور حدوث کے وقت خبر حاضر نہیں رہتے بلکہ غائب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ صدور اور حدوث آنی ہے زمانی نہیں اور قبل وجود کسی فعل کے جو اس فعل کی خبر دی جاتی ہے تو وہ لاجرم بصیغہ استقبال ہونی چاہیے غرض حدوث کے لئے صیغہ حال ممکن نہیں یا لفظ ماضی ہوگا یا لفظ استقبال اگر قبل حدوث کسی وجہ سے مطلع ہو کر خبر دینگے تو بصیغہ استقبال خبر دینگے اور بعد حدوث معائنہ کر کے خبر دینگے تو بصیغہ ماضی خبر دینگے، حال جب ہو سکتا تھا کہ حدوث بھی مثل استمرار یعنی حاصل مصدر زمانی ہوتا آنی نہوتا۔ بہر حال نسبت علم خداوندی کے سب بمنزلہ حال کے ہے۔ سو جہاں کہیں وقائع آئندہ کو ماضی کے الفاظ سے بیان کیا ہے جیسا وَنَادیٰ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ یا اور سوا اس کے تو وہاں علت اس کی یہ ہے کہ خدا کو سب مستحضر اور پیش نظر ہے اور جہاں امور گذشتہ میں صیغہ استقبال کا مذکور ہے۔ جیسا حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجَاھِدِیْنَ یا وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ وغیرہ تو وہاں یہ مدنظر ہے کہ نسبت اپنے ماقبل کے مستقبل ہے۔

وقائع عالم قدیم نہیں ہوسکتے کیونکہ مستمر نہیں

اس بحث کو اہل انصاف انصاف سے ملاحظہ فرمائیں اور پھر فرمائیں کہ یہ ہیچمداں ہرچند دیوانہ ہے لیکن کسقدر ٹھکانے کی بات کہتا ہے مگر برائے خدا ذرا سوچ سمجھکر دیکھیں مبادا اپنی جلدی میں میرے ذمے یہ تہمت نہ لگا دیں کہ فلانے رسالے والا وقائع عالم کے قدیم ہونے کا قائل ہے تنبیہ کے لئے میں ابھی سے کہے دیتا ہوں کہ کسی واقعہ کے قدیم ہونے کے لئے یہ ضرور ہے کہ اس کا استمرار وجود اعنے حاصل بالمصدر بقدر تمام زمانہ من اولہ الی آخرہ ہو یعنے ازل سے لے کر ابد تک اس کا استمرار وجود موجود ہو اس سے قدم ثابت نہیں ہوتا کہ ایک زمانہ محدود الطرفین پر منطبق ہو اگرچہ وہ زمانہ قطع نظر حرکت لازمہ کے بذات خود ایک شے مستقر ہو۔ یعنے مثل حرکات انسانہ ہو کہ ایک جز حادث ہوا تو ایک فانی ہوگیا اللّٰھم انت الھادی لا ھادی الا انت

حصول علم کے دو طریقے بالواسطہ و بلا واسطہ

اور اگر کوئی عقل کا پورا اس تقریر میں کچھ الجھنے لگے اور اس طریق سے مطلب تک پہنچنا اس کو دشوار معلوم ہو تو ایک دوسرا طریق جس کی بہ وضاحت خدا کے علم کا قدیم ہونا اور ان آیات کا بھی بلا تکلف اس پر مطابق آجانا ثابت ہو جائے۔ جو درج اوراق ہیں پر توجہ خاطر ناظرین ضروری ہے۔ اپنے علوم کے تجسس کرنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمکو علم اشیا دو طریق سے حاصل ہوتا ہے ایک تو بے واسطہ دوسرا بواسطہ لوازم یا بواسطہ ملزومات، مثلاً آفتاب کا یا دھوپ کا علم کبھی تو بے واسطہ ہوتا ہے آنکھ سے دیکھا معلوم ہوگیا اور کبھی بواسطہ ہوتا ہے آفتاب کا علم دھوپ کے وسیلہ سے یا دھوپ کا علم آفتاب کے وسیلہ سے، اگر آدمی گھر میں ایسی جگہ بیٹھا ہو جہاں سے آفتاب نظر نہ آتا ہو پر دھوپ نظر آتی ہو تو دھوپ کے وسیلہ سے معلوم ہو جائیگا کہ آفتاب آسمان پر نکلا ہوا ہے سو یہ علم جو آفتاب کا حاصل ہوا تو بواسطہ لازم حاصل ہوا اور اگر آفتاب کو صحن میں بیٹھے ہوئے دیکھیں اور یوں سمجھیں کہ چھت پر دھوپ ہوگی تو یہ دھوپ کا علم بواسطہ ملزوم حاصل ہوا علیٰ ہذا القیاس آگ اور دھوئیں کے علم کو سمجھئے کہ کبھی بے واسطہ حاصل ہوتے ہیں جیسے آگ کو یا دھوئیں کو خود آنکھ سے دیکھ لیا کبھی بواسطہ یک دیگر ہوتا ہے مثلاً دھوئیں کو دیوار کے پیچھے سے دیکھ کر آگ کو سمجھ جانا یا دور سے جہاں چراغ کا دھواں نظر نہ آتا ہو چراغ کے

شعلہ کو دیکھ کر دھوئیں کو جان لینا۔

اکثر ایک چیز کا علم بواسطہ اور بیواسطہ دونوں ساتھ آتے ہیں

لیکن ایک شے کے علم بے واسطہ کو اس کا علم بواسطہ بھی بلبشتر لازم ہوتا ہے اور دونوں ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں اور کسی طرح کا تقدم اور تاخر نہیں ہوتا مثلاً آگ کو قریب سے دیکھئے تو دھواں بھی اس کے ساتھ ہی نظر آئے گا سو اس صورت میں آگ کا علم دو طرح حاصل ہو سکتا ہے ایک تو بے واسطہ کیونکہ آنکھ سے خود نظر آتی ہے دوسرا دھوئیں کے واسطے سے کیونکہ اگر آگ نظر نہ آتی۔ اور دھواں ہی نظر آتا تو بیشک آگ کا علم حاصل ہوتا سو درصورتیکہ آگ بھی نظر آئی تو بطریق اولےٰ آگ کا علم دھوئیں کے واسطے سے ہونا چاہیئے اور ظاہر بھی تو ہے اب دھوئیں میں کیا کمی آگئی ہے جو دلالت نہ کرے۔

کبھی علم بواسطہ علم بے واسطہ میں محو ہو جاتا ہے کہ اس کا خیال بھی نہیں رہتا

بلکہ غور سے دیکھئے تو تلازم جس سے علم بالواسطہ حاصل ہوتا ہے اسی صورت سے معلوم ہوتا ہے مگر آگ کا علم جو بواسطہ دھوئیں کے اس صورت میں حاصل ہوتا ہے ہرچند علم بے واسطہ ہی کے ساتھ حاصل ہوتا ہے لیکن علم بے واسطہ میں ایسا منمحل اور محو ہے کہ اس کی خبر بھی نہیں ہوتی اور کسی کو اس طرف دھیان بھی نہیں گذرتا اس کی ایسی مثال ہے کہ دن کو ستاروں کا نور بھی ہوتا ہے مگر آفتاب کے نور میں ایسا محو ہے کہ معلوم بھی نہیں ہوتا۔

کبھی دو چیزوں کا علم بے واسطہ یا ایک کا بواسطہ دوسری کا بیواسطہ بھی اکھٹے ہی حاصل ہو جاتے ہیں

جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی کہ ایک شے کا علم بیواسطہ اور بواسطہ بسا اوقات دونوں ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں ایسا ہی یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ کبھی دو چیزوں کا علم بے واسطہ بھی ساتھ ہی حاصل ہوتا ہے مثلاً آگ کو اور دھوئیں کو ایک ساتھ دیکھئے علیٰ ہذا القیاس ایک شے کا علم بے واسطہ اور دوسری شے کا علم بواسطہ پہلی شے کے واسطے سے بھی اکھٹے ساتھ ہی حاصل ہوتے ہیں مثلاً دھوئیں کا علم بے واسطہ اور آگ کا علم بواسطہ دھوئیں کے واسطے سے اور ایسے ہی آگ کا علم بے واسطہ اور دھوئیں کا علم بواسطہ آگ کے واسطہ سے دونوں ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں اور اکثر کچھ تفاوت نہیں ہوتا جو ایک کو یوں کہیں کہ یہ علم تو فلانی ساعت میں حاصل ہوا

اور یہ علم اس سے پہلی ساعت یا اس کے بعد کی ساعت میں حاصل ہوا۔

بے واسطہ اور بواسطہ حاصل ہونے والے علم الٰہی میں کوئی تقدم تاخر نہیں

لیکن تاہم عقل کے نزدیک ایک ترتیب ہے کہ اس کی رو سے مقدم موخر کہہ سکتے ہیں یعنی ایک شے کے علم بیواسطہ کو دوسری شے کے علم بالواسطہ سے جو بواسطہ پہلی شے کے حاصل ہوتا ہے عقل ایک طرح سے مقدم سمجھتی ہے یعنی ہر کوئی یوں سمجھتا ہے کہ دوسری شے کا علم اس صورت میں پہلی شے کے علم پر موقوف ہے سو جیسا ہاتھ میں کسی چیز کو لے کر ہلایئے تو گو وہ چیز ہاتھ کے ساتھ ہی ہلتی ہے لیکن پھر یوں کہتے ہیں کہ ہاتھ اول ہلتا ہے ایسا ہی اس صورت میں گو دونوں چیزوں کا علم برابر ہی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جس کا علم بے واسطہ ہے بہ نسبت اس کے علم کے جس کا علم اسی کے واسطے سے حاصل ہوتا ہے مقدم گنا جاتا ہے اور جیسا یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہاتھ کو اس لئے ہلایا تاکہ وہ چیز ہلے جو ہاتھ میں ہے۔ ایسا ہی یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دھوپ کو اس لئے دیکھا تاکہ آفتاب بھی معلوم ہو جائے۔

کلام الٰہی میں ماضی و حال علم بیواسطہ سے تعبیر ہے اور استقبال علم بالواسطہ سے

جب یہ تمام مقدمات ذہن نشین ہو چکے۔ تو اب التماس یہ ہے کہ خداوند کریم کے علم کو اگر قدیم کہیئے تو حتیٰ نعلم وغیرہ کے استقبال میں کچھ فرق نہیں آتا اور حتیٰ نعلم وغیرہ کے استقبال سے اس کے علم کے قدیم ہونے میں کچھ تفاوت نہیں پڑتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خداوند علیم کو ہر چیز کا علم دو طرح سے حاصل ہے بے واسطہ اور بواسطہ یکدیگر، کیونکہ تمام موجودات کے ساتھ لوازم لگے ہوئے ہیں، سو جیسا لوازم اور ملزومات دونوں کا علم بیواسطہ اسے حاصل ہے ایسا ہی لوازم کا علم ملزومات کے واسطہ سے، ملزومات کا علم لوازم کے واسطہ سے بھی اسے حاصل ہے اور دونوں ازل سے برابر ساتھ ہیں۔ گو علم بالواسطہ کسی چیز کا اسکے علم بے واسطہ میں محو اور مضمحل ہو، اور ایسا ہی کسی چیز کا علم دوسری چیز کے علم کے واسطہ سے اور اس دوسری چیز کا علم برابر ساتھ ہی ازل سے خداوند لم یزل کو حاصل ہیں اور دونوں قدیم ہیں مگر کسی چیز کے علم بالواسطہ کو بہ نسبت اس چیز کے علم کے جس کے واسطے سے یہ علم حاصل ہوا ہے۔ موخر گنیں گے اور یہ علم بہ نسبت اس علم کے مقدم سمجھا جائے گا۔ سو جہاں کہیں علم خداوندی کے ذکر میں صیغہ استقبال کا یا معنے استقبال کے پائے جاتے ہیں وہ باعتبار علم بالواسطہ کے ہے ورنہ باعتبار زمانہ کے کچھ تفاوت نہیں اور جہاں کہیں ماضی یا حال مستعمل ہے وہاں

علم بے واسطہ مراد ہے۔

بنی آدم کے علوم چونکہ بواسطہ ہیں اس لئے بصیغہ استقبال (بواسطہ) تکلم فرمایا

اور باعتبار علم بالواسطہ کے کلام کرنے کی وجہ یہ پیش آئی ہے کہ کلام اللہ کے مخاطب آدمی ہیں اور تمام آدمی بلکہ تمام ذوی العقول کو اکثر چیزوں کا علم بالواسطہ ہی ہے بیواسطہ نہیں۔ روح بنی آدم یا بنی آدم کے کمالات نفسانی جیسے سخاوت، شجاعت، خلق، مروت، اگر ہیں تو دل میں ہیں آنکھوں سے یا کانوں سے یا سوا اس کے اور حواس خمسہ سے معلوم نہیں ہوتے ان کو اگر کوئی دوسرا معلوم کرتا ہے تو ان کے آثار اور لوازم سے معلوم کرتا ہے۔ سخاوت دینے دلانے سے جو ہاتھ کا کام ہے، شجاعت مارنے مرنے سے، جو ہاتھ پاؤں سے تعلق رکھتا ہے خلق شیریں زبانی سے جو زبان سے متعلق ہے معلوم ہوتی ہیں علیٰ ہذا القیاس روح کا ہونا نہ ہونا دوسروں کو حرکات سکنات سے جو بدن سے متعلق ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔

اگر علوم بے واسطہ سے تکلم فرماتے تو وہ بنی آدم پر حجت نہ ہوتے کیونکہ ان کے بس میں نہیں

اور جہاں کہیں جناب باری تعالےٰ نے اپنے علم میں صیغہ استقبال استعمال کیا ہے وہ ایسے ہی مور ہیں جو بنی آدم کو بے واسطہ معلوم نہیں ہو سکتے۔ سو ان سے باختیار علم بے واسطہ کے اگر کلام کرتے۔ تو ان پر کچھ حجت نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ان کو الزام دے سکتے تھے۔ اس لئے الزام دینے کے موقع میں باعتبار علم بالواسطہ کے کلام کی ہے اور جہاں یہ غرض نہیں وہاں باعتبار علم بے واسطہ کے کلام کی ہے اور وہاں صیغہ ماضی کا یا حال کا مستعمل ہے مگر بنی آدم کو چونکہ ان اشیاء کا علم بے واسطہ ہو ہی نہیں سکتا اور بسبب ان واسطوں کا علم قبل ان کے وجود کے بنی آدم کے حق میں ممکن ہی نہیں اور اس وجہ سے ان کے تمام علوم برابر حاصل نہیں ہوتے تو وہ خدا کو اپنے اوپر قیاس کر کے صیغہ استقبال سے حدوث سمجھ جاتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ کلام اللہ میں ایک جا تو یوں مذکور ہے کہ خداوند علیم کو تمام اشیاء کے علوم ازل سے حاصل ہیں جیسا کہ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا۔ اور ایک سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعضے علوم حادث ہیں جیسے الفاظ حتیٰ نعلم وغیرہ مگر جو لوگ فہمیدہ ہیں اور نکتہ مذکورہ سے متنبہ ہو گئے ہیں وہ دونوں کو مطابق یکدیگر سمجھتے ہیں۔

محو و اثبات کی بحث اور علم الٰہی کے دو دفتر

اب مناسب یوں ہے یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَاءُ وَ یُثْبِتُ کے معنے بھی بیان کیے جائیں کہ منصفان علماء شیعہ کو شاید انتظار ہو مخدوم من اول ساری آیت گوش گذار ہے بعد اس کے اپنا ما فی الضمیر بھی معروض خدمت ہوگا ساری آیت یوں ہے وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ اَنْ يَاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتَابِ حاصل اس کا یہ ہے کہ کسی رسول سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی معجزہ جو اس کی نبوت کی نشانی ہو خدا کی بے اجازت لے آئے اللہ کے یہاں ہر مدت کی ایک جدا کتاب ہے اس میں سے جو چاہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اس کے پاس ایک اور بڑی کتاب ہے جو سب کی اصل ہے۔ یہ تو اس آیت کا حاصل ہوا۔ اب اہل فہم سے یہ امید ہے کہ بعد ملاحظہ ان دونوں لفظوں کے ایک تو لکل اجل کتاب، اور دوسرا وعندہ ام الکتاب، اور نیز بعد لحاظ اس امر کے کہ جملہ یمحو اللہ الخ اول کے بعد واقع ہے بے تنبیہ کے آپ سمجھ جائیں گے کہ خداوند کریم کے یہاں دو دفتر ہیں ایک بڑا جس کی طرف ام الکتاب کا لفظ اشارہ کرتا ہے۔ دوسرا چھوٹا دفتر جس کی طرف جملہ لکل اجل کتاب ہدایت کرتا ہے اور محو اور اثبات یعنی مٹانا نہ مٹانا یہ چھوٹے دفتر میں ہوتا ہے بڑے میں نہیں ہوتا سو بعینہٖ یہی اہل سنت کا مذہب ہے وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ بڑا دفتر جو علم خداوندی کے موافق ہے یا خود علم خداوندی ہے اس میں گھٹا و بڑھاؤ نہیں ہوتا۔

عقیدہ بدا قرآن سے اس طرح ثابت ہے جیسے لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ سے نماز کی ممانعت

پھر شیعہ کس خوبی پر یہ دعوے کرتے ہیں کہ بدا کلام اللہ سے ثابت ہوتا ہے اگر اسی آیت کے بھروسے کودتے ہیں تو یہ بعینہ ایسا ہی استدلال ہے جیسا کسی بانوا نے کہا تھا کہ کلام اللہ میں خدا نے نماز سے منع فرمایا ہے اس لئے ہم نہیں پڑھتے۔ کسی نے پوچھا کہ صاحب ہمیں بھی بتلاؤ ہم نے تو آج تک یہ بات نہیں سنی اگر یہ حکم ہے تو کلام اللہ کے قربان جائیے بڑے آرام کی بات نکل آئی بانوا نے کہا صاحب سورہ نساء میں نہیں کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ یعنی نماز کے پاس نہ پھٹکو اس نے کہا صاحب اس کے بعد وَاَنْتُمْ سُكَارٰى بھی تو ہے یعنی نشے کی حالت میں نماز مت پڑھو۔ ساری آیت کے معنی پر عمل کرنا چاہیے بانوا نے کہا بابا سارے کلام پر کس سے عمل ہوا ہے یہ بھی

غنیمت ہے جو اتنا بھی عمل ہو جائے سو شاید علماء شیعہ نے بھی اسی قاعدہ پر عمل کیا ہے۔

اور میرے نزدیک ایک اور عذر شیعوں کے لئے اس موقع میں خفت اتارنے کے لئے بہت عمدہ ہے وہ یہ ہے کہ سارے کلام اللہ کے یاد نہ ہونے میں تو شیعہ معذور ہی ہیں۔ اتفاق سے لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ، تک فقط ان کو یاد ہو گیا تھا۔ بسبب کمال عبودیت اور سراپا بندہ ہونے کے اسی پر اعتقاد جما بیٹھے۔ سو یہ بات تو قابل تعریف ہے اگر وعندہ ام الکتاب بھی ان کو معلوم ہوتا اور پھر سنیوں کے موافق ان کا اعتقاد نہ ہوتا تب البتہ جائے گرفت تھی سبحان اللہ اس تفسیر دانی اور کلام اللہ کے محفوظ ہونے پر سنیوں سے مقابلے کا دعوے مگر، مو شے بخواب اندر بیرون ز شہر شد۔، جناب من شیعوں کے اکثر استدلال تو بانوا مذکور کے سے استدلال ہیں اور کلام اللہ کی یادداشت ایسی ہے جیسے مرزا نوشہ شاعر تبقاضائے تائید مذہب اپنی سرگذشت لکھتے ہیں ؎

لا تقربوا الصلوٰۃ زفہمم بخاطر است ٭ وز امر یاد ماند کلوا واشربوا مرا

علم الٰہی قدیم غیر متغیر محیط ہے

حق یوں ہے کہ علم الٰہی میں کچھ تغیر نہیں آتا اور کیونکر تغیر ہو سکے۔ خداوند کریم جا بجا ایسے ہی توہمات کے دفعیہ کے لئے فرماتا ہے۔

كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا۔ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عَالِمِيْنَ۔ اِنَّ اللّٰهَ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا۔ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيْطًا۔

حاصل سب کا یہ ہے، کہ خداوند کریم ازل سے ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کی حقیقت پہچانتا ہے اور ہر چیز ازل سے اس کے احاطہ علمی اور احاطہ وجودی میں ہے

چنانچہ تصویر اس مضمون کی کچھ مذکور بھی ہوئی پھر جب ازل سے ہر چیز کو محیط ہے۔ تو بعد اس کے غلطی کا باعث اگر ہو سکے ہے تو یہ ہو سکے ہے کہ کوئی چیز بیچ میں خدا کے اور خدا کے معلومات کے حائل ہو جائے۔ سو اگر یہ احتمال ہے تو اس کا جواب تو کلام اللہ ہی میں بہت جگہ موجود ہے نحن اقرب یعنی ہم سب سے زیادہ نزدیک ہیں یا شیعی یوں تجویز فرمائیں کہ نعوذ باللہ خداوند کریم کے حواس میں فتور ہے سو اتنی جرأت شیعوں ہی کو ہے معہذا لا يخفى على الله من شيء في الارض ولا في السماء یعنی اللہ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی زمین میں نہ

آسمان میں یہ بھی کلام اللہ ہی میں ہے کسی پنڈت کی پوتھی کی آیت نہیں

عقیدہ بدا خدا کے لئے جہل مرکب تجویز کرتا ہے

تیسر طرفہ یہ ہے کہ اکثر علماء شیعہ معقولات میں دخل در معقولات رکھتے ہیں مگر تیسر اتنا نہیں سمجھتے کہ علم غلط حقیقت میں علم نہیں وہ اقسام جہل میں سے ہے اسی واسطے اس کو جہل مرکب کہتے ہیں اس اصطلاح کو منطق کے چھوٹے رسالہ پڑھنے والے تو درکنار ان پڑھ بھی سمجھتے ہیں۔ بلکہ زبان زد عام وخاص ہے کہ جہل مرکب سے تو جہل بسیط ہی بھلا بایں ہمہ جو یہ حضرات ذات والا صفات جناب کبریائی کو جہل مرکب کا بٹہ لگاتے ہیں۔ تو اول تو ان آیات مرقومہ پر خط نسخ کھینچنا پڑا سبحان اللہ خدا کے کلام کو بندے نسخ کریں اور وہ بھی اعتقادات میں کہ باتفاق شیعہ وسنی بلکہ باتفاق عالم قابل نسخ ہی نہیں دوسرے خدا کیجا جہل مرکب کجا نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات۔

عقیدہ بدا تمام موجودات کو ایک طرح خدا پر فضیلت دیتا ہے

تیسرے جمادات وغیرہ جن کو بالکل علم نہیں۔ بلکہ تمام موجودات ایک وجہ سے خدا سے افضل ٹھیرے کیونکہ کوئی ہو سوائے خدا کے سب میں کچھ نہ کچھ جہل بسیط ہے اور خدا میں جہل بسیط نہیں کیونکہ کلام اللہ کی آیات سے خود واضح ہو چکا کہ خدا کو سب چیز کی خبر ہے۔ سو وہ خبر اور وہ علم اگر غلط ہو وے تو جہل مرکب ہوگا اور جہل مرکب سے جہل بسیط آخر افضل ہی ہے۔ تو سب مخلوقات ایک وجہ سے خدا سے افضل نکلی واہ سبحان اللہ کیا خدا کی قدر شناسی ہے۔

تمام عالم علم الٰہی کے محو و اثبات کا دفتر ہے

باقی کوئی ہم سے یوں پوچھے کہ وہ دفتر کونسا ہے جس میں محو اور اثبات ہوتا ہے تو گو ہمیں بعد اس کے کہ یہ معلوم ہو گیا کہ وہ دفتر علم الٰہی کے علاوہ ہے کچھ اس کے جواب کی حاجت نہیں لیکن تسکین خاطر کر دینی بھی اچھی ہوتی ہے اس لئے معروض خدمت ہے کہ ان امور کی حقیقت تو خدا ہی جانے یا جن کو وہ اطلاع کر دے مگر بطور امکان و احتمال اس مقام میں ہمیں بیان کرنا لازم پڑا اس کم فہم کے فہم نارسا میں جو مضمون بتقاریر بعض بزرگان آتا ہے تو یہ ہے کہ تمام عالم دفتر خداوندی ہے مگر اس میں سے بعض اشیاء کو بمنزلہ اوراق کے اور بعض کو بمنزلہ نقوش اور حروف کے سمجھئے۔

محو و اثبات کی ایک تفہیمی تمثیل

تفہیم کے لئے اول یک مثال گوش گذار ہے موم یا گارے یا کسی اور نرم چیز کو ہم کئی کئی شکل میں لا سکتے ہیں چاہیں اس کو گول بنا لیں چاہیں چپٹا مگر اس موم پر ان اشکال میں سے ایک وقت میں ایک ہی شکل آسکتی ہے دو مجتمع نہیں ہو سکتیں۔ جب دوسری شکل آئے گی پہلی مٹ جائے گی لیکن چونکہ اشکال تو ایک قسم کے نقش و نگار ہیں تو ان کو تو بمنزلہ حروف اور نقوش سمجھئے اور اس موم کو بمنزلہ اوراق سمجھئے۔ جب یہ مثال ذہن نشین ہو چکی تو اب سنئے کہ تمام اجسام میں تبدل اشکال اور کیفیات نظر آتا ہے زمین سے جو کھیتی نکلتی ہے تو وہی اجزائے خاکی ہوتے ہیں پر خدا کی نیرنگی سے ان کی شکل اول بدل جاتی ہے پھر اس کھیتی کی شکل کیا سے کیا ہو جاتی ہے آخر رفتہ رفتہ وہی غذا جو حقیقت میں اجزاء خاکی ہیں شکل بدل کر غذا بن گئے ہیں۔ معدہ میں جا کر کچھ اور ہی ہو جاتے ہیں اور پھر نطفہ بن کے کچھ اور رنگ روپ پیدا کر لیتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اور اجسام میں دیکھ لیجئے گرمی سردی وغیرہ جتنے تغیرات ہیں وہ سب اسی قسم کے ہیں۔

ایسے ہی ارواح میں طرح طرح کی کیفیات کا تبدل رہتا ہے رنج خوشی خوف وامن وغیرہ سو جو چیزیں کہ بدلتی رہتی ہیں ان کو تو اس دفتر خداوندی کے حروف اور نقوش سمجھئے اور اجسام اور ارواح وغیرہ کو جو ان سب احوال میں بمنزلہ موم بجائے خود موجود رہتے ہیں اس دفتر کے اوراق سمجھئے بعد اس کے یہ ذہن نشین کیجئے کہ جو جو اشکال معدوم ہو گئے وہ تو محو ہو گئے اور جو ان کی جگہ قائم کئے گئے وہ اثبات اور ثبت ہو گئے۔ چنانچہ محاورہ دان فارسی اور عربی جانتے ہیں کہ اثبات اور ثبت لکھنے کے موقع میں بولا کرتے ہیں۔

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ کی عجیب تفسیر

مگر چونکہ ہر شکل کے لئے کچھ نہ کچھ زمانہ چاہیئے اور اس کی بقا کے لئے زمانہ میں سے کچھ مقدار معین ہوتی ہے تو خداوند کریم نے ارشاد فرمایا لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ۔ یعنی ہر زمانہ کے لئے جدا جدا نقوش ہیں جب ایک زمانہ ہو لیتا ہے اور دوسرے نقوش اور کلہائے اشکال اور کیفیات کی بہار آتی ہے اور ان کے زمانہ کی آمد ہولی ہے تب پہلے نقوش کو مٹا دیتے ہیں اور دوسرے زمانے کے مناسب نقوش ان اوراق میں لکھے جاتے ہیں مگر یہ وہ اوراق نہیں کہ پہلے نقوش کے مٹانے سے بگڑ جائیں یا آلودہ ہو جائیں بلکہ جیسے دفتر میں یا سلیٹ کی تختی یا لکڑی کی تختی پر جو چاہا لکھ دیا۔ پھر جب چاہا مٹا دیا اور اس کی جگہ اور لکھ دیا ایسے ہی ان اوراق

میں بھی جو چاہا لکھدیا اور جب چاہا مٹا دیا۔

ام الکتاب کی توضیحی مثال لیکن پہلے پچھلے سب نقوش کی نقل بلکہ اصل ایک بڑے دفتر اور بڑی کتاب میں ہے جیسے تحریر پڑھنے والے جس شکل کو پڑھتے جاتے ہیں سلیٹ پر کھینچ کھینچ سمجھتے جاتے ہیں، اور جب سمجھ لیتے ہیں اور دوسری شکل کے سمجھنے کی نوبت آتی ہے پہلی کو مٹا دیتے ہیں اور دوسری کھینچ لیتے ہیں اور باینہمہ ان سب کی نقل بلکہ اصل تحریر اقلیدس میں موجود ہے۔ باقی ربط اس آیت کا اپنے ماقبل سے اس صورت میں یہ ہوگا کہ کسی نبی سے کیونکر ہو سکے کہ اپنے آپ کوئی آیت لے آئے، ہمارے یہاں تو ہر زمانے کے لئے نقوش مقرر ہیں گنے چنے ہوئے رکھے ہیں۔ اس میں کمی بیشی کب ہو سکتی ہے جو کوئی اپنی طرف سے اسمیں اپنی خواہش کیموافق ہی آیت کا نقش بھی رلا دے؟

محو و اثبات علم الٰہی میں نہیں لہذا بدا کی گنجائش بھی نہیں اب اس تقریر کو اہل انصاف غور فرمائیں کہ کیسی برجستہ ہے اور پھر باینہمہ اس میں کہیں اس کی گنجائش نہیں کہ قائلین بدا انگشت رکھ سکیں یا تمسک کر سکیں پھر کوئی کیونکر کہدے کہ آیت میں محو اثبات کا ذکر ہے تو علم الٰہی میں محو اثبات ہوتا ہوگا مگر جو بات اپنے ذہن میں جمی ہوئی ہوتی ہے اسی کی طرف ذہن دوڑا کرتا ہے بھوکے کے نزدیک دو اور دو چار روٹیاں ہی ہوتی ہیں اور اگر اس تقریر کو سن کر کسی کے یوں کان کھڑے ہوں کہ مشہور تو یوں سنا تھا کہ لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ سے جو لکھنا نکلتا ہے تو یہی لکھنا ہے جسے عرف میں لکھنا کہتے ہیں سو وہ تو کسی کلام اور الفاظ کے مقابلہ میں جو حروف اور نقوش ہوتے ہیں ان کے لئے ہوتا ہے تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ حق بات چاہے مشہور ہو کہ نہو ہاں اگر یہ معنے چسپاں نہ ہوں تو جب ہی کہو۔

ام الکتاب اور محو و اثبات کی ایک اور مثال معہذا جیسے اور صاحبوں کی مرضی ہم بھی اس راہ چلتے ہیں دوکانداروں کے یہاں اکثروں نے دیکھا ہوگا کہ روزمرہ کی برداشت کو تختی پر لکھتے جاتے ہیں بعد ازاں بہی میں نقل کر کے تختی کو دھو لیتے ہیں اور پھر دوسرے دن کی برداشت اسی تختی پر لکھنی شروع کر دیتے ہیں سو روز یہ لکھنا اور مٹانا رہتا ہے اور بہی ایک ہی وہ ایسی ہے کہ اس میں تمام ایام کی برداشت کی تفصیل تاریخ وار درج ہے کہ اس میں بجز لکھنے کے مٹانے کا اتفاق نہیں ہوتا سو ایسا ہی جناب باری تعالے کے کارخانہ قدرت میں سمجھ لیجئے جیسے یہاں روزمرہ کی برداشت

تختی پر لکھتے ہیں۔ وہاں قرن وار کسی لوح پر ایک تحریر ہوتی ہو اور پھر اس کو اس لوح سے مٹا کر بڑی کتاب میں کہ اس کو اُمّ الکتاب کہتے ہوں درج کر دیتے ہوں بعد ازاں پھر دوسرے قرن کا حساب کتاب لکھنا شروع کر دیتے ہوں مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن کا حساب کتاب ایک لوح پر لکھ کے اس کو کسی بڑی لوح میں نقل کر دیا ہو پھر اس لوح سے اس تحریر کو مٹا کر صحابہ کے قرن کا حساب کتاب لکھ کر اسی طرح لوح کلاں میں درج کر دیا ہو اسی طرح یہ محو اثبات ہمیشہ ہوتا ہو مگر سب جانتے ہیں کہ یہ محو اثبات بوجہ غلطی تحریر نہیں کہ جس سے بدا ثابت ہو جائے۔

محو و اثبات بالفرض احکام میں بھی ہو تو صداقت ہے بدا نہیں اور سلمنا کہ یہ بھی نہ سہی بلکہ حکم احکام کے تبدیل و تغیر کے باعث یہ محو اثبات ہوتا ہو تب بھی تو مقتدایان شیعہ کا دعوے ثابت نہیں ہو سکتا تصویر اگر مطلوب ہے تو اس کی یہ صورت ہے کہ بیمار اگر طبیب کے پاس جاتا ہے تو وہ اس کے لئے موافق قواعد طب کے مثلاً منضج تجویز کرتا ہے۔ جب اس کی میعاد پوری ہو لیتی ہے تو انہی دواؤں میں سے بعض دواؤں کو کاٹ دیتا ہے اور سنا وغیرہ بڑھاتا ہے اور بعد اس کے تبرید کا نسخہ لکھتا ہے اور پھر مقویات تجویز کرتا ہے تو اس صورت میں جو کچھ طبیب تجویز کرتا ہے وہ سب کتب طب کے موافق ہوتا ہے۔ اور منضج اور مسہل اور تبرید اور مقویات کی جو تبدیلی کرتا ہے تو وہ تبدیلی اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ پہلی تجویز میں کچھ غلطی ہو گئی تھی بلکہ عین فہم و خوبی طبابت یہی ہے کہ اپنے اپنے وقت پر منضج اور مسہل اور تبرید کا استعمال ہوا کرے۔

سو جیسے یہ قصہ ہے ایسا ہی کارخانہ قدرت کا کارخانہ سمجھئے۔ جناب باری تعالے کو جو حکیم مطلق ہے بجائے طبیب حاذق خیال فرمائیے اور ام الکتاب کو بجائے کتب طب قرار دیجئے اور اس کتاب کو جو لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ میں ہے یعنی ہر ہر مدت کی جدا جدا کتاب کو بمنزلہ نسخہ منضج اور مسہل رکھئے اور فرشتوں کو تیماردار اور مجموعہ عالم کو جو اصطلاح محققین میں مسمی بہ شخص اکبر ہے بیمار فرض کیجئے اور محو و اثبات کو ایسا سمجھئے جیسا منضج کی جگہ مسہل بدلتے ہیں اور مسہل کی جگہ تبرید سو اس تبدیلی کو بدا مصطلح شیعہ سمجھنا کمال خوش فہمی پر دلالت کرتا ہے ہاں اگر یہ تبدیلی اس قسم کی ہوتی جیسے تشخیص کی غلطی سے اول کچھ تجویز کیا تھا پھر کچھ سمجھ میں اور آیا البتہ ایک موقع تھا لیکن لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ اس بات کو چاہتا ہے کہ مدت وار جدا جدا تحریریں ہوتی ہیں اور وہ تبدیلی

بوجہ تبدیلی مدت ہے بوجہ غلطی تجویز نہیں۔

القصہ یہ تینوں تقریریں جو مذکور ہوئیں ایک سے ایک چڑھتی ہوئی ہے اور بعد ملاحظہ ان تقریرات کے مدعیان بدا کا حوصلہ معلوم نہیں ہوتا کہ پھر اس آیت کی طرف منھ کر کے بھی سودیں یا اس آیت سے تمسک کا نام بھی لیں مگر جس کے دل میں انصاف نہو اس کے آگے حق بات کا بیان کرنا بھی لاحاصل خیر کوئی سمجھے یا نہ سمجھے جو اس پر بھی نہ سمجھے اسے خدا سمجھے۔

عقیدۂ بدا پر تیسرا استدلال | اور بعض علماء شیعہ کو بدا کی حقیقت پر ایک اور نئی دلیل سوجھی ہے آیت وَ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰی ثَلٰثِیۡنَ لَیۡلَۃً وَّ اَتۡمَمۡنٰہَا بِعَشۡرٍ الخ سے بدا کی حقیقت پر استدلال لاتے ہیں، تفصیل اس اجمال کی سنئے، ہم سناتے ہیں حاصل اس آیت کریمہ کا اول معروض ہے وہ یہ ہے کہ ,,وعدہ ٹھہرایا ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا۔ اور پورا کیا ہم نے اس مدت کو ایک عشرہ اور بڑھا کر سو پورا ہو گیا وقت اس کے رب کا چالیس راتیں انتہے''۔

اب تقریر استدلال سنئے اول تو جناب باری نے تیس شب کی محنت پر توراۃ کا وعدہ کیا پھر تیس رات کے مجاہدہ پر توراۃ عطا نہ ہوئی بلکہ فرماتے ہیں کہ تیس رات کے بعد دس روز اور بڑھا دیئے۔ سبب اس زیادتی کا بجز اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تیس رات کی خلوت پر توراۃ کا عطا ہونا خلاف مصلحت معلوم ہوا یہ کثیر اجرت اس قلیل مدت پر نازیبا نظر آئی تعظیم اجرت کے لئے مدت اور بڑھائی۔ سو اگر خدا ہی کو یہ بات پہلے سے سوجھی نہ تھی تب تو بدا کا ثبوت موافق اصطلاح متقدین ظاہر ہے ورنہ اس سے تو کم بھی نہیں کہ خداوند علیم تو جانتا تھا پر حضرت موسے اور بنی اسرائیل کو کچھ کا کچھ تبلا دیا۔ سو اس بات میں اور اس بات میں گو زمین و آسمان کا تفاوت ہے پر ہمارے حق میں جیسا بدا حسب اصطلاح متقدمین ویسا ہی توریہ رب العالمین۔ نہ اُس صورت میں خدا کے کلام پر اعتماد نہ اس صورت میں کلام ربانی قابل استناد۔ پھر اگر فضائل صحابہ وغیرہ معتقدات اہل سنت پر کلام ربانی شاہد بھی ہو تو کیا ہوا ایک زبانی بات ہے قابل التفات نہیں۔

جواب | مگر کوئی سمجھدار ہو تو ہم بھی سنیجی میں اس کا جواب لئے بیٹھے ہیں غلطی یا غلط گوئی متکلم اور ہے اور غلط فہمی مخاطب اور حضرات شیعہ اپنی غلط فہمی سے اپنی غلط فہمی کو غلطی یا غلط

گوئی خداوندی سمجھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ غلط فہمی اپنی سمجھ کا قصور ہے خداوند علیم کا اس میں کیا قصور؟ یہ سب جانتے ہیں کہ جناب باری نے اس قصہ کو مختصر بیان فرمایا ہے۔ روزوں کا اس میں ذکر نہیں مسواک کا اس جگہ مذکور نہیں سو جیسا روزوں کا ذکر نہیں فرمایا حالانکہ حدیث و تفسیر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ فقط تیس دن رات مقصود نہ تھے بلکہ اتنے دنوں صائم رہنا مطلوب تھا۔ ایسے ہی ہو سکتا ہے کہ بعض اور شرائط بھی ہوں کہ ان کا ذکر نہیں فرمایا منجملہ ان کے مسواک کا کرنا بھی ہو اور اگر فرض کیجئے روایات سے ثابت ہو جائے کہ توراۃ کی اجرت میں فقط تیس دن کے روزے ہی ٹھیرے تھے اور سوا اس کے اور کوئی بات مشروط نہ ہوئی تھی تو قطع نظر اس کے کہ اس امر کا ثبوت غیر ممکن معلوم ہوتا ہے فقط عدم ثبوت نکلے تو نکلے ثبوت عدم محال نظر آتا ہے۔

جواب کی ایک توضیحی مثال | ہم کہتے ہیں کہ بہت سے ایسے شرائط ہوتے ہیں کہ وقت تقرر اجرت ان کا مذکور نہیں آتا ان کا معروف ہونا کافی ہو جاتا ہے۔ کچہری یا فوج کے ملازموں کو دیکھئے کہ لباس خاص اور اکرام حکام اور تقدیم تسلیم کا وقت تقرران سے کوئی مذکور نہیں کرتا۔ با ایں ہمہ ان امور کے ترک پر ان سے مواخذہ کیا جاتا ہے جرمانہ لیا جاتا ہے تاوان لیتے ہیں سزا دیتے ہیں اور اگر ملازمان بادشاہی کی بات بایں وجہ قابل قیاس نہو کہ ان سے تو اصل کار اور اجرت کی مقدار کا بھی ذکر نہیں آتا۔ ایک بات معین ہوتی ہے جس سے ہر عام و خاص جانتا ہے، علیٰ ہذا القیاس اور امور بالائی مثل لباس وغیرہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ سو اس حساب سے ان کا حال مثل اصل امر رہا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات تو ہمارے اور بھی مفید مطلب ہے۔ کیونکہ جب شہرت کے سامنے تمام امور کے ذکر کی حاجت نہیں تو بعض امور کے مذکور ہونے کی تو بشرط شہرت لاجرم حاجت نہ ہوگی۔

دوسری توضیحی مثال | معہذا یہ مثال ناپسند ہے تو اور مثال لیجئے گھوڑے کو کہیں جانے کے لئے کرایہ کرتے ہیں تو چارجامہ یوری لگام رکاب وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں کرتا با ایں ہمہ اگر گھوڑے والا گھوڑے کے ساتھ یہ چیزیں حوالہ نہیں کرتا تو کرایہ لے جانے والا کیسا کچھ لڑتا جھگڑتا ہے اور بن پڑتا ہے تو کرایہ میں سے بھی کچھ نہ کچھ کتر لیتا ہے۔ ایسے ہی اگر مابین بندگان خاص خداوندی

خصوصًا انبیاء اور جناب باری کچھ قوانین ادب مقرر ہوں اور بندگان خاص کے نزدیک مشہور معروف ہوں اور اس کے ترک پر اگرچہ ذکر نہ آئے مواخذہ ہو تو عین حق اور عین صواب ہے مگر اس کو بدا نہیں کہہ سکتے، بدا کہنا جب مناسب ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو ہرگز اس کی اطلاع نہ ہو اور در صورتیکہ اس کی اطلاع ہو اور فقط بمقتضاء بشریت ان سے خطا ہو جائے تو پھر بدا کجا۔

دوسرا جواب | اور یہ بھی نہیں کلام اللہ سے فقط اتنا اثبات ہوتا ہے کہ تیس دن کے مجاہدہ پر توریت کا عطا ہونا ٹھیرا تھا اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک ماہ کا کسی کا کچھ مشاہرہ مقرر کر دیں سو جیسے ایک ماہ کی تنخواہ کے یہ معنے ہیں کہ ایک مہینے کی یہ مزدوری ہوئی۔ خواہ تیسویں دن ملے خواہ دس دن بعد ایسے ہی تیس رات دن کے مجاہدہ پر توریت کے عطا ہونے کے یہ معنے ہیں کہ تیس دن کے مجاہدہ کا یہ ثمرہ اور یہ پھل ہے خواہ تیسویں دن ملی ہو یا دس دن بعد، باقی رہی دس روز زیادہ کی محنت کی وجہ اس کا بیان ہمارے ذمہ ضرور نہیں۔

دفع توہم | اور اگر کوئی نادان لفظ اتممنا سے دس رات کا بہ نسبت تیس رات کے تتمہ ہونا سمجھ کر الجھنے کو تیار ہو تو اس کا جواب بھی لیجئے سنن ونوافل کا بہ نسبت فرائض کے متمم ہونا اور علی ہذا القیاس صدقۃ الفطر کا بہ نسبت صیام رمضان کے متمم ہونا احادیث صحیحہ سے ظاہر وباہر ہے مگر کسی کے نزدیک اس کے یہ معنے نہیں کہ فرائض پنجگانہ کی مقدار بہ نسبت زمانہ سابق کے زیادہ کی گئی بلکہ یہ معنے ہیں کہ بمقتضاء بشریت ہر عمل میں کچھ نہ کچھ قصور رہ ہی جاتا ہے کتنا ہی اہتمام کیوں نہ کرو۔ اس صورت میں مقدار اصلی خدا کے نزدیک بھی اور بندوں کے علم میں بھی وہی رہی اور یہ سب اوپر کا بکھیڑا از قبیل قضاء مافات اور جبر نقصان اور مکافات تقصیرات ہے سو ایسے ہی ان دس دن کو سمجھئے بلکہ لفظ اتممنا ہی خود اس بات پر شاہد ہے کہ یہ دس دن کی محنت از قبیل جبر نقصان ہے ورنہ میعاد اصلی وہی تیس دن تھے اگر ان تیس رات کا مجاہدہ بہمہ وجوہ قابل پسند ہوتا۔ اور بمقتضائے بشریت جس سے سب ناچار ہیں نبی ہو یا ولی ہو۔ چنانچہ واقف کار واقف ہیں کوئی قصور فتور عارض حال موسوی نہ ہوتا۔ تو جناب باری تعالٰے کی طرف سے اور دس دن کا مطالبہ نہ ہوتا۔

لفظ میقات کی تفسیر | باقی رہا لفظ میقات ربہ کا اس بات پر دلالت کرنا کہ میعاد اصلی چالیس راتیں

تیس سو اس کا جواب یہ ہے کہ بازار خداوندی میں ہر عمل کی ایک اجرت ہے اور ہر اجرت کے لئے ایک محنت معین ہے کلام اللہ حدیث اس کے گواہ ہیں فضائل عظیمہ مثل حصول توریت وغیرہ کا نرخ چالیس رات کی محنت اصل سے مقرر ہو مگر کمال جود اور عموم رحمت کے باعث حضرت موسٰے علیہ وعلی نبینا السلام کے لئے دس دن یعنے تہائی محنت کی تخفیف کی گئی ہو جیسے اس امت کے عوام کے لئے نو حصے محنت کی تخفیف کی گئی ہے اور نہ ہو تو اس آیت کو دیکھئے مَن جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا یعنی جو ایک نیکی لائے گا دس گنا ثواب پائیگا سو دس گنا تو جب ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایک نیکی کے عوض دس نیکیوں کا ثواب ملے پھر جب ایک ہی نیکی پر دس نیکیوں کا ثواب ملا تو نو حصے محنت کی تخفیف آپ نکل آئی آیات اور احادیث میں اس مضمون کے اور بھی بہت شواہد ہیں پھر بعضی آیات واحادیث تو ایسی ہیں جن سے اس سے زیادہ تخفیف بھی بعض بعض افراد کے لئے ثابت ہوتی ہے، باندیشہ تطویل تفصیل سے معذور ہوں۔

غرض یہ ہے کہ حضرت موسٰے کے لئے بحکم عنایت قدیمانہ دس دن کی تخفیف ہوئی ہو پر بمقتضائے بشریت حضرت موسٰے علے نبینا وعلیہ السلام سے یہ عمل ایسا کامل نہ بن پڑا جیسا توریت کے معاوضہ کے لئے بکار تھا بلکہ کچھ نقصان نکلا جس کی مکافات اور تلافی دس دن کی خلوت ومجاہدہ سے ہو سکی، اس لئے بنظر رحمت خاصہ حضرت موسٰی کی تیس دن کی محنت کو رد تو نہ کیا۔ اگرچہ رد کرنے کا موقع تھا ہاں دس دن کی اور ہدایت فرمائی تاکہ کامیاب جائیں اور غیروں کے سامنے ندامت نہ اٹھائیں۔ جب اس طریقہ سے وہی چالیس دن آ پڑے تو جناب باری نے بھی یہ ارشاد فرمایا فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ اَرْبَعِينَ لَيْلَةً یعنے پس تمام ہو گئی وہ ہی چالیس راتیں جو اس کے رب کا میقات تھا، یعنے وہ وقت جو ایسی نعمتوں کے لئے اس نے مقرر کر رکھا تھا۔ سو انجام کار وہی پورا ہوا۔

تیسرا جواب | یا یوں کہیئے کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بذات خود قابل اہتمام اور شایان تاکید ملک علام نہیں ہوتیں، پر کسی بندہ خاص سے جو ایک وقت خاص اور ساعت اخلاص میں بضرورت کسی امر عارضی کے ظاہر ہوتی ہیں تو جناب باری بروئے کمال بندہ پروری اور غلام

نوازی اس عمل کو ایسا قبول کرتا ہے کہ اس کو داخل عبادات خاصہ کر دیتا ہے اور پھر ہر خاص و عام سے اس کے کرنے نہ کرنے کا حساب لیتا ہے تاکہ خدا کی قدر شناسی اور اس بندہ کی رفعت و قدر معلوم ہو جائے مثال اس کی اگر مطلوب ہے تو حضرت ہاجرہ کا صفا مروہ کے بیچ دوڑنا اور اس سبب سے اس سعی کا داخل سنن یا واجبات حج ہو جانا حالانکہ عقل سلیم کو اس فعل میں کوئی مضمون تعبد کا نظر نہیں آتا سب کا سنا ہوا قصہ ہے۔

علی ہذا القیاس اگر چالیس رات کی مقدار اول سے خداوند علیم کے نزدیک قابل اہتمام نہ ہو بلکہ اس وقت تک وہی تیس رات کی مقدار مہتم بالشان ہو مگر چونکہ بندہ خاص سراپا اختصاص حضرت موسے علیہ وعلی نبینا الصلواۃ والسلام سے ایک وقت خاص میں جس کا مذکور ہے چالیس رات کا مجاہدہ بضرورت معلوم ظہور میں آیا تو بوجہ کمال اخلاص حضرت موسیٰ علیہ السلام جناب باری نے اس عمل کو ایسا قبول فرمایا کہ آئندہ سے فضائل جلیلہ کی تحصیل کے لئے عدد اربعین ہی مقرر ہو گیا اور جب اس وجہ سے یہ عدد مہتم بالشان ٹھہرا تو جناب باری عز اسمہ کے اس قول کے فتم میقات ربہ اربعین لیلۃ یہ معنے ہوئے کہ ہر چند ایسی نعمتوں کے لئے اصل میں وہی تیس راتیں تھیں لیکن چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بضرورت معلوم حالت اخلاص میں چالیس رات کا مجاہدہ ظہور میں آیا تو خداوند کریم نے اس عمل کو ان کے اخلاص کے باعث ایسا قبول فرمایا کہ اب سے تقرب بارگاہ خداوندی کے لئے پوری چالیس شب و روز کی خلوت مقرر ہو گئی چونکہ پہلی تقریر اور اس تقریر میں فرق ظاہر ہے ان دونوں کے بیان فرق سے معذور ہوں۔

بدا کیلئے کذب لازم ہے | حاصل نتیجہ اس طول بیانی کا عرض کرنا پڑا اس لئے سامع خراش اہل انصاف ہوں کہ بدا کا ثبوت اس آیت سے جب ہو سکتا ہے کہ یا تو جناب علام الغیوب ہی نے پہلے سے یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ بعد مرور تیس شب کے حضرت موسے علیہ السلام کو توراۃ عطا کرینگے اور جب تک ہرگز چالیس رات کی تاخیر کا دھیان نہ تھا اتفاق سے کسی مصلحت تازہ کے باعث ارادہ سابق سے پلٹ گئے اور تیس رات کے بدلے چالیس رات کے بعد عطا فرمائی یا جناب باری عالم الغیب والشہادۃ کے علم و ارادہ میں تو یہی تھا کہ بعد انقضاء مدت چہل شب عطاء

توراۃ سے حضرت موسے علیہ السلام مشرف ہوں۔ مگر عمداً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تیس شب کے بعد توراۃ کے عطا ہونے کی خبر دی حضرت موسے علیہ السلام باعتماد صدق خبر خداوندی یہی سمجھتے رہے کہ لاجرم بعد مرور تیس شب کے توراۃ عطا ہو گی مگر چونکہ مد نظر خداوندی کچھ اور تھا توراۃ کی بات چالیس رات پر جا پڑی۔

اس صورت میں گو صفت علم خداوندی اور صفت ارادہ عیب و نقصان سے منزہ رہے پر کلام خداوندی میں دروغ کا بٹہ لگا یہ اس واسطے جتلایا کہ بعض محققان شیعہ بپاس عصمت صفت علم و ارادہ بدا کی تقریر کچھ ایسی ہی کرتے ہیں جس سے نقصان و عیب جو کچھ ہو اخبار تک رہے علم و ارادہ تک نہ پہنچے، پر جو لوگ خدا کی عظمت و جلال کو کسی قدر سمجھتے ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ خداوند عظیم الشان کی کوئی صفت کیوں نہ ہو عیب و نقصان سے مبرا ہے۔ محقق مذکور نے بزعم خود اچھی روش اختیار کی تھی اور صفت علم و ارادہ کو نقصان سے بچا کر یوں خوش تھے کہ اہل سنت سے دامن چھڑا لیا پر یہ نہ سمجھے کہ یہ صفتیں اگر منزہ رہیں تو کیا ہوا ایک اور صفت میں نقصان لازم آیا۔

آرے دروغ گو را حافظہ نباشد

مخاطب کی غلط فہمی سے علم خداوندی میں بدا ثابت نہیں ہو سکتا | بہر حال یہ دو صورتیں بدا کے ثبوت کی تھیں اور در صورتیکہ یہ دونوں صورتیں نہوں بلکہ بشکل عقد اجارہ اور تعلیق شرط و جزا ہو تو اگر بوجہ عدم وقوع شرط جزا ظہور میں نہ آئی اور بسبب ناپسندی عمل اجرت نہ ملی تو اس میں خدا کی جانب کونسا قصور عائد ہوتا ہے جو بدا کے ثبوت کی گنجائش ملے ہاں حضرت موسے علیہ السلام غلطی فہم کے باعث جس سے انبیاء معصومین بھی معصوم نہیں اگر کچھ کا کچھ سمجھ جائیں تو ہم تو نہیں کہہ سکتے یہ ان کا قصور ہے مگر اس کو بدا سے کیا علاقہ، ایسے بدا کے تو خود اہل سنت جو بدا کے بغایت منکر ہیں بکثرت قائل ہیں اختلاف آئمہ مجتہدین لاجرم ایک نہ ایک کی غلط فہمی کو مستلزم ہے ان کے نزدیک رحمت عظمےٰ ہے بالجملہ بدا کی حقیقت یہ ہے کہ متکلم یعنی جناب باری خود غلط سمجھے جیسے متقدمین شیعہ کی رائے معلوم ہوتی ہے یا عمداً غلط کہدی جیسے بعض محققین زمانہ تاویل کرتے ہیں نہ یہ کہ مخاطب یعنی انبیاء یا علماء وغیرہم اپنے قصور فہم سے

بجھ کا کچھ سمجھ جائیں اس کو غلطی اجتہاد اور غلطی فہم اور قصور فہم کہتے ہیں بدا کو اس سے کچھ علاقہ نہیں، ہاں کوئی قاصر الفہم اگر اس کو بدا سمجھ جائے تو تا دم وضوح حق گو نہ معذور ہے۔ گو ایسی باتوں میں عذر جہل مقبول نہیں اور بعد وضوح حق اور اتمام حجت پھر یہ قصور اعلیٰ درجہ کا قصور ہے نعوذ باللہ من سوء الفہم۔

مگر ناظرین تقریر ہذا کو اس قدر یاد رہے کہ غلطی اجتہاد کی گنجائش اگر ہے تو ماسوا محکم اور عبارت النص میں ہے۔ عبارت النص اور محکم میں اہل فہم نہیں بہکتے۔ جو اس میں بھی خطا کرے وہ جاہل ہے عالم نہیں سو تلاوت کرنے والے کلام اللہ کے خود جانتے ہیں کہ آیات فضائل صحابہ در باب فضیلت صحابہ محکم اور عبارت النص ہیں کہ نہیں ؟ ـ

آیۂ میقات کی دو دیگر تفسیریں اور بدا کا استیصال | اگر کوئی اب بھی نہ سمجھے تو اس کو خدا سمجھے پر نقل مشہور ہے جیسے کو تیسا ایسے نادانوں کا یہ علاج ہے کہ یوں کہا جائے ثلثین لیلۃ یا مفعول بہ ہے چنانچہ ظاہر ہے یا مفعول فیہ اگر مفعول بہ ہے تو قدر موعود تو وہی تیس راتیں تھیں اور مطلب تھا کہ تم طور پر آنا۔ اپنا ایک خاص کام یعنی تیس رات کی عبادت جو اہل عقل کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں تم سے لیں گے سو اس وعدہ کو پورا فرمایا اور پھر بمقتضائے کرم خداوندی دس دن کا اور اضافہ فرمایا سو یہ از قبیل لَدَیْنَا مَزِیْدٌ ہے اور اس نعمت اول کی اس کو دو گُن سمجھنا چاہیئے۔ جب عوام امت محمدی کو نو نو گنی اصل سے دگن ملتی ہو اگر حضرت موسےٰ علیہ السلام کو ایک تہائی دگن مل گئی تو شیعوں کو اتنا برا کیوں معلوم ہوتا ہے اس صورت میں تورات کو اس وعدے سے کچھ علاقہ نہیں، یا تو وہ از قسم وعدہ وعید ہی نہو بلکہ از قبیل لَدَیْنَا مَزِیْد ہو یا موعود تو ہو پر بالاستقلال موعود ہو تیس رات کی محنت کا بطور تعلیق و شرط موعود نہو۔

بالجملہ آیت سے اس صورت میں اگر ثابت ہوگا۔ تو تیس رات کی عبادت کا موعود ہونا ثابت ہوگا تورات کا موعود ہونا جس پر مدار کار اثبات بدا تھا ہرگز ثابت نہ ہوگا اور اگر مفعول فیہ ہے تو یہ معنے ہوں گے کہ تیس راتوں تک وعدہ ہو تا رہا۔ باقی رہا موعود کیا ہے اس کے بیان سے یہ آیت ساکت ہے اگر امر موعود عطاء تورات تھا تب کچھ نقصان نہیں اور اگر امر دیگر تھا تب کچھ خلجان نہیں، اول تیس رات تک یہ بشارت آتی رہی جب باین لحاظ کہ ایک مہینے کی مقدار عرف

بنی آدم میں ایک مقدار کثیر ہے اسی سبب اکثر معاملات اجرت اس پر منعقد ہوتے ہیں اس قدر بشارت سے تسلی ہوگئی تب مزید اطمینان کے لئے چلہ پورا کیا اور اسی واسطے ایک بار ہی واعدنا موسیٰ اربعین لیلۃ کہکر خاتمہ نہ کر دیا بلکہ ثلثین لیلۃ کہکر واتممنا ہا بعشر فرمایا بہر حال مطلب یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں یہ نہیں کہ کسی امر کے لئے اول کچھ ایک مدت مقرر فرمائی۔ پھر وقت پر اور مدت کام میں آئی جو بدا کے لئے دست آویز اور مذہب حق سے جائے گریز ہو چنانچہ ظاہر ہے مگر دیکھنے والوں کو یہ معلوم رہے کہ یہ تقریر اخیر بموافق مثل مشہور جواب ترکی بہ ترکی اہل جدل کے مقابلہ میں بطور مجادلہ لکھی گئی ہے ورنہ طالبان حق کے لئے یہی حق و باطل خود ظاہر ہے۔

خاتمہ مباحث بدا | اب اسقدر ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ شیعہ بدا کے وقوع کے مدعی تھے اور یہ آیت بزعم خود انہوں نے دلیل دعوےٰ سمجھ رکھی تھی اور یہ سب اہل فہم جانتے ہیں کہ مدعی کے لئے دلیل ایسی چاہیئے۔ جس میں خلاف دعوےٰ اور کوئی احتمال نہ ہو اور جو کوئی احتمال خلاف دعوےٰ اس دلیل سے سمجھ میں آتا ہو اور پھر وہ احتمال بھی ایسا کہ بہ نسبت دعوےٰ مدعی کے زیادہ چسپاں بلکہ عین مفہوم مطابقی ہو اور باین ہمہ اور دلائل اس کے مثبت ہوں اور دعوےٰ مدعی کو رد کرتے ہوں۔ تو اہل عقل پھر ہرگز اس دعوے کو قبول نہ کریں گے اور حق نہ سمجھیں گے، بلکہ حق اس دوسرے ہی احتمال کو سمجھیں گے، سو یہاں بعینہٖ یہی صورت ہے۔ چنانچہ اہل فہم پر پوشیدہ نہ رہے گی۔

جب بدا کے ابطال سے بفضلہٖ تعالیٰ فراغت پائی تو ہم اپنی طرف سے اُن لوگوں کے عذر کا جواب دے چکے جو خلفاء ثلٰثہ اور باقی مہاجرین اور انصار کی بزرگی کے باوجودیکہ کلام اللہ میں ان کی بزرگیاں مذکور ہیں اور ان کے لئے بڑے بڑے وعدہ کئے ہیں اس عذر سے قائل نہیں ہوتے تھے کہ شاید خدا کو بدا واقع ہوا ہو۔ اور یہ سارے وعدے اور سب ان کی تعریفیں غلطی سے اول ظہور میں آئی ہوں اور پھر بعد میں حقیقت الامر صحابہ کی جناب باری تعالےٰ کو معلوم ہوگئی ہو اور بروئے انصاف اب ہمارے ذمے یہ واجب نہیں کہ ائمہ کے اقوال سے ان کو تسلی کر دیں۔

بدا کے ضمن میں ائمہ کے علم غیب پر بحث اور اگر ہم اس پر بھی خاک ڈالیں تو یہ بات کیونکر تسلیم کی جائے کہ ائمہ کو ما کان وما یکون کا علم تھا اس لئے اگر ان کے اقوال سے خلفاء یا اصحاب کی بزرگی ثابت ہو جائے تو پھر کوئی شبہ باقی نہ رہے گا۔ سبحان اللہ خدا کے کہنے سے تو تسلی نہ ہو اور اماموں کے فرمانے پر قرار آ جائے اول تو صدہا آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ سوا جناب باری تعالےٰ کسی کو علم غیب نہیں برائے تسکین دو تین آیتیں لکھنی ضرور پڑیں۔
مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا۔ یعنی نہیں جانتا کوئی کہ کل کو کیا کرے گا۔ اس آیت میں کسی کا استثناء نہیں سب کو امام ہو یا غیر امام برابر فرماتے ہیں کہ کل کی خبر نہیں رکھتے۔
قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ۔ کہہ دے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ نہیں جانتے زمین و آسمان والے غیب کو مگر اللہ جانتا ہے۔

ماکان ویکون تسلیم کرنے میں مساوات لازم ہے اور دوسرے اس صورت میں خدا کے علم میں اور ائمہ کے علم میں مساوات لازم آئے گی حالانکہ جناب باری تعالےٰ سورہ یوسف میں یوں ارشاد فرماتے ہیں وَفَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ یعنے ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے اور اگر کوئی یوں کہے کہ اگر اس آیت سے استدلال کرتے ہو تو اس آیت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ خدا سے بھی زیادہ کوئی علم والا ہے کیونکہ اس آیت میں کلیۃً فرما دیا ہے کہ خدا اور غیر خدا کی تخصیص نہیں کی تو یہ بات اول تو اہل فہم کے نزدیک قابل جواب نہیں اور جواب کے قابل بھی ہے تو اس جواب کے کہ یوں کہا جائے۔ ع

بریں فہم و دانش بباید گریست

کون نہیں جانتا کہ ایسے مقامات میں جناب باری تعالےٰ باستثناء عقلی مستثنیٰ ہوا کرتا ہے اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ سے کسی نادان کو بھی آج تک یہ شبہ نہیں پڑا کہ جب اللہ ہر چیز پر قادر ہوا تو اپنے معدوم کر دینے یا اپنے شریک کے پیدا کر دینے پر بھی قادر ہوگا۔ اتنا ہر کوئی سمجھ لیتا ہے کہ انبیاء اور اماموں کے پیدا کرنے اور معدوم کر دینے پر دونوں پر قادر ہے ایسے ہی فَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ سے جاہل سا جاہل بھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ خدا سے بھی زیادہ کوئی عالم ہوگا پھر اگر کوئی اس قسم کی گفتگو کرے تو بجز تعصب اور

ہٹ دھرمی کے اور کچھ نہیں کہا جاتا۔

ایک عجیب تفسیری لطیفہ معہذا ذی علم کے لفظ میں ایک اشارہ لطیف اس بات کے جواب کی طرف بھی ہے جیسے اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ میں جو لفظ شیے ہے اس میں ایک اشارہ لطیف خدشہ مذکور کے جواب کی طرف ہے بیان اس کا یہ ہے کہ ذی علم اور علیم ہر چند بظاہر دونوں لفظ ہم معنی ہیں لیکن ذی علم میں ایک گونہ آتنی بات نکلتی ہے کہ غیر ذات ہے کیونکہ اضافت بالاتفاق تغائر پر دلالت کرتی ہے بخلاف علیم کے کہ اس میں یہ بات نہیں سو چونکہ خدا کا علم غیر ذات نہیں بالاجماع خصوصاً شیعہ کے نزدیک تو اس کو ذی علم کہنا مناسب نہیں بلکہ علیم کہنا چاہیئے جیسے کہ شے اسے کہنا چاہیئے جو مشیت کے تلے داخل ہو اور ذات خداوندی مشیت کے تلے داخل نہیں بلکہ معاملہ بالعکس ہے۔ القصہ جیسے خداوند کریم مشیت کے تلے داخل ہی نہیں جو اشیاء میں معدود ہو اور قدرت کے تصرفات اس پر چل سکیں، ایسے ہی خداوند کریم ذی علم میں داخل ہی نہیں جو اس سے اوپر کوئی علیم ہوگا۔

الحاصل علم میں کوئی خدا کے ہم پلہ نہیں۔ جیسے وہ ذات میں یکتا ہے ویسے ہی صفات میں یکتا ہے، نہ انبیاء اس کے علم میں برابر ہیں نہ امام نہ ملک نہ جن، نہ خواص نہ عوام، اس عقیدہ میں شیعوں کا بعینہ ایسا غلو ہے جیسا نصاریٰ کا حضرت عیسےٰ کی بزرگی میں قدم حد سے بڑھ گیا ہے اور وہ تشبیہ جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عیسےٰ سے دی اور یوں فرمایا ہے کہ تیری مثال ایسی ہے جیسے حضرت عیسےٰ کی مثال کہ ایک فرقہ ان کی محبت میں ہلاک ہوا اور ایک ان کے بغض میں۔ وہ تشبیہ اور تمثیل سب بجا اور درست نکلی کہ خوارج نے جو بغض کیا اور روافض نے وہ محبت کی کہ جس سے حضرت امیر کو انبیاء سے تو بڑھایا ہی تھا خدا تک پہنچا دیا بلکہ انہوں نے لکد تیا حشریشہ کا کام کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تو فقط حضرت امیر ہی کی نسبت یہ فرمایا تھا حضرات شیعہ نے آپ کے فرمانے کی ایسی تصدیق کی کہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر دکھلایا خوارج سے تصدیق نبوی میں وہ کارگذاری نہیں بن پڑی تھی جو شیعہ سے بن پڑی القصہ خوارج سے حضرات ائمہ کے باب میں وہ تفریط نہ ہوئی جو شیعوں سے افراط ہوئی اور کسی نے سچ کہا ہے دشمن دانا بہتر از نادان دوست،

بالفرض اگر علوم غیب ائمہ کے لئے ثابت بھی ہوں تو بدا کا خدشہ دور نہیں ہوا

اور اگر سلمنا ائمہ کو علم ما کان اور علم ما یکون تھا بھی تب جو خدشہ کہ بوجہ بدا کہ خدا کے فرمودہ میں تھا وہ بجائے خود رہے گا کیونکہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ جو افضل الائمہ اور اعلم الائمہ ہیں وہ یوں فرماتے ہیں فی حدیث الکافی والامالی الصدوق عن امیر المومنین لولا آیۃ فی کتاب اللہ لاخبرتکم بما یکون الی یوم القیمۃ یرید بالآیۃ قولہ یمحوا اللہ ما یشاء ویثبت ۔ حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ کافی جو کلینی کی تصنیف ہے اور امالی جو شیخ صدوق کی کتاب ہے ان دونوں میں حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کا یہ ٹکڑا ہے آپ نے فرمایا اگر ایک آیت یعنے یمحوا اللہ ما یشاء نہ ہوتی تو میں تمہیں جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے سب کی خبر دیدیتا یہاں تک حاصل روایت ہوا اب غور فرمائیے کہ جو دلیل ان کے عالم ما یکون اور عالم ما کان ہونے کی تھی وہی دلیل اس بات کی بھی ہے کہ ان کا علم خدا کے علم سے بڑھ کر نہیں پھر باینہمہ جس وجہ سے خدا کا علم قابل اعتماد نہ تھا اسی وجہ سے ائمہ کے علوم بھی قابل اطمینان نہیں خدا کے بدا سے وہ بھی تنگ تھے اور اپنے کسی علم پر بھروسہ نہ کرتے تھے۔ اس خیال سے شاید شیعوں کو تو یہ رنج ہو کہ ہمارا دین ہی ہاتھ سے چلا جب ائمہ کو اپنے علم پر اعتماد نہ ہو تو یہ دین جو انہیں کے علوم کا پرتو ہے کیا قابل اعتماد رہا۔؟

پر ہمیں خوشی ہے کہ اصحاب ثلثہ اور سوا ان کے اور مہاجرین و انصار کی برائیاں جو شیعہ حضرات ائمہ سے روایت کرتے تھے قطع نظر اس کے کہ ان روایات کے راوی کذاب اور مفتری تھے چنانچہ کچھ کچھ اس کا بیان ہو چکا یونہی قابل اطمینان نہ تھے اور سوا اس کے اور جو کچھ ان کی کتابوں میں خلاف مذہب اہل سنت حضرات ائمہ سے مروی ہے سب ساقط الاعتبار ہو گیا۔

باقی رہی یہ بات کہ بدا اگر ہوا بھی ہوگا تو کہیں قدر قلیل ہوا ہوگا تو جواب اس کا یہ ہے کہ اعتبار کے اٹھ جانے کو اتنا بھی بہت ہے انجیل اور توریت کونسی ساری کی ساری اول سے آخر تک بدل گئی تھیں؟ دس پانچ جگہ کی تحریف نے سب کا اعتبار کھو دیا۔

مناقب خلفاء و صحابہ بزبان امیر و دیگر ائمہ

اور اگر کوئی یہ فرق نکالے کہ کلام اللہ میں جو کچھ اصحاب کے

فضائل نازل ہوئے ہیں یا خلفاء ثلثہ کی بزرگیوں کی طرف اشارہ ہے وہ سب قبل وفات ...... اکثر اصحاب نازل ہو لیا تھا اور وفات سے پہلے پہلے آدمی کا کچھ اعتبار نہیں ہاں خاتمہ کا اعتبار ہے۔ سو خدا کی تشخیص میں غلطی کا احتمال ہے پر امیر المومنین یا اور ائمہ نے جو کچھ فرمایا ہوگا وہ سب بعد وفات کا قصہ ہے اس میں غلطی کا احتمال نہیں اگر ان کے کلام سے ان کی بزرگی خاصکر اصحاب ثلثہ میں سے کسی کی ثابت ہو جائے تو پھر گنجائش انکار نہیں۔ اس لئے ائمہ کی روایات پیش نظر کرتا ہوں، نہج البلاغۃ تصنیف علامہ رضی میں جس کی مرویات شیعوں کے نزدیک متواترات میں سے ہیں، یوں منقول ہے کہ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سے جو لوگوں نے ان اصحاب کا حال پوچھا جن کا انتقال ہو چکا تھا تو آپ نے ان کے وہ اوصاف فرمائے جو بجز اولیا کے ہو ہی نہیں سکتے وہ عبارت بلاغت آمیز بعینہ منقول ہے کانوا اذا ذکروا اللہ ھملت اعینھم حتی تبل جباھھم مادوا کما یمید الشجر یوم الریح العاصف خوفا من العقاب ورجاء للثواب اور پھر دوسری دفعہ ان کے حق میں فرمایا کان احب اللقاء الیھم لقاء اللہ وانھم یتقلبون علی مثل الجمر من ذکر معادھم۔ حاصل ان دونوں عبارتوں کا یہ ہے کہ صحابہ کا حال یہ تھا کہ جب خدا کا ذکر کرتے تھے بہ نکلتی تھی ان کی آنکھیں یہاں تک کہ ان کے جبہے تر ہو جاتے تھے اور خدا کے ڈر اور امید ثواب میں ایسے لرزتے اور جھومتے تھے جیسے درخت تیز ہوا سے اور سب میں زیادہ محبت ان کو خدا کے ملنے کی تھی اور آخرت کو یاد کر کے ایسے بے چین ہو کر کروٹیں لیا کرتے تھے جانو انگاروں پر لوٹتے ہیں"، اور حضرت امام سجاد سے صحیفہ کاملہ میں بڑی طول طویل دعا جس میں اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور ان کے لئے دعا خیر مندرج ہے منقول ہے۔ سو ساری دعا کی نقل کی گنجائش نہیں فقط دو چار لفظ لکھے دیتا ہوں، اس دعا میں اللھم واصحاب محمد خاصۃ الذین احسنوا الصحابۃ لکھے آگے کہتے ہیں فارقوا الازواج والاولاد فی اظھار کلمتہ وقاتلوا الآباء والابناء فی تثبیت نبوتہ اس کے بعد میں فرماتے ہیں۔ فلا تنس لھم اللھم ما ترکوا لک وفیک وارضھم من رضوانک الخ پھر اس کے بعد تابعین تک

تک نوبت پہنچا اور ان کے حق میں بھی اسی قسم کی دعائیں فرمائیں حاصل ان الفاظ کا یہ ہے "یا اللہ ... محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جنہوں نے خوب یاری کا حق ادا کیا اور ... مال اور اولاد کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بول بالا کرنے کے لئے چھوڑ دیا اور باپوں اور بیٹوں سے ان کی نبوت کے جمانے کے لئے لڑے سو مت بھولیو ان کے حق میں یا اللہ ... جو انہوں نے تیرے لئے اور تیرے سبب سے چھوڑ دیا اور راضی کر دے ان کو تو اپنی رضا مندی سے" یہاں تک الفاظ مذکورہ کا مضمون ہے ان روایات سے تو مطلقاً صحابہ کی تعریف ... کی ثابت ہوتی ہے

مناقب صدیق | ... وہ بھی سنئے کہ جس سے خاص ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے رضی کی ... البلاغۃ میں جو شیعوں کے نزدیک مثل وحی آسمانی ہے روایت کیا ہے عن امیر المومنین ... اِنَّہٗ قَالَ لِلّٰہِ بِلَادُ اَبِیْ بَکْرٍ فَلَقَدْ قَوَّمَ الْاَوَدَ وَدَاوَی الْعَمَدَ وَاَقَامَ السُّنَّۃَ ... الْبِدْعَۃَ ذَھَبَ نَقِیَّ الثَّوْبِ قَلِیْلَ الْعَیْبِ اَصَابَ خَیْرَھَا وَسَبَقَ شَرَّھَا اَدّٰی اِلَی اللّٰہِ طَاعَتَہٗ وَاتَّقَاہُ بِحَقِّہٖ رَحَلَ وَتَرَکَھُمْ فِیْ طُرُقٍ مُتَشَعِّبَۃٍ ... فِیْھَا الضَّالُّ وَلَا یَسْتَیْقِنُ الْمُھْتَدِیْ حاصل اس کا یہ ہے کہ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں خدا ہی کے واسطے ہیں شہر[1] ابوبکر کے یعنی ابوبکر میں ... خوبیاں ہیں پس قسم ہے کہ انہوں نے سیدھا کر دیا کجی کو اور اصلاح کر دیا ستون کو اور قائم کر دیا سنت کو پس پشت ڈالا انہوں نے بدعت کو دنیا سے پاک دامن ... بے عیب گئے خوبی خلافت کی ان کو نصیب ہوئی اور آگے چلے گئے خلافت کے فسادوں سے ادا کی انہوں نے خداوند کریم کی طاعت پرہیزگار رہے حق پرہیزگاری کا چلے گئے اور لوگ مختلف رستوں میں حیران ہیں کہ نہ گمراہوں کو راہ ملتی ہے اور نہ ہدایت والوں کو اپنی ہدایت کا یقین ہے" یہاں تک حاصل معنی خطبہ مرقومہ ہوا۔

علامہ رضی کی خیانت جو مفید مطلب ہو سکی | اب گوش گذار ناظرین رسالہ یہ ہے کہ علامہ رضی

[1] یعنی چونکہ ابوبکر کے شہر خدا ہی کے تھے تو خدا ہی کے رتبے کا ظہور ہوا اور ظاہر ہے کہ جس کا خدا ... ہو ... لاجرم بڑا ہی صاحب کمال ہوگا۔

نے پاس داری مذہب ابوبکر کے لفظ کی جگہ لفظ فلاں بدل دیا ہے تاکہ سنیوں کو گنجائش استدلال نہ رہے اور ان علامہ رضی کی کچھ عادت ہی تھی مگر اتنا نہ سمجھے کہ نام کے چھپانے سے کیا فائدہ؟ حضرت امیر المومنین سے پہلے کل تین خلیفہ تھے سو جس کی تعریف ہوگی سنیوں کا مطلب کہیں نہیں گیا لہٰذا وہ اوصاف ایسے ہیں کہ خود ابوبکر صدیق کا ہاتھ پکڑا دیں ہیں خاص کر پہلا وصف اور دوسرا وصف کہ یہ دو وصف سواء ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کوئی تبلائے تو اور کس پر منطبق ہوتے ہیں؟ اور کس کی خلافت میں دین میں کجی آ گئی تھی؟ اور کس رکن یعنے ستون میں ارکان اسلام میں سے نقصان آ گیا تھا کہ اس نے اس کی درستی کی؟

ہاں ان کی خلافت میں البتہ بسبب وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چار طرف سے شور ارتداد اٹھا بہت لوگ ادائے زکوۃ سے جو رکن اسلام ہے مانع آئے سو نہ ابوبکر صدیق ہوں نہ یہ فتنے دبیں ان کے برکات اور حسن انتظام اور خوبیٔ خلافت کے باعث جو حضرت امیر کے آنکھوں میں کھبے ہوئے تھے اور شیعہ بھی جی میں تو مانتے ہی ہوں گے زبان سے کہیں یا نہ کہیں حضرت امیر رضی اللہ عنہ اپنے زمانے کے فساد اور فتنوں کو دیکھ دیکھ انہیں یاد کرتے ہیں اور تاسف کرتے ہیں کہ ایسے زمانے میں ایسا شخص ہونا چاہئے تھا۔

صدیق کی شجاعت اور استقامت | اور کیوں نہ ہو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ تھے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جب چار طرف مرتدین کا زور ہوا تو اکثر صحابہ گھبرا گئے یہاں تک کہ حضرت عمر جیسے جری اور ذی ہوش اور صاحب رائے کے ہوش بھی ٹھکانے نہ رہے یہ انھیں کی ہمت بندھانے کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا تھا اَجَبَّارٌ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ وَخَوَّارٌ فِی الْاِسْلَامِ یعنے اے عمر کیا کفر کے زمانے میں یہ شور اشوری تھی اور اسلام میں یوں بول گئے القصہ حضرت عمر کی یہ رائے تھی کہ ایسے میں اگر لشکر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نہ بھیجا جائے تو مناسب معلوم ہوتا ہے مبادا مدینہ منورہ لشکر مجاہدین سے خالی ہو جائے اور دشمن تاخت کر بیٹھیں لیکن آفرین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور استقامت

پر کہ باوجود ان ہنگاموں کے ہرگز نہ گھبرائے، اور یہ فرمایا کہ جس لشکر کی تیاری خود سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کر گئے ہوں یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کو روانہ نہ کروں اور ایسے ہی مرتدین کے قتال میں جو لشکر کے بھیجنے کا ارادہ فرمایا اور اکثر صحابہ کی رائے اس باب میں ان کی رائے کے مخالف ہوئی تو ایسا کچھ فرمایا کہ اگر کوئی نہ جائے گا تو میں تنہا جا کر لڑوں گا۔ اور اسی طرح زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں کے قتال کے باب میں جب حضرت عمر نے یہ شبہ کیا کہ وہ کلمہ گو ہیں تو یہ ارشاد فرمایا کہ جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا نماز کو فرض کہے گا اور اسے فرض نہ سمجھے گا میں اس سے بے تامل لڑوں گا واللہ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک بکری کا بچہ لوگ زکوٰۃ میں دیتے ہوں گے اور اب نہ دینگے تو میں ان سے جہاد میں دریغ نہ کروں گا الحاصل یہ انہیں کی شجاعت اور فہم و فراست تھی جو یہ رائے صائب سوجھی اور دین کو تھاما ورنہ دین میں وہ فتور پڑے تھے کہ خدا ہی حافظ تھا۔

سو جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ اپنے زمانے کے فسادوں اور بدعتوں کو جو لوگوں نے برپا کر رکھے تھے دیکھ دیکھ کر ان کو یاد کرتے تھے چنانچہ الفاظ خطبہ مذکورہ خود گواہی دیتے ہیں اسی واسطے اکثر شارحین نہج البلاغۃ کی یہی رائے ہے اور کیونکر ممکن ہو کہ اور کسی پر ان اوصاف کو منطبق کردیں بہت کرتے تو یہ کرتے کہ کسی ایسے شخص کا احتمال پیدا کرتے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مرگیا ہوتا، جیسے بعضے نا انصافوں نے کیا ہے۔ سو شارحین کے ذمہ معنے کا درست کرنا بھی تو ہوتا ہے ان اوصاف کو اس پر کیونکر منطبق کر دیتے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو کچھ خوبی ظہور میں آئی وہ سب آپ کا طفیل تھا اور کسی کا اس میں کیا اجارہ؟ اور خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک زبان پر اس لئے نہیں لا سکتے کہ سنیوں سے اس کا کیا عذر کریں گے کہ حضرت امیر نے ماحسبنی لفظ فلاں کہا، کس قدر گستاخی کی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کس طرح سے ذکر کیا۔

مقام تعریف مقام تصریح ہوتا ہے نہ کہ مقام اخفاء

اور پھر کیا باعث ہوا کہ محل تعریف میں جو مقام تصریح و اعلام ہوتا ہے یہ اخفاء اور ابہام بلکہ اسی نظر سے کہ یہ محل تعریف ہے یوں خیال میں آتا ہے کہ یہ تعریف ابوبکر ہی کی تعریف ہے اور یہ کنایہ لاجرم اعدائے صحابہ کی تحریف ہے ورنہ رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں تو کچھ اندیشہ ہی نہ تھا جو کسی نے یوں چھپایا اور نام نہ بتایا۔ ہاں ابوبکر کی ضد میں بایں غرض کہ یہ مدح ابوبکرؓ کی مدح نہ ہو جائے گو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دشمنی کی تہمت بھی اپنے ذمہ لازم آئے، اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عداوت (گو بہ جبر) باعثِ اخفاء نام ہو سکے گوارا کریں، اور اس طرح سے اس مدح کو مدحِ نبوی قرار دیں تو ممکن ہے مگر اوصاف مذکورہ اس توجیہ کو کرنے بھی دیں آپ کے زمانے میں اول تو اقامت سنت اور تخلیفِ بدعت کے کیا معنے؟ جس سے چاہو پوچھ دیکھو اقامت سنت کے لفظ سے کیا متبادر ہوتا ہے؟ ہر کوئی اتنا جانتا ہے کہ اقامت کے لئے سنت کا وجود اور اس کی پستی ہونی چاہئے۔ نہیں تو پھر اقامت کس کی ہوگی سنو جو کچھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم احکام فرماتے تھے یا خود کوئی عمل کرتے تھے تو وہ اقامت سنت نہ ہوتی تھی بلکہ اس کو خود سنت سمجھنا چاہیے، معہٰذا بعد مقرر ہونے احکام سنت کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کونسا ان میں فتور پڑ گیا؟۔ اور پڑ بھی گیا تھا۔ تو آپ نے اس کی کیا اصلاح فرمائی؟

بہر حال کچھ کیجئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کی طرف یہ اوصاف ڈھلتے ہیں سو یہ کرامت حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی ہے کہ ہر چند علامہ رضی نے ان کے کلام کو خراب کرنا چاہا مگر معنے وہی رہے اور بدنامی اپنے ذمہ لگائی بھلا اتنا بھی خیال نہ کیا کہ تعریف کے محل میں ایسے کنایات سے کون باتیں کیا کرتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے۔ اور بعضے شارحین کی رائے یہ ہے کہ اس خطبہ میں حضرت عمر کی تعریف ہے۔ سو حضرت عمر ہمیں کون سے برے ہیں اور حضرت عمرؓ پر جو وہ اس تعریف کو منطبق کرتے ہیں تو اس وجہ سے کہ وہ یوں لکھتے ہیں کہ مجھے مصنف کے ہاتھ کا یعنی علامہ رضی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہج البلاغۃ کا نسخہ مل گیا تھا۔ سو اس میں لفظ فلانے کے نیچے عمر کا نام لکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ مجھ سے فخار بن معد مولوی ادیب شاعر نے ایسا ہی بیان کیا اور میں نے ابو جعفر یحییٰ بن زید علوی سے جو پوچھا کہ اس لفظ سے کون مراد ہے تو انہوں نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مراد ہیں، میں نے کہا کیا امیر المومنین نے اس قدر ان کی تعریف کی انہوں نے کہا ہاں۔

الغرض اس وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ بعضے خطبوں میں جو حضرت عمر کے نام سے تعریف ہے تو اس کے الفاظ ان الفاظ سے بہت ملتے ہیں بعضے شارحین حضرت عمر کی طرف ڈھلے ہیں پر اظہر یہی ہے کہ مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں لیکن جب شیعوں نے دیکھا کہ آخر یہ تعریف ہی تو کسی کی اصحاب ثلثہ میں سے ہے تو انہوں نے کہا کہ آؤ حضرت عمر ہی کی تبلاؤ حضرت عمر آخر حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے داماد تو ہیں۔ ابوبکر صدیق رض سے تو بہرحال کچھ ان کا پاس لحاظ زیادہ ہی چاہیئے۔ لیکن ہمارا ادھر بھی لیکھا ہے اسی واسطے جو روایت کہ خاص ان کی تعریف میں ہے اس کو بھی زیب رقم کرتا ہوں۔

مناقب عمر رض بزبان امیر رض

الاسمان کتاب الموافقت میں فرین حکیم سے روایت کرتا ہے کہ جب حضرت عمر کا انتقال ہوا تو میں نے کہا حضرت علی کے پاس چلنا چاہیئے اور ان کی سنیں وہ کیا کہتے ہیں سو میں جو ان کی محفل میں آیا تو بہت لوگ ان کے منتظر بیٹھے تھے سو کچھ یونہی دیر ہوئی ہوگی جو حضرت علی رض تشریف لائے۔ اول تو سر مبارک جھکایا۔ پھر اوپر اٹھا کر فرمایا۔ لِلّٰهِ دَرُّ بَاكِيَةِ عُمَرَ وَاعُمَرَاهُ قَوَّمَ الْاَوَدَ وَاَبَدَ الْعَمَدَ مَاتَ نَقِيَّ الثَّوْبِ قَلِيْلُ الْعَيْبِ وَاعُمَرَاهُ ذَهَبَ بِالسُّنَّةِ وَاتَّقَى الْفِتْنَةَ اَصَابَ وَاللّٰهِ ابْنُ الْخَطَّابِ خَيْرَهَا وَنَجَى مِنْ شَرِّهَا وَلَقَدْ نَظَرَ لَهٗ صَاحِبُهٗ فَصَارَ عَلَى الطَّرِيْقَةِ مَا اسْتَقَامَتْ ثُمَّ قَالَ فَقَالَ وَرَحَلَ الْمَرْكَبُ فَتَشَعَّبَهُمُ الطَّرِيْقُ لَا يَدْرِي الضَّالُّ وَلَا يَسْتَيْقِنُ الْمُهْتَدِيْ۔

اس عبارت کے معنے بھی قریب قریب پہلی ہی روایت کے ہیں اس لئے بعض شراح جن کا ذکر ہو چکا روایتِ مقدم کو بھی حضرت عمر رض ہی پر محمول کرتے ہیں لیکن اوصاف کو دیکھئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی پر پھبتے ہیں۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا باقی اس روایت کے الفاظ اور اس روایت کے الفاظ کے تطابق سے کچھ یہ لازم نہیں آتا کہ دونوں ایک ہی آدمی کی تعریف میں ہوں۔ اگر دونوں روایتوں کو جدا جدا شخص کے لئے سمجھئے تب بھی تو کچھ محال نہیں آخر حضرت عمر

کی خلافت بھی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کی خلافت کا تتمہ تھا بنیاد ساری باتوں کی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی باندھ گئے تھے ملک شام اور ایران پر جو جہاد ہوا تو پرواز اس کا خلیفہ اول ہی ڈال گئے تھے اور جو جو لوازم خلافت تھے سب کی جڑ وہی درست کر گئے تھے چنانچہ ماہران تواریخ پر پوشیدہ نہیں وہ موجد قوانین انتظام تھے اور حضرت عمر رض اس کے برتنے والے غرض حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک رستہ ڈال گئے ہیں کہ حضرت عمر اسی رستہ چلتے گئے اگر اس وجہ سے کہ ابوبکر صدیق کے کاموں کو حضرت عمر رض نے پورا کیا ان کو بھی موصوف باوصاف مندرجہ روایاتِ اول سمجھیں تو چنداں بعید نہیں۔

باب عقیدۂ تقیہ

عقیدۂ تقیہ اور اس کے عقلی و نقلی مباحث

بہرحال اگر شیعوں کو یہی مرکوز خاطر ہو کہ ہم بجز اماموں کے فرمانے کے اصحاب ثلثہ یا اور اصحاب کے قیامت تک معتقد نہ ہوں گے تو یہ عذر بھی ہم نے ان کا باقی نہ رکھا۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا جو مرقوم ہوا مگر ہم جانتے ہیں کہ خوئے بدرا بہانہ بسیار، شیعہ اپنی ناانصافی سے باز نہ آئیں اور بسبب عداوتِ صحابہ کے جو اہل بیت کی محبت سے پہلے ان کی رگ و پے میں رچ گئی ہے عجب نہیں کہ خلاف امیدوں بھی کہہ اٹھیں کہ حضرات ائمہ کی بات کا بھی کیا اعتبار؟ ساری عمر انہوں نے تقیہ میں گذاری اور حق کو ناحق اور ناحق کو حق کہتے کہتے چل دیئے، جب امام الائمہ حضرت امیر المومنین باایں ہمہ شہرۂ شجاعت اور زور کرامت کہ شیر خدا اور علی ولی اللہ ان کا لقب ہے خلفائے ثلثہ سے اتنا کچھ ڈرتے تھے کہ ان کے زمانے میں تو کیا اپنے زمانے میں بھی اظہار مذہب حق نہ کر سکے ہوں تو اوروں کا تو کیا ذکر؟ ہم جب تک ہرگز نہ مانیں کہ یا تو تقیہ کو کوئی باطل کر دکھلائے یا کسی ایسے کی سند تبلائے کہ وہ تقیہ نہ کرتے ہوں۔

اس لئے ناچار تقیہ کی اصل حقیقت بھی کھولکر کچھ کچھ دکھلانی پڑی۔ ناانصافوں سے پلہ پڑا ہے دیکھئے کتنی جگہیں پاؤں کھائیں اور ہم ان کی دم کے ساتھ لگے ہوئے کہاں کہاں تک جائیں۔ مخدوم من آفرین ہے ان لوگوں کی ہوشیاری پر کہ جن کا یہ دین ساختہ پرداختہ ہے،

ایسی نامعقول باتوں کا بجز بدا اور تقیہ کے رواج ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر سنیوں نے کلام اللہ کا حوالہ دیا تو بدا کا عذر کیا، اماموں کا قول پیش کیا تو تقیہ سے الزام دیا اب بیچارے سنی اپنا سا منھ لے کر رہ نہ جائیں تو اور کیا کریں؟ غرض جس نے اس مذہب کو تراشا واقعی نہایت ہوشیار تھا، پر کم فہم بھی ہوں تو اتنے ہوں جتنے حضرات شیعہ کہ دلم و دانہ کی ان کو کچھ تمیز نہیں، ہائے افسوس کیسے کیسے لوگ اس دام میں پھنس گئے یہ نہ سمجھا کہ دین خداوندی کو ایسی باتوں سے کیا علاقہ یہ فقط یاروں کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں، نہ عبداللہ بن سبا یہودی منافق اور اس کے شاگرد بیشہ ہوتے نہ یہ قواعد تشیع تصنیف ہوتے۔ خیر بہرحال اس حیلۂ اخیر کا جواب بھی دے لیجئے! شاید خداوند کریم کسی کو ہدایت نصیب فرمائے۔

تقیہ شیعہ کی اپنی روایات کے آئینے میں مخدوم من اول تو یہ عذر روایات مذکورہ میں بنظر غور پیش نہیں جاتا خاص کر پہلی دو روایات میں حضرت امام سجاد زین العباد رضی اللہ عنہ وعن آبائہ الکرام نے جو کچھ اصحاب کرام کی تعریف فرمائی تو عین مناجات خداوندی اور دعا کے وقت فرمائی ہے خدا سے کیا تقیہ پڑا تھا؟ اگر کسی بنی آدم سے کلام گفتگو ہوتی تو یہ بھی احتمال ہوتا کہ شاید طرفدار ان صحابہ میں سے ہو اور اگر خدا پر بھی صحابہ کی طرفداری کی تہمت بھی تو سنیوں کے زہے نصیب کہ ان کے پیشواؤں کی خدا بھی طرفداری کرتا تھا۔ لیکن شیعوں کو اپنا فکر چاہیئے معہذا حق مذہب سوا اس کے اور کسے کہتے ہیں کہ خدا ان کی پشتی پر ہو سارا کلام اللہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْن اور اسی قسم کی آیات سے بھرا ہوا ہے باقی خدا کی طرف یہ احتمال تو ہو ہی نہیں سکتا کہ خدا بھی اصحاب ثلثہ سے ڈرے تھا۔ نعوذ باللہ منہا۔

ہاں اگر شیعہ کہدیں تو کچھ نہیں کیونکہ ان کے عقائد کے موافق تو حضرت علی کا تقیہ بھی کچھ اس سے کم نہیں، شیر خدا جدا تھے۔

موت پر اختیار، غیب کا علم، بے انتہا شجاعت، پھر تقیہ کیوں؟ با ایں ہمہ اپنی موت اپنے اختیار میں، چنانچہ کلینی نے اس بات کو ثابت ہی کیا ہے کہ اماموں کی موت ان کے اختیار میں ہے۔ اور

کلینی کیا سارے امامیہ اس پر متفق ہیں کہ علم ما کان و ما یکون جدا تھا اتنا یقیناً جانتے تھے کہ فلانے وقت فلانے کے ہاتھ سے شہید ہونگا اس سے پہلے نہ اس سے پیچھے، اور تمام عمر میں اس اس طرح باسائش گذاروں گا کہ باوجود کثرت انبوہ دشمنان میرا کوئی مزاحم حال یا درپے جان و مال نہ ہوگا اور اگر ہوگا بھی تو میرا کچھ نقصان نہ ہوگا پھر ان سب اختیارات اور علوم کے بعد شجاعت تو ایسی کہ ہزار رستم بھی ہوں تو مان جائیں، ابوبکر و عمر تو کس گنتی میں ہیں، اور کرامت اس قدر کہ درِ خیبر کو اٹھا کر پھینک دیں۔ خانہ ابوبکر و عمر کی کیا حقیقت۔

پھر با ایں ہمہ ابوبکرؓ اور عمرؓ سے ڈرے، کوئی انصاف کر کے تبلائے کہ یہ تقیہ خدا کے تقیہ سے کس بات میں کم ہے؟ علاوہ بریں وقت تعریف مذکور ابوبکر و عمر کا بجز نام و کام نام و نشان باقی نہ رہا تھا اور ظاہر ہے کہ مرے ہوئے سے تو گیدڑ بھی نہیں ڈرتے شیر خدا علی مرتضیٰ پھر روباہ مری ہوئی سے دبے تو قیامت آگئی، خیر کہاں تک کہیئے مطلب اتنا ہے کہ دعا کے وقت کہ جو وقت مناجات عالم السر والخفیات ہے اس وقت تقیہ کا ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ منافقین کا نماز پڑھنا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، منافق بندوں کو دھوکا دیتے تھے اور در صورت تقیہ نعوذ باللہ حضرت امام سجاد خدا کو۔ کیونکہ یہ تو ہم یقیناً جانتے ہیں اور شیعہ بھی کتنے ہی نادان کیوں نہ ہوں اس کے خلاف نہ کہیں گے کہ حضرت امام کی عبادت روی و ریا تھی سو کسی سنی یا معتقد خلفا کے استرضا کا تو ان کی عبادت میں احتمال ہی نہیں۔ بجز اس کے کہ بخیال جانبداری خلفا جو خدا سے ظہور میں آئی یہ خیال دل میں ہو کہ ایسا نہ ہو کہ خداوند کریم بہ سبب خلفا اور بے اعتقادی صحابہ سے اگرچہ حق ہی ہو ناراض نہ ہو جائے۔ نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات جناب من ایسی محفل میں تقیہ کا احتمال کرنا جس پہلو سے پلٹ کر دیکھو دین کو برہم درہم کئے دیتا ہے۔ یا خداوند کریم کی طرف برائی عاید ہوگی تعالی اللہ عن ذالک علوا کبیرا یا ائمہ کی طرف۔۔۔ نعوذ باللہ منہ کثیرا۔ بہرحال تقیہ کے پردہ میں یہ دشمنان اہلبیت ائمہ کو کیا کیا کچھ نہیں کہہ لیتے واقعی بہت خوبصورتی سے ہجو کرتے ہیں۔

حضرت امیر نے بعد وفات صدیق کے مناقب خلفاً بیان کئے اسوقت خوف بھی نہ تھا بھلا امام سجاد تو ستم

دیدہ اور ظلم کشیدہ دشمنانِ سفاک تھے تسیرنہ وہ شجاعت تھی جو حضرت امیر میں تھی نہ وہ کرامت تھی جو حضرت امیر میں تھی اگر ان کے حق میں کوئی تقیہ کا دعوے کرے تو شاید کوئی بیوقوف فی الجملہ مان بھی جائے۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ حضرت امیر کی نسبت باایں ہمہ زور و شجاعت و باوجود یکتائے علم و کرامت و استمرار صحت و سلامت کہ زمان خلفا ثلثہ سے لے کر اپنی خلافت تک بے اندیشہ گذاری اپنی نیند سوئے اپنی بھوک کھایا یہ احتمال کیا جائے کہ انہوں نے ایسے دس جھوٹ پر قسم کھائی کہ ان کی بدولت آسمان گرجائے تو عجب نہیں اور زمین پھٹ جائے تو دور نہیں، کجا یہ اوصاف جمیلہ اور محامد علیہ کہ لگ بھگ انبیاء کے اوصاف اور لوازم کے ہیں کجا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہ بزعم شیعہ ابلیس سے بھی بڑھ کر کہ اس کا برا کہنا مستحب بھی نہ ہو اور ان کا تبرا فرض بلکہ اس سے بڑھ کر کہا جائے تو عجب نہیں کیونکہ موافق مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا کے ایسے ویسے لوگوں کے فرضوں کا ثواب دس گنا ہو تو ہو اس لئے کہ اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ جو ایک نیکی لے کر آئے گا تو اس کو دہ چند ثواب ملے گا۔

اور لعن شیخین اس قدر مقبول ہے کہ ان کی کتابوں میں یہ بات مرقوم ہے کہ ابوبکر صدیق اور عمر رضی اللہ عنہما پر سحر صبح لعنت کرنی ستر نیکیوں کے برابر ہے اور پھر طرفہ یہ ہے کہ ابلیس اور نمرود اور شداد اور فرعون اور ابوجہل اور امیہ بن خلف اور ابولہب وغیرہم دشمنان خدا اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا لعن او تبرا ماشہ بھر نیکی کے برابر نہیں کسی نے ایسوں ہی کی تعریف میں کہا ہے۔ "بریں عقل و دانش بباید گریست"، بالجملہ ایسے لوگوں کی تعریف جو ابلیس اور نمرود اور فرعون اور ابوجہل وغیرہم سے بھی بڑھ کر ہوں اور پھر تعریف بھی اس قدر کہ دس بڑے بڑے کمالات لقسم بیان کئے جائیں ایسے کاملوں سے جن کا نام حضرت علی شیر خدا جن کے اوصاف اوپر مذکور ہو چکے جب ہی ہو سکتی ہے کہ کافر ہونے کے یہ معنے ہوں کہ خدا کا بڑا ہی مطیع و فرمانبردار ہو، سو اگر کفر کے یہی معنے ہیں تو کون مردود برا مانتا ہے ایسی گالیاں تو جتنی چاہیں شیعہ دے لیں بجز تسلیم اس طرف سے انشاء اللہ جواب ہی نہ ہوگا

بیت۔ بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی ٭ جواب تلخ می زیبد لب لعل شکرخارا

سبحان اللہ کس کس پیچ سے حضرات ائمہ کی معصومیت بلکہ بزرگی کو بٹہ لگاتے ہیں۔ خوارج سے شیعہ (رہم جائیں) کچھ دو انگشت زیادہ ہی ہوں گے پر اتنا ہی کہ شیعہ سنوار کر چھان پھٹک کر عیب لگاتے ہیں اور خوارج اناڑیوں کی طرح بے سوچے سمجھے گنوار کا سا لٹھ مار بیٹھتے ہیں۔

حکایات تقیہ کی روایات کتب شیعہ بزور تکذیب کرتی ہیں

القصہ یہ عذر لوچ عاقلوں کے سامنے کہ ائمہ معصومین اصحاب ثلثہ یا اور مہاجرین اور انصار کی تعریف بوجہ تقیہ کیا کرتے تھے قطع نظر اس کے کہ عقل کے نزدیک یہ عذر لاطائل گوز شتر کے نرخ بکتا ہے یوں بھی تو قابل تمسک نہیں کہ جن بزرگواروں کی طرف تقیہ کی تہمت کرتے ہیں ان ہی بزرگواروں کے افسانے جو ان کی معتبر کتابوں میں منقول ہیں بآواز بلند تقیہ کی تکذیب کرتی ہیں ہر چند سب کا اس رسالہ میں درج کرنا ممکن نہیں لیکن "مشتے نمونہ خروارے" دو تین روایتیں جو امام الائمہ حضرت امیر کے اظہار حق اور صدق حال پر دلالت کریں درج کی جاتی ہیں تاکہ بحکم متابعت بزرگان اوروں کی بزرگی اور خوبی بھی کذب اور ریا سے پاک و صاف ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ جب شمس الائمہ کا حال یہ ہے کہ تقیہ میں جو بقول شیعہ ان پر منجملہ فرائض ہی تھا اس قدر تقصیروار تھے اور احکام کا تو کیا ذکر؟ تو اور ائمہ کا کیا حال ہوگا۔؟

امیر کا حکم کہ سچائی اختیار کرو خواہ کچھ بھی ہو

نہج البلاغت میں جو شیعوں کے نزدیک اصح الکتب اور متواتر ہے حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا یہ قول تقیہ کے ابطال میں دلیل قوی اور برہان کامل ہے عَلَامَةُ الْإِيمَانِ إِيثَارُكَ الصِّدْقَ حَيْثُ يَضُرُّكَ عَلَى الْكِذْبِ حَيْثُ يَنْفَعُكَ یعنی ایمان کی نشانی یہ ہے کہ جہاں سچ بولنا ضرر کرتا ہو ایسی جگہ سچ بولنے کو پسند رکھے۔ جھوٹ بولنے پر جو نفع دیتا ہو۔ اس روایت سے صاف نکلتا ہے کہ جو تقیہ کرے اس میں ایمان نہیں کیونکہ علامت ایمان کی یہ ہے کہ جان و مال کا ضرر گو ہو جائے پر جھوٹی بات زبان پر نہ لائے۔

امام کی شجاعت اور اشتیاق جنت

دوسری روایت بھی نہج البلاغت ہی کی سن لیجئے

قَالَ اَمِیْرُالْمُؤْمِنِیْنَ اِنِّیْ وَاللّٰهِ لَوْ لَقِیْتُهُمْ وَاحِدًا وَهُمْ طِلَاعُ
الْاَرْضِ كُلِّهَا مَا بَالَیْتُ وَلَا اسْتَوْحَشْتُ وَاِنِّیْ مِنْ
ضَلَالَتِهِمُ الَّتِیْ هُمْ فِیْهَا وَالْهُدٰی الَّذِیْ اَنَا عَلَیْهِ لَعَلٰی
بَصِیْرَةٍ مِنْ نَفْسِیْ وَیَقِیْنٍ مِنْ رَبِّیْ وَاِنِّیْ اِلٰی لِقَاءِ اللّٰهِ وَلَحُسْنِ
ثَوَابِهٖ لَمُنْتَظِرٌ رَاجٍ ۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں بیشک قسم اللہ کی اگر ان سے تن تنہا مقابل ہوں اور وہ تمام زمین کو گھیرے ہوئے ہوں تو میں ہرگز کچھ پروا نکروں ۔ اور نہ گھبراؤں اور مجھے ان کی گمراہی اور اپنی ہدایت کا حال عیاں ہے اور اس بات کا خداداد یقین ہے اور میں خدا کے ملنے یعنے مرنے اور اس کے ثواب کے انتظار اور امید میں ہوں ،، اب غور فرمائیے جو شخص تن تنہا اتنے دشمنوں سے بھی نہ ڈرے جو تمام روئے زمین کو ڈھک لیں اور ڈرنا تو درکنار پروا اور گھبراہٹ تک نہ ہو ۔ بلکہ مرنے اور جنت کا مشتاق ہو ایسے لوگوں سے تقیہ کے ہونے کے کیا معنے ؟ ایسے لوگ بھی اگر ڈرنے لگے تو قیامت آگئی معہذا تقیہ بغیر خوف کے تو ہوتا ہی نہیں اگر مرجانے کا خوف ہے تو وہ اماموں کو ہوتا ہی نہیں کیونکہ اول تو ان کی موت ان کے اختیار میں ہے جنانچہ کلینی نے اس مسئلہ کو ثابت کیا ہے اور تمام امامیہ کا اس پر اتفاق ہے پھر وہ کسی سے کیا ڈریں اور کیوں ڈریں؟ دوسرے علم وقائع گذشتہ اور نیز وقائع آئندہ سب ان کو مستحضر، خود اپنے مرنے کا حال اور کیفیت بتفصیل و تشریح معلوم ہوتی ہے ۔ اس وقت سے پہلے ڈر ہو ہی نہیں سکتا ۔

انبیاء اور ائمہ کا منصب صبر تحمل اور حق گوئی ہے ۔ اور اگر خوف مال یا آبرو یا بدگوئی خلائق کا اندیشہ یا کسی قسم کی تکلیف کا خوف ہے تو انبیاء اور ائمہ کا کام یہی ہے کہ تکلیفیں اٹھایا کریں، اور تحمل کیا کریں اور دشمنوں کی قوت و شوکت اور اپنی بے کسی اور بے زری کا لحاظ نہ کریں ۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم نمرود سے نہ چھپے اور آگ میں گرنا قبول کیا حضرت موسیٰ فرعون سے نہ ڈرے اور آخر نوبت جلاوطن ہونے کی پہنچی حضرت نوح علیہ السلام نے نوسو برس تک کیا کیا مصیبتیں اٹھائیں شیعوں نے بھی سنی ہوں گی ۔ حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا کا

مقتول ہونا شہرۂ آفاق ہے حضرات شیعہ ہی انصاف کر کے فرمائیں کہ ان کے مقتول ہونے کا باعث سوا کلمۃ الحق اور حق گوئی کے اور کیا تھا عزت چھوڑ یہاں تو جان پر کھیل گئے ۔ حضرت امیر جو انبیاء سے افضل نہیں تو مساوات میں تو شیعوں کے نزدیک کلام ہی نہیں آبرو تک کا خدا سے دریغ کریں ۔

تقیہ اگر فرض تھا تو امام حسین کی شہادت معصیت ہوگی اور خود خلف رشید حضرت امیر رضی اللہ عنہ سید الشہداء شہید کربلا رضی اللہ عنہ جان نازنین کو نثار راہ خدا کر گئے اگر تقیہ سنت حضرت علی بلکہ فرض خداوندی تھا تو اس سے زیادہ اور کونسا موقع تقیہ کا ہوگا کہ تیس ہزار فوج جرار برسرِ کارزار زن و فرزند ہمراہ ننگ و ناموس کا اندیشہ نہ کھانا نہ دانا نہ پانی کا سامان نہ آڑ کے لئے کوئی مکان اور اس طرف سے فقط اتنی طلبگاری کہ بیعت یزید قبول کر لو پھر جہاں جی چاہے چلدو بڑے حیف کی بات ہے جان و مال سب برباد گئے زن و فرزند پر جو کچھ گذری سب جانتے ہیں پھر تس پر خاتمہ ہوا تو یوں ہوا کہ فرض مفترض معمول بہ اہل بیت پر عمل نہ کیا بے گناہوں کو مفت کے مظلمہ میں گرفتار کیا ان کا وبال نعوذ باللہ اپنی گردن پر لیا نعوذ باللہ اگر یہی تقیہ ہے تو ہم جانتے ہیں کہ یہ دوست بدتر از ہزار دشمن بہ نسبت حضرت امام الشہداء نعوذ باللہ عقیدہ خسر الدنیا والاخرۃ رکھتے ہیں واللہ کہ ان الفاظ کے کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے مگر خداوند عالم الغیب والشہادہ خوب جانتا ہے میں تقیہ سے نہیں کہتا کہ یہ سب ڈوکد بدولت حضرات مدعیان دروغ فرقہ مسمے الشیعہ کے ہے ورنہ یہ خاکپائے غلامان اہل بیت ان حضرات کو اکابر اولیاء اللہ اور عمدۂ صدیقین اور افسر مخلصین اور خلاصہ محسنین اور زبدہ متقین اور سر حلقہ محبوبین سمجھتا ہے حاشا و کلا جو بطور شیعہ دعوے دروغ ہو ۔

امام کا اپنی کرامت سے حضرت عمر کو مرعوب کر دینا تیسری روایت راوندی کی کہ مقتدائے شیعہ اور شارح نہج البلاغت ہے کتاب خرائج الجرائح میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے ۔

اِنَّ عَلِیًّا بَلَغَهٗ عَنْ عُمَرَ اَنَّهٗ ذَكَرَ شِیْعَتَهٗ فَاسْتَقْبَلَهٗ فِیْ بَعْضِ
طُرُقَاتِ بَسَاتِیْنِ الْمَدِیْنَةِ وَفِیْ یَدِ عَلِیٍّ قَوْسٌ فَقَالَ یَا عُمَرُ بَلَغَنِیْ
عَنْكَ ذِكْرُكَ لِشِیْعَتِیْ فَقَالَ اِرْبَعْ عَلٰی ضَلْعِكَ فَقَالَ عَلِیٌّ اِنَّكَ لَهٰهُنَا

ثُمَّ رَمٰی بِالْقَوْسِ عَلَی الْاَرْضِ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ کَالْبَعِیْرِ فَاغِرًا فَاهُ وَقَدْ اَقْبَلَ نَحْوَ عُمَرَ لِیَبْتَلِعَهٗ فَقَالَ عُمَرُ اللّٰهَ اللّٰهَ یَا اَبَا الْحَسَنِ لَا عُدْتُ بَعْدَهَا فِیْ شَیْءٍ وَجَعَلَ یَتَضَرَّعُ اِلَیْهِ فَضَرَبَ یَدَهٗ اِلَی الثُّعْبَانِ فَعَادَتِ الْقَوْسُ کَمَا کَانَتْ فَمَضٰی عُمَرُ اِلٰی بَیْتِهٖ۔ الخ۔

یہ روایت بہت بڑی ہے کہاں تک نقل کروں اتنے الفاظ بھی بہت ہیں پر حاصل معنی اس کا بیان کئے دیتا ہوں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کو یوں خبر پہنچی تھی کہ عمر کچھ شیعہ علی کو برا کہتے ہیں سو اتفاقات سے بعضے مدینہ کے باغوں کی راہ میں ان کے سامنے آگئے حضرت علی نے فرمایا اے عمر مجھے یوں خبر پہنچی ہے کہ تو میرے شیعہ کو برا کہتا ہے۔ عمر نے کہا اے میاں اپنی خیر مناؤ۔ حضرت علی نے فرمایا تم اتنے ہو گئے۔ پھر کمان کو جو زمین پر ڈالا تو ایک اژدہا ہوا اونٹ کے برابر منہ کھولے ہوئے حضرت عمر کی طرف نگلنے کے ارادہ سے دوڑا۔ عمر نے کہا خدا کے واسطے خدا کے واسطے اے ابو الحسن پھر اس کے بعد ایسی بات کبھی نہ کہونگا اور لگے گڑگڑانے۔ حضرت علی نے اس اژدہا کی طرف جو ہاتھ لپکایا پھر وہی کمان کی کمان ہو گئی۔ خیر عمر اپنے گھر چلے گئے۔ اس روایت کو دیکھئے تو تقیہ کی تو گردن ہی توڑ دی۔ خلیفوں اور اصحاب میں بڑی دھوم دھام حضرت عمر ہی کی تھی اور سنی بھی انہیں کی شوکت اور دبدبہ کو بہت زبان پر لایا کرتے ہیں سو جب ان کا یہ حال ہو کہ ایک کرشمے سے ان کو ڈرا دیا اور بیچارے تو فقط اشارہ کے تھے۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت امیر کا سکوت جو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے افعال اور حرکات پر تھا یہاں تک کہ غصب فدک دیکھا کئے۔ اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کر دیا اور ان سے بیعت کر لی اور ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے یہ سب بوجہ حقانیت تھا نہ بوجہ تقیہ ورنہ اس زور اور قدرت اور اس کرامت کا آدمی اور کون تھا جو ان سے اندیشہ یا ہراس رکھتا اور اگر بالفرض یہ زور اور بل اور یہ قدرت خداداد کسی میں ہوتی بھی تب غصب دختر طاہرہ مطہرہ تو ہرگز گوارا نہ ہوتا۔ اہل ہند جو تمام ولایتوں کے لوگوں کے نامردہ پن میں امام ہیں ان میں کا بھنگی اور چمار بھی اس سہولت سے بیٹی نہیں دیتا۔ جس طرح حضرت امیر نے اپنی دختر مطہرہ کو حضرت عمر کے حوالہ کر دیا

آپ بھی دیکھتے رہے اور صاحبزادی بھی، پھر صاحبزادوں میں بھی ایک وہ تھے کہ جنہوں نے تین ہزار فوج جرار کا مقابلہ کیا حالانکہ وہ زمانہ ضعیفی اور تحمل کا تھا اور بہن کے نکاح کے وقت عین شباب تھا اور تس پر تماشہ یہ ہے کہ ہنگامہ کربلا میں جو دشمنان سفاک نے حرم محترم اور زنان اہلبیت کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو کیا کچھ غضب اور جوش آیا شیعوں کو تو شہادت نامہ کربلا ازبر ہی ہوگا۔ لکھنے کی کیا حاجت۔

تقیہ از روئے عقل و نقل و عرف بالجملہ روایات شیعہ خود تقیہ کی جڑ اکھاڑتی ہیں فقط سنیوں ہی کا قصور نہیں، اور اب آگے اور لکھنا ہمیں ضرور نہیں کہ بحمد اللہ عاقلان منصف کے لئے یہ بھی بہت ہے مگر بنظر اتمام حجت اور مزید توضیح یوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عقل اور نقل اور عرف سے بھی اس بات میں استفتا کیجئے تاکہ شیعوں کی آنکھیں تو کھلیں کہ ہم کس خواب خرگوش میں مدہوش ہیں۔ جناب من عقل کی رو سے دیکھئے تو پیغمبروں اور اماموں کا تقیہ ایسا ہے جیسے کسی معلم کو لڑکوں کے پڑھانے اور تادیب کے لئے نوکر رکھا جائے اور وہ معلم تعلیم اور تادیب تو درکنار الٹا لڑکوں کے ہمرنگ ہو کر گیند بلا یا گلی ڈنڈا کھیلنے لگے، تو پیغمبروں اور اماموں کیلیے خدا کی طرف سے تقیہ کا فرض ہونا ایسا ہی ہے جیسا معلم اور مودب کو اہل مکتب یہ حکم دے کہ پڑھلیے، پر چاہیئے تمہارے اور لڑکوں کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلے، خبردار ایسا نہ کرنا اور ان کی تادیب میں تقصیر نہ ہو لیکن جس طرح سے لڑکے چاہیں سرمو اس میں تفاوت نہو نہ ان کو ڈرائیو، نہ مارئیو نہ اپنی طرف سے کچھ کہیو بلکہ وہ کھیلیں تو ان کے ساتھ تم بھی کھیلنے لگیو۔

اب اہل انصاف انصاف فرمائیں کہ یہ بات کچھ عقل کی ہے اور اس میں اور پیغمبروں اور اماموں کے تقیہ میں کیا فرق ہے؟ اور پھر تقیہ بھی اتنا کچھ کہ دین برباد ہو گیا تمام امت محمدی گمراہ ہو گئی تس پر اپنا ننگ و ناموس جاتا رہا پر چاہیئے زبان سے کلمۃ الحق نکلے اس کی نوبت نہ آئی۔ کھل کھیلنا تو کجا اور پھر باینہمہ حضرات شیعہ معتقد اس بات کے کہ دین شیعہ عین مطابق عقل ہے اور کیونکر نہ کہیں خداوند کریم تو ان کے اعتقاد کے موافق باینہمہ خداوندی اور احکم الحاکمین ہونے کے محکوم عقل ہے اور عقل کی اطاعت اس کے ذمہ فرض ہے۔ واہ سبحان اللہ کیا خدا کی قدردانی ہے جب خدا کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو کسی کو کیا شکایت؟ اول تو

خدا کو محکوم بنایا اور اس کے احکم الحاکمین ہونے سے جو کلام اللہ میں بعینہ انہیں الفاظ سے مذکور ہے ہاتھ اٹھایا دوسرے ایسا خلاف عقل حکم اس کے نام لگایا کہ جس سے بزعم خود نعوذ باللہ خدا کو گنہگار اور تارک فرض ٹھہرایا تعالی اللہ عن ہذہ العیوب علوا کبیرا۔

تقیہ از روئے کلام اللہ اور از روئے نقل تقیہ کا حال پوچھئے۔ تو سینکڑوں آیتیں ایسے تقیہ کی برائی پر (جیسے حضرات شیعہ آپ کرتے ہیں اور اماموں کے ذمہ لگاتے ہیں) دلالت کرتی ہیں۔ بلکہ الٹے تقیہ نہ کرنے کی خوبیاں کلام اللہ سے جتنی چاہو نکال لو یہاں تک کہ جان کے جانے کے وقت بھی تقیہ کے نہ کرنے ہی کی بہبودگی کلام اللہ سے ثابت ہوتی ہے۔ کلام اللہ کوئی عنقا چیز نہیں جو نہ ملے اگر شیعوں کو بوجہ یاد نہ ہونے کلام اللہ کے میری طرف جعل کا احتمال ہو تو مطابق کر دیکھیں کہ کلام اللہ میں سورہ بقر میں دوسرے سیپارہ میں نصف سے کچھ بعد یہ آیت ہے کہ نہیں۔؟

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ۔	یعنی کیا تم کو اے مسلمانو یہ گمان ہو گا کہ تم جنت میں یونہی چلے جاؤ اور تم پر وہ حالت نگزری ہو جو پہلوں پر گذری کہ ان کو شدت کا خوف اور تکلیفیں پیش آئیں اور جھڑ جھڑائے گئے یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان دار تھے گھبرا کر یوں کہنے لگے۔ کہ خدا کی مدد کب ہوگی۔ سو خبردار رہو اللہ کی مدد قریب ہی لگی ہوئی ہے۔

اور اس آیت کو بھی دیکھ لیں۔ سورۂ آل عمران میں چوتھے سیپارہ میں مابین ربع اور نصف کے یہ آیت ہے۔

وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ	یعنی بہت سے نبی ہوئے ہیں جس کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والے دشمنوں سے لڑے ہیں سو جہادوں میں جو تکلیفیں ان کو پیش آئیں تو ان تکلیفوں کے سبب وہ کچھ ڈھیلے ہوئے نہ سست ہوئے نہ کفار سے کچھ دب نکلے اور اللہ صابروں سے محبت رکھتا ہے۔

تقیہ جنت سے محرومی کا سبب ہے ان دونوں آیتوں کو خدا النظر غور اور بچشم انصاف دیکھئے اور بے روی و ریا فرمائیے کہ مرضی جناب باری کس طرف ہے درصورتیکہ عوام مومنین کے حق میں یوں کہا تو بتلائیے تو امام اور پیغمبر تو امام اور پیغمبر ہیں وہ تو دین کی باتوں میں عوام سے بڑھ کر ہوتے ہیں پہلی آیت کی رو سے تو تقیہ کی صورت میں جنت سے امید ہی منقطع ہے پھر اس سے زیادہ اور تقیہ کو کیونکر وضع کرینگے باقی سنیوں کی بے بسی اور بے کسی کا عذر ہو تو جناب باری تعالے نے پہلے اس کا دفعیہ فرمادیا ہے الا ان نصر اللہ قریب یعنی گھبراؤ مت ہماری مدد پاس ہی لگی ہوئی ہے۔

خوف کفار سے سست ہونا ممنوع ہوا تقیہ تو دور کی بات ہے اور دوسری آیت میں تقیہ تو تقیہ کفار کے خوف سے سست ہو جانے اور ضعیف ہو جانے پر تنبیہ کرتے ہیں کیونکہ تقیہ کی برائی کی طرف تو اشارہ وما استکانوا میں آگیا تھا اس لئے کہ اس کے معنے یہی ہیں کہ ان لوگوں نے کفار کے آگے باوجود تکلیفات کے بھی ظاہری چاپلوسی نہ کی اور یہی تقیہ ہے اور کیا تقیہ کے سر سینگ ہیں پھر جو دوباتیں اور فرمائیں کہ نہ سست ہوئے نہ ضعیف ہوئے تقیہ سے دو نمبر اور ادھر کو کھینچا ہے تاکہ اس سے دور رہیں اور اس میں گرفتار نہ ہو جائیں سبحان اللہ خدا بھی کیا منتظم اور مدبر ہے یہ وہی قصہ ہے، بمرگش گیر تا بہ تپ راضی شود۔ لیکن آفرین ہے شیعوں کی بھی ہٹ دھرمی پر کہ تپ پر بھی راضی نہیں ہوتے۔ موت تو درکنار اور کیوں راضی ہوں جہاد کو کیوں سر دھریں اور جہاد تو جب ہوگا جب ہوگا۔ سنیوں کے گھروں کے پلاؤ اور قورمے کیوں ہاتھ سے کھوئیے اور کیوں ان کے تیر ملامت کا نشانہ ہو کر اپنے نصیبوں کو روئیے جنت گئی بلا سے گئی۔

نقد را بنسیہ گذاشتن کار خردمنداں نیست

اور میں نے جو یہ عرض کہ اس آیت میں تقیہ وغیرہ سے روکتے ہیں ہر چند اہل فہم کے نزدیک محتاج بیان نہیں لیکن باندیشہ خوش فہمی شیعہ گذارش ہی لازم ہے اس آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہے جسے تامل ہو دیکھ لو کہ جناب باری تعالے اس امت کے لوگوں

کو خاص کر صحابہ کو پہلی امتوں کے حال سنا سنا کر سست ہونے اور ضعیف ہونے اور تقیہ کرنے سے روکتے ہیں اب اہل انصاف سے التماس ہے کہ باوجود ان تنبیہات کے اگر کوئی نہ مانے اس کو کیا کہیئے وہ ناکارہ لوگوں میں سے ہوگا یا عمدہ اور عمدہ بھی اس قدر کہ مستحق ثواب ہو جیسا اہلِ تقیہ فرماتے ہیں۔

تقیہ سبب عتاب ہے، نہ کہ موجب ثواب

حق تو یوں ہے کہ تقیہ والے مورد عتاب ہیں چنانچہ ان آیات سے ظاہر و باہر ہے ثواب کجا اور تقیہ کر کے منصب پیغمبری اور مرتبہ امامت پر مامور رہنا تو در کنار ویسے بھی خیر نہیں خاص کر ایسے تقیہ کے ساتھ کہ بزعم شیعہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ائمہ کرتے تھے صحابہ معلومین کے ساتھ کہ جو ان کے عقیدے کے موافق نعوذ باللہ ابلیس سے بھی بڑھ کر تھے چنانچہ اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہمیشہ ہم نوالہ اور ہم پیالہ رہے۔ اور ہمیشہ ان کی رضا جوئی میں عمر عزیز کو بسر کیا خداوند کریم تو ارشاد فرمائے وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيْرٍ یعنے اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم اگر تو بعد حق و ناحق کے معلوم کرنے کے ان کی خواہشوں کے موافق کچھ بھی کرے گا تو تیرا کہیں ٹھکانا نہیں نہ تیرا کوئی دوست تجھے چھڑا سکے گا۔ نہ کوئی تیری مدد کرنے والا ہے جو خدا سے بچا لے گا" اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم با ایں ہمہ ممانعت و تہدید پھر بھی ان کی دلجوئی سے باز نہ آئے۔ خدا کی خواہش پر ان کی خواہش کو مقدم رکھا۔

انبیاء خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے

القصہ خداوند کریم تو عوام تک کو تقیہ کے کرنے سے روکے اور شیعہ خواص کو بھی تقیہ کرنے والا اور وہ بھی دائم التقیہ سمجھیں حالانکہ خاص امانت رسالت کے پہنچانے والوں کی (جو شیعوں کے نزدیک بھی پیغمبر اور امام ہیں) جناب باری علامت ہی یہ فرماتا ہے کہ وہ کسی سے ڈرتے نہیں اور اللہ کے پیام کے پہنچانے میں دریغ نہیں کرتے۔ سورۂ احزاب کے پانچویں رکوع میں یہ آیت موجود ہے انبیاء کے حق میں فرماتے ہیں اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسَالَاتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰه یعنے انبیاء کے اوصاف یہ ہیں پہنچاتے ہیں اللہ کے پیام اور اسی سے ڈرتے ہیں اور سوا اللہ کے اور کسی سے نہیں ڈرتے اس آیت کو دیکھئے کہ فقط انبیا کا نہ ڈرنا ہی اس میں نہیں جو کوئی شیعہ یوں کہنے لگے کہ تقیہ دین کے چھپانے کو کہتے ہیں کیا ضرور ہے کہ ڈر ہی کے سبب چھپاتے ہوں بلکہ کچھ اور مصلحت ہو سو یہ احتمال اول تو ان کا جی جانتا ہے کہ کیسا نامعقول ہے پھر با ایں ہمہ شاید کوئی اس بات میں کچھ زبان زوری بھی کرتا لیکن جناب باری تعالےٰ تو علام الغیوب ہے شیعوں کی ہٹ دھرمی تو پہلے ہی سے جانتا تھا اسی لئے پہلے ہی یہ پخر لگا دی الذین یبلغون رسالات اللہ۔

خاتم الانبیاء کو تبلیغ کا تاکیدی امر

پھر انبیاء میں سے بھی خاص کر جناب سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کو نرا خاص کر حکم جداگانہ سنایا۔ تاکہ مزید تاکید ہو اور کوئی کسی قسم کی سستی اور مداہنت ظہور میں نہ آجائے چنانچہ سورہ حجر میں فرماتے ہیں، فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ یعنی سنا دے کھول کر دین کی بات اور مشرکین کا کچھ دھیان نہ کر،، اور پھر اس کے آگے برابر تاکید پر تاکید اسی بات کی چلی جاتی ہے کہ کہنے میں قصور نہ کر جیسے شک ہو دیکھ لے اور پھر با ایں ہمہ سورہ احزاب میں یوں فرماتے ہیں لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ حاصل یہ ہے تمہارے حق میں رسول اللہ ہی کا اقتدا انہیں کی چال ڈھال اور راہ روش پر رہنا اچھا ہے جسے اللہ کی اور پچھلے دن کی امید ہے،، اس آیت نے ساری امت کے ذمہ یہ بات واجب کر دی جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حق بات کے کہنے اور اظہار دین میں دریغ نہیں کرتے تھے تم بھی نہ کرو پھر خاص کر ائمہ تو ائمہ ہیں وہ تو تبلیغ دین اور اظہار حق ہی کے لئے بھیجے گئے ہیں بلکہ شیعوں کے نزدیک رسولوں سے زیادہ نہیں تو برابری میں تو حرف ہی نہیں اور برابری نہ سہی جب ایک کام پر مامور ہوئے تو اس میں اوروں سے تو زیادہ ہی کنج دکاؤ چاہیئے

انبیاء اور ان کے نائب سب کا مقصد انذار و تبشیر ہے

معہذا خداوند کریم فرماتے ہیں وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ۔ یعنے ہم نہیں بھیجتے مرسلین کو مگر فقط بشارت دینے اور ڈرانے کے لئے،، اور مرسلین کلام اللہ کی اصطلاح کے موافق فقط پیغمبر ہی کو نہیں کہتے بلکہ جو خدا کے احکام پہنچائے پیغمبر ہو یا نائب پیغمبر چنانچہ سورہ یٰسین میں جو اِنَّا اِلَيْكُمْ

لمرسلون ہے اس سے نائبان حضرت عیسٰے مراد ہیں حالانکہ وہ نبی نہ تھے نائب نبی تھے اور امام کے تو خود یہی معنے ہیں شیعوں کے نزدیک کہ نائب نبی ہو باقی کوئی یوں کہے کہ حضرت کے یاروں کو جو رسول کہا تو بایں معنے کہ وہ حضرت عیسٰے کے بھیجے ہوئے تھے اور آیت وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ میں وہ مراد ہیں جو خدا کے بھیجے ہوئے ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسٰے کے نائبوں کے بھیجنے کو بھی خداوند کریم نے اپنی طرف نسبت کیا اور یوں فرمایا ہے اِذْ اَرْسَلْنَا اِلَیْهِمُ اثْنَیْنِ یعنی ہم نے بھیجا اور یوں نہیں فرمایا کہ عیسٰے نے بھیجا جب حضرت عیسٰے کے نائبوں کو خداوند کریم اپنا بھیجا ہوا مرسل کہے تو ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے نائب تو اس کے بھیجے ہوئے کیوں نہ ہوں گے؟ اور جب اس کے بھیجے ہوئے اور مرسل ہوئے تو موافق آیت مذکورہ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ ان کا کام بھی یہی ہے بشارت اور ڈرانا۔ پھر اب فرمایئے کہ تقیہ کہاں سے آگیا؟ ہم سے تو نہیں ہو سکتا کہ منھ اُلال کر جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ اطہار کی نسبت یوں گمان بھی کریں کہ وہ فرمودہ الٰہی میں سرِمو بھی تفاوت کرتے ہوں ہمہ تن اظہار دین میں مشغول تھے اور کیوں نہ ہوں اول تو آیت مذکورہ سے خود مترشح ہے کہ پیغمبر تبلیغ رسالت میں قصور نہیں کرتے پھر نائب کیونکر اخفا کرینگے۔ نہیں تو پھر نائب ہی کیا ہوئے اور مخالف ہوئے (جیسے لکھے کے مٹانے والے)۔

آنحضرت کی بعثت کا مقصد ہی اظہار دین تھا | دوسرے جناب باری تعالےٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجنے کی غرض یہی بیان فرماتے ہیں کہ اظہار دین کے لئے ان کو بھیجا ہے۔ سورہ فتح اور سورہ صف اور سورہ توبہ میں ہے هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ مطلب یہ ہے کہ خدا ہی نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دیکر تاکہ سارے دینوں پر غالب اور ظاہر کردے،، اب سنئے کہ اظہار دین اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف اس آیت میں منسوب ہے تب تو مطلب ظاہر ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ اظہار دین خدا ہی کو کرنا مدنظر تھا پر اس طور پر اور اس سامان سے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھیجا سو جو کچھ دین کی ترقی ان کے سبب ہوئی وہ سب خدا

ہی نے کی لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بیچ میں ایسے تھے جیسے کاریگر اور کار کے بیچ میں آلات ہوتے ہیں تو اس صورت میں مطلب ظاہر کیا اظہر ہے کیونکہ خدا کا ارادہ اظہار کا ہوگا تو پھر کون چھپا سکے گا بلکہ اس آیت میں ایک دلیل کامل ہے سنیوں کے مذہب کی حقیقت کی کیونکہ درصورت تقیہ شیعہ جو سنی بن جاتے ہیں تو ظاہر میں دین اہل سنت ہوتا ہے اور باطن میں مذہب شیعہ تو مذہب اہل سنت تو دین حق ٹھہرا اس لئے کہ لیظہرہ میں جو ضمیر ہے تو دین الحق کی طرف راجع ہے اور مذہب شیعہ علی الدین کلہ میں داخل رہا۔ اور ظاہر ہے کہ ماسوا دین حق کے سب دین باطل ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ اظہار جو اس آیت سے مقصود ہے وہ حضرت امام مہدی کے زمانے سے پہلے ہونا چاہیئے "وجہ اس کی یہ ہے کہ غالب ہونے کے لئے دو چیزیں ہونی چاہیئں ایک غالب ایک مغلوب، ایسے ہی ایک چیز جو ایک چیز سے ظاہر ہو تو وہ دوسری بھی ہونی چاہیئے۔ سو اس آیت میں ظاہر ہے علی الدین کلہ بھی لیظہرہ کے ساتھ ہے اور اس کے ملنے سے یہ معنے ہوگئے ہیں کہ اور دینوں سے یہ دین ظاہر ہوگا نہ یہ کہ اور دین باقی ہی نہ رہیں گے۔ سو حضرت امام کے وقت میں شیعہ ہی فرما دیں کہ اور دین رہے گا یا نہیں؟ معہذا لیظہرہ ارسل سے متعلق ہے تو وہ اظہار ارسال کے متصل ہی چاہیئے سو ایسا اظہار سوا مذہب اہل سنت کے اور کسی دین کو اب تک میسر نہیں آیا شیعہ ہی فرمائیں کہ میں جھوٹ کہتا ہوں یا سچ ہے؟ اس کے بعد ہرچند اب کچھ ضرورت نہیں کہ منقولات میں سے ابطال تقیہ کی کوئی سند اور بیان کی جائے۔

تبلیغ دین، انبیاء علماء اور ائمہ پر فرض ہے | لیکن مزید توضیح کے لئے اتنا اور معروض ہے کہ جب کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے تو اول دفعہ تو وہ اکیلا ہی ہوتا ہے اگر وہ اظہار حق نہ کرے اور بالکل چپکا بیٹھ رہے تو فرض تبلیغ احکام اس کے ذمہ رہ جائے اور فرضیت تبلیغ احکام کی انبیاء اور درویشوں اور علماء کے ذمہ سب کے نزدیک مسلم ہے اور کسی اور پر نہ ہو ہمارے پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم پر تبلیغ احکام کی فرضیت اس آیت سے واشگاف ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ یعنے اے رسول پہنچا دے جو کچھ تیری طرف نازل کیا گیا ہے تیرے رب کی طرف سے

اور اگر یہ نہ کیا تو تونے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام"، اسی طرح اور لوگوں کو فرماتے ہیں۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ یعنے اور چاہیئے کہ رہے تم میں ایک جماعت بلاتی نیک کام کی طرف اور حکم کرتی اچھی بات کا اور منع کرتی ناپسند کو"، سو یہ حکم ظاہر ہے کہ معروف اور منکر کے جاننے والوں کو ہے سو اسی کا نام عالم اور درویش ہے جتنا کوئی زیادہ جانے وتنی ہی اس کے ذمہ فرضیت زیادہ ہوگی۔ سو اماموں سے زیادہ اس باب میں اور کون ہوگا، بالجملہ اگر انبیاء مہرِ سکوت منھ پر لگا کر بیٹھ رہیں اور سرے سے منھ کھولیں ہی نہیں تب تو انبیاء کا گنہگار ہونا لازم آئے گا اور اگر احکام الٰہی پہنچائیں تو ظاہر ہے کہ احکام الٰہی تو نفس کے خلاف ہی ہوں گے۔ اسی واسطے مطیع و فرماں بردار کوئی کوئی ہوتا ہے ورنہ پھر بدبخت کوئی کوئی ہوتا اور جب نفس کے خلاف کوئی بات کہتا ہے تو لاکھ میں سے ایک تو مثل ابوبکر صدیق کے بے کھٹکے مانتا ہے ورنہ سو سو حجتیں نکالتے ہیں بلکہ الٹے دشمن ہوجاتے ہیں، پھر اس وقت اگر آدمی لوگوں کی بدگوئی اور ایذا رسانی سے ہٹ رہے تو اس میں اور دنیاداروں میں کیا فرق رہا؟ ہر کوئی اس کو مطلب کا یار سمجھکر دونی تکذیب پر کمر باندھے گا اور جو ساتھ ہوگئے تھے وہ ہٹ رہیں گے سو دین کی خیریت ہوئی اور نبوت بھی ختم ہوئی اور اگر ایسے وقت میں پکارا رہا اور لوگوں کی بدگوئی اور نقصان جان و مال سے نہ ڈرا تو آگے پھر آسانی کا وقت ہے اللہ کا وعدہ ہے کہ بعد شدت اور کلفت کے نصرت بھیجتا ہے چنانچہ آیت أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ الخ کے آخر میں جو أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ہے اپنے ماقبل سے مل کر یہی کہتا ہے اور جب آسانی ہوئی اور خدا کی مدد آپہنچی تو پھر تقیہ کس مرض کی دوا ہے؟ الغرض انبیا کے حق میں کوئی صورت تقیہ کے روا ہونے کی معلوم نہیں ہوتی اور چونکہ ائمہ ہدیٰ بھی نائبان پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور نائب کا وہی کام ہوتا ہے جس کام کے لئے منیب ہوا کرتا ہے تو بیشک تبلیغ احکام ان کے ذمہ میں فرض ہوگی اور ان کی کیا تخصیص ہے سب ہی پر فرض ہے۔ چنانچہ ابھی مرقوم ہوا لیکن یہ خاص اسی کام کے لئے ہوتے ہیں اور پھر ائمہ ہدیٰ معصوم بھی ہیں صدور گناہ کا احتمال نہیں تو ان سے بھی تقیہ کا ہونا ممکن نہیں جیسے کہ انبیاء سے ممکن نہیں۔

آنحضرت کی مکی زندگی تقیہ کا استیمال ہے

سو بفضلہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء کے احوال کے مطابق کرنے سے یونہی معلوم ہوتا ہے کہ حق گوئی میں انہوں نے ذرہ برابر دریغ نہیں کیا بلکہ اس سبب سے جان و مال عزت و آبرو سب کو برباد کیا ہے اور اپنی بات سے نہیں ہٹے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حال تو ظاہر ہے سب اہل اسلام نے سنا ہوگا، آپ کی ایذاؤں کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ سالہا سال تک کفار نے ذات برادری سے نکالے رکھا مکہ سے باہر پڑے رہے یہ عہد کرلیا تھا کہ ان سے نہ کوئی بیع و شرا کرے نہ ان کا کوئی کام مزدوری غیر مزدوری سے کردے اور زبانی طعن و تشنیع اور دشنام اور دست درازیاں تو جدا رہیں۔ آخر یہ ہوا کہ قتل کا ارادہ ہوا اور آپ چھپ کر مدینہ منورہ کو تشریف لے گئے۔ اگر تقیہ فرض کیا درست بھی ہوتا تو آپ کیوں اتنے مصائب اٹھاتے؟ اور کیوں بیت اللہ جیسی اشرف چیز کو چھوڑ کر آتے؟ ابولہب اور ابوجہل کیوں دشمن ہوتے؟ برائے خدا کوئی تبلائے تو یہی کہ ان ملعونوں کو سوائے حق گوئی کے آپنے اور کیا ستایا تھا زمین ملک ان کے نہیں دبالئے تھے ملک و دولت ان کے نہیں چھین لئے تھے علیٰ ہذا القیاس حضرت ابراہیم علیہ السلام جو آگ میں ڈالے گئے اور ہجرت کر کے وطن سے چلے آئے تو آپنے سوا حق گوئی اور اظہار حق کے اور کیا گناہ کیا تھا؟ بالجملہ مثل آفتاب روشن ہوگیا کہ انبیاء نے نہ تقیہ کیا اور نہ ان سے تقیہ ہوسکے۔

علیٰ ہذا القیاس جو ان کے نائب ہیں نہ انھوں نے تقیہ کیا نہ ان سے ہوسکے، چنانچہ حضرت امام حسین سید الشہداء کی جانِ نازنین پر جو کچھ گذرا وہ سب جانتے ہیں باعث اس کا فقط حق گوئی تھا ورنہ یزید کا کلمہ کہہ دیتے تو جان کی جان بچتی اور الٹی مال و دولت اور اعزاز و اکرام ہوتا اور حضرت امام الائمہ حضرت امیر کا امیر معاویہ سے لڑنا سب پر روشن ہے سوائے انکے اور اماموں کا حال بھی سُنا ہوگا کہ سلاطین سفاک کے ہاتھ سے کیا کیا ایذائیں ان کے نصیب ہوئیں قیدخانوں میں محبوس رہے اگر تقیہ کرلیتے تو کیوں یہ ذلت اور خواری اور کیوں یہ محنت و دشواری اٹھاتے؟ ہاں عوام مومنین کی نسبت اگر کوئی کہے تو فرضیت تو درکنار؟ البتہ جواز معلوم ہوتا ہے اگر عذر قرار واقعی ہو، مثلاً لڑکے اور عورتیں اور اندھے

اور لنگڑے اور اپاہج اور قیدی اور سوا اس کے جو کوئی ایسا ہی ناچار ہو تو اس کو بقدر ضرورت کفار سے موافقت جائز ہے بشرطیکہ جان کا یا کسی عضو کا اندیشہ ہو (اپنی یا اپنی اولاد یا ماں باپ وغیرہ کا) اور اگر کچھ یونہی تکلیف کا اندیشہ ہو جسے تحمل کر سکے تو پھر کفار سے موافقت کرنی ہرگز جائز نہیں۔

صبر کے فضائل اور ترغیب جس سے تقیہ کی حقیقت کھلتی ہے۔

اور بایں ہمہ پھر ثواب اس میں ہے۔ کہ تقیہ نہ کرے کیونکہ صبر کی جو جا بجا تعریفیں کتاب اللہ میں آئی ہیں۔ تو ایسوں ہی کے واسطے ہیں نہیں تو تقیہ میں کیا ایذا تھی جو صبر کی ضرورت ہوتی؟ اس میں تو اور پلاؤ اور متنجن میسر آتے ہیں اور حضرت اور قبلہ بن جاتے ہیں اسی لئے کلام اللہ میں جتنی صبر کی تاکید ہے اتنی کسی اور چیز کی نہیں۔ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ یعنے سب انسان ٹوٹے میں ہیں مگر جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے اور آپس میں ایک دوسرے کو حق گوئی اور حق پر قائم رہنے اور صبر کی نصیحت کی۔ شیعوں کے مذہب میں حق گوئی تو کہاں، حق کے دبا لینے کی تاکید ہے، ابوبکر صدیق کو تو ایک فدک کے دبا لینے میں اس قدر برا کہتے ہیں۔ یہ جو تمام حق خداوندی یعنے دین حق کے دبا لینے کی فرضیت کے قایل ہیں ان پر کتنے ہزار لعنت چاہیے؟ اور سوا اس کے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ وَاصْبِرُوْا وغیرہ آیات صبر سے کلام اللہ بھرا ہوا ہے اگر تقیہ فرض ہوتا صبر کوڑی کے کام کا بھی نہ تھا معہذا کہیں ایک جگہ تو اس کا حکم آیا؟ بالجملہ اگر تقیہ کہیں ہے بھی تو عوام کے واسطے ہے اور ان میں بھی معذوروں کے لئے نہ ہر کسی کے لئے، اور اُن کے واسطے بھی جان کے خوف میں اور وہ بھی جائز ہے واجب نہیں بلکہ ثواب کی بات یہی ہے کہ نہ کرے اور کرے بھی تو واجب ہے کہ بقدر ضرورت کرے۔

جہاں اظہار حق نہ ہو سکے ہجرت واجب ہے

اور عین حالت تقیہ ہجرت کی فکر میں رہے اور جب قدرت پائے آنکھ بچا کر کہیں ایسی جگہ بھاگ جائے جہاں اظہار حق سے کوئی مانع نہ ہو کیونکہ کلام اللہ میں ہجرت کی برابر تاکیدیں بھری ہوئی ہیں۔ اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ

فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ۔ یعنے میری زمین واسعہ ہے گھر کی کیا تخصیص ہے جہاں بن پڑے وہاں ہی چلے جاؤ اور میری ہی عبادت کرو" دوسرے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔ یعنے جو لوگ ملائکہ ان کی جانیں قبض کرتے ہیں اور وہ ہجرت کے مقدمہ میں تقصیر وار تھے تو فرشتے ان سے کہتے ہیں تم کس کام میں تھے؟ اور کہتے ہیں کہ ہم ضعیف تھے بے بس ایک زمین میں پڑے تھے فرشتے کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی جو تم ہجرت کر لیتے سو ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے انجام کی"

اور سوا ان آیات کے اور بہت آیات میں ہجرت کا حکم ہے سو ہجرت کا حکم اسی اندیشہ سے ہوتا ہے کہ احکام دینی ظاہر نہیں ہو سکا کرتے بالجملہ عوام کو یہ بشرائط مذکورہ جائز ہی واجب نہیں، ورنہ ایسے ہی ہٹے کٹوں کو جو زمین میں لات ماریں تو پانی نکل آئے ہرگز اخفاء حق جائز نہیں، ان کو یہ لازم ہے کہ اگر وطن میں یا جہاں کہیں وہ ہوں اظہار حق نہ کر سکیں تو وطن چھوڑ کر چلے جائیں۔

اکراہ میں بھی اظہار حق افضل ہے۔

چنانچہ آیہ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ فقط اتنی ہی اجازت پر دلالت کرتی ہے کہ اپنا بچاؤ کر لو پر کفار سے موافقت اور دوستی مت کرو سو بچاؤ تو یوں بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی اس جگہ سے چل دے تسکین خاطر کے لئے معنے ساری آیت کے لکھے دیتا ہوں حاصل یہ ہے کہ مومن کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور ان سے موافقت اور صلح نہ رکھیں، مومنوں کو سوا خدا کے اور کسی کی موافقت اور دوستی نہیں چاہیے اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ کے حساب سے کسی شمار میں نہیں مگر ہاں یہ تمہیں اختیار ہے کہ کچھ اپنا بچاؤ کر لو اور پھر یہ ہے کہ اللہ اپنے آپ سے ڈراتے ہے اور پھر اللہ کی طرف سب کا ٹھکانا ہے" یعنی مجھ سے ڈرنا چاہیے کہ میری طرف آنا ہے کافروں سے کیا ڈرتے ہو؟ ان سے موافقت تو

جب کر لے جب ان کی طرف نہیں جانا ہوتا فقط ہاں اگر آدمی ان کے پنجوں میں پھنس جائے محبوس ہو یا مثل محبوسوں کے جیسے اندھے، اپاہج، لنگڑے لولے، لڑکے، بچے، عورتیں، بیمار اور پھر تس پر کفار زبردستی بھی کریں اور وہ زبردستی بھی ایسی ہو کہ عادت کے موافق اس کو اٹھا نہیں سکتا جیسے قید و قتل تو خیر اختیار ہے اگرچہ ثواب اس میں ہے کہ کھل کھیلے کیونکہ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ سے فقط اجازت ہی معلوم ہوتی ہے کہ اکراہ کی صورت میں فقط بظاہر موافقت کر لے۔ سو اکراہ اسے ہی کہتے ہیں جو مذکور ہوا لیکن ان آیات سے جو خدا کی راہ میں مارے جانے کے فضائل ان میں بیان ہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ثواب اظہار ہی میں ہے۔

سیدنا ابراہیم کے کسی واقعہ سے اخفاء دین ثابت نہیں

باقی حضرت ابراہیم کا جھوٹ بولنا کوئی زبان پر لائے تو کمال بے حیائی کی بات ہے انہوں نے بظاہر جھوٹ بولا حقیقت میں جھوٹ نہیں بولا قصہ ان کا معروض ہے معلوم ہو جائے گا۔ جب حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کو سمجھانا شروع کیا اور بت پرستی سے منع کیا اور بتوں کی ہجو کرنی شروع کر دی تو حضرت کے باپ ہی اول تو مخالف ہو گئے اور ان کا کہنا ماننا تو درکنار ان کو دھمکانا شروع کیا اس فکر میں تھے کہ کسی طرح ان کے بتوں کو توڑ دیجئے اتفاقاً کفار کی عید کا دن آ گیا لوگ ان کے پاس بھی آئے کہ چلو انہوں نے ستاروں کی طرف دیکھ کے یا کتاب (نجوم کی) دیکھ کے یوں فرمایا کہ میں بیمار ہونے والا ہوں کفار نے سمجھا کہ جیسے ہم نجوم کا اعتبار کرتے ہیں یہ بھی نجوم کو مانتے ہیں سو انہیں نجوم کی راہ سے کچھ یوں معلوم ہوا ہے کہ میں جاؤں گا تو بیمار ہو جاؤں گا اور یہاں حقیقت میں ستاروں کو یا کتاب کو برائے نام ہی دیکھا تھا، اور یہ جو کہا تھا کہ میں بیمار ہو جاؤں گا، یا تو کچھ آثار بیماری کے ہونگے، یا آدمی بیمار ہوا ہی کرتے ہیں اور یہاں سے کہا ہی نہ تھا کہ مجھے ستاروں کے حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ میں بیمار ہو جاؤں گا جو جھوٹ ہوتا ہاں وہ یہی سمجھ گئے کہ انہیں نجوم سے یہ بات معلوم ہوئی۔ جب وہ اپنی عید میں چلے گئے تو انہوں نے ان کے سب بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا پر ایک بڑے بت کو کچھ نہ کہا۔

آخر جب کفار ہٹ کر آئے تو انہیں خبر ہوئی انہیں ہی اپنے بتوں کا دشمن سمجھتے تھے

سو انہیں ہی پکڑا ان سے جو پوچھا تو انہوں نے استہزاء کے طور پر کہا کہ صاحب اس بڑے بت نے یہ کام کیا ہے سو یہ دوسرا جھوٹ ہے کہ جیسے کوئی دیوانہ بھی یوں نہ کہے کہ ایسا جھوٹ ہے جیسے ہم جھوٹ سمجھتے ہیں بلکہ ایسی بات ہمارے محاورہ میں بڑا سچ گنا جاتا ہے ان دونوں قصوں کو غور کیجئے اور پھر فرمائیے کہ یہ اخفاء حق ہے یا اظہار حق ہے اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اسی کام کی بدولت آگ میں ڈالے گئے خاص کر یوں کہنا کہ بڑے نے کیا ہے یہ جھوٹ کیا سچ سے بھی زیادہ اصلی مطلب پر دلالت کرتا ہے سب جانتے ہیں کہ یہ جواب کیا تھا ایک چڑانا تھا۔ ایسے میں تو ان کو غصہ نہ آتا تب آتا اور حقیقت میں چھپاتے تو دین کو اس وقت چھپاتے، سو چھپانا تو درکنار حضرت نے اول تو ان کو چڑایا اور پھر کیا کیا سوال جواب کئے کہ رستم کا حوصلہ نہیں جو ایسے وقت میں ایسی بات کہے اور اول دفعہ جو ان کو نجوم کی طرف دیکھ کر دھوکا دیا تو کچھ جان کا بچاؤ آپ کو مدنظر نہ تھا مال کا بچاؤ آپ کو مدنظر نہ تھا آبرو کا پاس آپ کو نہ تھا بلکہ اپنی جان کے کھونے کا شوق لگا تھا فقط مطلب اتنا تھا کہ یہ جائیں تو تنہائی میں ان کے بت ٹکڑے کیے جائیں۔ سو یہ کام کرنا جان پر کھیلنا تھا ہاں اس کے ساتھ یہ بھی ہو کہ رسوم کفار اور ان کی عبادت اور اشعار سے بھی یکسو رہیں بہرحال یہ جانبازی کا سامان تھا۔ اور جانبازی کو تقیہ کہنا ایسوں ہی کا کام ہے کہ جنکو دُم کی اور ناک کی تمیز نہ ہو۔

اخفائے علاقۂ زوجیت اخفائے دین نہیں ہے

بارے رہا تیسرا جھوٹ وہ یہ ہے کہ حضرت اپنی بیوی سارہ کو لئے ہوئے ہجرت کئے ہوئے جاتے تھے ایک بستی میں جا کر پہنچے جہاں کا حاکم بڑا ظالم اور نہایت زانی تھا اس کے شیطانی لشکر میں سے کسی نے حضرت سارہ کے حسن و جمال کی خبر کر دی اس مردود نے ان کو بلوا بھیجا تب حضرت ابراہیم نے بایں خیال کہ اگر اس مردود کو حضرت سارہ کا کچھ زیادہ خیال ہوا تو یوں سمجھ کر کہ خاوند کو سب سے زیادہ غیرت ہوتی ہے ایسا نہ ہو بیجا کریں مجھ کو مروا نہ ڈالے۔ جب حضرت سارہ کے لے جانے کو اس کے پیادہ آ گئے تو یوں فرمایا کہ اے سارہ اگر وہ ظالم تجھ سے پوچھے تو یوں کہنا کہ میں ابراہیم کی بہن ہوں کیونکہ ہم تو دونوں دینی بہن بھائی ہیں معہذا حضرت سارہ حضرت ابراہیم کے چچا کی بیٹی بھی تھیں تو یہ بھی حقیقت میں جھوٹ نہ تھا اور اگر بالفرض والتقدیر یہ کہنا جھوٹ ہی تھا تب دین کا اخفاء تو نہ تھا اگر اخفاء

تھا تو علاقہ زوجیت کا اخفاء تھا اور وہ بھی بایں غرض کہ یہ جان جو حق گوئی میں جانے کے لائق ہے ایسا نہ ہو کہ ایسے قصہ میں جائے اور خدا کی راہ میں جاں نثاری کا ارمان دل کا دل میں رہ جائے غرض اس جگہ جان کا بچانا بھی اسی لئے تھا کہ کل کو اظہار حق کروں اور خدا کے کام میں جان دوں، ایسے قصے میں نہ مروں۔ بالجملہ حضرت ابراہیم کے معاملات سے تقیہ کا ثبات کرنا کمال دانشمندی اور خوش فہمی پر دلالت کرتا ہے علی ہذا القیاس جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ہجرت کر جانا اور غار ثور میں چھپنا یہ سب کا سب اظہار حق کے باعث تھا، ورنہ ابوجہل اور کفار مکہ کی موافقت میں تو کچھ زیان ہی نہ تھا۔ اس کو تقیہ کہنا اس سے بھی بڑھ کر ہے ایسا تقیہ یہ بھی ہے کہ آدمی دشمن کے وار کو ڈھال سے روکتا ہے اگر بچاؤ کر لینے کے معنی تقیہ ہے تو یہ تو عین اظہار حق ہے کیونکہ بچاؤ کی تو جب ہی ضرورت پڑتی ہے کہ دوسرا کوئی در پئے ایذا ہو۔

بچاؤ اور تقیہ میں فرق عظیم ہے

اس مقام پر ہر کسی نے غالباً تقیہ شیعہ اور بچاؤ میں فرق سمجھ لیا ہوگا پر مزید توضیح کے لئے میں بھی کچھ عرض کئے دیتا ہوں تقیہ مصطلح شیعہ میں دشمن کے دل سے خیال ایذا ہی نکل جاتا ہے۔ کیونکہ تقیہ میں تو اپنے مذہب کا فقط بدل لینا اور اپنے آپ کو ہم مذہب دشمن بنا لینا ہوتا ہے سو چونکہ اختلاف مذہب میں دشمنی دینی کے باعث تقیہ کی ضرورت ہوتی ہے تو درصورت تبدیل مذہب دشمنی ہی نہ رہے گی بلکہ برعکس دوستی بن جائے گی اور بچاؤ کی صورت میں دشمنی اور بڑھ جاتی ہے اور خیال ایذا رسانی دوبالا ہو جاتا ہے کیونکہ آدمی کا قاعدہ ہے کہ جب تک دشمن اپنے قابو میں رہتا ہے اور ایسا موقع ہوتا ہے کہ اس کو ایذا دے سکیں۔ تو اس اول تو کچھ چنداں رشک نہیں ہوتا دوسرے یوں بے فکری ہوتی ہے کہ جب چاہیں گے اسے ذلیل و خوار کر دینگے تیسرے جب وہ کچھ اپنا بچاؤ کر لیتا ہے تو پھر اپنا بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ مبادا اب یہ ہم پر وار نہ کرے تو ان وجوہ سے اعداء کو خیال ایذا رسانی تا مقدور زیادہ ہوتا ہے۔ ایسے میں جو کچھ ان سے بن پڑا کرتا ہے دریغ نہیں کیا کرتے تو اس صورت میں مقربان الٰہی کو سخت مصیبت پیش آیا کرتی ہے بالجملہ یہ فرق لطیف یاد رکھنا چاہیئے کہ بہت کار آمد ہے۔

حضرت امیر (بزعم شیعہ) سنت احمدی و ابراہیمی و موسوی پر عمل پیرا نہ ہو سکے

جب یہ بات مقرر ہو چکی تو اب اہل انصاف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے احوال کو جو ہنگام قیام مکہ معظمہ اور اثنائے ہجرت میں پیش آئے حضرت امیر کے احوال سے جو بعد وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پیش آئے ملا کر دیکھیں اگر اصحاب کرام مرتد ہو گئے تھے تو بیشک حضرت امیر بھی بحکم متابعت پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ویسے ہی پیش آتے، جیسے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم ابوجہل اور امیہ بن خلف وغیرہم سے پیش آئے اور آپ پر بھی وہ سانحے گذرتے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر گذرے آخر کو ایک نہ ایک دن تو نوبت ہجرت پہونچتی اور سنت احمدی اور سنت ابراہیمی اور سنت موسوی کی تکمیل ہو جاتی لیکن شکایت تو یہ ہے کہ حضرت امیر نے کبھی منھ کھول کر ایک دفعہ بھی یوں نہ فرمایا کہ میں دین حق پر ہوں اور تم دین باطل پر اور اگر آپ نے اظہار حق کیا تو دو حال سے خالی نہیں کہ یا اصحاب نے آپکا فرمانا تسلیم کر لیا تب تو تقیہ کی کیا ضرورت اور ان پر کیا اعتراض ہے؟ بلکہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ عین موافق مرضی مرتضوی ہوا اور نہ مانا تو کیا سبب کہ ایسے دشمن کو کسی قسم کی ایذا نہ دی اور اگر یوں کہیئے کہ بسبب شجاعت مرتضوی یا امداد خداوندی کے وہ کچھ ایذا نہ پہنچا سکے تو اول تو یہ خلاف معقول رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کون سے حضرت امیر سے کم تھے جو آپ پر یہ آفتیں آئیں حاشا وکلا جو حضرت امیر نے کبھی تقیہ کیا ہو؟ اگر تقیہ کرتے تو مکہ معظمہ ہی میں کرتے اور کبھی کیا ہوتا تو امیر معاویہ کے ساتھ ضرور کر لیتے بہت ہوتا تو یہ ہوتا کہ قاتلان عثمان مارے جاتے وہ کون سے آپ کو ایسے عزیز تھے کہ جن کے پاس و لحاظ میں اتنے کچھ شور و فساد کے دین میں دروازہ ہوئے۔

حضرت سید الشہداء نے تو بے گناہوں کو اور وہ بے گناہ بھی کیسے کہ اپنے قوت بازو اور اپنے لخت جگر کو اس دین ہی کی بابت قتل کروایا اور اپنے آپ بھی جان بحق ہوئے اور زن و فرزند ننگ و ناموس کا بھی کچھ لحاظ نہ فرمایا حالانکہ یہ سب کشت و خون بظاہر لاحاصل تھا تیس ہزار آدمیوں کے مقابلہ میں اتنے آدمیوں اور اس بے سروسامانی پر کیا امید کامیابی تھی بخلاف حضرت امیر کے کہ وہ اگر قاتلان عثمان غنی کو امیر معاویہ کے حوالہ کر دیتے تو خلافت کی خلافت

بنی رہتی ایک باعث جو مسفد دین تھا اپنا مطیع و منقاد ہو جاتا دین کی ترقی ہوتی، اور پھر با اینہمہ کچھ بے جا بھی نہ تھا آخر قاتلان حضرت عثمان ظالم تھے مظلوم نہ تھے اور نہ سہی ہمراہیان امام الشہداء کے برابر تو بے گناہ بھی نہ تھے۔ حق یوں ہے کہ یہ سب تہمت اخفاء حق اور عیب نامردہ پن ان حضرات شیعہ کا لگایا ہوا ہے سبحانک ہٰذا بھتان عظیم۔

دوران خلافت میں بھی امیر پر تقیہ واجب تھا

اور طرفہ تر شیعوں کا گوز شتر اور سنئے سید مرتضٰی جو بڑے محقق مذہب شیعہ ہیں وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ حضرت امیر پر اپنی خلافت اور حکومت کے زمانے میں بھی تقیہ باقی تھا، الٰہی یہ تقیہ نہ ہوا ایک جان کا وبال ہوا کسی راہ حضرت امیر کا پیچھا چھوٹتا ہی نہیں مگر کوئی ان سے پوچھے کہ اگر اس وقت بھی تقیہ ان پر واجب تھا تو امیر معاویہ کو کیوں معزول کیا۔ حضرت تو پہلے سے ان سے ڈریں تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ اس شخص کا مکر بہت بڑا ہے حالانکہ مغیرہ بن شعبہ اور عبداللہ بن عباس کی صلاح بھی یہی تھی کہ ابھی معزول نہ فرمایئے بعد استقامت معزول فرمایئے گا مگر آپ نے نہ مانا اور یہ نہ ماننا آخر کو موجب کیا کیا خرابیوں کا ہوا یہ سب شیعوں ہی کی کتابوں میں ہے۔

سید مرتضٰی صاحب کی دلیل سنئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ خلافت مرتضوی برائے نام تھی امیر معاویہ ہمیشہ ان سے لڑتے رہے معہذا آپ کی فوج اور آپ کے ساتھی اکثر اولاد صحابہ تھے جو آپ کے دشمن جان گذرے ہیں اور ان کے دل میں خلیفہ اوّل اور ثانی کا عدل اور فضل جما ہوا تھا اگر حضرت امیر اس وقت کما ینبغی اظہار حق کرتے تو بہت دشواری ہو جاتی گمان غالب تھا کہ فوج بھی بھر جاتی اس سبب سے عالم خلافت میں بھی ان پر تقیہ واجب تھا اور اظہارِ حق حرام۔

اس اعتقاد میں ہر چند سید مرتضٰی نے تمام امامیوں کا خلاف کیا ہے کیونکہ وہ سب اس بات کے قائل ہیں کہ قبل خلافت آپ پر تقیہ واجب تھا اور بعد خلافت آپ پر بھی حرام تھا۔ لیکن بزعم خود بڑی دوراندیشی اور کمال چالاکی کری تھی پر خدا نے چلنے نہ دی۔

خلافت امیر میں تقیہ کے بہتان کا پس منظر

انہوں نے اپنے عندیہ میں اس کا بچاؤ کیا تھا۔ کہ مبادا کوئی سنی حضرت کے ایام خلافت کے خطبوں اور ملفوظات کو جن میں اصحاب کرام خصوصًا

خلیفہ اول اور خلیفہ ثانی کی تعریف ہے دیکھ کر ناک میں دم کر دے یا یہ گرفت کر بیٹھے کہ دین شیعہ حق ہے تو حضرت امیر کی خلافت تو سب میں اخیر تھی آپ نے کیوں نہ اس کو شائع ذائع کیا اگر آپ دین شیعہ کو رواج دیتے اور اسے مشہور کرتے تو روئے زمین میں یہی دین ہوتا اور سنیوں کا دین نیست و نابود ہو جاتا۔ جیسے ابوبکر اور عمر نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دین کو تمہارے گمان کے موافق نیست و نابود کر دیا اور اپنا ساختہ پرداختہ مروج کر دیا اور آپ کے بعد کسی نے دین کے باب میں چنداں کنج کاوی نہیں کی سو آپ ہی کا دین باقی رہنا چاہیئے تھا القصہ حضرت امیر آخر میں خلیفہ ہوئے تھے یہ بات دین کی ترقی کے لئے ایسی مفید ہوئی تھی کہ در صورت برعکسی ترتیب کے ہرگز متصور نہیں پھر کیا سبب کہ دین اہل سنت و جماعت ہی مشہور رہا اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بھی دین اہل سنت ہی پسند تھا۔ الغرض اس اندیشہ سے سید مرتضٰی صاحب نے یہ چکر کھایا اور یہ ملٹے لئے تھے

حضرت امیر وسائل رکھتے ہوئے بھی اظہار دین نہ کرسکے

لیکن یہ نہ سوجھی کہ خلافت اور ولایت اسے کہتے ہیں کہ ملک میں تصرف ہو حکم احکام چلتے ہوں محصول اور خراج رعیت سے وصول کر سکے چور قزاق کو سزا دے سکے سو یہ بات سوا شام کے اور کون سے ملک میں حاصل نہ تھی خصوصًا حجاز اور عمان اور حرمین اور بحرین اور عراقین اور آذربائیجان اور فارس اور خراسان میں بے کھٹکے آپ کی حکومت تھی پھر یہ تھوڑی سلطنت تھی؟ امیر معاویہ کے پاس تو اتنا ملک تھا بھی نہیں وہ اپنے ملک میں جو حکم چاہتے تھے جاری کرتے تھے ادھر ابوبکر صدیق کو دیکھو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فقط ملک عرب میں حکومت چھوڑ کر اس عالم سے تشریف لے گئے تھے اور پھر بھی چار طرف معاندین زور پر تھے مسیلمہ کذاب اور بنو حنیفہ ملک یمامہ میں ایک طرف اور سجاح متنبیہ بنی تمیم میں کہ ان سے بڑھ کر عرب میں کوئی قبیلہ ہی نہ تھا جدا ہی برسر پرخاش، منکرین زکوۃ اپنی ہی طرف کو کھینچ رہے تھے بنو عسفان جامہ سے باہر جدا نکلے جاتے تھے ادھر گرد و نواح مدینہ کے مرتدین کا جدا زور شور تھا آپ کے ساتھی گنے چنے مکہ مدینہ والے ہی تھے اور پھر با اینہمہ کسی بات میں کسی سے نہ دبے، اور کسی حکم میں مداہنت نہ کی اگر زکوۃ نہ دینے والوں کو ان کے طور پر راضی کر دیتے اور اوروں کو ان کے طور

پر تو کچھ مشقت نہ ہوتی۔

صدیق نے بے سروسامانی میں اظہار حق کیا

ابوبکر صدیق باوجود اس قلت سامان اور عدم شجاعت کے اتنے دشمنوں سے بھی نہ گھبرائے۔ حالانکہ اکثر ان کے دشمن لڑائی کے مشاق تھے اور بعضے بعضے تو چھوٹے سے بادشاہ تھے۔ اور حضرت علی با اینہمہ شجاعت وکرامت اور زور وقدرت اور شوکت اور سلطنت اور امامت وولایت کہ ابوبکر کو ایک بھی ان اوصاف جزیلہ میں سے نصیب نہ تھا اظہار حق میں (اور بھی کسی امر میں نہیں) اتنی سستی فرمائیں؟ اگر ابوبکر صدیق کو یہ اوصاف کہیں سے مل جاتے پھر کافر نام کو بھی پھونس کا آدمی بھی دنیا میں رہتا تو ہمارا ذمہ تھا باقی یہ کہنا کہ آپ کی فوج اکثر اولاد صحابہ تھی اگر کوئی سنی کہتا تو زیب بھی دیتا، سید مرتضیٰ صاحب کس منھ سے کہتے ہیں قاضی نور اللہ صاحب کی نہیں سنتے وہ کیا فرماتے ہیں کہ حضرت علی کے ساتھ قریش میں سے کل پانچ ہی آدمی تھے باقی تیرہ قبیلہ معاویہ کے ساتھ اس لئے آپ کو فتح میسر نہ ہوئی۔ بالجملہ شیعوں کے اقرار سے آپ کے ہمراہی کوفیان جاں نثار تھے جو مقتدایان شیعہ ہیں اگر وہ نہ ہوتے اور صحابہ کی اولاد ہی ہوتی تو جیسے ان کو عدل اور فضل شیخین کا دیکھے بھالے اعتقاد تھا اور اس کے باعث ان کی راہ روش پسندیدہ تھی ایسے ہی اپنے ماں باپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بھی سنے سنائے یاد تھا۔

معہذا اگر پھر جاتے تو کیا تھا آخر دین مرتضوی میں وہ وہ آسائشیں اور سہولتیں ہیں کہ منکر بھی معتقد ہو جاتے۔ متعہ کا آوازہ سن کر امیر معاویہ کے ہمراہی بھی ہمراہ ہو جاتے بلکہ جس اہل مذہب کے کان میں یہ بشارت پہنچتی کہ جیتے جی یہ مزے ہیں اور مر کر یہ مرتبے۔ کیسے ہی دین کے پکے کیوں نہ ہوتے حضرت امیر کی ہمرکابی اختیار کرتے علاوہ بریں غسل رجلین کی تخفیف تراویح سے بے کھٹکے ایسا دین اور ایسا ایمان تو قسمت ہی سے ملتا ہے اگر اظہار دین خود کرتے تو تمام ملک عرب اور طوائف عجم ممد ومعاون ہوتے سبحان اللہ سنیوں سے مقابلہ اور پھر یہ سامان، اتنا ہی سوچا ہوتا کہ ابتداء سے لے کر آخر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ممد ومعاون وہی لوگ تھے جو آپ کے دشمنان جانی کے بھائی

برادر یا اولاد تھے خالد بن الولید، عکرمہ بن ابی جہل بلکہ خود حضرت عمر کہ ابوجہل کے بھانجے اور ابوبکر صدیق ابو قحافہ کے بیٹے، حضرت عثمان ابو سفیان کے قرابتی علیٰ ہذا القیاس اور لوگ ایسے ہی تھے۔

مقربان الٰہی کا طریقہ اظہار حق کرنا اور جفائیں اٹھانا ہے

اب بس کیجئے اور ایک دو آیت لکھ دیجئے جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ مقربان الٰہی کا کام ہمیشہ سے ستم کشی اعداء دین رہا ہے۔ اور مدام اچھے لوگوں نے ان کے ہاتھ سے ایذائیں اٹھائی ہیں، اور خداوند کریم کو دین کے مقدمہ میں سختی اور پختگی پسندیدہ ہے نہ کہ سستی اور مداہنت اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیَاتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیِّیْنَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّالَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ یعنے جو لوگ انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو جو حق بات کہتے ہیں ان کو سخت عذاب کی بشارت سنا دے "، اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء اور اچھے لوگ تقیہ نہیں کیا کرتے بلکہ حق گوئی میں دریغ نہیں کرتے اور اسی سبب سے ان کو قتل کر دیتے تھے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔ یعنی اے ایمان والو جو تم میں سے مرتد ہو جائے گا تو بلا سے اللہ اور ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے خدا کو محبت ہوگی اور خدا سے ان کو محبت ہوگی مومنوں کے سامنے تو ذلیل نظر آئیں گے اور کافروں کے سامنے بڑے سخت ہوں گے خدا کی راہ میں جہاد کرینگے۔ اور کسی کے بھلا برا کہنے سے نہ ڈریں گے "، اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے محب ومحبوب وہی لوگ ہیں جو کافروں کے سامنے دب کر نہ رہیں اور ان کی خوشامد نہ کریں۔ بلکہ ان سے کھچے ہی رہیں اور کسی کی ملامت سے نہ ڈریں اب فرمائیے کہ تقیہ میں سوا کفار کی خوشامد اور ان کی موافقت اور اندیشہ ملامت کے اور کیا ہوتا ہے؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تقیہ محبوبوں اور محبوں کا کام نہیں بلکہ دشمنان

خدا اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا کام ہے۔

تقیہ عرف اور دستور کی کسوٹی پر

اب الحمد للہ کہ عاقلان منصف کے لئے خوبی تقیہ عقل ونقل سے خوب واضح ہو گئی مناسب وقت یوں ہے کہ عرف اور دستور خلائق پر بھی اس کو منطبق کر کے کچھ اس کی بزرگی بتلا دیجئے۔ جملہ آفاق میں پسندیدہ خلائق پختگی اور استقامت ہے اور تلون کو سب لوگ ناپسند کرتے ہیں۔ خاص کر دین کے مقدمات میں اور وہ بھی پھر اتنا کہ ایک دفعہ شور اشوری اور پھر بالکل بے نمکی، سو پیغمبران دین اور ائمہ ہدیٰ اگر ایک دفعہ احکام دین سنا کر پھر خوف جان یا خوف آبرو سے ہم کاسہ کفار ہو جائیں تو سب کے نزدیک یہ ذہن نشین ہو جائے کہ یہ لوگ خام طمع دنیا طلب ہیں۔ پھر وہ معجزات کا عطا ہونا جو محض حسن اعتقاد خلائق کے لئے ہے سب رائیگاں ہو جائے اور جو لوگ کہ آمادۂ ہدایت ہوں، وہ منحرف ہو جائیں اور جو راہ پر آ لئے ہوں وہ اس حب جاہ کو دیکھ کر بے اعتقاد ہو کر پلٹ جائیں۔ بلکہ ایسے لوگوں کو سخت دنیا دار سمجھیں۔ معہذا ظاہر ہے کہ نصیحت کی تاثیر کے لئے خود عمل کرنا رکن اعظم ہے۔ جب تقیہ ہوا تو عمل کجا؟ تو لاجرم اس صورت میں ہدایت کی کوئی صورت نہیں۔

بالجملہ تقیہ کے بطلان پر عقل اور نقل اور عرف تینوں متفق ہیں پر جس کی چشم انصاف کور ہو اس کو کیا نظر آئے؟ اور نقل مشہور ہے بلکہ حدیث شریف ہے حُبُّكَ الشَّیْءَ یُعْمِیْ وَیُصِمّ یعنے تجھے اگر کسی چیز سے محبت ہو جائے تو اس کے عیوب اور نقصانات کے دیکھنے سننے میں وہ محبت تجھ کو اندھا بنا دیتی ہے اگر محبت مذہب دل سے ایک طرف کر کے ان تقریروں اور اثبات تقیہ کی تقریروں کو موازنہ کریں تو انشاء اللہ مولوی عمار علی صاحب بھی توبہ کر اٹھیں میر نادر علی کو تو شیعہ کیا بنائیں؟ اور اب ہم کو اسکی ضرورت نہیں رہی کہ بعد اس کے بھی کچھ بیان کریں لیکن اتمام حجت کے لئے اتنا اور معروض خدمت علماء شیعہ ہے کہ اگر بالفرض والتقدیر فرض محال تقیہ ثابت بھی ہو جائے، تو موافق جمہور شیعہ حضرت امیر پر ہنگام خلافت تقیہ حرام تھا پھر تعریف صحابہ کو تقیہ پر کیوں محمول کیا جائے؟

حضرت ابوبکر صدیق کو صدیق نہ کہنے والے کے لئے حضرت جعفر کی بددعا،

اور سلمنا کہ ہنگام خلافت بھی ان پر تقیہ فرض تھا تو قطع نظر اس کے کہ یہ تعصب ہی تعصب ہے اور اس قول کے قائل نے عقل کی بھی ناک کتر لی ہے اس میں کیا عذر کریں گے کہ حضرت امام باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعریف کرتے ہیں حالانکہ موافق مذہب شیعہ وہ خدا کی طرف سے تقیہ کرنے سے ممنوع تھے اور تقیہ ان پر حرام تھا۔ علی بن عیسٰے اردبیلی امامی اثنا عشری اپنی کتاب کشف الغمہ عن معرفت الائمہ میں نقل کرتے ہیں۔

سُئِلَ الْاِمَامُ اَبُوْ جَعْفَرٍ عَنْ حِلْیَةِ السَّیْفِ هَلْ یَجُوْزُ فَقَالَ نَعَمْ قَدْ حَلّٰی اَبُوْبَکْرِ الصِّدِّیْقُ سَیْفَهٗ فَقَالَ الرَّاوِیُ اَلْقَوْلُ هٰکَذَا فَوَثَبَ الْاِمَامُ عَنْ مَکَانِهٖ فَقَالَ نَعَمْ الصِّدِّیْقُ نَعَمْ الصِّدِّیْقُ نَعَمْ الصِّدِّیْقُ فَمَنْ لَّمْ یَقُلْ لَهُ الصِّدِّیْقُ فَلَا صَدَّقَ اللّٰهُ قَوْلَهٗ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ۔

یعنے حضرت امام ابو جعفر یعنے امام محمد باقر رضی اللہ عنہ وعن آبائہ الکرام سے کسی نے پوچھا کہ تلوار کے قبضہ پر چاندی سونے کا کچھ نقش ونگار یا بوٹے وغیرہ بھی درست ہیں۔ یا نہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں درست ہے اس لئے کہ ابوبکر صدیق نے اپنی تلوار پر چاندی کا جھول کرایا تھا راوی نے کہا کیا آپ ابوبکر صدیق فرماتے ہیں۔ آپ غصہ میں اپنی جگہ سے اچک بیٹھے اور فرمانے لگے ہاں صدیق، ہاں صدیق، ہاں صدیق، جو انہیں صدیق نہ کہے اللہ اس کی بات کو دنیا اور آخرت میں سچی مت کیجیو فقط۔ اب گوش گذار اہل انصاف یہ ہے کہ سب امامیہ اس بات پر متفق ہیں کہ علی بن عیسی اردبیلی علم وفضل میں یکتا اور نقل اور روایت میں بڑے معتمد علیہ ہیں انکی روایت پر کوئی سقم نہیں پکڑ سکتا،

امام جعفر پر تقیہ حرام تھا

باقی رہی یہ بات کہ حضرت امام محمد باقر پر تقیہ کے حرام ہونے کی کیا دلیل ہے؟ سو یہ وجہ معقول اس کا جواب بھی ہم سے معقول ہی سنئے۔ کلینی میں روایت ہے

عَنْ مُعَاذِ بْنِ کَثِیْرٍ عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَ

جَلَّ اَنْزَلَ عَلٰی نَبِیِّہٖ کِتَابًا فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ ہٰذِہٖ وَصِیَّتُکَ اِلَی النُّجَبَاءِ فَقَالَ وَمَنِ النُّجَبَاءُ یَا جِبْرِیْلُ فَقَالَ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ وَوُلْدُہٗ وَکَانَ عَلَی الْکِتَابِ خَوَاتِیْمُ مِنْ ذَھَبٍ فَدَفَعَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی عَلِیٍّ وَاَمَرَہٗ اَنْ یَّفُکَّ خَاتِمًا مِنْہُ فَیَعْمَلُ بِمَا فِیْہِ ثُمَّ دَفَعَہٗ اِلَی الْحَسَنِ فَفَکَّ عَنْہُ خَاتِمًا فَعَمِلَ بِمَا فِیْہِ ثُمَّ دَفَعَہٗ اِلَی الْحُسَیْنِ فَفَکَّ خَاتِمًا فَوَجَدَ فِیْہِ اُخْرُجْ بِقَوْمٍ اِلَی الشَّہَادَۃِ فَلَا شَہَادَۃَ لَہُمْ اِلَّا مَعَکَ وَاشْتَرِ نَفْسَکَ لِلّٰہِ فَفَعَلَ ثُمَّ دَفَعَہٗ اِلٰی عَلِیِّ بْنِ الْحُسَیْنِ فَفَکَّ خَاتِمًا فَوَجَدَ فِیْہِ اَنْ اَطْرِقْ وَاصْمُتْ وَالْزَمْ مَنْزِلَکَ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ فَفَعَلَ ثُمَّ دَفَعَہٗ اِلَی ابْنِہٖ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِیِّ بْنِ الْحُسَیْنِ عَلَیْہِ السَّلَامُ فَفَکَّ خَاتِمًا فَوَجَدَ فِیْہِ حَدِّثِ النَّاسَ وَاَفْتِہِمْ وَانْشُرْ عُلُوْمَ اَہْلِ بَیْتِکَ وَصَدِّقْ اٰبَاءَکَ الصَّالِحِیْنَ وَلَا تَخَافَنَّ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ فَاِنَّہٗ لَا سَبِیْلَ لِاَحَدٍ عَلَیْکَ ثُمَّ دَفَعَہٗ اِلٰی جَعْفَرِ الصَّادِقِ فَفَکَّ خَاتِمًا فَوَجَدَ فِیْہِ حَدِّثِ النَّاسَ وَاَفْتِہِمْ وَلَا تَخَافَنَّ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ وَانْشُرْ عُلُوْمَ اَہْلِ بَیْتِکَ وَصَدِّقْ اٰبَاءَکَ الصَّالِحِیْنَ فَاِنَّکَ فِیْ حِرْزٍ وَاَمَانٍ فَفَعَلَ ثُمَّ دَفَعَہٗ اِلَی ابْنِہٖ مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ وَکَذٰلِکَ اِلٰی قِیَامِ الْمَہْدِیِّ وَرَوَاہُ مِنْ طَرِیْقٍ اٰخَرَ عَنْ مُعَاذِ بْنِ کَثِیْرٍ اَیْضًا عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ وَفِیْہِ فِی الْخَاتِمِ الْخَامِسِ وَقُلِ الْحَقَّ فِی الْاَمْنِ وَالْخَوْفِ وَلَا تَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ انتہیٰ۔

حاصل روایت کا یہ ہے کہ کلینی میں معاذ بن کثیر سے روایت ہے وہ حضرت امام محمد باقر سے روایت کرتے ہیں کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے نازل کی اپنے نبی پر ایک کتاب اور فرمایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ تیری وصیت ہے نجبا کو، آپ نے فرمایا جبریل نجبا کون ہیں؟

جبریل نے کہا علی بن ابی طالب اور ان کی اولاد، اور اس کتاب پر سونے کی مہریں لگی ہوئی تھیں (یعنی جیسے خطوں پر لکھ لکھ کر مہر لگا دیتے ہیں ایسے ہی اس خط پر لاکھ کی جگہ سونے کی مہریں لگی ہوئی تھیں) سو حضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے اس وصیت نامہ کو حضرت علی کو دیا اور یہ فرمایا کہ ایک مہر کو توڑیں اور جو اس کے نیچے سے نکلے اس پر عمل کریں، پھر انہوں نے حضرت امام حسن کو دیا انہوں نے بھی ایک مہر توڑ کر اس کے نیچے جو کچھ نکلا اس پر عمل کیا، پھر انہوں نے حضرت سید الشہدا، امام حسین رضی اللہ عنہ کو دیا انہوں نے مہر توڑی تو اس کے نیچے سے یہ نکلا کہ ایک قوم کو شہادت کی طرف لے جا۔ اس لئے کہ ان کی شہادت تیرے ہی ساتھ ہے' اور اپنی جان کو اللہ کے واسطے خرید لے، سو انہوں نے ویسا ہی کیا بعد اس کے انہوں نے حضرت امام زین العابدین کو وہ وصیت نامہ دیا، انہوں نے مہر کو توڑا تو اس میں نکلا کہ سر جھکا کر بیٹھ رہ' اور اپنے گھر ہی میں رہ، اور اپنے رب کی عبادت کئے جا یہاں تک کہ موت آجائے' سو انہوں نے ویسا ہی کیا، پھر انہوں نے وہ وصیت نامہ اپنے بیٹے امام محمد باقر کو دیا انہوں نے جو مہر کو توڑا اس میں یہ پایا کہ لوگوں سے حدیثیں بیان کر اور فتوے دے اور اپنے اہل بیت کے علوم کو پھیلا، اور اپنے آباد اجداد صلحا کو سچا کر اور سوا خدا کے کسی کے کسی سے مت ڈر' اس لئے کہ کوئی تجھ پر قادر نہ ہو سکے گا، پھر انہوں نے اپنے بیٹے امام جعفر صادق علیہ السلام کو وہ وصیت حوالہ کی' انہوں نے جو مہر توڑی تو اس میں بھی یہ پایا کہ حدیثیں بیان کر لوگوں سے' اور فتوے دے اور کسی سے سوائے خدا کے مت ڈر اور اپنے اہل بیت کے علوم کو پھیلا' اور اپنے آبا و اجداد صالحین کی تصدیق کر اس لئے کہ تو خدا کے حفظ و امان میں ہے۔ سو انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ پھر انہوں نے اپنے بیٹے امام موسے علیہ السلام کو وہ وصیت دی اور اسی طرح حضرت امام مہدی تک ہوتا چلا گیا۔

اور دوسری سند سے کلینی ہی معاذ بن کثیر مذکور کے واسطے سے امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے اور اس روایت میں پانچویں مہر میں یعنی حضرت امام باقر کی نوبت میں اتنا اور بھی ہے اور کہتا رہ حق بات امن میں اور خوف میں اور سوا خدا کے

کسی سے مت ڈر فقط اس روایت میں غور فرمائیے کہ حضرت امام محمد باقر کو کس تاکید سے تقیہ کی ممانعت ہے، پھر بھی حضرت امام محمد باقر رح جن کو یہ وصیت تھی کہ حق کے سوا کبھی کچھ اور مت کہیو حضرت ابوبکر صدیق کی اتنی کچھ تعریف فرماتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی مرتبہ بجز نبوت کے نہیں اس لئے کہ بعد انبیاء کے کلام اللہ میں صدیقین ہی کو ذکر فرماتے ہیں اور پھر تعریف بھی اس تاکید سے کہ بددعا فرماتے ہیں ان لوگوں کے حق میں جو انہیں صدیق نہ کہیں اور برا کہنے کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔

امام جعفر کی بددعا سے حقانیت اہل سنت اور بطلان مذہب شیعہ ظاہر ہو گیا

ہمیں اس روایت سے فقط یہی فائدہ نہیں ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیق کا صدیق ہونا بے غل و غش ثابت ہو گیا اور کسی کو تقیہ کے احتمال کی گنجائش نہ رہی، بلکہ شیعوں کے مذہب کا بطلان اور سنیوں کے مذہب کی حقانیت بھی بہ تحقیق معلوم ہو گئی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضرات شیعہ قاطبۃً خواہ امامیہ خواہ غیر امامیہ خواہ اثنا عشریہ خواہ غیر اثنا عشریہ اس بددعا کے اندر داخل ہیں جو حضرت امام معصوم مستجاب الدعوات امام محمد باقر کی زبان مبارک سے صادر ہوئی ہم کو تو ہم کو شیعوں کو بھی اس کے قبول ہونے میں تامل نہیں سو اس سبب سے ہم کو بالیقین معلوم ہو گیا کہ ان کے دعوے محبت اہل بیت اور دعوے اسلام اور دعوے ایمان سب خداوند کریم کے نزدیک جھوٹا ہے اور آخرت میں بھی خداوند کریم ان کی تکذیب فرمائے گا سو اس سے زیادہ اور کونسا مرتبہ باطل ہونے کا ہو گا دوسرے حضرت علیؓ نے جو کیا سب حسب فرمان الٰہی اور موافق وصیت پیغمبری تھا حضرت ابوبکر صدیق رض اور حضرت عمر رض اور حضرت عثمان رض سے جو بیعت کی، علیٰ ہذا القیاس حضرت امام حسن نے جو خلافت امیر معاویہ کے حوالہ فرمائی سب حسب ارشاد خداوندی اور ارشاد پیغمبری تھا بوجہ تقیہ نہ تھا اور جب ابوبکر صدیق رض اور حضرت عمر فاروق رض اور حضرت عثمان ذوالنورین سے حضرت علی نے بیعت موافق ارشاد خداوندی کی تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ قابل اسی کے تھے، علیٰ ہذا القیاس دختر مطہرہ حضرت ام کلثوم کا نکاح جو حضرت عمر سے ہوا تو وہ نکاح بھی خدا کے حکم کے موافق ہونے میں حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے نکاح سے کچھ کم نہیں، جیسے ان کا نکاح حضرت علی

رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موافق ارشاد خداوندی ہوا تھا ویسے ہی حضرت ام کلثوم کا نکاح بھی حضرت عمر رض سے حسب فرمان الٰہی تھا۔ وھو المراد الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ سب حیلہ و حجت امامیہ کا جواب دندان شکن بن پڑا یہ اسی خداوند نعمت کا کرم ہے، حق کو حق کر دکھایا اور باطل کو باطل۔

امام جعفر پر ایک اعتراض جو خودکشی کی نوعیت رکھتا ہے

مگر ہاں اتنا کھٹکا باقی ہے کہ شاید فرقہ امامیہ اہل سنت کی ضد میں اگر یہ حجت کریں کہ واقعی کلام اللہ اور اقوال عترت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سنیوں کے برحق ہونے اور شیعوں کے باطل پر ہونے کے دو گواہ عادل ہیں کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَحَدُھُمَا اَعْظَمُ مِنَ الْاٰخَرِ کِتَابُ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلُ بَیْتِیْ۔ یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تم میں دو چیزیں بھاری چھوڑے جاتا ہوں جب تک تم ان دونوں کو پکڑے رہو گے گمراہ نہ ہو گے، ایک ان میں دوسرے سے بڑا ہے وہ دونوں کیا ہیں ایک تو کلام اللہ دوسرے میرے اہلبیت فقط،،۔ اور اس حدیث کو سنی شیعہ دونوں فریق بالاتفاق برسر و چشم رکھتے ہیں۔ اور اس کے حدیث ہونے کے قائل ہیں القصہ شیعہ اب اگر تین پانچ کریں تو یوں کریں کہ موافق حدیث مسطور کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلے اللہ علیہ السلام سنیوں کے برحق ہونے اور شیعوں کے باطل پر ہونے کے دو گواہ عادل بہت ہیں لیکن اس بات کو کیا کیجئے کہ اقوال عترت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو ہم تلک پہنچے ہیں تو وہ سب کے سب امام معصوم مستجاب الدعوات اعنی امام محمد باقر علیہ السلام کی بددعا میں کہ جس کا ابھی مذکور ہوا داخل ہیں کیونکہ ہمارے سارے پیشوا، ابوبکر صدّیق کے صدّیق ہونے کے منکر ہیں ان سب کا قول ہر چہ بادا باد قابل تسلیم نہ رہا کیونکہ بددعا تو یہی ہے کہ خدا ان لوگوں کی بات سچی نہ کرے پھر جب ان کی بات ہی سچی نہ ہوئی تو ان کی روایات کا کیا اعتبار؟

معہذا اکثر پیشوایان مذہب شیعہ اور راویان اخبار صحیحہ مذہب مذکور کافر مطلق اور بے دین محض تھے کہ فتویٰ شیعہ بھی ان کے حق میں بجز تکفیر اور نہیں

ہو سکتا۔ چنانچہ بعض بعض کا احوال کچھ اوپر آیت محمد رسول اللہ الآیت کے ترجمہ اور متعلقات میں گذر چکا اور اوروں کا حال کچھ نہ پوچھئے کہ پردہ ہی میں بہتر ہے۔ زرارۃ بن اعین کے باب میں تو امام جعفر صادق نے اس بات کی گواہی دی کہ وہ اہل نار سے ہے چنانچہ کتب معتبرہ میں ابن سمان سے موجود ہے اور قاضی نور اللہ صاحب قم فرماتے ہیں کہ زرارہ بن اعین کے چار بھائی حمران، عبد الملک، بکیر، عبد الرحمٰن اور زرارہ کے دو بیٹے حسن حسین اور بھتیجے یعنے چاروں بھائیوں کے بیٹے حمزہ محمد خریش عبد اللہ جہم عبد المجید عبد الاعلیٰ عمر سب کے سب زرارہ بن اعین کا سا عقیدہ رکھتے تھے یعنی مثل زرارہ، سب اس بات کے قائل تھے کہ خداوند کریم ازل میں جاہل تھا نعوذ باللہ منہا تو اس صورت میں کُنَّا بِکُلِّ شَیْئٍ عَالِمِیْنَ کے مضمون کے منکر تھے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ کلام اللہ کا منکر کون ہوتا ہے۔

علیٰ ہٰذا القیاس اوروں کو سمجھئے یہ تو بڑے مقتداؤں اور بڑے حاملان اخبار کا ذکر ہے اور ضعفاء اور مجاہیل کا کچھ حساب ہی نہیں پھر ہم اپنی روایات کا کس طرح اعتبار کریں اس صورت میں ایک گواہ کی گواہی تو ہمارے نزدیک مسلم یعنے کلام اللہ کا فرمانا تو خیر جبراً کرہاً بر سر کیونکہ ہر قرن میں تبواتر منقول ہوتا رہا ہے پر دوسرے گواہ کی گواہی یعنی اہلبیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی جب قابل اعتبار ہو کہ وہ بھی ایسی ہی طرح منقول ہوا اور یہ بھی نہیں تو سند ایسی تو ہو کہ اس کے راوی دیندار مومن ہوں کافر تو نہ ہوں سو چونکہ ہماری روایات کے ایسے راوی نہیں اور سنیوں کا ہمیں پہلے سے اعتبار نہیں تو فقط ایک گواہ باقی رہ گیا اور شریعت میں ایک گواہ کا اعتبار نہیں اس لئے ہم صحابہ کے معتقد نہیں ہو سکتے گو اس میں ہمارے مذہب کی ہی بیخ و بنیاد اکھڑ جائے اور سب کو یہ معلوم ہو جائے کہ شیعوں کے دین اور روایات کا یہ حال ہے ؎

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی ٭ گو مشت خاک ما ہم برباد رفتہ باشد

سو اس کا جواب ہمارے پاس ہر چند بوجہ عقل بہت کچھ ہے لیکن اب بھی [illegible] کہ یوں کہا جائے کہ اگر تم ہماری ضد میں اپنے مذہب سے بھی دست بردار ہوئے تو صاحب ہم

مارے تم جیتے۔ خیر اب بفضلہ تعالیٰ یہ بات ثابت ہو گئی کہ بشہادت ثقلین یعنی کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مذہب شیعہ غلط ہے اور یہی فقط مقصود تھا تو اب مناسب یوں ہے کہ بقدر مناسب اور باندازہ فرصت مولوی عمار علی صاحب کے خط کی بھی خبر لیجئے مگر مناسب یوں ہے کہ اول اس خط کو لفظاً لفظاً نقل کیجئے تاکہ ناظرین جواب کو لذت کامل نصیب ہو اس لئے اول وہ خط ہی پیش نظر کرتا ہوں وہ خط یہ ہے

نقل خط مولوی عمار علی

میر صاحب مظہر عنایت و کرم مجمع محامد شیم زاد فضلہ و کرمہ بعد سلام کے واضح خدمت عالی ہووے کہ عنایت نامہ تمہارا پہنچا جو کچھ آپ نے لکھا تھا معلوم ہوا آپ نے لکھا تھا کہ مجھے صحت علماء شیعہ سے فدک کے غصب ہونے میں نہیں ہوتی صورت اس کی یہ ہے کہ آپ کی ملاقات کسی عالم واقف اور خبردار سے آج تک حاصل نہیں ہوئی اگر مجھ سے آپ کی ملاقات ہووے اور میری زبانی آپ سنیں تو آپ پر واضح ہو جاوے کہ اہل سنت بالکل غلطی پر ہیں اور ہٹ دھرمی کرتے ہیں اور بحث پر لینا لیتے ہیں اور تین سوال جو آپ نے عبد الحق کی طرف سے لکھے تھے ان کا جواب مختصر یہ ہے کہ سوال اول میں آپ نے لکھا تھا کہ رسول خدا کی بیٹیوں کا نکاح کس سے ہوا یہ سوال بے محل ہے، اس واسطے کہ جناب رسول خدا کے نطفہ سے ایک بیٹی تھی فاطمہ زہرا سو وہ حضرت علی سے منسوب تھی اور دو بیٹیاں جو اور آنحضرت کی اہلسنت مشہور کرتے ہیں وہ دونوں حضرت کے نطفہ سے نہ تھیں بلکہ وہ حضرت خدیجہ کے پہلے شوہر کے نطفہ سے تھیں ہمراہ حضرت خدیجہ کے آئی تھیں اور نام ان دونوں صاحبزادیوں کا رقیہ اور ام کلثوم تھا ابن حجر محدث اہلسنت نے کتاب اصابہ میں لکھا ہے۔ کہ ایک کا نکاح تو ان میں سے عتبہ بن ابی لہب سے ہوا تھا اور دوسری کا نکاح ابو العاص بن الربیع سے اور یہ دونوں کافر تھے انتہےٰ۔ بعد ایکے نکاح ان دونوں کا عثمان سے ہوا جس وقت کہ باوجود قوت اسلام کے کافروں کے نکاح میں رہی ہیں اور پیغمبر خدا نے ان سے علیحدہ نہ کیا۔ اگر عثمان کے نکاح میں آئیں تو کیا قباحت ہے عثمان تو خود مسلمان تھا حضرت کے روبرو

اور ان کافروں سے بدرجہ بہتر تھا۔

البتہ بعد وفات جناب رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے ایسی بدعتیں عثمان نے کیں کہ عائشہ اس کے حق میں کہتی تھی اقتلوا نعثلا لعن اللہ نعثلا اقتلوا احراق المصاحف یعنی قتل کرو اس ریش دراز کو لعنت کرو اس ریش دراز پر قتل کرو اس قرآن کے جلانے والے کو، چنانچہ استیعاب میں لکھا ہے یہاں تک بدعتیں کیں کہ صحابہ رسول نے تنگ ہو کر اسے قتل کیا یہ سب ماجرا اہل سنت کی کتابوں میں مذکور ہے اگر سند اس کی مطلوب ہوگی۔ تو روانہ کر دی جائے گی اور اگر یہ دونوں صاحبزادیاں بھی رسول خدا کے نطفہ سے ہوتیں تو ان کے فضائل کچھ مذکور ہوتے جیسے کہ حضرت فاطمہؑ کے فضائل سنی شیعہ کی کتابوں میں مذکور ہیں سیدۃ نساء العلمین سیدۃ نساء اہل الجنۃ، الفاطمۃ بضعۃ منی اور سوا اس کے فضائل فاطمہ کے صدہا کتابوں میں مذکور ہیں اور ان دونوں کے فضائل ایسے مذکور نہیں ہیں اگر آنحضرتؐ کے نطفہ سے ہوتیں تو البتہ مذکور ہوتے۔

سوال دوسرا علی نے عائشہ سے بہتر جنگ کئے۔ اگر باغ فدک اصحاب ثلثہ نے غصب کیا تھا تو علی نے ان پر جہاد کیوں نہ کیا، جواب اس کا یہ ہے کہ یہ سوال بھی غلط ہے اس واسطے کہ علی نے عائشہ سے بہتر جنگ نہیں کئے۔ بلکہ ایک جنگ کی تھی سو عائشہ کو شکست ہوئی چنانچہ اہلسنت کی کتابوں میں لکھا ہے اور فدک کے غصب کرنے سے جہاد لازم نہ ہوا تھا اس واسطے کہ جہاد مال دنیا کے غصب کرنے سے واجب نہیں ہے بلکہ پیغمبر اور امام واسطے ترقی دین کے جہاد کرتے ہیں نہ واسطے مال دنیا کے اور علی کے پاس جہاد کرنے کو انصار کب تھے کہ وہ جہاد کرتے جہاد کرنے کا حکم تنہا کے واسطے نہیں ہے بلکہ جس وقت انصار و مددگار بہم پہونچیں اس وقت جہاد کرنا چاہیئے جیسے کہ رسول خدا جب تک مکہ میں رہے بسبب ہونے انصار کے حکم جہاد کا نہ ہوا، جب مدینہ گئے کافروں کے خوف سے ہجرت کر کے اور انصار بہم پہنچے تو جہاد کفار پر کیا اور جب تک مکہ میں رہے کچھ نہ ہو سکا۔ بلکہ کچھ کچھ مددگار بھی وہاں موجود تھے۔ ان مددگاروں میں ایک علی بھی تھے ان سے بھی کچھ نہ ہو سکا آخر کفار کے خوف سے سب نے اپنا وطن اصلی چھوڑ دیا مگر ایسے ہی حال علی کا بعد رسول خدا کے تھا کہ خلفاء ثلثہ کے زمانہ میں ان

کو انصار و مددگار بہم نہ پہنچے تو جہاد نہ کیا اور جب بہم پہنچے تو عائشہ پر بھی جہاد کیا۔ اور معاویہ پر بھی۔

اور سوال تیسرا یہ کہ علی کی بیٹیوں کا نکاح کس سے ہوا تھا، جواب اس کا یہ ہے کہ فاطمہ کے پیٹ سے علی کی دو بیٹیاں تھیں بڑی بیٹی زینب کہ جس کا نکاح عبداللہ بن جعفر طیار سے ہوا تھا اور دوسری بیٹی کلثوم تھی کہ جس کا نکاح محمد بن جعفر طیار سے ہوا تھا فقط یہی سوال تھا جس کا جواب ہوا اگر کچھ زیادہ لکھتے تو زیادہ لکھا جاتا۔ اور فدک کا غصب ہونا جو آپ نے دریافت کیا تھا اس کو ایک دفتر چاہیئے لیکن کچھ مختصر تھوڑا سا آپ کی خدمت میں تحریر کرتا ہوں اگر آپ کی طبیعت میں انصاف ہے تو اسی قدر کفایت کرتا ہے اور جو کچھ لکھتا ہوں یہ سب اہل سنت کی معتبر کتابوں سے ہے جس شخص کو کچھ تردد ہو مطابق کر لے۔ اور بعد اس کے انصاف کرے کہ یہ ظلم ہے یا نہیں؟ جلال الدین سیوطی نے تفسیر در منثور میں اور شیخ علی متقی نے کنز العمال میں اور ابو علی موصلی نے اپنی مسند میں اور صاحب معارج النبوۃ نے معارج النبوۃ میں اور سوا اس کے اور علماء اہل سنت نے روایت کی ہے کہ جس وقت نازل ہوئی آیت وآت ذاالقربی حقہا یعنی دے تو اے محمد قرابتوں کو حق ان کا،، تو اس وقت پیغمبر خدا نے جبریلؑ سے پوچھا کہ قریب میرے کون ہیں اور حق ان کا کیا ہے جبریل نے عرض کی کہ قریب تمہارے فاطمہ ہے اور حق اس کا فدک ہے فدک اس کو دیدو اس وقت رسول خدا نے فدک فاطمہ کو دے دیا پس تحریر سے ان علماء کی ثابت ہوا کہ رسول خدا نے فاطمہ کو فدک دیا اور فاطمہ مالک فدک کی تھی۔

جب رسول خدا نے دنیا سے رحلت فرمائی اور ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے تو فدک کو فاطمہ سے چھین لیا اور ان کا قبضہ اٹھا دیا اب فرمایئے؟ کہ یہ غصب نہیں تو کیا ہے؟ اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ تاریخ آل عباس کہ کتب معتبرہ اہلسنت سے ہے اس میں لکھا ہے کہ جس وقت اولاد حسنین نے مامون رشید خلیفہ عباسی سے دعوے فدک کا کیا تو اس نے دو صد علماء اہل سنت جمع کر کے کہا کہ حال فدک کا راست راست بیان کرو انہوں نے بروایت واقدی اور بشیر بن ولید بیان کیا کہ بعد فتح خیبر آیت وآت ذاالقربی حقہ نازل ہوئی تو رسول

خدا نے جبریل سے پوچھا کہ ذوالقربےٰ میرے کون ہیں اور حق ان کا کیا ہے جبریل نے عرض کی کہ فاطمہ زہرا تمہاری قریب ہے اور حق اس کا فدک ہے اس وقت رسول خدا نے فاطمہ کو فدک دے دیا جب ابوبکر نے اپنی خلافت میں فاطمہ کو فدک سے منع کیا تو فاطمہ نے فرمایا کہ فدک مجھکو میرے باپ نے دیا ہے ابوبکر نے قبول کیا اور چاہا کہ فاطمہ کو کاغذ معافی کا لکھدے اور فدک فاطمہ کو پھیر دے اس وقت عمرؓ نے کہا کہ فاطمہ سے گواہ طلب کر کہ پیغمبر خدا نے اس کو کب دیا ہے؟ اس وقت فاطمہ زہرا حضرت علی اور ام ایمن کہ ایک بی بی تھی اور حسنین علیہ السلام کو گواہ اپنا لائی اور انہوں نے گواہی دی کہ پیغمبر خدا نے فاطمہ کو فدک دیا ہے تو اس وقت ابوبکر نے فاطمہ کو کاغذ فدک کا لکھدیا کہ اپنے حق پر قابض ہووے عمر نے وہ کاغذ ابوبکر سے لے کر پھاڑ ڈالا اور کہا کہ فاطمہ ایک عورت ہے اور علی اس کا شوہر ہے اپنے نفع کے لئے کہتا ہے ابوبکرؓ نے بھی قبول کیا اور یہ دعوےٰ کرنا فاطمہ کا ابوبکر سے ہبہ فدک کا اور گواہی دینا علی اور حسنین کا اور ام ایمن کا اور رد کرنا اور نامنظور کرنا ابوبکر کا ان کی گواہی کو اہلسنتؓ کی بہت کتابوں میں لکھا ہے مثل صواعق محرقہ اور فصل الخطاب اور معجم البلدان اور ریاض النضرہ اور کنز العمال اور تاریخ حاکم اور جمع الجوامع اور شرح مواقف اور نہایت العقول اور سوا اس کے بہت کتابوں میں ہے لیکن ابوبکر نے فاطمہ کو اور اس کے گواہوں کو اس دعوے میں جھوٹا جانا اور سوائے فاطمہ کے جس کسی نے ابوبکر سے دعوےٰ کیا اس کو ابوبکر نے سچا جانا۔ اور گواہ اس سے طلب نہ کئے جو کچھ اس نے مانگا دیدیا۔

چنانچہ صحیح بخاری میں جابر سے روایت ہے، وہ کہتا ہے کہ میں ابوبکرؓ کے پاس گیا اور میں نے کہا کہ پیغمبر خدا نے اپنی زندگی میں مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مال بحرین کا آوے گا۔ تو میں تجھ کو اس میں سے اس قدر مال دوں گا۔ اور مال بحرین کا حضرتؐ کی زندگی میں نہ آیا۔ لیکن اب تمہارے پاس آیا ہے تم اس میں سے مجھ کو دو کہ حضرت نے مجھ سے وعدہ کیا تھا ابوبکرؓ نے یہ بات سن کر اسی وقت تین مٹھی مال کی مجھے بھر کر دی اور گواہ مجھ سے پیغمبر خدا کے وعدہ کرنے کے طلب نہ کئے اور فتح الباری شرح صحیح بخاری میں وجہ اسکی اسطرح سے لکھی ہے کہ ابوبکر نے جو جابر سے گواہ طلب نہ کئے اور دعوےٰ کرتے ہی مال اس کو دیدیا سبب اس کا یہ ہے کہ

جابر سا صحابی معاذ اللہ پیغمبر خدا پر جھوٹا دعویٰ کرے کہ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا ایسا نہیں ہو سکتا اگر جابر سچا نہ ہو تو پھر کون سچا ہو سکتا ہے اس واسطے ابوبکر نے اس سے گواہ طلب نہ کئے اور بدون گواہی اس کو مال دے دیا اب کہتا ہوں میں کہ وائے بر دینداری اہل سنت کہ فاطمہ کو جو کہ پارہ جگر رسول خدا ہے جابر کے برابر بھی نہ جانا کہ ادنیٰ صحابی تھا اور ان کے نزدیک فاطمہ کا مرتبہ جابر کے برابر بھی نہ ہوا کہ جابر کو تو بدون گواہوں کے مال دیدیا اور اس کو جھوٹ سے بچایا اور کہا کہ جابر سچا نہ ہوگا تو اور کون سچا ہوگا اور فاطمہ کو جھوٹا سمجھ کر اس سے گواہ طلب کئے جب گواہوں نے اس کی گواہی دی تو ان کی گواہی کو رد کیا علی کو تو کہا کہ یہ شوہر اس کا ہے اپنے نفع کے لئے کہتا ہے۔ علی کو بھی جھوٹا جانا ہر چند علی بھی صحابی تھے۔ لیکن جابر کے برابر سچے نہ تھے اور حسنین کو کہا یہ فرزند اس کے ہیں اور لڑکے ہیں اور ام ایمن جو باقی رہی وہ ایک عورت ہے اس کی گواہی کیسے درست ہووے۔

اب فرمائیے کہ یہ غصب نہیں تو اور کیا ہے۔ سوا اس کے اور غصب کس کو کہتے ہیں؟ اور یہ عداوت ہے یا دوستی؟ اور مروت اور رعایت حق رسولؐ؟ اور حق اور سچ تو یہ ہے کہ اہل بیت کی دشمنی میں حق رسول کی بھی رعایت نہ کی۔ آپ نے لکھا تھا کہ مجھے غصب فدک کی کسی سے صحت نہیں ہوتی اب آپکو چاہیئے کہ میری صحت علماء سنت سے کرا لیئے اور میری باتوں کا جواب لکھوا کر بھجوائیے کہ کیا سبب ہے، کہ جابر کو سچا جانا، اور فاطمہ کو جھوٹا سمجھا اور اس مظلومہ کے گواہوں کو بھی رد کیا۔ اور یہ بھی سننا چاہیئے کہ جب فاطمہ نے جانا کہ ابوبکر نے مجھے ہبہ فدک میں جھوٹا سمجھا تو اس معصومہ نے دعوےٰ وراثت کا کیا اور ابوبکر سے کہا کہ میں پیغمبر خدا کی بیٹی ہوں مجھے ان حضرت کا مال ارث میں پہنچتا ہے اور فدک میرے باپ کا مال ہے مجھے دیدے اس وقت ابوبکر نے ایک جھوٹی روایت قرآن کے خلاف بنا کر کہا کہ میں نے پیغمبر خدا سے سنا ہے کہ وہ حضرت فرماتے تھے کہ انبیاء کا مال سب صدقہ ہے کسی کو ان کے وارثوں میں سے نہیں پہنچتا۔ اول تو یہ روایت خلاف قرآن کے ہے دوسرے یہ کہ پیغمبر خدا نے اپنے وارثوں میں سے نہ بیٹی سے نہ اپنی بیبیوں سے کسی سے کہا کہ میرا مال صدقہ ہے تم کو نہیں پہنچتا تم دعوے نہ کرنا اور حکم خدا کا جو کچھ ان کے واسطے تھا اس

کو ان سے چھپا کر رکھا اور ایک اجنبی شخص سے کہ اس کو کسی طرح کا دخل پیغمبر خدا کی وراثت میں نہ تھا اس کے کان میں کہدیا اور کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ کہا

لیکن باوجود اس کے پھر ایک مرتبہ فاطمہؓ ابوبکر کے پاس گئی اور اس وقت ابوبکر منبر پر تھا۔ کہا کہ اے ابوبکر تیری بیٹی تو تیرا ترکہ پاوے اور میں اپنے باپ کا ترکہ نہ پاؤں اس وقت ابوبکر منبر سے نیچے اترا اور کہا کہ لے میں تجھکو فدک دیتا ہوں یہ کہکر فاطمہ کو کاغذ لکھدیا اتنے میں عمر آیا اور ابوبکر سے پوچھا کہ یہ کیسا کاغذ ہے کہا کہ میں نے فاطمہ کو فدک لکھدیا ہے۔ عمر نے وہ کاغذ ابوبکر کے ہاتھ سے لیکر پھاڑ ڈالا اور کہا کہ لوگوں کو کیا دے گا؟ عربوں سے لڑائی ہو رہی ہے۔

چنانچہ یہ روایت سبط ابن جوزی نے اپنی سیرت میں تحریر کی۔ ہے اور واقدی محدث اہلسنت اور برہان الدین حلبی شافعی نے اپنی سیر میں لکھا ہے فاطمہ نے ابوبکر سے دعوے فدک کا کیا کہ فدک میرا ہے میرے باپ نے مجھکو دیا تھا۔ اس وقت ابوبکر نے فاطمہ کو فدک کا کاغذ لکھدیا جب فاطمہ وہ کاغذ لے کر وہاں سے پھری تو رستہ میں عمر سے ملاقات ہوئی عمر نے فاطمہ سے پوچھا کہ یہ کیسا کاغذ ہے فاطمہ نے کہا کہ ابوبکر نے مجھکو فدک لکھدیا ہے عمر نے وہ کاغذ ہاتھ فاطمہ سے چھین کر پھاڑ ڈالا اگر کوئی کہے کہ ابوبکر کا اس میں کیا قصور ہے۔ اس نے تو لکھدیا تھا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ ابوبکر حاکم تھا اس کو اس امر میں تابعداری عمر کی نہ چاہیئے تھی عمر کو اس شر سے باز رکھتا اور اس کے کہے پر عمل نہ کرتا لیکن وہ تو اس کا ہر امر میں شریک تھا اس کے مشورہ بدون کچھ نہیں کر سکتا تھا اور میں کہتا ہوں کہ اگر صحابہ ابوبکر کو اس امر میں سچا جانتے تھے اور علی بھی ابوبکر کو سچا جانتے تھے کہ ابوبکر سچ کہتا ہے پیغمبر خدا کا ترکہ صدقہ ہے کسیکو نہیں پہنچتا تو پھر علی اور عباس نے عمر کی خلافت میں عمر سے جا کر کیوں دعوے کیا۔ پیغمبر کے ترکہ کا اس وقت عمر نے علی اور عباس کو کہا کہ تم ابوبکر کو کاذب اور خائن اور غادر اور آثم جانتے تھے اور مجھے بھی تم دونوں کاذب اور خائن اور غادر اور آثم جانتے ہو اور میں وہی کروں گا۔ جو کہ ابوبکر کرتا تھا یہ روایت صحیح مسلم میں لکھی ہے

اور مسند احمد بن حنبل میں لکھا ہے کہ عثمان کی خلافت میں عثمان سے بھی پھر دعوے کیا تھا پس اگر ابوبکر سچا ہوتا تو ان کے زمانہ میں دعوے ہرگز نہ کرتے معلوم ہوا کہ ابوبکر اس روایت میں بالکل جھوٹا تھا۔ ازراہ عداوت کے روایت بنا کر فاطمہ کا حق غصب کیا اور عمر خود علی

اور عباس سے اقرار کرتا ہے کہ تم ابوبکر کو کاذب اور خائن جانتے تھے اور مجھے بھی تم کاذب اور خائن جانتے ہو پس جس وقت علی نے ان کو کاذب اور خائن جانا تو بیشک ہم بھی ان کو کاذب اور خائن جانیں گے اور یہی مطلب غصب ہے۔ اور صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ جس وقت ابوبکر نے فدک کے دینے سے انکار کیا تو فاطمہ زہرا اس پر غضب ناک ہوئی اور تمام عمر پھر کبھی اس سے کلام نہ کیا اور صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ فاطمہ نے وقت مرنے کے وصیت کی کہ ابوبکر اور عمر میرے جنازہ پر نہ آنے پائیں۔ فقط۔

جواب خط

یہاں تک خط مذکور کی عبارت تھی بلکہ بلاکم و کاست لفظاً لفظاً نقل کر دیا ہے۔

لیکن اب ہماری بات سننے کے لئے بھی تیار ہو جیئے تاکہ مولوی صاحب کی اس طمطراق کی حقیقت اور مولوی صاحب کی قابلیت اور علماء شیعہ کی فہم و فراست بخوبی معلوم ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ یہ خط ہر چند عبارت میں تو زیادہ لیکن مثل غذا قلیل الکیموس کہ باوجود قلت کیموس کے سیئی الکیموس بھی ہے خلاصہ نکال لئے۔ تو کل دو چار ہی باتیں ہیں پھر وہ بھی غلط اگر اعتبار نہ آئے تو دیکھیے۔ اول مولوی صاحب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ کے نطفہ سے فقط ایک ہی بیٹی تھی جن کا نام حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا تھا اور اہلسنت جو دو بیٹیاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اور مشہور کرتے ہیں وہ آپ کے نطفہ سے نہ تھیں بلکہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پہلے خاوند کے نطفہ سے تھیں خیر غنیمت ہے، کہ جناب مولوی عمار علی صاحب نے اتنا تو لحاظ رکھا کہ حضرت خدیجۃ الکبرا کی اولاد ہونے سے تو ان کو خارج نہیں کیا ہم ایسی ناانصافی پر اس کے بھی شکر گذار ہیں ورنہ جہاں مولوی صاحب نے جرأت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا نسب منقطع کیا تھا اگر حضرت خدیجۃ الکبرا سے بھی ان کا نسب منقطع کر دیتے جیسے بعضے ایسے ہی دشمنان نہانی اہل بیت نے کیا ہے۔ تو کون مانع تھا، بات یہ ہے کہ اس جگہ تو مولوی صاحب نے غیرت کی ناک ہی کتر لی ہے اور موافق

مثل مشہورہ۔ دروغ گویم بر روئے تو، یہ ستم کئے ہیں کہ سنیوں کی ضد میں اہلبیت پر جفا کر کے (سو کھی) اپنے ایمان پر بھی تو قلم پھیر گئے نہ کلام اللہ کی سنی نہ اپنی معتبر کتابوں کا لحاظ کیا آفرین ہے کیوں نہ ہوں مولوی عمار علی ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

بنات طیبات از روئے کلام اللہ شریف | برائے خدا اہل انصاف بے روی و ریا ہو کر میری گذارش کو سنیں اگر بیجا ہو جب ہی کہیں کلام اللہ موجود ہے اگر مولوی عمار علی صاحب کو یہ عذر ہو کہ شیعوں کو کلام اللہ یاد نہیں ہوتا ہم کلام اللہ کے حوالوں کی کیونکر تصدیق کریں تو میں پتے وار تبلاتا ہوں۔ سورہ احزاب میں بائیسویں سیپارہ میں قریب ربع کے آخر کے رکوع سے پہلے رکوع کے شروع ہی میں یوں ارشاد فرماتے ہیں یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ یعنے کہدے اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بیبیوں اور بیٹیوں کو اور مومنوں کی عورتوں کو کہ اپنے اوپر اپنی چادریں ڈال لیا کریں" فقط اب گذارش یہ ہے کہ اتنی بات تو مولوی عمار علی صاحب بھی سمجھتے ہوں گے کہ بنات جمع ہے اور جمع کم سے کم تین پر بولی جاتی ہے اور اگر کبھی توسع کر کے دو پر بھی اطلاق کر دیں تب بھی ایک سے تو زیادہ ہی ہوگا بہرحال یہ کہنا کہ حضرت فاطمہ کے سوا اور کوئی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹی ہی نہ تھی تب بھی غلط ہوگا افسوس مولوی صاحب کو اتنی شرم بھی تو نہ آئی کہ کوئی سنے گا تو کیا ہوگا مگر مولوی صاحب نے ہم جانے یہ سن رکھا ہے "الحیاء یمنع الرزق" یعنے حیا رزق روک دیتی ہے اس لئے شاید اس پر کبھی دھیان نہ فرمایا الحیاء شعبۃ من الایمان کیونکہ ایمان کا ثمرہ بالفرض کچھ ہوا بھی تو آخرت میں ہوگا رزق تو آج ہاتھ سے جائے ہے اور پہلے لوگ فرما گئے ہیں۔

"نقد را بنسیہ گذاشتن کار خردمنداں نیست"

بالجملہ یا تو مولوی صاحب یہ تسلیم فرمائیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کئی بیٹیاں تھیں پھر یہ آپ تسلیم کرینگے کہ وہ حضرت رقیہ وغیرہا تھیں کیونکہ سوا ان کے اور کسی کی نسبت تو کسی نے یہ دعوے کیا ہی نہیں ورنہ آیات ربانی کے منکرین کے لئے یہ تازیانہ موجود ہے۔ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیَاتِنَا اِلَّا الْكَافِرُوْنَ یعنی نہیں انکار کرتے ہماری آیات سے مگر کافر" اور اگر کافر بن جانا گوارا کریں اور اس بات کو نہ مانیں کہ سوا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلے اللہ

علیہ وسلم کے اور بھی کوئی بیٹی تھی تو ناچار پھر ہمیں شیعوں ہی کی کتابوں کی سند دینی لازم ہو گی انھیں تو جھوٹا نہیں بتائیں گے اور اگر ہماری ضد میں ان سے بھی دست بردار ہوں تو سبحان اللہ "چشم ما روشن دل ما شاد"

بنات طیبات کی تعداد از روئے کتب شیعہ | بہرحال اس امید پر اس باب میں روایات کتب معتبرہ شیعہ ہی نقل کرتے ہیں، نہج البلاغت میں جو شیعوں کے نزدیک مثل صحیفہ آسمانی اور آیات قرآنی کے ہے اور اس کے مرویات کو سب اثنا عشریہ متواتر سمجھتے ہیں علامہ رضی جو اس کے جامع ہیں حضرت امیر کا قول حضرت عثمان کے خطاب میں یوں نقل فرماتے ہیں قَدْ بَلَغْتَ مِنْ صِهْرِهٖ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ مَالَمْ یَنَالَا یعنی الشیخین حاصل اس کا یہ ہوا کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان ذی النورین کو کسی مقام میں یوں فرماتے ہیں کہ تم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دامادی کا وہ شرف میسر آیا ہے کہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو بھی میسر نہیں آیا اور شیخ الطائفہ ابوجعفر طوسی تہذیب میں جو صحاح اربعہ شیعہ میں سے ہے اور ہمسنگ کافی کلینی ہے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے یوں روایت کرتے ہیں۔

كَانَ یَقُوْلُ فِیْ دُعَائِهٖ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی رُقَیَّةَ بِنْتِ نَبِیِّكَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی اُمِّ كُلْثُوْمَ بِنْتِ نَبِیِّكَ یعنے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ دعا میں یوں کہا کرتے تھے کہ یا اللہ رحمت بھیج حضرت رقیہ پر جو تیرے نبی کی بیٹی ہیں یا اللہ رحمت بھیج حضرت ام کلثوم پر جو تیرے نبی کی بیٹی ہیں"۔ اور اس پر بھی تسکین خاطر نہ ہو اور جناب مولوی صاحب قبلہ اپنی وہی مرغی کی ایک ٹانگ گائے جائیں اور اس کی یوں تاویل کرنے لگیں کہ عرف کی رو سے انہیں بیٹیاں کہدیا ہو لے پالک کو سارا جہاں بیٹا بیٹی کہا کرتے ہیں ورنہ حقیقت میں حضرت فاطمہ ہی بیٹی تھیں تو میں بھی انشاء اللہ مولوی صاحب سے تسلیم ہی کرا کر چھوڑوں گا۔ کلینی میں روایت موجود ہے۔ تَزَوَّجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ خَدِیْجَةَ وَهُوَ ابْنُ بِضْعٍ وَعِشْرِیْنَ سَنَةً فَوُلِدَ لَهٗ مِنْهَا قَبْلَ بَعْثَتِهٖ عَلَیْهِ السَّلَامُ اَلْقَاسِمُ وَرُقَیَّةُ وَزَیْنَبُ وَاُمُّ كُلْثُوْمَ وَوُلِدَ لَهٗ بَعْدَ الْمَبْعَثِ اَلطَّیِّبُ وَالطَّاهِرُ وَفَاطِمَةُ حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

نے حضرت خدیجۃ الکبرےٰ سے جب نکاح کیا تو اس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف کچھ اوپر پچیس برس کی تھی سو حضرت خدیجہ سے آپ کے نطفہ سے پہلے نبوت کے تو حضرت قاسم اور حضرت رقیہ اور حضرت زینب اور حضرت ام کلثوم پیدا ہوئے اور بعد نبوت کے حضرت طیب اور حضرت طاہر اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہم اجمعین پیدا ہوئے، اس روایت میں شیعوں کو کچھ تین پانچ کرنے کی گنجائش نہیں لے پالک ہونے کے احتمال کو بھی پیش نہیں کر سکتے اور اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں ایک تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور تین اور۔ حضرت زینب حضرت رقیہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہن اور یہی سنیوں کا دعوےٰ ہے

پر مولوی صاحب نے کمال تورّع کے باعث تین کے عدد کو منہ پر لانا بھی گوارا نہ کیا اور اہل سنت کی طرف دو ہی صاجزادیوں کا سوا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعوےٰ کرنا بیان کیا معہذا انہوں نے سمجھا حریف کی بات کو جتنا گھٹایا جائے مناسب ہے سبحان اللہ اس تبحر پر اہلسنت کی بیسیوں کتابوں کے نام گناتے چلے جاتے ہیں کوئی جانے مولوی صاحب کی نظر میں سب گذری ہوئی ہیں حضور کو اس بات کی تو خبر ہی نہیں جو زبان زد عام و خاص اہلسنت ہے اہلسنت کی کتابوں کو دیکھنا تو کہاں نصیب؟ میں جانوں کسی سنی طالب علم سے کتابوں کے نام سن بھلے ہیں ورنہ بعضی بعضی کتابیں جو حضور نے رقیمہ کریمہ میں ان کے حوالہ سے غصب فدک بیان فرماتے ہیں شاید خواب میں بھی نہ دیکھیں ہوں خصوصاً جمع الجوامع اور مسند احمد بن حنبل، علیٰ ہذا القیاس اور کتابیں بھی ایسی ہی ہیں۔ ہرچند بعد اس تحریر کے مجھکو کچھ ضرورت تحریر نہیں۔ اہل فہم اور اہل انصاف کے نزدیک دو ٹوک بات ہوگئی۔

مذکور نہ ہونا معدوم ہونے کی دلیل نہیں ہے

لیکن مولوی صاحب کی خوش فہمی کی تعریف بھی ہمارے ذمے واجب ہے، جناب مولوی صاحب اس دعوے کی دلیل کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے سوا حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی صاحبزادی نہ تھی یوں رقم فرماتے ہیں کہ اگر حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں

ہوتیں تو ان کے فضائل بھی مذکور ہوتے۔ جیسے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے فضائل طرفین کی کتابوں میں موجود ہیں کیا دلیل ہے؟ کسی نے ایسوں ہی کی تعریف میں کہا ہے کہ ع۔ "بریں فہم و دانش بباید گریست" اگر مولوی صاحب کو قواعد استدلال کی خبر نہ تھی تو کسی سے پوچھ لینا تھا۔ آخر اتنا بھی اوروں ہی کی تے چشی کے بھروسے پر ہے عجب ہی تو یوں بے تحقیق جو چاہا لکھدیا، جناب مولوی صاحب معقولات کے طور پر تو اتنا ہی جواب بہت ہے کہ عدم الاطلاع یا عدم الذکر عدم الشئے پر دلالت نہیں کرتا۔ لیکن آپ کے سامنے تو بے نقل کام نہیں چلتا کیونکہ کمال تورع سے معقولات کے ذکر کو تو آپ حرام ہی جانتے ہونگے جناب باری تعالےٰ سورہ نساء کے آخر میں ارشاد فرماتا ہے۔ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ یعنی بہت رسول تو ایسے ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے تجھے کہلایا ہے پہلے سے اور بہت سے رسول ایسے ہیں کہ ان کا قصہ اور احوال ہم نے تجھ سے بیان ہی نہیں کیا۔، غرض اگر کسی کا ذکر نہ کرنا اس کے عدم کی دلیل ہوا کرے تو لازم آئے کہ سوا ان رسولوں کے جن کا کلام اللہ میں مذکور ہے نعوذ باللہ منہ کوئی اور رسول پیدا ہی نہوا ہو معہذا یہ کچھ لازم ہے کہ کسی بزرگ کی اولاد سب کی سب برابر ہوا کرے۔ اور اگر اس بات کو مانیں تو مولوی صاحب سنبھل کر مانیں۔ پھر حضرت امام محمد باقر اور زید شہید کو جو انکے بھائی تھے برابر کرنا پڑیگا۔ یہ تو مولوی صاحب نے فرمایا ہوتا کہ اہل سنت حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت ام کلثوم کو برابر سمجھتے ہوں۔ حاشا وکلا حضرت فاطمہ کو جو شرف ہے وہ اور کے لئے نہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

عمار علی کی تاریخ دانی

باقی یہ جو مولوی صاحب رقم فرماتے ہیں کہ حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم میں سے ایک کا نکاح ابوالعاص سے ہوا تھا یہ مولوی صاحب کی قوت حافظہ کی دلیل ہے "آرے دروغ گو را حافظہ نباشد" جناب من ابوالعاص سے حضرت زینب کا نکاح ہوا تھا اور وہ دونوں صاحبزادیاں جن کا نام آپ نے لکھا ہے ابولہب کے دو بیٹوں سے منسوب ہوئیں تھیں اور حافظ ابن حجر کا نام کیوں بدنام کرتے ہو۔ خطا تو اپنی ہے اور لگاتے ہیں اوروں کے ذمہ، اور یہ جو مولوی صاحب

ارشاد فرماتے ہیں کہ باوجود قوت اسلام کے وہ کافروں کے نکاح میں رہیں یہ مولوی صاحب ہی کی جرأت ہے سبحان اللہ وہ حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں نہ تھیں تو حضرت خدیجہ کی بیٹیاں تو تھیں۔

اور ہم جانیں کہ شیعہ بھی ام الاطہار حضرت خدیجۃ الکبرٰے کی اتنی تو پاسداری ضرور کرتے ہوں گے کہ ان کی بیٹیوں کو مسلمان تو .... سمجھتے ہوں گے اور خیر کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مولوی صاحب تو ان کو مسلمان ہی سمجھتے ہیں کیونکہ اگر وہ دونوں کافر ہوتیں۔ تو اس کے کہنے کیا حاجت تھی کہ جس وقت کہ باوجود قوت اسلام کے کافروں کے نکاح میں رہیں اور پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے علیحدہ نہ کیا اگر عثمان کے نکاح میں آئیں تو کیا قباحت ہے، عثمان تو خود مسلمان تھا حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے روبرو اور ان کافروں سے بدرجہا بہتر تھا انتہٰی۔ پھر کسی مسلمان کے خیال میں آسکے ہے۔ کہ باوجود قوت اسلام اور شوکت اہل اسلام کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ادنٰے مسلمان عورت کو بھی رہجا ئیکہ حضرت خدیجہ کی بیٹیاں، کفار کی قید میں رہنے دیتے۔

مسلمان عورت کو قید کفار سے رہائی دلانے کا قرآنی حکم

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خداوند کریم تو ہر خاص و عام کو اس کی تاکید فرماتا ہے کہ مسلمان عورتوں کو کفار کی قید سے چھڑاؤ۔ یقین نہ ہو تو سورۂ نساء کی یہ آیت موجود ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا۔

یعنی خداوند کریم مسلمانوں کو یوں ارشاد فرماتا ہے کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے جو تم خدا کی راہ میں قتال نہیں کرتے اور ضعیفوں کے چھڑانے کیلئے نہیں لڑتے۔ یعنی واسطے ناتوانوں کے مردوں سے اور عورتوں سے اور بچوں سے۔ جو یوں کہتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی خبرگیراں اور مددگار بنادے۔"

معہٰذا شیعوں کو بھی معلوم ہوگا کہ ان آیات کا نزول قبل فتح مکہ ہے اور فتح مکہ سے پہلے ایسی شوکت اسلام نہ تھی کہ آپ ملک عرب میں جو چاہیں سو کرلیں، سو اگر مولوی صاحب کا یہ مطلب ہے کہ اس آیت کے نزول تک وہ مکہ معظمہ ہی میں تھیں تب تو قطع نظر جھوٹ کے ان کا کفار کے پنجہ میں رہنے کا قائل ہونا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس پردہ میں طعن کرنا ہے اور اگر اس آیت کے نزول سے پہلے ہی وہ تشریف لے آئی تھیں۔ سو شوکت ہی آپ کو کونسی تھی جو باوجود اس کے آپ نے ان کا کافروں کے نکاح میں رہنا گوارا کیا۔ اور اگر ہم سے پوچھئے تو حق یوں ہے کہ قبل بعثت نبوی کے دونوں صاحبزادیوں کا نکاح ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے ہوا تھا بعد بعثت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جب ابولہب برسر پرخاش حضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہوا تو عداوت کے باعث اپنے بیٹوں سے کہہ کے آپ کی صاحبزادیوں کو طلاق دلوادی۔ سو وہ دونوں اول سال ہجرت ہی میں مدینہ منورہ آگئی تھیں، یہاں تک کہ غزوہ بدر میں جو پہلے ہی سال ہجرت میں واقع ہوا ہے ایک صاحبزادی تو حضرت عثمان کے نکاح میں تھیں۔ اور انہیں کی بیماری کے باعث حضرت عثمان کو حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں رہنے کی اجازت دی تھی۔ مگر تاریخ دانی اور راست بیانی مولوی صاحب پر ختم ہے جو چاہیں فرمادیں۔

ذوالنورین کے فضائل اور واقعہ شہادت کی تفصیل

باقی حضرت عثمان کے باب میں جو کچھ مولوی صاحب نے لکھ کر اپنی عاقبت خراب کی ہے اس کا جواب ہم سے نہیں ہوسکتا ہم کس کو کہیں ہمیں حضرت علی اور حضرت عثمان دونوں بمنزلہ دو آنکھوں کے ہیں بجز اس کے کہ یوں کہیں کہ مولوی صاحب کو خدا سمجھے اور کیا کہیں؟ اور یہ جو ارشاد ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عثمان رضی اللہ عنہ نے بدعتیں کیں۔ اس کا جواب تو جب لکھا جاتا جب ان کو لکھتے معہٰذا آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا اور اس کے مابعد کی آیات کے ترجموں میں بزرگی اصحاب ثلثہ بالخصوص اور باقی اصحاب بالعموم مذکور ہولی ہے اس لئے اس گوز شتر پر نکتہ گیری مناسب نہیں اور باقی حضرت عائشہ کا حضرت عثمان کی نسبت اُقْتُلُوا نَعْثَلًا یا لَعَنَ اللّٰهُ نَعْثَلًا یا اُقْتُلُوا حَرَّاقَ الْمَصَاحِفِ کہنا یہ سب ابن قتیبہ اور ابن اعثم

کوئی سمساطی کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں اور یہ جماعت کی جماعت کذاب مشہور ہیں اور شیعہ غالی ہیں ان کے کہنے کو سنیوں کی طرف منسوب کرنا اسی مثل مشہور کا مصداق بنتا ہے "ہم پادے آپ لگا دے اوروں کو" مولوی صاحب کو شرم نہیں آتی کہ ان افسانہائے دروغ کو سنیوں کی کتابوں کی طرف منسوب کر کے ایک دوسرا جھوٹ اپنی گردن پر رکھتے ہیں۔

عمار علی کی فنون عربیہ میں مہارت

خیر جو صاحب کہ ان کتب پر عبور رکھتے ہیں وہ تو حقیقت الامر کو آپ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے ان کے اطمینان کے لئے اتنی بات بہت ہے کہ اُقْتُلُوْ جو جمع ہے اس کے ترجمہ میں تو قتل کر۔ جو واحد کا ترجمہ ہے رقم فرماتے ہیں چنانچہ ملاحظہ نقل خط مولوی صاحب سے معلوم ہو جائے گا اس میں تو خیر یہ بھی احتمال ہے کہ کرو کی واؤ بہانہ سہو مولوی صاحب کے قلم سے رہ گئی ہو مگر اس میں تو سہو کی بھی گنجائش نہیں کہ لَعَنَ اللّٰہُ کا ترجمہ لعنت کرو، زیب رقم ہے کجا ماضی کجا معنی امر؟ با اینہمہ لفظ اللہ کے ترجمہ میں ضمیر واحد غائب کے معنی واحد حاضر کے کئے، نہ معلوم یہ کون سے محاورہ کے موافق مولوی صاحب نے ترجمہ کیا ہے؟ ادنے سے ادنیٰ طالب علم جانتا ہے کہ کسی طفل میزان خوان کو مصدر کے معنی تبلا دیجئے تو اگر اس میں پایہ فہم ہوگا تو وہ صحیح صحیح اُقْتُلُوْ اور لَعَنَ کے معنے تبلا سکتا ہے مگر جناب مولوی صاحب اس تحریر پر کہ مقتدا شیعہ اور امام امامیہ سی سبب سے ہو گئے ہیں ہنوز جمع اور واحد اور ماضی اور امر کے فرق کو نہیں سمجھتے، بجز اس کے اور کچھ نہیں کہا جاتا کہ یا تو حضور کو میزان تک کا سلیقہ نہیں اور یہ عمامہ بندی اور کرتہ پوشی اور دعوائے علم و امامت فقط اتنی بات پر ہے کہ دو چار باتیں کہیں سے سن بھاگے ہیں، اور بوجہ جعلسازی عوام کی نظر بندی کر کے روٹیاں مروڑتے پھرتے ہیں یا قدر قلیل مایۂ علم تو ہے پر خداوند کریم نے موافق وعدہ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ مولوی صاحب کو بوجہ شامت بد اعتقادی اور بدگوئی مقربان الٰہی صحابہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ اجمعین، اظہار بطلان مذہب مولوی صاحب کے لئے اتنی بھی تو ہدایت نہیں کرتا کہ ترجمہ ہی ٹھیک کر لیں

بہر حال اس سلیقہ اور اس استعداد پر ایسے ایسے مضامین عالی میں گفتگو کرنے

کو تیار ہیں اور اہل سنت سے کہ ان کا طریقہ ہو بہو سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہے اور اس میں ہرگز گنجائش حرف گیری نہیں الجھنے کو موجود ہیں اور با ایں ہمہ ایسی ایسی کتب کا حوالہ دیتے ہیں کہ بجز ادیب کامل ان کا مطلب صحیح نہیں سمجھ سکتا۔ اس استعداد کو دیکھ کر تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اگر بالفرض کچھ فریب نہیں تب بھی غلطی فہم سے تو مولوی صاحب کی باتیں خالی نہ ہونگی مگر ایک توجیہ ہو سکتی ہے یعنی یوں کہئے کہ مولوی صاحب بھی سچ فرماتے ہیں بیشک اہل سنت کی معتبر کتابوں میں ان روایات کو لکھ کر یوں لکھدیا ہے کہ یہ روایات موضوع اور افترا ہیں شیعوں کی گھڑی ہوئی ہیں وہاں کچھ اور مطلب تھا مولوی صاحب کمال فطانت سے اپنا مطلب سمجھ گئے۔

سو اس قاعدہ پر اگر مولوی صاحب جمے رہیں تو ہمیں یقین ہے کہ رفتہ رفتہ ترقی کر کے کتاب اللہ سے مال کے نہ دینے کے مضمون نکال کر مالداروں سے بہت سا کچھ کما لیں گے کیونکہ کلام اللہ میں لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ کے بعد ھُوَ خَیْرٌ لَّھُمْ لکھا ہوا ہے تو کل کو مولوی صاحب فرمانے لگیں گے زکوٰۃ کا نہ دینا بہتر ہے ادھر فرعون کے حق میں رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی مذکور ہے تو فرعون کو رب اعلے بتائیں گے، علیٰ ہذا القیاس مولوی صاحب کا یوں رقم فرمانا کہ استیعاب میں لکھا ہے یہانتک بدعتیں کیں کہ صحابہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تنگ ہو کر اسے قتل کیا سراسر دروغ اور بہتان صاف ہے اتنی بات کو عوام اور نادان بھی جانتے ہیں کہ اہل سنت میں سے کوئی شخص حضرت عثمان کی نسبت حرف گیر نہیں۔ دل و جان سے ہر کوئی اُن کا معتقد خالص ہے اور متبدع اور اہل بدعت کو اہل سنت سراسر گمراہ سمجھتے ہیں اور کلی مخالفت ان سے رکھتے ہیں اور کیونکر مخالفت نہ رکھیں بدعت تو خلاف سنت ہی کو کہتے ہیں سو اگر ایسی معتبر کتابوں میں حضرت عثمان کی نسبت متبدع ہونا مذکور ہوتا تو اہل سنت میں سے ان کا کوئی نام بھی نہ لیتا چہ جائیکہ یہ اعتقاد۔

یہ سب مولوی عمار علی صاحب کی جعلسازی ہے مگر موافق نقل مشہور "حق بزبان جاری شود"، مولوی صاحب بلکہ پیشوایان مولوی صاحب اس جھوٹ میں

بھی بیساختہ حق کہہ گذرے اتنا تو معلوم ہوا کہ اہل بدعت قابل قتل ہیں۔ سو اہل سنت کو سمجھنا
چاہیئے کہ وہ کس درجہ کو مقبول ہوں گے اور حسب اہلسنت مقبول ہوئے تو لاجرم شیعی مردود
اور داخل زمرۂ اہل بدعت اور قابل قتل ہوں گے القصہ اگر آدمی فہمیدہ ہو اور مولوی
صاحب کی ان فریب بازیوں کو دیکھے تو بلا تامل دجال نہیں تو کوچک ابدال دجال سمجھے
اللہ اللہ ایسے فریب باز ہم نے بھی نہ دیکھے تھے نہ سنتے تھے اپنی کتابوں کی روایات کو جو
حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم کے بنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہونے پر دلالت کرتی
ہیں چھپا کر اگر جھوٹ بول دیا تو بظاہر یہ احتمال تھا کہ اہلسنت کو شیعوں کی روایات کی کیا
خبر ہوگی پر اس بے حیائی کو دیکھنا کہ اہل سنت کے سامنے اہل سنت ہی کی کتابوں کے
حوالہ سے جھوٹ بولتے ہیں، در وغ گویم بر روئے تو۔

ذی النورین کے بچاؤ کے لئے صحابہ اور اہل بیت کی جانکاہی

خیر مولوی صاحب کو تو اس شرمانے سے
کب شرم آتی ہے حیا تو حیا والوں ہی کو آتی ہے۔ اس لئے لازم یوں ہے کہ صحابہ کا اور اہلبیت
کا بدل و جان حضرت عثمان کے بچانے کی تدبیروں میں مصروف رہنا اور متمنیٔ اجازت حضرت
عثمان درباب قتال اہل ہوا ہونا روایات صحیحہ اور تواریخ طرفین سے ثابت کیجئے تاکہ مسلمان
سادہ لوح مولوی عمار علی صاحب کی ان ابلہ فریبیوں سے فریب میں نہ آجائیں۔ اور شاید
مولوی صاحب کی بھی اس خواب غفلت سے آنکھ کھل جائے اور اس نشۂ ضلالت سے
چونک اٹھیں لیجئے سنئے کہ جو کچھ مولوی صاحب نے رقم فرمایا ہے محض افترا اور سراسر بہتان
ہے لڑکے اور دیوانے بھی ہوں تو سمجھ جائیں کہ یہ فقط مولوی صاحب کی شرارت ہے اس لئے
کہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر اور حضرت عائشہ اور امیر معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص جو
حضرت امیر سے لڑتے تھے تو حضرت عثمان کے قصاص ہی کیلئے تو لڑتے تھے چونکہ قاتلان حضرت
عثمان رضی اللہ عنہ حضرت امیر کے ساتھ ہو لئے تھے اور حضرت بناچاری انہیں کچھ نہیں کہہ سکتے
تھے کیونکہ وہ بسبب کثرت اور شورہ پشتی کے کسی سے دبتے نہ تھے اور بجائے خود یوں
سمجھتے تھے کہ جب ہم نے بنی بنائی خلافت کو درہم برہم کر دیا تو اوروں کی کیا ہستی ہے؟ حضرت
طلحہ اور حضرت زبیر وغیرہم کو تو اس قسم کے توہمات تھے کہ حضرت علی دربارۂ قصاص مداہنت

کرتے ہیں اور امیر معاویہ اور ان کے ذیل کے لوگ یوں سمجھتے تھے کہ حضرت عثمان حضرت علی
ہی کے اشاروں سے قتل ہوئے ہیں۔

خیر تواریخ طرفین شیعہ وسنی کی حاضر ہیں صحابہ نے بلوا، قتل عثمان رضی اللہ
عنہ کے دبانے میں اپنی طرف سے کچھ قصور نہیں کیا پر مقدر یوں ہی تھا تا مقدور کلمہ کلام سے
بلوائیوں کو سمجھایا جب کچھ ان کی سمجھ میں نہ آئی تو حضرت عثمان سے قتل قتال کی اجازت چاہی
پر حضرت عثمان ہی قتل قتال اور جنگ وجدال کے روادار نہ ہوئے بلکہ کمال تاکید سے مانع
آئے لاچار ہو کے صحابہ خاموش ہو کر بیٹھ رہے بااین ہمہ پانی کے پہنچانے اور بلوائیوں کے ہٹانے
میں آخر تک تدبیروں میں مشغول رہے حضرت زید بن ثابت انصار تمام انصاریوں کو لے
کر آئے اور جوانان انصار نے کہا اگر فرماؤ تو دوبارہ انصار خدا بنیں عبداللہ بن عمر تمام مہاجرین
کے ساتھ آئے اور یہ کہا جنھوں نے تم پر بلوا کر رکھا ہے وہی لوگ ہیں جو ہماری ہی تلواروں سے
مسلمان ہوئے ہیں اور اب تک ان صدموں کے ڈر سے پاجامہ میں ہگے دیتے ہیں یہ ساری
بڑھ بڑھ کے باتیں کرنی ان کی اس سبب سے ہیں کہ کلمہ گو ہیں اور تم کلمہ گوئی کا لحاظ کرتے
ہو اگر فرماؤ تو انہیں ان کی حقیقت دکھلادیں اور وہ بھولے دن پھر انہیں یاد دلادیں حضرت
عثمان نے فرمایا۔ یہی بات مت کہو، ایک میری جان کے لئے اتنا ہنگامہ اسلام میں برپا مت
کرو مگر باایں ہمہ حضرات حسنین، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، ابوہریرہ، عبداللہ بن عامر
بن ربیعہ اور سوا ان کے اور صحابہ حضرت عثمان کے ساتھ ان کے گھر میں تھے اور جب بلوائی
ہجوم کرتے تھے تو یہ سب صاحب پتھر لاٹھی مار مار ہٹاتے تھے اور دروازہ بند کر دیتے تھے
اور حضرت عثمان کے غلام جو ایک نوج کی نوج تھے یہاں تک کہ اگر آپ ان کو حکم دے دیتے
تو اہل بلوا کو حقیقت معلوم ہو جاتی ہتھیار اور لڑائی کا سامان لے کر حاضر ہوئے اور کمال زاری
اور بے قراری سے کہا کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ خراسان سے افریقہ تک کوئی ہماری تلوار کے سامنے
نہیں ٹھہرا اگر حکم ہو تو ان لوگوں کا گھمنڈ نکالدیں اور تماشا دکھلادیں کیونکہ سمجھانے سے تو ان
کی اصلاح نہیں ہوتی انہوں نے دیکھا کہ کلمہ گوئی کے باعث ہمیں کوئی چھیڑ نہیں سکتا اس لئے
روبراہ نہیں ہوتے اور تمہارے اور سوا تمہارے اور بڑے بڑے صحابہ کی بات نہیں سنتے حضرت

عثمان یہی فرمائے جاتے تھے کہ اگر میری خوشی منظور ہے اور میرا حق نمک ادا کرنا چاہتے ہو تو ہتھیار الگ کر کے اپنے گھروں میں بیٹھ رہو۔ اور جو ہتھیار الگ کر دے گا اسے میں نے آزاد کیا واللہ خونریزی خلائق سے پہلے اگر میں مقتول ہو جاؤں تو یہ مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے اس بات سے کہ خونریزی کے بعد مارا جاؤں یعنی میری شہادت تو لکھی ہوئی ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرما دیا تھا تم لڑو یا نہ لڑو میں مقتول ہوں گا۔ سو کیا فائدہ کہ لوگ بھی مارے جائیں اور مطلب بھی حاصل نہ ہو۔

اور تواریخ فریقین میں موجود ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادوں اور حضرت جعفر کی اولاد کو اور اپنے چیلے قنبر کو حضرت عثمان کے دروازہ پر متعین کر رکھا تھا اور حضرت طلحہ اور حضرت زبیر نے بھی اپنے بیٹوں کو دروازہ پر بٹھا دیا تھا تاکہ بلوائیوں کو دھکے دیتے رہیں۔ سو جب اہل بلوا ہجوم کر کے آتے تھے یہ سب صاحب لاٹھی لکڑی سے جو ہاتھ میں آجاتا تھا لڑتے تھے یہاں تک کہ حضرت سبط اکبر امام ہمام امام حسن رضی اللہ عنہ خون آلودہ ہو گئے محمد بن طلحہ اور قنبر کے سر پر زخم لگا، جب دروازہ کی راہ سے اہل بلوا کو آنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی اور اندر گھسنے کی کوئی تدبیر نہ بنی تو پیچھے سے بعض انصاریوں کے گھر میں نقب دیکر اندر گھس گئے اور حضرت عثمان کو شہید کر دیا۔

ذوالنورین کے لئے امام کی مدافعت

نہج البلاغت جو اصح الکتب شیعہ ہے اس بات کی گواہ ہے، حضرت امیر سے اس میں روایت ہے کہ انہوں نے یہ فرمایا وَاللّٰہِ قَدْ دَفَعْتُ عَنْہُ یعنی حضرت علی قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ واللہ میں نے تو حضرت عثمان سے اس بلا اور اس بلوا کو بہت ہی ہٹایا، اس کی شرح میں تمام شراح نہج البلاغت نے روایت کیا ہے کہ حضرت امیر بلوا کے دنوں میں جب حضرت عثمان کے گھر میں آتے تھے تو بلوائیوں کو چابک مار مار دفع کرتے تھے اور برا بھلا کہتے تھے اور لعنت کرتے تھے ابن اعثم کوفی یعنی شیعوں کا مورخ جو حضرت عثمان وغیرہ اصحاب کرام کا دشمن جان ہے وہی اپنی فتوح میں نقل کرتا ہے کہ حضرت امیر نے فرزند ارجمند سبط اکبر امام حسن رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ حضرت عثمان کے پاس جاؤ اور کہیو میرے والد کا دل تمہاری ہی طرف لگا ہوا ہے فرماتے ہیں میں سنتا ہوں کہ یہ لوگ تمہارے مقدمہ میں

کچھ بہت شور و غل کر رہے ہیں اور کسی کی نصیحت نہیں سنتے اور تمہارے قتل کا مصمم ارادہ کئے بیٹھے ہیں اس لئے تمہاری طرف سے مجھے بہت اندیشہ ہو رہا ہے اگر فرماؤ تو میں بھی آ کر تمہارا مددگار ہوں اور ان لوگوں سے لڑوں اور جس طرح بن پڑے ان لوگوں کو تمہارے دروازہ سے ہٹاؤں۔ حضرت امام حسن حسب ارشاد والد ماجد حضرت عثمان کے پاس آئے، اور یہ پیام پہنچایا انہوں نے فرمایا مجھے یہ منظور نہیں کہ آپ تکلیف اٹھائیں اور ان لوگوں سے لڑیں میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے یوں فرماتے ہیں، اگر ان لوگوں سے لڑو تو لڑو فتح ہوگی اور نہ لڑو تو روزہ ہمارے پاس کھولیو۔ سو اب یہی تمنا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا کر روزہ کھولئے۔ حضرت حسن چپ ہو کر چلے آئے۔

حضرت امام کا کوئی معاملہ ظاہر داری نہ تھا

اب سنئے اہل ایمان کا تو یہ کام نہیں کہ حضرت امیر کے تمام معاملات کو نفاق اور ظاہر داری پر محمول کریں۔ شیعہ اگر بحکم اَلْمَرْءُ یَقِیْسُ عَلٰی نَفْسِہٖ حضرت امیر اور صاحبزادوں کے ان معاملات اور ان تمام گفتگوئں کو منافقانہ سمجھیں، تو انہیں اہل ایمان ہی کون سمجھتا ہے۔ معاذ اللہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ اور نفاق ،، چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی ،، اور اگر بالفرض محال نفاق ہی تھا تو اسی وقت ہو گا اپنی خلافت میں کوفہ میں جب خطبہ میں اس بات پر قسم کھائی۔ کہ میں نے قاتلان عثمان کو بہت ہٹایا تو اس وقت کیا دباؤ تھا جب تو حضرت عثمان بھی شہید ہو لئے تھے اور قطع نظر شجاعت کے کار فرمائے خلافت بھی آپ ہی تھے مرے ہوئے سے تو نامرد بھی نہیں ڈرتے اور بے سر و سامان کو ہراس نہیں ہوتا، حضرت علی کو اس شجاعت اور اس شوکت پر کیا ہوا کہ اب تک بھی عثمان کا خوف نہ گیا اگر بزعم شیعہ اس میں کچھ نفاق ہوتا تو حضرت عثمان کی شہادت کے بعد بآواز بلند یوں کیوں فرماتے۔؟

دفاع عثمان کے لئے دیگر صحابہ کا رویہ

ادھر حضرت عبد اللہ بن سلام ہر صبح کو بلوائیوں کے پاس جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ حضرت عثمان کو قتل مت کرو ورنہ ان کے قتل کے بعد بہت سے فتنے فساد اٹھیں گے ،، اور حضرت حذیفہ بن الیمان جن کو منافقین کا علم تھا اور حضرت امیر نے بھی ان کے حق میں اس علم کی گواہی دی، چنانچہ شیعوں کی کتابوں میں موجود ہے بلوائیوں کو حضرت

عثمان کے قتل سے بتاکید منع کرتے تھے۔ اور یہ فرماتے تھے کہ ان کا مارا جانا بہت فتنوں کا باعث ہو جائے گا اب کوئی مولوی صاحب سے پوچھے کہ یہ لوگ جن کا مذکور ہوا صحابہ نہیں تو اور کون ہیں؟ پھر ان میں سے حضرت علی تو وہ ہیں کہ وہ اکیلے لاکھوں کے برابر ہیں۔ خصوصًا شیعوں کے نزدیک، سو اگر بالفرض والتقدیر صحابہ ہی نے ان کو قتل کیا ہوتا تو حضرت علی تو مانع ہی تھے، پھر مولوی صاحب نے کس خوبی پر ہجو کے موقع میں کہدیا کہ صحابہ رسول نے تنگ ہوکر اُسے قتل کیا، مگر میں ہی جو کا مولوی عمار علی صاحب بلکہ تمام شیعہ حضرت امیر اور بزرگان مسطور الاسم کو صحابہ نہیں سمجھتے، یہ تو اوباش کوفہ اور بدمعاشان مصر اور منافقان امت کو صحابہ سمجھتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جو حضرت عثمان کے قتل کے لئے اکھٹے ہوکر آئے تھے۔ سو مولوی صاحب نے اپنے عندیہ کے موافق سچ ہی کہا ہے، نوف ہے اس عقل ناہنجار پر کہ اپنے مذہب کے پابند بھی تو نہیں، بہرحال یہ جو مولوی صاحب نے لکھا ہی کہ صحابہ نے تنگ ہوکر قتل کیا سراسر بہتان اور دروغ صریح ہے پر جسے نہ خدا کا ڈر ہو نہ خلق کی شرم وہ جو چاہے سو کرے مگر ہم تو اس بے حیائی اور اس جرأت پر غش ہیں کہ کس دلاوری سے فرماتے ہیں اگر سند مطلوب ہو تو روانہ کردی جاوے۔

ع۔ چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد

حضرت علی پر بزدلی کا بہتان

اور یہ جو کچھ جناب مولوی صاحب حضرت عائشہ اور حضرت علی کی جنگ کے باب میں رقم فرماتے ہیں کہ ان کی باہم بہتر جنگ نہیں ہوئیں ہیں اور جہاد مال دنیا کے واسطے نہیں ہوتا یہ بجا درست، مگر تعجب ہے کہ اس بات میں مولوی صاحب نے کچھ جھوٹ کیوں نہیں بولا ہم جانیں یہ مثل سچی ہے اَلْکَذُوْبُ قَدْ یَصْدُقُ یعنی جھوٹا کبھی سچ بھی بول دیتے لیکن تاہم بھی حق سے چشم پوشی کر ہی گئے، حضرت علی کے صحابہ ثلثہ سے جہاد نہ کرنے کو اس وجہ پر محمول کرتے ہیں کہ حضرت علی کے پاس انصار اور مددگار کب تھے۔ کوئی مولوی صاحب سے پوچھے کہ انصار اور مددگار کی ضرورت جہاد میں فقط اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ تن تنہا آدمی مجمع کثیر کے مقابلہ میں کیا کرے گا؟ سو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر بوجہ نہ ہونے انصار کے قبل مدینہ منورہ کو آنے کے جہاد نہ کیا تو بجائے خود

تھا کہ آپ میں تن تنہا تاب مقابلہ کفار نہ تھی۔ حضرت امیر کو کیا عذر تھا جو انہوں نے تن تنہا جہاد نہ کیا دیکھو تو وہ خود اپنے حال میں کیا فرماتے ہیں:۔

حضرت علی تمام دنیا پر بھاری تھے

نہج البلاغت میں جو اصح الکتب شیعہ ہے علامہ رضی نقل کرتے ہیں۔

قَالَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِنِّیْ وَاللہِ لَوْ لَقِیْتُھُمْ وَاحِدًا وَّھُمْ طِلَاعُ الْاَرْضِ کُلِّھَا مَا بَالَیْتُ وَلَا اسْتَوْحَشْتُ وَاِنِّیْ مِنْ ضَلَالِھِمُ الَّتِیْ فِیْھَا وَالْھُدَی الَّذِیْ اَنَا عَلَیْہِ لَعَلٰی بَصِیْرَۃٍ مِّنْ نَّفْسِیْ وَیَقِیْنٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاِنِّیْ اِلٰی لِقَاءِ اللہِ وَلَحُسْنِ ثَوَابِہٖ لَمُنْتَظِرٌ وَّرَاجٍ۔	یعنے فرمایا حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے کہ تحقیق قسم اللہ کی اگر میں ان سے تن تنہا ملوں اور وہ اس کثرت سے ہوں کہ تمام روئے زمین کو ڈھکے ہوئے ہوں تو میں کچھ پروا نہ کروں اور نہ گھبراؤں اور مجھے انکی گمراہی اور اپنی ہدایت (جانو آنکھوں سے نظر آ رہی ہے) اور خدا کی طرف سے اس کا یقین ہو گیا ہے اور میں اللہ تعالےٰ کے ملنے اور اس کے اچھے ثواب کا منتظر اور امیدوار رہوں۔ فقط

جو شخص کہ تمام روئے زمین کے آدمیوں بلکہ اتنے آدمیوں سے بھی جو زمین کو ڈھک لیں تن تنہا نہ ڈرے اس کو انصار اور مددگار کی کیا حاجت؟ ہاں اماموں کی موت اپنے اختیار میں نہ ہوتی تو یوں بھی کہہ سکتے کہ نہ گھبرانے اور نہ پروا کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آدمی مارا بھی نہ جائے شاید اس سبب سے جہاد نہ کیا ہو آپ نے سمجھا میں تن تنہا لڑوں گا تو فتح تو معلوم مارا ہی جاؤں گا پھر کیا حاصل؟ جہاد اعلاء دین کے لئے ہے جب وہ تو حاصل نہ ہو اور فقط جان ہی جاتی رہے پھر جہاد کاہے کے لئے کیجیئے؟ کچھ خدا کو فقط جان گنوانا تو مطلوب نہیں۔

حضرت علی شجاعت میں بے مثل اور اپنی موت پر قابو یافتہ تھے (بزعم شیعہ)

اور درصورتیکہ امام کا انتقال اس کے اختیار میں ہو چنانچہ کلینی نے اس کو ثابت کیا اور تمام امامیہ اس پر متفق ہیں تو پھر تن تنہا جہاد میں وہ ترقی دین ہوتی کہ مجمع کی صورت میں ہرگز ممکن نہیں مددگاروں کی وجہ سے اگر آدمی نہ مارا جائے تو کرشمے کی بات نہیں ہاں تن تنہا ہو کر پھر

تمام جہان جس کو نہ مار سکے اس سے زیادہ اور کیا معجزہ ہوگا۔ ہندو جو عجائب پرست ہیں اگر ایسا معجزہ کسی سے دیکھ لیں تو بیشک پکار اٹھیں لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ایک دو دفعہ بھی اگر ایسی لڑائی لڑ لیتے تو بہت سے بہت تکلیف ہوتی تو اتنی ہی ہوتی کہ آپ زخمی ہی ہو جاتے یا بیہوش ہو جاتے لیکن عموماً یہ اعتقاد لوگوں کے دل میں بیٹھ جاتا۔ کہ پھر تے تو نکلتا اور موافق مخالف سب حلقہ بگوش حضرت امیرؓ ہو جاتے اور دین کی ایسی ترقی ہوتی کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کرات مرات کثیر کثیرا انبوہ سے جہاد کرنے میں وہ ترقی نہ ہوئی تھی کیونکہ کفار غلبۂ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بوجہ جمعیت سمجھ کر معتقد نہ ہوئے تھے اسی واسطے اپنے غلبہ کی بھی امید رکھتے تھے اور لڑنے سے دریغ نہ کرتے تھے اگر حضرت امیر تن تنہا لڑتے تو جو مطلب کہ حضرت امام ہمام امام مہدی کے آنے پر موقوف تھا وہ بھی حاصل ہو جاتا اور اہل بیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ گذرا وہ ظہور میں نہ آتا۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ لڑنا تو شے دیگر حضرت امیر تو اصحاب ثلٰثہ کے سامنے کبھی اتنا بھی نہ بولے جتنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ابوجہل اور امیہ بن خلف اور ابولہب اور ولید بن عقبہ وغیرہم کے سامنے بول لئے تھے، طرفہ تماشا ہے کہ جناب سرور کائنات کے اس زور اور بل اور قوت اور شجاعت کے باب میں کوئی روایت نہو، اور وہ تو حق گوئی کی بدولت کفار نگونسار کے ہاتھ سے عالم تنہائی میں کیا کیا جفائیں اٹھائیں یہاں تک کہ علاوہ دشنام ہائے ناانجام اور دست درازی ہائے بے اندازہ کی نوبت یہ پہنچی کہ گھر بار سب کو الوداع کیا۔

حضرت علی نے پوری زندگی خوف وذلت سے گذاری (بزعم شیعہ)

حضرت امیر کو ایک دفعہ بھی یہ نوبت نہ آئی کہ علی الاعلان حق گوئی اختیار کریں اور جفائیں اٹھائیں یا مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے شرف ہجرت کو اضعاف مضاعف فرماتے۔ بلکہ ہم پیالہ اور ہم نوالہ انہیں کے پیچھے نمازیں پڑھتے عید جمعہ میں انہیں کے خطبہ سنتے انہیں سے رشتہ پیوند قرابت پیدا کرتے تمام عمر یوں ہی گذاری اور بھی کچھ نہیں ہو سکتا تھا تو جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تقیہ نہ کیا تھا آپ بھی نہ کرتے، القصہ حضرت امیر کے جہاد نہ کرنے کو اس بات پر محمول کرنا کہ آپ کے ساتھ انصار اور مددگار نہ تھے کمال سفاہت ہی بلکہ درپردہ حضرت امیر کی تکذیب

کرنی ہے تو حضرت امیر تو یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے مقابلہ میں سارا جہان بھی آ جائے تو کچھ اندیشہ نہیں، اور پھر بوجہ موت کے اختیاری ہونے کے تنہائی کی صورت میں اور امید بہبودی تھی، اور مولوی صاحب یوں ارشاد فرمائیں کہ حضرت امیر انصار کے محتاج تھے معہذا اور کتابوں کو تو پلٹ کر دیکھیں انصار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بزعم شیعہ سب انصار و مددگار حضرت امیر تھے، اولاد انصار آپ کی مددگار رہی آپ کے ایام خلافت میں اکثر اولاد انصار آپ کے ساتھ تھی، پھر کیا وجہ کہ آپ نے اصحاب ثلٰثہ کے زمانہ میں جہاد نہ کیا؟ انصاف یوں ہے کہ حضرت امیرؓ دل معین و مددگار خلفائے ثلٰثہ رہے خصوصاً شیخین، کہ آپ نے ان کی تعریفیں اپنی خلافت میں بھی کی ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ زمانہ تقیہ کا نہ تھا باعتقاد جمہور امامیہ اس زمانہ میں آپ پر تقیہ حرام تھا۔ چنانچہ پہلے مرقوم ہو چکا، اور نیز اس زمانہ میں ان کا انتقال ہو چکا تھا مرے ہوئے سے تو نامردوں کو بھی خوف نہیں ہوتا چہ جائیکہ حضرت علی؟ پھر ان سب وقائع کے ملاحظہ کے بعد اور حضرت علی کی شجاعت اور کمالات اور قوت ایمانی کو خیال کر کے اہل فہم کو تو بجز اس کے خیال میں نہیں آسکتا کہ حضرت علی کا سکوت فقط اسی وجہ سے تھا کہ ان کو خلیفہ برحق سمجھتے تھے،

حضرت علی باوجود بے مثل شجاعت کے جگر گوشۂ رسول کو فدک نہ دلا سکے

باقی جناب مولوی صاحب کا یہ ارشاد کہ جہاد مال دنیا کے لئے ہوتا ہے ہر چند درست ہے لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ مظلوم کی نصرت دین میں سے ہے یا دنیا میں سے؟ اور مظلوم بھی کون جگر گوشۂ جناب سید الاولین والآخرین، اگر ایسے مظلوموں کی نصرت داخل دین ہے تو حضرت علی نے باوجود اتنی استطاعت کے کہ اکیلے سارے جہان کا مقابلہ کر سکتے تھے اور اپنی جان کا کچھ زیان بھی نہ تھا معہذا انصار ان کے انصار تھے کیوں حضرت زہرا کی مدد نہ کی؟ اگر حضرت زہرا معاف کر دیتی جب بھی ایک بات تھی حسب الارشاد مولوی صاحب موصوفؒ تادم واپسیں ابوبکر صدیق کا ظلم ان کے پیش نظر تھا اور اگر یوں کہیے کہ نصرت مظلوم کار دنیاوی ہے تو دنیا کی خوبی اور بزرگی تو سب ہی جانتے ہیں اس صورت میں نصرت مظلوم اگر ممنوع بھی نہ ہوگی تو موجب ثواب بھی نہ ہوگی واجب تو درکنار، پھر باینہمہ ترک نصرت حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے جو سینہائے شیعہ لبریز شکایت صحابہ اور اولاد صحابہ ہیں محض بیجا ہوا لیکن ہم جانتے ہیں کہ مولوی صاحب نصرت مظلوم کو منجملہ دین بلکہ واجب

ہی قرار دیں گے کیونکہ اول تو کلام اللہ اور احادیث طرفین اس مضمون سے مشحون ہیں، دوسرے صحابہ کے مطاعن کی کوئی بات چاہیئے مولوی صاحب تو اس پر غش ہیں بلا سے حضرت امیر پر بھی حرف آجائے مگر ہمیں خدا کی ذات سے یقین ہے کہ ہم نے جو کچھ تقیہ کے باب میں اوپر لکھا ہے اگر مولوی صاحب بغور دیکھیں تو زبان سے بھی نہ کہیں گے تو دل سے تو بیشک اس بات کے معتقد ہو جائیں گے کہ حضرت امیر کا اصحاب ثلثہ سے بیعت کرنا اور فدک کے نہ دینے پر سکوت کرنا سب بوجہ حقانیت اصحاب ثلثہ تھا نہ بوجہ تقیہ۔ اور آگے جو کچھ آتا ہے۔ انشاء اللہ وہ تقریر ماسبق کی اور تاکید کرے گا۔ اس مجموعہ کو دیکھ کر سب کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت امیر کی وہ لوگ زیادہ قدر کرتے ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ آپ کسی سے ہارے ہوئے نہ تھے اور بسبب ضعف اور ناتوانی کے خلفاء کے ساتھ موافقت نہ رکھتے تھے بلکہ محض خدا واسطے۔ یا وہ لوگ جو یوں کہتے ہیں کہ آپ ذلیل و خوار بے سر و سامان ناتوان ناچاری کے باعث اطاعت کرتے تھے اور آپ کے دل میں کچھ تھا اور زبان پر کچھ تھا تمام عمر اخفاء حق اور کتمان دین میں مصروف رہے، اور باوجودیکہ آیہ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (جس کا یہ مضمون ہے کہ خلط ملط مت کرو حق کو باطل کے ساتھ، اور مت چھپاؤ حق کو جان بوجھ کر) آپ کو یاد تھی پھر بھی حضرت اصحاب کے ساتھ ایسے ہم پیالہ اور ہم نوالہ ہوئے کہ بظاہر حق و باطل کی تمیز دشوار ہوگئی چنانچہ گروہ اعظم اہلسنت اسی دھوکے میں اصحاب ثلثہ کی حد سے زیادہ توقیر کرنے لگے اور معاملہ سب برعکس ہوگیا دین اصلی بہت ضعیف اور مخفی رہ گیا۔

حضرت ام کلثوم کے نکاح کی بحث

تیسرا مطلب حضور کے رقیمہ میں یہ ہے کہ حضرت ام کلثوم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نواسی جو حضرت علی کے صلب اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہما کے شکم سے تھیں ان کا نکاح حضرت محمد بن جعفر طیار سے ہوا تھا ہر چند یہ جواب سوال سائل پر بظاہر منطبق ہے لیکن حقیقت میں دیکھیے کہ یہ جواب سوال سائل سے ایسی ہی نسبت رکھتا ہے جیسے کہ کسی گاہک کے اس سوال کے ساتھ کہ لالہ تیل بھی ہے لالہ کا یہ جواب ہاں میاں آلو بھی ہے اتنا تو مولوی صاحب بھی سمجھتے ہوں گے کہ سائل کی غرض اس بات کے پوچھنے سے کہ حضرت

علی کی بیٹیوں کا نکاح کس کس سے ہوا یہی ہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ حضرت ام کلثوم دختر مطہرہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عمر سے ہوا یہ صحیح ہے، یا غلط ہے؟ اور یہ بھی احتمال ہے کہ مولوی صاحب نہ سمجھے ہوں اس لئے کہ بات بھی تو بہت مشکل ہے بہرحال جناب مولوی صاحب نے اس جواب میں طرفہ چالاکی کی ہے کہ جواب کا جواب دے دیا اور بات کی بات رکھ لی مگر نہ معلوم اس جواب میں پہلی چال کیوں بھول گئے یا اور کوئی عمدہ مصلحت نظر آئی یہ تو حضرت ام کلثوم کی مولوی صاحب کی طرف شکایت ہی رہ گئی کہ ان کی خالاؤں کو تو مولوی صاحب نے جفاء قطع نسب سے مستحق اجر عظیم کیا انہوں نے کیا قصور کیا تھا جو مولوی صاحب نے اس عنایت سے محروم رکھا؟ کیا وہ اہل بیت میں سے نہ تھی جو اس جفا سے دریغ کیا مگر مولوی صاحب کی طرف سے میں جواب دیئے دیتا ہوں اَلْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّم یعنے بزرگی پہلوں ہی کے لئے ہے" اس مثل کے خلاف کیونکر کر دیں، شاید ملا زمان مولوی صاحب کو یہ گمان ہوا ہو کہ حضرت ام کلثوم بنت سیدۃ النساء کی تزویج کا قصہ حضرت عمر سے بہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کے نکاح کے جو حضرت عثمان سے ہوا تھا ایک جدید امر ہے اور تازہ بات، مبادا اس کا کوئی جاننے والا ہو اور قلعی کھل جائے مگر میں ذمہ کش ہوں اہل سنت ان دونوں قصوں کو یکساں پرانا سمجھتے ہیں اور اس فرق کو فرق نہیں سمجھتے۔ اب کے جناب مولوی صاحب اگر میر نادر علی صاحب کو یہ مضمون لکھ کر کہ حضرت ام کلثوم حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی بیٹی ہی نہ تھیں اصلاح تحریر متقدم کر دیں اور اندیشہ بدظنی سنیاں ہو تو عذر بدا موجود ہے آپ کچھ خدا سے تو زیادہ نہیں؟ جب خداوند کریم کو باایں ہمہ علم غیب بدا واقع ہوتا، تو آپ تو آدمی ہی ہیں۔

القصہ مصلحت یوں ہے کہ اسماء بنت عمیس کی طرف منسوب کر دیجئے اور جھوٹ ہے تو بلا سے "چو آب از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یک دست"، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کی نسبت میں تصرف کیا ہے نواسی کے نسب میں بھی سہی، معہذا اور ابنائے روزگار فقط دنیا کے لئے سینکڑوں جھوٹ بولتے ہیں آپ نے اگر دو جھوٹ حفظ دین کے لئے بول دیئے تو کیا غضب ہوا بلکہ بنظر پاس ننگ و ناموس دین اور متابعت

بزرگان اور ائمہ اظہار امیدِ ثواب عظیم ہے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا تقیہ ہے۔

عمارعلی کی تلبیس لیکن جناب مولوی صاحب کے لوازم رائے زنی اور مشورہ گوئی میں سے ہے۔ کہ جملہ مراتب نفع و نقصان سے اطلاع کر دیجئے۔ اس لئے معروض ہے کہ باایں ہمہ منافع ایک اس میں نقصان بھی ہے کہ جناب باری تعالےٰ یوں بھی فرماتا ہے وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ یعنی حق باطل کو مت رلاؤ اور نہ چھپاؤ حق کو جان بوجھکر، دوسرے یوں بھی فرماتا ہے وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ مَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ یعنی نہ چھپاؤ گواہی اور جو چھپائے گواہی تو اس کا دل گنہگار ہے، ان دونوں آیات پر نظر کر لیجئے مگر مجھ سے غلطی ہوئی آپ نے اب کون سی (حق و باطل کے رلانے اور شہادتِ حق کے چھپانے میں) کمی کی ہے جو اس کا اندیشہ ہو اس سے زیادہ اور کیا رلانا ہوگا کہ حضرت عمر کے نکاح کا نام ہی نہ لیا بلکہ اصل رلانا تو یہی ہے اگر صاف انکار کر دیتے اور کہدیتے کہ حضرت زہرا کے یا حضرت علی کے کوئی بیٹی ہی نہ تھی تو یہ رلانا نہ تھا اسے انکار کہتے ہیں اور عربی زبان میں اسے حجود کہتے ہیں اور یہ جو اکثر آتا ہے وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا تو اسی مقام میں آتا ہے اور یہ انداز کہ جواب کا جواب ہو جائے اور پھر بات ہاتھ سے نہ جائے جیسے مولوی صاحب نے اس مقام میں کیا ہے تو یہ عین حق و باطل کا رلا دینا ہے معہذا حق باطل کے خلط ملط کر دینے میں جو برائی ہے تو فقط اسی سبب سے ہے کہ دوسرا کوئی دھوکا نہ کھائے درصورتیکہ اہل سنت جماعت نے شیعوں کی روایات سے یہ ثابت کر دیا ہو کہ حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے ہوا تو کیا اندیشہ؟ وہ دھوکے کی بات ہی نہ رہی جس سے ڈریئے اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو یہ دیکھیئے آپ کے یہاں کی روایتیں اس باب میں ہمارے پاس موجود ہیں۔

آپ اپنی عادتِ سلف دغا و فریب کو نہ چھوڑ بیٹے۔

فاروق سے ام کلثوم کا نکاح حضرت عباس نے کیا تھا قاضی نور اللہ صاحب شہید رابع حضرت عباس عم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے احوال میں رقم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حضرت عباس سے بہت محبت تھی اور ان کے حق میں یوں فرماتے تھے کہ عباس میرے باپ کی جگہ ہے اور سوائے اسکے بہت ہی کچھ ان کے فضائل لکھے، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ حضرت عباس نے حضرت عمر کے کہنے کے موافق حضرت امیر سے حضرت ام کلثوم کے نکاح کی خواستگاری کی حضرت امیر نے

اول بار انکار فرمایا دوسری دفعہ سکوت فرمایا، بعد ازاں حضرت عباس نے خود حضرت ام کلثوم کا حضرت عمر سے نکاح کر دیا حضرت امیرؓ بوجہ تقیہ منع نہ کر سکے اس لئے چپکے ہو رہے یہ ہیں قاضی صاحب کا بیان۔

بزعم شیعہ حضرت عباس اعراف میں ہوں گے میں نے اپنے اعتقاد کے موافق حضرت عباس اور حضرت عمر کے نام پر لفظ حضرت لگا دیا ہے ورنہ قاضی صاحب سے اس تعظیم کی کسے امید ہے؟ اس لئے کہ حضرت عمر تو ان کے نزدیک حضرت عمر ہیں وہ حضرت عباس کے حق میں بھی اسی بیان کے پس و پیش میں یوں لکھتے ہیں بلکہ یہ تقریر بھی بطور دلیل ہی بیان کی ہے اور مطلب اصلی ان کا یہ ہے کہ وہ اعراف میں ہوں گے، لیکن حق بات چھپی نہیں رہتی عاقل خود جانتے ہیں کہ جو ایسے محبوب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہوں وہ اعراف میں کیوں کر رہیں گے؟ ان کے تو نیازمند بھی اگر جنت میں چلے جائیں تو کچھ بعید نہیں، حیف صد حیف محبان حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا تو یہ رتبہ ہو کہ ان کے محبوں کو کوئی گناہ ضرر نہ کرے بلکہ گناہ تو گناہ کفر بھی ضرر نہ کرے،

محبوب رسول اعراف میں اور یہودی و نصرانی جنت میں چنانچہ رضی الدین لغوی نے زینا ابن اسحٰق نصرانی کے جنتی ہونے کا فقط چند بیتوں[1] کی تصنیف کے باعث جن کے مضمون سے محبت حضرت علی ٹپکتی ہے حکم کر دیا ہے حالانکہ انہیں ابیات سے اس کا نصرانی ہونا ثابت ہے اور ایسے ہی ابن فضلون[2] یہودی کو سب علماء (اس فرقہ کے) بزرگ سمجھتے ہیں اسکا باعث بھی یہی دو تین بیتیں ہیں۔ القصہ حضرت علی کا تو یہ رتبہ کہ ان کے محب بھی اگرچہ کافر ہی کیوں نہ ہوں جنت میں جائیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے محبوب بھی جنت میں نہ جانے پائیں اعراف سے آگے

شعر زینا النصرانی [1]

عدی و تیم لا احاول ذکرھم — بسوء ولکننی محب لھاشم

وما یعترینی فی علیّ واھلہ — اذا ذکروا فی اللہ لومۃ لائم

یقولون ما بال النصاری تحبھم — واھل النھی من اعرب واعاجم

فقلت لھم انّی لاحسب حبھم — سری فی قلوب الخلق حتی البھائم

لابن فضلون [2]

رب ھب لی من المعیشۃ سولی — واعف عنی بحق آل الرسول

واسقنی شربۃ بکف علیّ — سید الاولیاء بعل بتول

۲۸

قدم رکھنے کی اجازت نہ ہو اور پھر محبوب بھی کون؟ چچا جان اور وہ بھی مسلمان، کیونکہ اگر کافر ہوتے تو اعراف تک کی نوبت میسر کہاں آتی۔ کیونکہ کفار کے لئے تو سعیر تیار ہے فرماتے ہیں اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَ وَ اَغْلٰلًا وَّسَعِیْرًا یعنی ہم نے کافروں کے لئے تیار کر رکھی ہیں زنجیریں اور طوق اور سعیر، دوسری آیت وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَھُمْ نَارُ جَھَنَّمَ یعنی جو لوگ کافر ہوئے ان کا ٹھکانہ بجز جہنم کے اور کچھ نہیں، بہرحال قاضی صاحب کی تحقیق کی خوبی دیکھنی چاہیئے کہ کس دعوی کو کس دلیل سے ثابت کرتے ہیں اس سے واضح ہو گیا کہ حضرت علی بھی ان کو بجائے پدر بزرگوار ہی سمجھتے تھے اگر بالفرض اپنا چچا نہیں بھی چاہتا تھا تب اس وجہ سے کہ حضرت عباس کا فرمانا اس قابل نہیں کہ نہ مانیئے ان کا فرمانا قبول کر لیا۔ نہ کہ تقیہ کی وجہ سے چپکے ہو رہے مگر حق گمراہ کرتا ہے۔ تو الٹی ہی سمجھ میں آتی ہے۔

حضرت علی کی خاموشی رضامندی کی وجہ سے تھی | بہرحال اتنی بات ثابت ہے کہ حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے بالضرور ہوا ہے، باقی رہا عذر تقیہ، سو اہل عقل آپ پہچانتے ہیں کہ یہ خیال خام اہل تشیع نے ورنہ یہ روایت خود ہی اس کی تکذیب کرتی ہے کہ یہ سانحہ بوجہ تقیہ حضرت امیر پر گذرا ہو کوئی مسلمان سمجھ سکتا ہے کہ اول تو حضرت امیر اور پھر تقیہ؟ یہ ایسی بات ہے کہ جیسے کوئی یوں کہے کہ شیر ہو کر گیدڑوں سے ڈرتا ہے، اور پھر حضرت امیر کا تقیہ بھی ایسے قصہ میں کہ کوئی کافر بے دین اور بے غیرت اور بے تمکین بھی گوارا نہ کرے، معہذا یہ بھی منجملہ محالاتِ عادی ہے کہ محبوب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آپ ہی کے خاندان کے ساتھ ایسی جفا ظہور میں آئے اس لئے کہ محبت نبوی تو میزان حق و باطل ہونی چاہیئے۔ جس طرف کو آپ کی محبت جھکی وہ حق ہو دوسری جانب باطل، الغرض محبوب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لاریب اہل حق میں سے ہوں گے پھر اہل حق سے کہیں ہو سکتا ہے کہ آپ کی نواسی کو ایک کافر بے دین کے حوالہ کر دے؟ معہذا ہم نے مانا کہ بوجہ تقیہ ہی حضرت امیر نے یہ نکاح حضرت عمر سے کر دیا لیکن تاہم یہ عذر تقیہ بدتر از گناہ ہے۔ حضرت عمر کے ساتھ حضرت علی کو بھی کیوں ساتنے ہو؟

فاروق اگر کافر ہوں تو امام علی بھی محفوظ نہیں | بالجملہ یہ نکتہ محفوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ اگر حضرت علی

مسلمان ہیں اور کامل الایمان ہیں تو حضرت عمر ضرور باایمان ہیں کہ ان کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح کر دیا اور حضرت عمرؓ اگر نعوذ باللہ کافر ہیں تو حضرت علیؓ نعوذ باللہ پہلے ہیں، کافر نہیں فاجر سہی کہ اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کر دیا، اپنے آپ کیا تو کفر میں کچھ شک نہیں۔ اور زبردستی کر دیا تو باوجود اس استطاعت کے اتنی بے عزتی نعوذ باللہ کہ ادنی چمار بھی گوارا نہ کرے حضرت علی تو در کنار، الہٰی تو خوب جانتا ہے کہ میں اس عقیدہ سے بدل و جان ناخوش ہوں، اور حضرت زہرا کی صاحبزادی کا یہ قصہ بناچاری لکھتا ہوں کہ کسی طرح مولوی عمار علی صاحب حضرت علی کی طرف سے بدظن نہ رہیں۔

تزویج ام کلثوم کا کتب شیعہ سے ثبوت | اور خیر یہ بھی نہ سہی ہم بھی دہو نگے تو ان شاء اللہ تعالیٰ قاضی صاحب کو اماموں کے اقوال سے جھوٹا کریں گے کتب امامیہ میں صحیح صحیح روایتیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ حضرت امیر نے حضرت عمر کو لائق فائق سمجھ کر اپنی صاحبزادی مطہرہ کا نکاح کیا نہ کہ جبراً کرہاً سُئِلَ الْاِمَامُ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِیِّ الْبَاقِرُ عَنْ تَزْوِیْجِھَا فَقَالَ لَوْلَا اِنَّہٗ رَاٰہُ اَھْلًا لَّمَا کَانَ یُزَوِّجُھَا اِیَّاہُ وَکَانَتْ اَشْرَفَ نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ جَدُّھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَخَوَاھَا الْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ عَلَیْھِمَا السَّلَامُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ وَاَبُوْھَا عَلِیٌّ ذُو الشَّرَفِ وَالْمَنْقَبَۃِ فِی الْاِسْلَامِ وَاُمُّھَا فَاطِمَۃُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَجَدَّتُھَا خَدِیْجَۃُ بِنْتُ خُوَیْلِدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا حاصل اس کا یہ ہے کہ حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ سے حضرت ام کلثوم کے حضرت عمرؓ سے نکاح کی وجہ پوچھی گئی، انہوں نے فرمایا کہ اگر حضرت علی حضرت عمر کو حضرت ام کلثوم کے لائق نہ سمجھتے ہرگز ان کا نکاح ان سے نہ کرتے، وہ سارے جہان کی عورتوں سے زیادہ شرافت والی تھیں، اس لئے کہ نانا تو ان کے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور دو بھائی ان کے حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما جو جوانان جنت کے سردار ہیں، باپ ان کے حضرت علی رضی اللہ عنہ جو اسلام میں شرف اور منقبت رکھتے ہیں اور اماں ان کی حضرت

فاطمہ سیدۃ النساء رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیٹی، اور نانی ان کی خدیجۃ الکبریٰ خویلد کی بیٹی رضی اللہ عنہا فقط ،،

شیعہ کو اہل بیت سے محبت نہیں صحابہ سے عداوت ہے ۔ اس روایت کو دیکھئے اور حضرت قاضی صاحب کی بناوٹ کو دیکھئے زوف اس دعوئ محبت پر کہ اس پردہ میں کیا کہتے ہیں، مشہور تو یوں کرتے ہیں کہ ہم کو اہل بیت سے محبت ہے اور اس لئے صحابہ سے عداوت ہے، اور ہماری تشخیص میں یوں آتا ہے کہ آپکو اصل صحابہ سے عداوت ہے اور اس سبب اہل بیت کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، سو اہلبیت کب اس طرح کھنچتے ہیں؟ بلکہ اس طرف سے کھنچتے ہیں اور کیونکر نہ کھنچیں۔ امام محمد باقر رضی اللہ عنہ پر تقیہ حرام تھا چنانچہ بحث تقیہ میں اس کی سند گذر چکی، ان کے فرمانے کے بعد بھی حضرت علی اور حسنین کیا ان کے ساتھ بنی ہاشم کو بے غیرت اور بے حیا بتلائے جاتے ہیں، اور طاہرہ مطہرہ جگر گوشہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جو اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ لِیُذۡهِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَهِّرَکُمۡ تَطۡهِیۡرًا کی بشارت تطہیر میں داخل ہے، بدشنام وزنا نعوذ باللہ پیش آتے ہیں، خدا ان خبیثوں کو سمجھے پھر اہل بیت کا ان پر غصہ نہو تو اور کیا ہو جس کے دل میں ایمان ہے وہ ایسی واہیات کو سن کے کانپ اٹھتے ہیں پر خدا جانے ان تیرہ دردوں کو کیا ہوا کہ اپنے اس عیب قبیح کے ہنر بنانے کے لئے اماموں پر بھی بہتان باندھتے ہیں یہ ہے ایمان کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ پر بہتان باندھتے ہیں اور اپنا گناہ ان... کے سر دھرتے ہیں اور اس نکاح کے عذر میں یہ ناپاک الفاظ نقل کرتے ہیں کہ جن کی نقل سے بھی جی ڈرتا ہے ترجمہ تو درکنار وہ الفاظ یہ ہیں وَهُوَ اَوَّلُ فَرۡجٍ غُصِبَ مِنَّا، ایخداوند عالم الغیب تجھ پر روشن ہی کہ میں بدل وزبان اس خیال ناپاک سے بری ہوں اور یوں سمجھ کر کہ نقل کفر کفر نباشد بایں خیال نقل کرتا ہوں کہ شاید کوئی بے خبر ان دغابازوں کے دام میں پھنسا ہوا ان کے کہ کفریات سن کر شاید راہ راست پر آجائے۔

حب حضرت علی کفر کے باوجود اگر جنتی بناتی ہے تو تبرا بھی بنا دیگی افسوس ایک حضرت عمر کی عداوت کے سبب خاندان نبوی کو تو اتنا بٹہ لگا دیا پر یہ نہ ہو سکا کہ تبعدق اہل بیت حضرت عمر

ہی کو شامل رحمت اور مغفرت خداوندی سمجھ لیتے کیا یہ نسبت تزویج زینیا بن اسحق نصرانی اور ابن فضلون یہودی کے اشعار سے بھی گئی؟ حب علی رضی اللہ عنہ میں یہ تاثیر ہی کہ ایمان کی بھی ضرورت نہیں، حالانکہ کلام اللہ سے کفار کا ٹھکانا جہنم ہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ مرقوم ہو چکا پھر کیا اتنی بھی تاثیر نہ ہوگی کہ اپنے واسطے داروں کو بخشوالیں، بہر حال علماء شیعہ حضرت ام کلثوم کے حضرت عمر سے نکاح ہونے میں متفق ہیں پر بعضے بھولے چوکے حق بات بول جاتے ہیں اور معنے بری طرح ادا کرتے ہیں سو ہمارا تو مذہب یہ ہے کہ خُذۡ مَا صَفَا وَدَعۡ مَا کَدِرَ لیکن مولوی عمار علی صاحب سب سے بڑھتے رہے انہوں نے سمجھا حق کو حق کہیئے تو مذہب کی خیر نہیں بلکہ مذہب تو مذہب سنیوں سے ہزار مرتبہ زیادہ حضرت عمر کا معتقد ہونا پڑے گا کہ وہ اہلبیت میں داخل ہو جائیں گے اور تقیہ کی صورت میں بھی باوجود جھوٹ بولنے کے وہی خرابی کی خرابی برسر، بلکہ اس سے زیادہ۔ کیونکہ بطفیل اہلبیت حضرت عمر کے ناحق میں اتنی خرابی نہیں جتنا بطفیل عمر اہل بیت کے نہ ماننے میں خرابی ہے خصوصاً حضرت امیر کے، اور درصورت تقیہ ظاہر ہے کہ کمال بے غیرتی اور بزدلی اور بے حیائی اور دین کی سستی اور حدود اور احکام میں مداہنت اور مداہنت بھی اس قدر لازم آتی ہے، سو مولوی صاحب نے ہمارے نزدیک بہت اچھا سمجھا کیونکہ جب جھوٹ بولنا ہی ٹھیرا تو معقول ہی کیوں نہ بولے گو کچھ زیادہ ہی سہی

چو آب از سر گذشت ؛ چہ یک نیزہ چہ یک دست

چونکہ مولوی صاحب کے اس حل سے فی الجملہ ہوشیاری ٹپکتی ہے تو عجب نہیں کہ اگر پتے کی بات کہی جائے تو ان کے دل میں لگ جائے اور شاید اس سبب سردست نہیں تو رفتہ رفتہ حق کو حق سمجھ جائیں ہمیں بھی لازم پڑا کہ کوئی اور روایت بھی بیان کریں کہ اس میں ایک تو مولوی صاحب کا حضرت عمر پر غیظ وغضب کم ہو جائے گا دوسرے کثرت روایات سے شرما کر شادان وفرحان نہیں تو ملتے ہی زبان سے شاید مان جائیں وہ روایت یہ ہے رَوَی ابۡنُ اَبِی الۡحَدِیۡد شَارِحُ نَهۡجِ الۡبَلَاغَةِ فِیۡ قِصَّةِ تَزۡوِیۡجِ اُمِّ کُلۡثُوۡم فَجَاءَ عُمَرُ اِلٰی مَجۡلِسِ الۡمُهَاجِرِیۡنَ بِالرَّوۡضَةِ وَقَالَ

زِفُّونِي زِفُّونِي قَالُوا بِمَاذَا يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ قَالَ تَزَوَّجْتُ
أُمَّ كُلْثُومَ بِنْتَ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ۔

حاصل یہ ہے کہ ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغت حضرت ام کلثوم کے نکاح کے قصہ میں بیان کرتا ہے کہ جس جگہ مہاجرین روضہ میں بیٹھے ہوئے تھے حضرت عمرؓ آئے اور یہ فرمایا کہ مجھے مبارک باد دو مجھے مبارک باد دو، انہوں نے کہا یا امیر المومنین کاہے کی مبارک باد؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے حضرت ام کلثوم علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے نکاح کیا ہے فقط، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اس نکاح سے بڑا افتخار تھا' اہل انصاف کے نزدیک تو یہی بات کفایت کرتی ہے کہ حضرت عمر کے معتقد ہو جائیں کیونکہ بظاہر افتخار اسی وجہ سے ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قرابت حاصل ہوگئی، اور کوئی یوں نہ سمجھے، لو ہم کون سے گلے پر چھری رکھے ہوئے ہیں۔

حضرت ام کلثوم سے فاروقی کی اولاد

اب مناسب یوں ہے کہ اس بات کا خاتمہ کیجئے پر بطور تنبیہ ایک اور امر معروض خدمت ہے بعضے امامیوں نے سنیوں کے سامنے شرم اتارنے کے لئے حضرت سارہ زوجہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں سے اخذ کر کے یوں بات بنائی ہے کہ حضرت عمر حضرت ام کلثوم پر قادر نہ ہوئے اور وجہ یہ ہوئی کہ ایک جن بیچ میں حائل ہو جاتا تھا۔ سو ہر چند اس جا جھوٹا ہونا اس روایت نامعقول سے بھی نکلتا ہے کہ جو حضرت امام جعفر صادق کی طرف سے بنالی ہے مگر بایں ہمہ تبواتر ثابت ہے کہ حضرت ام کلثوم کے شکم مبارک سے حضرت عمر کے ایک بیٹا پیدا ہوا ان کا نام زید رکھا، وہ جوان ہوئے آخر کو بیس برس کی عمر میں بنی عدی کی باہم کی خانہ جنگی میں شہید ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، اور ان کی والدہ بھی اسی روز بیماری میں انتقال کر گئی تھیں، اور نو جنازوں کو ایک دفعہ نکالا اور حضرت امام حسین اور حضرت عبداللہ بن عمر نے جنازہ کی نماز پڑھ کے دفن کر دیا اور یہ بھی نہ ہی یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ مدت العمر حضرت عمر کے پاس رہیں، حضرت سارہ کسی ایسے کی نواسی نہ تھیں۔ جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، جب ان کو ایک دم میں چھڑا دیا تو حضرت ام کلثوم کی تو زیادہ ہی قدر کرنی چاہیئے۔

باب مباحث فدک

الحمد للہ کہ مولوی عمار علی صاحب کی تمام افترا پردازیوں کے جواب سے فراغت پائی مگر جو کچھ انہوں نے دربارہ فدک زبان درازیاں اور افترا پردازیاں کیں ہیں اس کی مکافات میں حسب مثل مشہور جیسے کو تیسا اور جواب ترکی بہ ترکی، مناسب تو یوں تھا کہ ہم بھی کچھ نظم و نثر سے پیش آتے اور مولوی صاحب کی مہملات کے جواب میں مولوی صاحب کو بے نقط سناتے۔ مگر چونکہ ایسی خرافات کا بکنا پاجیوں کا کام ہے ہم کو کیا زیبا ہے کہ ایسی نازیبا باتوں میں مولوی صاحب کے ہمصفیر ہوں اور اپنی زبان کو گندہ کریں اور اہل عقل اور ارباب حیا سے شرمندہ ہوں؟ معہذا اصحاب ثلثہ کی اہانت کے انتقام میں مولوی عمار علی صاحب سے دست و گریباں ہونا تو ایسا ہی ہے جیسا چاند سورج پر تھوکنے کی سزا میں کتے کے کوئی پتھر لگائے یا آسمان کی طرف تھوکنے کے عوض میں کسی کم عقل ناہنجار کے منہ میں کوئی پیشاب کی دھار لگائے ظاہر ہے۔ کہ اول تو چاند سورج کو ان حرکات ناشائستہ سے کیا نقصان؟ بلکہ عقلا کے نزدیک اور دلیل رفعت مکان ہے؟ دوئم کجا شمس و قمر کجا سگ و کم عقل سگ نزاد؟ مساوات ہو تو ایک بات بھی ہے ورنہ سگ اور سگ مزاجوں کی اتنے میں کچھ عزت نہیں جاتی ہاں اپنی اوقات البتہ فی الجملہ خراب جاتی ہے۔ سو ایسے ہی اصحاب ثلثہ کو اول تو مولوی عمار علی صاحب جیسوں کی اہانت یا برا کہنے سے کیا نقصان؟ بلکہ الٹا باعث رفعت شان ہے۔ چاند سورج کی طرح وہ روشن ہوئے تو کتے ان پر بھونکے اور اوروں پر کیوں نہ بھونکے؟ دوئم کجا اصحاب ثلثہ کجا امثال مولوی عمار علی؟ جو ان کے برا کہنے کے عوض میں ان کو برا کہہ کے جی ٹھنڈا ہو اور دل کا بخار نکلے یہاں تو یہی نسبت مذکور ہے۔ سو مولوی عمار علی صاحب جیسوں کے برا کہنے میں ان کی تو کچھ عزت نہیں جاتی جو قصاص تبرا یا اہانت اصحاب ہو، ہاں اپنی اوقات خرافات میں صرف ہوگی۔ سو ہم کون سے مجتہد زمانی طوسی ثانی مولوی میرن صاحب کے چیلے چانٹوں میں سے ہیں جو عقل کی یہ شہادت در بارہ دشنام نہ سنیں "دشنام بمذہبے کہ طاعت باشد مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم" اور دشنام کو عبادت نہ سمجھ کر مولوی عمار علی صاحب کو گالیاں دے کر

ان کی عزت بڑھائیں اور مولوی عمار علی صاحب یا امثال مولوی عمار علی صاحب کو چھوڑ کر کسی بُرے کو بُرا کہیں تو کس کو کہیں۔

حبِ اہل بیت وحبِ صحابہ ایمان کے دو پر ہیں

اہلبیت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم تو ہمارے حق میں چشم و چراغ ہیں ہمارے نزدیک اعتقاد صحاب اور حبِ اہل بیت دونوں کے دونوں ایمان کے لئے بمنزلہ دو پر کے ہیں، دونوں ہی سے کام چلے ہے، جیسے ایک پر سے طائر بلند پرواز نصف پرواز تو کیا ایک بالشت بھی نہیں اڑ سکتا، ایسے ہی ایمان بھی بے ان دو پروں کے سہارے کے موجب فوز مقصود (جس کی طرف اُولٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ یا فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا وغیرہ میں اشارہ ہے) نہیں ہو سکتا بلکہ ایسا ایمان ایسا ہی ایمان ہے جس کا آیت لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا میں بیان ہے ہاں اگر ہم قدم بقدم حضرات شیعہ ہوتے تو جیسے انہوں نے موافق مثل مشہور غیروں کی بدشگنی کے لئے اپنی ناک کاٹ لی سنیوں کی ضد میں اصحاب کرام کو برا کہہ کے اپنے ایمان کا زیان کیا ہم بھی شیعوں کی ضد میں نعوذ باللہ اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہہ کر مثل خوارج و نواصب اپنے ایمان کو خراب کرتے لیکن ہم کو تو پابندی عقل و نقل سے ناچاری ہے شیعہ تو نہیں کہ مثل شتر بے مہار پراگندہ رفتار جائیں۔

حبِ اہل بیت وحبِ صحابہ ایمان کی دو آنکھیں ہیں

راہ کی بات تو یہ ہے کہ ہم کو دونوں فریق بمنزلہ دو آنکھوں کے ہیں کس کو پھوڑ دیں جس کو پھوڑیں اپنا ہی نقصان ہے بلکہ جیسے کوئی حسین متناسب الاعضا ہو کہ اس کی آنکھ ناک سب کی سب مناسب اور متناسب ہوں، اور پھر اس کی ایک آنکھ بیٹھ جائے تو دوسری آنکھ کی زیب بھی جاتی رہے گی، اور تس پر اگر بیٹھی ہوئی آنکھ کے حصہ کی فراخی بھی دوسری ہی آنکھ میں آجائے اور اس میں بجائے سپیدی کے بھی سیاہی ہی چھا جائے بجائے حسن ایسا قبیح المنظر ہو جائے کہ دلدادگان قدیمی اور عاشقان صمیمی بھی اس کی صورت پر لاحول پڑھنے لگیں، خاص کر دوسری آنکھ جو باقی رہی ہے بسبب اس کے کہ اپنے اندازہ سے زیادہ فراخ اور کشادہ اور سپیدی کی جا بھی سیاہی ہی ہو گئی ہے، ایسی بری اور بدشکل ہو جائے گی کہ کچھ نہ پوچھو بلکہ اگر چشم باقی ماندہ کو شعور اور اختیار ہو تو اپنی اسی حالت اصلی پر آجائے اور دوسری آنکھ کو بھی

بدستور قائم کر دکھلائے کیونکہ اپنا حسن بھی اصلی کیفیت اور دوسری آنکھ کی معیت میں ہے

شیعوں نے اپنے ایمان کی ایک آنکھ پھوڑ ڈالی

سو بعینہٖ یہی قصہ حضرات شیعہ کے ایمان کے ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، اعتقاد صحابہ اور حب اہلبیت جو بمقتضائے شہادات کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایمان کیلئے بمنزلہ دو آنکھوں کے ہیں (چنانچہ رسالہ ہٰذا کے ملاحظہ کرنے والوں پر پوشیدہ نہ رہے گا۔ ان دونوں آنکھوں میں سے شیعوں نے ایک آنکھ کو پھوڑ دیا اور اس کے حصہ کی فراخی اور کشادگی بھی بلکہ اس سے بھی زیادہ دوسری آنکھ کو دے کر اس کو خراب کر دیا۔ یعنے اعتقاد صحابہ کو جو بمنزلہ چشم ایمان ہے اپنے ہاتھوں کھو کر دوسری آنکھ یعنی حبِ اہل بیت کو اسقدر بڑھایا کہ صحابہ کے حصے کی محبت بھی انہیں کے لئے صرف کر دی، پھر جیسے کہ آنکھ میں سفیدی کی جا بھی سیاہی آجائے ان حضرات بزرگوار فرقہ مسمے بشیعہ نے بھی ایسا ہی کیا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ جیسے آنکھ میں تل اور سیاہی اور سفیدی غرض چند قسمیں ہوتی ہیں ایسے ہی عترت میں بھی چند قسمیں تھیں، اولاد اور ازواج اور سوا ان کے اور اقربا کیونکہ باتفاق اہل لغت عترت کے معنے خویش اور اقربا کے ہیں، سو ان سب میں سے حضرات شیعہ نے فقط اولاد کو اور اولاد میں سے بھی فقط دس بارہ کو اور سوا اولاد ایک آدھے کسی اور کو تو مخدوم و مکرم سمجھا باقی سب کے لئے تبرا ہے، پر جنکو اپنا پیشوا اور مقتدا بنایا اور مخدوم و مکرم ٹھیرایا ان کے حق میں محبت کو کچھ ایسا حد سے بڑھایا کہ گویا صحابہ باقی ماندگان عترت کے حصہ کی محبت بھی انہیں کے نثار کی، سو یہ بعینہ وہی مثل ہے کہ آنکھ اپنے اندازہ سے زیادہ کشادہ تو ہوئی تھی پر سفیدی کے عوض بھی سیاہی ہو گئی، شاید اس اجمال میں ناواتفان شیعہ کو بحکم مثل مشہور اَلْمَرْءُ يَقِيسُ عَلٰى نَفْسِهٖ کے احتمال جعل و تلبیس ہو اس لئے تفصیل اس اجمال کی ضرور کرنی پڑی، تاکہ اپنی کتاب اور اہل کتاب کی طرف مراجعت کر کے بآسانی تحقیق کر کے بعد تطبیق اس ہیچمداں کی تصدیق کریں۔

شیعوں نے عترت میں سے بعض کی تکریم کی اور اکثر پر تبرا کیا

سو تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضرات شیعہ حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم دختران مطہرہ حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم

کو سرے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں ہی نہیں سمجھتے یہاں تک کہ زبان زد خاص شیعہ یہ بات ہوگئی ہے عام تو درکنار خاص بھی اسی حساب سے عام ہی ہیں بلکہ عام سے بھی پرے، اور تو کیا کہوں، حالانکہ انہیں کی کتب معتبرہ سے ان دونوں مطہرات کا بہ نسبت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں ہونا ثابت ہوتا ہے، چنانچہ قریب ہی اس بات کی شرح مرقوم ہو چکی، اور حضرت عباس عم بزرگوار سید الابرار صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کی اولاد اور ایسے ہی حضرت زبیر بن العوام کو بھی داخل عترت نہیں سمجھتے، اور اس قرابت قریبہ پر بھی لحاظ نہیں کرتے حضرت عباس کی قرابت تو مشہور و معروف ہی ہے پر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بھی بسبب کثرت علاقہ ہائے قرابت گویا بمنزلہ برادر حقیقی کے تھے اول تو ان کی والدہ حضرت صفیہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عمہ اور ان کی دادی ہالہ بنت وہب بن عبد مناف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حقیقی خالہ اور ان کے باپ کی پھوپھی ام حبیب بنت اسد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دادی اور ان کی حقیقی پھوپی حضرت ام المومنین خدیجۃ الکبری رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ پھر ان سب کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہم زلف ان کی بیوی حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہن، ماسوا ان سب کے پانچویں پشت یعنی قصی بن کلاب میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جا ملتے ہیں، علماء نسب نے لکھا ہے کہ اتنی کثرت سے قرابت کے علاقے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے اور کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔

لیکن آفرین ہے حضرات شیعہ کو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اقرباء کے دشمن ہوں تو ایسے ہوں کہ حضرت زبیر جیسے قریب عزیز کو تو باوجودیکہ وہ مہاجرین اولین میں اور مجاہدین سابقین میں سے ہیں۔ اور سینکڑوں بشارات فرقانی اور وعدہ ہائے قرآنی ان لوگوں کی بزرگی پر گواہ ہیں۔ از جملہ کفار نگونسار اور منافقین بدکردار سمجھتے ہیں،

اہل بیت سے مراد کون ہیں؟

باقی رہیں ازواج مطہرات جو امہات مومنین یعنی سب مسلمانوں کی مائیں ہیں، ان کی نسبت جو کچھ حضرات شیعہ ثنا خوان ہیں سب ہی جانتے ہیں، حالانکہ اصل اہلبیت وہی ہیں کیونکہ اول تو اہل بیت کے معنے بعینہ اہل خانہ ہے اتنی بات تو اگر کچھ نہ جانتے ہوں

مولوی عمار علی صاحب بھی جانتے ہوں گے دوسرے لفظ اہل بیت جو کلام اللہ میں واقع ہوا ہے تو ازواج مطہرات ہی شان میں وارد ہوا ہے۔ گو حضرت علی اور حضرت زہرا اور حضرات حسنین بھی بوجہ عموم لفظ یا بہ سبب التماس حضرت رسالت پناہی صلے اللہ علیہ وسلم اہلبیت ہونے کی فضیلت میں داخل ہو گئے ہیں مزید تسکین کے لئے جس آیت میں یہ لفظ واقع ہے ما قبل اور مابعد سمیت لکھ کر اس کا ترجمہ لکھے دیتا ہوں تاکہ سب شیعہ و سنی متنبہ ہو جائیں

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى وَأَقِمْنَ الصَّلَوٰةَ وَآتِينَ الزَّكٰوةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا۔

یعنی اے نبی کی عورتو تم نہیں ہو جیسے ہر کوئی عورتیں، اگر تم ڈر رکھو، تو دب کر نہ کہو بات پھر لالچ کرے کوئی جس کے دل میں روگ ہے اور کہو بات معقول، اور قرار پکڑو اپنے گھروں میں اور دکھاتی نہ پھرو جیسا دکھانا دستور تھا پہلے نادانی کے وقت میں اور کھڑی رکھو نماز اور دیتی رہو زکوۃ، اور اطاعت میں رہو اللہ کی اور اسکے رسول کی، اللہ یہی چاہتا ہے کہ دور کرے تم سے گندی باتیں اے گھر والو اور ستھرا کرے تم کو ایک ستھرائی سے، اور یاد کرو اے پیغمبر کی بیبیو جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھروں میں اللہ کی باتیں اور عقلمندی، مقرر اللہ ہے بھید جانتا خبردار،

یہاں تک ترجمہ تھا۔ اب عرض یہ ہے کہ شیعہ ہی اپنے علماء سے پوچھیں۔ کہ میں نے ترجمہ صحیح کیا یا غلط۔ بہر حال ان آیات سے اول یہی سمجھ میں آتا ہے۔ کہ اہل بیت ازواج ہی ہیں۔

خاندان امام کو عبا میں لے کر دعا کرنے کی وجہ

اسی واسطے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت زہرا اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم اجمعین کو ایک عبا میں لے کر یہ دعا کی کہ

الٰہی یہ میرے اہل بیت ہیں تاکہ وہ بھی اس فضیلت میں داخل ہو جائیں، یہ ایسی مثال ہے جیسے کوئی بادشاہ قدر شناس چشم پوش اپنے وزیر سے یوں کہے کہ تمہارے گھر کے سب لوگوں کو ہم جدا جدا جگہ کر دیں گے تو وہ وزیر موافق محاورہ کے یوں سمجھ کر کہ ایسے موقع میں بی بی اور بیٹیا مراد ہوا کرتے ہیں اور بیٹی اور نواسی مراد نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ دوسرے گھر کی ہوتی ہیں۔ کچھ اپنے جی میں سوچکر وقت دیکھ کر بیٹی اور داماد اور نواسوں کو بھی پیش کرے، وہ بادشاہ اگر پوچھ بیٹھے کہ یہ کون ہیں تو بپاس لحاظ کہ بیٹی اور نواسی اور داماد بھی قرابت میں کچھ بیٹی اور پوتی اور بی بی سے کم نہیں، یہ کہے کہ حضور میرے گھر کے لوگ ہیں، تو اس بادشاہ کو گو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ داماد اور نواسی اور بیٹیاں ہیں اس کے گھر کے لوگ نہیں، پر بمقتضائے اپنی چشم پوشی ذاتی کے انکو بھی جا کر دیگا۔

یا لفظ اہلبیت اصل سے عام ہے ازواج اور حضرت علی اور حضرت زہرا اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم سب کو شامل ہے گو فقط ازواج ہی کی شان میں نازل ہوا ہو، جیسے دلی والا ایک لفظ عام ہے سب دلی والوں کی نسبت بول سکتے ہیں اگر کوئی دو دلی کے رہنے والوں کو یوں کہے کہ یہ دلی والے ہیں تو اس سے کوئی کودن گنوار تک بھی یہ نہیں سمجھتا کہ دلی والے فقط یہی ہیں ان کے سوا اور کوئی دلی والا نہیں اس تقریر سے سب پر واضح ہو گیا کہ کلام اللہ سے جو ازواج کا اہل بیت ہونا اور حدیث سے حضرت علی اور حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم اجمعین کا اہلبیت ہونا ثابت ہوتا ہے سب صحیح اور درست ہے اگرچہ شیعوں کی سمجھ میں نہ آتا ہو، بالجملہ ازواج مطہرات کو باوجودیکہ وہ اصلی اہلبیت ہیں اور کلام اللہ میں ان کی شان میں یوں آیا ہے وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں مومنوں کی مائیں ہیں، پھر بھی حضرات شیعہ اپنی زبان نہیں سنبھالتے اور لگام نہیں دیتے،، اگر دوسری آیت کا یوں جواب دیں کہ وہ مومنوں کی مائیں ہیں ہماری تو نہیں، تو مسلمانوں پر آیت اول کا۔ یعنے جس سے ان کا اہل بیت ہونا ثابت ہوتا ہے کیا جواب دیں گے؟ بالجملہ ازواج مطہرات کے اعتقاد اور محبت کا اس مذہب میں یہ حال ہے۔

شیعہ اولاد فاطمہ کی اکثریت کے دشمن ہیں

باقی رہی اولاد سو ان کا حال بھی سنئے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی اکثر اولاد کے حضرات شیعہ دشمن جانی ہیں اور برا کہتے ہیں منجملہ ان کے حضرت زید شہید فرزند ارجمند حضرت امام ہمام امام زین العابدین رضی اللہ عنہما جو عالم اور متقی اور متورع تھے، اور مروانیوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے اور ان کے بیٹے یحییٰ ابن زید ہیں جو بزعم اثنا عشریہ مرتد ہیں، اور ایسے ہی ابراہیم بن امام موسیٰ کاظم اور جعفر بن امام موسیٰ کاظم جن کا لقب شیعوں نے کذاب رکھ چھوڑا ہے، حالانکہ وہ کبار اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ اور بایزید بسطامی انہیں کے مرید ہیں اور جعفر بن علی برادر امام حسن عسکری کہ شیعوں کے عرف میں ان کا بھی لقب کذاب ہے اور حسن بن حسن مثنیٰ، اور ان کے فرزند عبداللہ محض، اور ان کے فرزند محمد نام جو ملقب بنفس زکیہ ہیں کافر اور مرتد سمجھتے ہیں۔ اور ابراہیم بن عبداللہ کو اور زکریا بن محمد باقر کو اور محمد بن عبداللہ بن الحسین بن الحسن، اور محمد بن القاسم بن الحسن، اور یحییٰ بن عمر کو بھی جو حضرت زید شہید کے پوتوں میں سے تھے، کافر اور مرتد جانتے ہیں اور جماعت کی جماعت سادات حسنیہ اور حسینیہ کو جو حضرت زید شہید کی امامت اور بزرگی کے قائل ہیں گمراہ اور اہل ضلالت میں سے سمجھتے ہیں۔ حالانکہ کتب انساب اور کتب تواریخ سادات اس بات پر شاہد ہیں کہ اکثر سادات حسنی، حسینی حضرت زید کی امامت اور فضیلت کے معتقد تھے۔

حاصل یہ کہ اکثر اثنا عشریہ ان بزرگواروں کو کافر اور مرتد سمجھتے ہیں اور بزعم خود یوں بکتے ہیں کہ یہ سب جگر گوشہ حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور لخت جگر حضرت بتول ہمیشہ ہمیشہ ابدالآباد تک جہنم میں رہیں گے اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کیونکہ ان کے نزدیک دوازدہ امام میں سے کسی امام کی امامت کا منکر ایسا ہی کافر ہے جیسا کسی نبی نبوت کا منکر، اور سب جانتے ہیں کہ کافر ابدالآباد تک جہنم میں رہیں گے، الغرض قول اکثر اثنا عشریہ کا یہی ہے اور یہی ان کے قواعد پر منطبق ہے کہ یہ بزرگواران مذکور کافر ہیں اور ان کے لئے کبھی نجات نہ ہو گی، اگرچہ بعضے اس بات کے قائل ہیں کہ یہ گروہ مثل حضرت عباس عم بزرگوار سید الابرار صلے اللہ علیہ وسلم اعراف میں رہیں گے، اور بعضے کہتے ہیں کہ بعد

عذاب شدید کے اپنے آباؤ اجداد کی شفاعت سے نجات پائیں گے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ دونوں قول پوچ ہیں کیونکہ جب منکر امامت کافر ہوا تو شفاعت کے ہونے اور اعراف میں رہنے کے کیا معنے، شفاعت بالاجماع کافروں کے حق میں نہ کوئی کر سکے اور نہ مقبول ہو، اور اعراف میں کافروں کا جانا خلاف قرآن ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ خَالِدِیْنَ فِیْھَا لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ۔	یعنے مقرر جو لوگ کہ کافر ہوئے اور کفر پر ہی مرے ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے ہمیشہ اسمیں رہینگے نہ ان سے عذاب کم کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت ملے گی،،

الحاصل حضرات شیعہ کو دعوائے محبت تو اس قدر اور پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اولاد اور اقرباء اور ازواج رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اماموں کی اولاد اور ان کے بھائیوں کے ساتھ یہ سلوک، خاک پڑے اس محبت پر، ان میں اور ناصبیوں میں دس بارہ ہی نمبر کا فرق ہے فقط اتنا ہی تو ہے کہ شیعہ دوازدہ امام اور ان کے بعض اقربا کی بزرگی کے معتقد ہیں اور ناصبی معتقد نہیں، سو اس اعتقاد سے تو ان کی بے اعتقادی ہی بھلی، کیونکہ اول تو یہ فرقہ محبت کے پردہ میں حضرات ائمہ کے ذمہ صدہا عیب لگاتے ہیں اور پھر ان کفریات کو ہر کس و ناکس اپنے بیگانے کے سامنے گاتے ہیں، چنانچہ کچھ کچھ تو اس رسالہ کے دیکھنے والوں کو بھی معلوم ہو گیا ہوگا۔

اہل شیعہ کی حضرت علی سے محبت جو دشمنی سے بدتر ہے | یہاں ہر چند اس بات کے مفصل لکھنے کا موقع ہے لیکن اس رسالہ مختصر کے مناسب نہیں اس لئے بطور نمونہ اشارہ کئے جاتا ہوں، حضرت امام الائمہ علی مرتضے رضی اللہ عنہ کے احوال کچھ ایسے تراش رکھے ہیں کہ جس سے ہر کوئی سمجھ جائے۔ کہ نعوذ باللہ وہ بڑے بے غیرت نامرد جھوٹے کذاب تھے، کہ اپنی بیٹی کافروں کے حوالہ کر دی، اور بہ خوف جان نہ اس مقدمہ میں کچھ چون و چرا

کی نہ کسی اور بات میں دم مارا، کافروں کے پیچھے ساری عمر نمازیں پڑھیں اور ہمیشہ ان سے ہم پیالہ اور ہم نوالہ رہے اور ان کی تعریفیں بارہا ایسی کریں کہ مومنان با اخلاص کی اس کے عشر عشیر کبھی ایک دفعہ بھی نہ کی جب ان کا یہ حال ہے تو اوروں کا تو کیا ذکر،

ع:۔ قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

خارجی اور ناصبی ہر چند حضرت علی کو برا سمجھتے ہیں پر اتنا نہیں سمجھتے،

انبیاء ائمہ سے بلکہ تمام مخلوق سے افضل ہیں | دوسرے پھر اس محبت نامعقول کو اتنا حد سے بڑھایا کہ انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کو بھی اماموں سے گھٹایا، چنانچہ مذہب امامیہ بہ نسبت تمام ائمہ ہدیٰ کے کہتا ہے کہ وہ سب تمام انبیاء سے افضل ہیں حالانکہ کلام اللہ اور خود ان کی کتابیں اس بات پر شاہد ہیں کہ انبیاء سب سے افضل ہیں، کلام اللہ میں برابر انبیا کی نسبت اصطفا اور اجتبا جو بمعنے چھانٹ لینے کے ہے مستعمل ہے اور ظاہر ہے کہ چھانٹی ہوئی چیز باقی سے افضل ہوتی ہے، معہذا کل چار فرقوں کی خداوند کریم تعریف فرماتا ہے انبیاء، اور صدیقین اور شہداء اور صالحین سو ہر جگہ انبیاء ہی کو مقدم کیا ہے، تو اس سے معلوم ہوا کہ نبی باقی تین فرقوں سے افضل اور رتبہ میں مقدم ہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے ائمہ ہدیٰ نبی تو تھے ہی نہیں پھر ان تینوں فرقوں میں سے جونسے کو شیعہ پسند کریں اختیار ہے بہت سے بہت اماموں کو صدیق کہیں گے اور ہمارا عقیدہ بھی یہی ہے۔ تب بھی انبیاء سے بعد ہی میں رہے۔

افضلیت انبیاء کتب شیعہ سے | لیکن ہم جانتے ہیں کہ شیعہ کلام اللہ کی کاہے کو سنیں گے؟ اس لئے مناسب ہے کہ انہیں کی کتابوں سے ان کو جھوٹا کیجئے اور جتا دیجئے کہ یہ جو مثل مشہور ہے کہ دروغ گو را حافظہ نباشد، اور ایسے ہی یہ مثل کہ ،،حق بر زبان جاری شود،، دونوں سچی ہیں، پیشوایان شیعہ نے ہر چند ان روایات کے تراشنے میں جہد بلیغ کیا جس سے اماموں کا انبیاء سے افضل ہونا ثابت ہو جائے لیکن بمقتضائے مثل اول چوک کر بمقتضائے مفہوم مثل ثانی حق بات کہی گئی روی الکلینی عَنْ ھِشَامِ الْاَحْوَلِ عَنْ زَیْدِ بْنِ عَلِیٍّ اَنَّ الْاَنْبِیَاءَ اَفْضَلُ مِنَ الْاَئِمَّۃِ وَاِنَّ مَنْ قَالَ غَیْرَ ذٰلِکَ فَھُوَ ضَالٌّ

یعنی کلینی بواسطہ ہشام احول کے زید بن علی سے روایت کرتا ہے کہ مقرر انبیا اماموں سے افضل ہیں اور بیشک جو اس کے سوا کہے وہ گمراہ ہے فقط۔ ادھر ابن بابویہ کتاب الامالی میں بروایت صحیح ایک حدیث طویل کے ضمن میں جس میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ کے نکاح کا قصہ مندرج ہے اس طرح روایت فرماتے ہیں۔

عَنِ الصَّادِقِ عَنْ آبَائِهِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ لِسُكَّانِ الْجَنَّةِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ وَاَرْوَاحِ الرُّسُلِ وَمَنْ فِيْهَا اَلَا اِنِّيْ زَوَّجْتُ اَحَبَّ النِّسَاءِ اِلَيَّ مِنْ اَحَبِّ الرِّجَالِ اِلَيَّ بَعْدَ النَّبِيِّيْنَ۔

یعنی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ اپنے باپ دادوں سے روایت کرتے ہیں کہ مقرر اللہ تعالیٰ نے فرمایا جنت کے رہنے والوں سے، یعنی فرشتوں سے اور رسولوں کی ارواح سے اور جو سوا ان کے جنت میں تھے، ان سے خداوند کریم نے فرمایا کہ خبردار رہو کہ میں نے اس عورت کا نکاح جو سب عورتوں سے زیادہ مجھے محبوب ہے اس مرد سے کر دیا ہے کہ جو سب مردوں سے زیادہ مجھے محبوب ہے، سا انبیاء کے بعد، غور فرمانے کی جا ہے یہ روایتیں بآواز بلند یہی کہتی ہیں کہ حضرت امیر کا رتبہ بعد انبیا کے ہے مگر ستم یہ ہے کہ باوجود ان روایات کے پھر ائمہ کو انبیاء سے افضل ہی تبلائے جاتے ہیں، ظاہراً اس کا سبب یہی ہے کہ صحابہ کے حصہ کی محبت اور نیز اکثر اہلبیت کے حصہ کا اعتقاد فقط انہیں چند اشخاص معدود کے حق میں صرف کرتے ہیں، سو بہ سبب ادغام اور اجتماع محبت ہائے کثیرہ کے محبت دوازدہ امام اپنی حد سے باہر نکل گئی۔

اور فی المثل شیعوں کے وہی مثل ہو گئی۔ جو نصرانیوں کی ہے کہ حضرت عیسیٰ کے ساتھ اس قدر محبت کو بڑھایا کہ ان کو عبودیت سے نکال کر معبودیت تک پہنچایا چونکہ یہ قصہ بعینہ آنکھ کی مثال کا سا ہے، یعنی جیسے کسی حسین متناسب الاعضا متناسق الاطراف کی ایک آنکھ بالکل پٹ ہو جائے اور اس کے حصہ کی فراخی بھی دوسری ہی آنکھ میں آجائے اور اس ایک ہی کی مساحت دونوں کی مساحت کے برابر ہو جائے اور پھر اس آنکھ میں بھی بجائے سفیدی سیاہی ہی چھا جائے ایسے ہی حضرات شیعہ نے حب اہل بیت اور حب اصحاب میں

سے ایک کو رکھا اور ایک کو کھو دیا، اور جس کو رکھا اس کو ایسا بڑھایا کہ دونوں کے برابر اس ایک ہی کو کر دیا، اور جیسے آنکھ میں سفیدی کی جا بھی سیاہی ہی چھا جائے تو انہوں نے بھی تمام اہل بیت میں سے چند اشخاص معدود کو بزرگ سمجھا اور باقی کو مردود اور مرتد قرار دیا، اور بایں وجہ کہ جن کے ساتھ شیعہ محبت کرتے ہیں ان کی محبت حد سے ... بڑھی ہوئی ہے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ باقیوں کے حصہ کی محبت بھی انہیں چند اشخاص معلوم کے لئے ہے تو اس صورت میں جیسے آنکھ مذکور خود نازیبا معلوم ہوگی اور تمام چہرہ کو بے زیب کر دیگی، ایسے ہی حب اہل بیت اور حب اصحاب جو بمنزلہ ایمان کی دو آنکھوں کے ہیں ان میں سے اگر ایک جاتی رہے اور دوسری بڑھ جائے تو دوسری بھی نازیبا ہو جائے گی اور ایمان کے حسن کو بھی بے زیب کر دے گی، اس لئے بالیقین یوں سمجھ میں آتا ہے کہ دوازدہ امام بھی اس محبت سے خوش نہ ہوں بلکہ متنفر ہوں، اور اس بات کے خواستگار ہوں کہ ان کی محبت اپنے اندازہ پر آجائے تاکہ بری نہ معلوم ہو، اور اس کے ساتھ اصحاب سے بھی محبت اور اعتقاد دل میں جمایا جائے تاکہ جیسے ایک آنکھ سے دوسری کی زیب و زینت ہونے ہی سے چہرہ پر حسن آتا ہے ایسے ہی حب اصحاب سے حب اہل بیت کو زینت ہو اور دونوں ہی سے ایمان اور اسلام کی خوبصورتی ظاہر ہو،

شیعوں نے صدیق کے بارے میں خدا کی گواہی اور ائمہ کی شہادت بھی رد کر دی

سو چونکہ اہل سنت رضا اہل بیت میں اپنی سعادت سمجھتے ہیں تو یہ خاکپائے غلامان اہلبیت کی طرف سے نیابتہً تمام شیعوں کے عموماً اور مولوی عمار علی صاحب کے خصوصاً کان ٹھولتا ہے کہ اے مدعیان محبت اہلبیت یہ محبت نامعقول جب تک مقبول نہ ہوگی جب تک کہ حب اصحاب اس کے برابر نہ ہو ورنہ ان کے برا کہنے میں تمہارا ہی برا ہوگا، خصوصاً رفیق غار جان نثار سید الابرار صلی اللہ علیہ وسلم یعنی حضرت ابوبکر صدیق جن کے صحابی ہونے کا خدا خود گواہ ہے چنانچہ مرقوم ہو چکا اور جن کے صدیق ہونے کی اماموں نے شہادت دی ہے اور بمبالغہ ان کی تعریف کی ہے چنانچہ معلوم ہو چکا ان کا برا کہنا خدا اور ائمہ کو جھٹلانا ہے ایسی صورت میں تو ہزار عیب بھی اگر آنکھوں سے نظر آئیں تو یوں سمجھے کہ ہو نہ ہو ہماری نظر اور فہم کا

قصور ہے خدا کا فرمایا اور ائمہ ہدیٰ کا کہا غلط نہیں ہو سکتا جن کو ہم عیب سمجھتے ہیں وہ
ہنر ہی ہوں گے ہماری سمجھ میں نہیں آتا تو مت آؤ ہم تو ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باوجود
اس جلالت قدر اور کمال علم و فضل اور نور نبوت اور وفور عقل کے حضرت خضر کی کشتی کے
توڑنے اور لڑکے کے قتل کرنے کو کہ وہ ظلم ہرگز نہ تھا، عین مطابق مرضی خداوندی تھا ظلم
عظیم سمجھا حالانکہ خداوند کریم کی ہدایت کے موافق گئے تھے اور جناب باری تعالےٰ نے پہلے ہی
حضرت خضر کے علم اور بزرگی کی اطلاع کر دی تھی، چنانچہ یہ تمام قصہ سورہ کہف میں رکوع
وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِفَتَاہُ سے لے کر رکوع وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْن
تک مذکور ہے پھر جب حضرت موسٰے علیہ السلام جیسے رسول جو مرسلین اولوالعزم میں سے
بھی اکثروں سے زیادہ ہیں آدھے قرآن کے قریب انہیں کے ذکر سے پُر ہو گا حضرت خضر
کے افعال کی حقیقت کو نہ سمجھیں حالانکہ حضرت خضر محققین کے نزدیک ولی ہیں نبی نہیں اور
اگر نبی بھی ہیں تو بالاتفاق اس رتبہ کے ہرگز نہیں جو رتبہ کہ حضرت موسٰے علیہ الصلاۃ والسلام
کو نصیب ہوا تو حضرات شیعہ تو نہ نبی ہیں نہ ولی نہ عقل و دانش سے ان کو کچھ بہرہ، چنانچہ
اسی لئے یہ مثل ہی ہو گئی ہے کہ اَلشِّیْعَۃُ نِسْوَانُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ۔ یعنی
شیعہ اس امت کی عورتیں ہیں۔"

ایسے نادان اگر امت مصطفوی کے سید الاولیائکے کسی فعل کی حقیقت نہ سمجھیں
تو کیا بعید ہے بلکہ عین مقتضائے قیاس ہے کیوں کہ یہ امت اور امتوں سے افضل، اس امت
کے اولیاء پہلی امتوں کے اولیاء سے افضل اور بھی نہیں تو جو اس امت میں ایسا ہو کہ خدا اور ائمہ
ہدیٰ دونوں اس کی تعریف کریں وہ تو بیشک پہلی امتوں کے اولیائے سے افضل ہو گا، ایسے شخص
کے افعال کی حقیقت تو اگر ائمہ ہدیٰ بھی نہ سمجھیں اور ظلم و ستم کا گمان کریں تب بھی اہل عقل
کے نزدیک کچھ حرج نہیں بہت ہو تو شیعوں کو یہ خلجان ہو کہ ائمہ ہدیٰ ہمارے عقیدہ کے
موافق افضل الخلائق ہیں ابو بکر اگر بزرگ بھی ہوں تب بھی ان سے افضل یا ان کے برابر
نہیں ہو سکتے تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تم خداوند کریم اور ائمہ ہدیٰ کی گواہی ابوبکر صدیقؓ کی
بزرگی کے باب میں قبول کر لو پھر اس کا جواب ہم سے سنو

اگر بالفرض و التقدیر ائمہ ہدیٰ ابوبکر صدیق سے افضل ہی ہوں اور خدا کا مہاجرین کو علی العموم
باقی امت سے صراحتہً افضل تبلانا پھر ان میں سے ابوبکر صدیق کو اشارۃً سب سے افضل کہنا
چنانچہ اول مفصل مرقوم ہو چکا تمہارے عقیدہ غلط کے موافق غلط ہو تب بھی تو کچھ دشوار نہیں
حضرت موسیٰ بھی تو حضرت خضر سے افضل تھے پھر ان کے افعال کی حقیقت نہ سمجھے اور احسان
کو نقصان اور عدل کو ظلم سمجھ کر ایسے مغلوب الغضب ہوئے کہ اپنے سب عہد و پیمان بھول گئے۔

حضرت موسے اور حضرت خضر کا واقعہ کج فہموں کے لئے عبرت ہے

القصہ مقتضائے ایمان خدا اور راز
ائمہ ہدیٰ تو یوں تھا کہ اگر بالفرض و التقدیر حضرت ابوبکر صدیق بظاہر ملحد و زندیق ہی شیعوں
کو نظر آتے تو خدا کی گواہی اور ائمہ کی شہادت کے بعد جو ان کی بزرگی کی نسبت اول میں اور
اوسط میں اس رسالہ کے مرقوم ہو چکی ہے اپنی بھی نہ سنتے اور اپنی عقل نارسا کی تکذیب کرتے
اور حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام کے قصہ کو پیش نظر کر کے تسکین خاطر پریشان اور
تسلی طبع کج کر لیتے، کیونکہ جناب باری تعالےٰ نے اس قصہ کو ایسے ہی کودنوں کے واسطے بیان
فرمایا ہے حضرات شیعہ جیسے عقل کے دشمن اپنی کج فہمی کے باعث خدا کے مقربوں اور دوستوں
سے بدگمان ہو کر خدا کو اپنا دشمن بنا لیں۔ قربان جایئے خدا علیم کے۔ کتنی دور کی سوجھتی ہے
مگر آفرین ہے شیعوں کی عقل پر بھی کہ اس پر بھی نہ سمجھے، خیر خدا انہیں سمجھے القصہ مقتضائے
ایمان و ادب تو یہ تھا۔

بالفرض اگر صدیق سے گناہ ہوا تو وہ نیکی بن چکا، ورنہ ائمہ ان کی تعریف نہ کرتے

اور اگر بحکم ت خشیمؔ اندیش کہ برکندہ باد بہ عیب نماید ہنرش در نظر
یہ بات ان کو دشوار ہی تھی تو یہ تو شیعہ بھی خواہ مخواہ مانیں
ہی گے کہ قیامت کو بعض گنہگاروں کے اعمال بد کو حسنہ بنا دیں گے کیونکہ کلام اللہ موجود
ہے۔ دیکھو کیا فرماتے ہیں اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ
یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنَاتٍ" یعنی مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے عمل
کئے تو ان کے گناہوں کو بھی خدا نیکیاں بنا دے گا فقط"۔ اور اگر خوردہ بینان مذہب شیعہ
کو یہ خلجان ہو کہ اس آیت میں جن گناہوں کی نیکیاں بنانے کی طرف اشارہ ہے ظاہر میں وہی
گناہ معلوم ہوتے ہیں جن کا سیاق میں ذکر ہے۔ از ظاہر ایام کفر کے گناہ ہیں، سو اگر ابوبکر

صدیق کا کوئی گناہ نیکی نبنے گا بھی تو وہی بنے گا جو ایام جاہلیت کے گناہوں میں کا ہو گا۔ ہمیں تو ایسی بہت سی باتوں میں کلام ہے جو بعد زمانۂ ایمان ان سے صادر ہوئیں۔ مثلاً غصبِ فدک کہ وہ بعد وفات سرور کائنات علیہ و علےٰ آلہ الصلوات والتسلیمات ان سے ظہور میں آیا تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ ایسا شیوہ انہیں لوگوں کا ہے کہ جن کا دل شبہ میں پڑا ہوا ہے، اور اب تک درجہ یقین و ایمان تک نہیں پہنچا، اگر ما سبق میں گناہان زمانہ کفر ہی کا ذکر ہو اور انھیں کی نسبت تبدیل کا یعنے نیکی بنا دینے کا اشارہ ہو تب بھی اتنی بات ثابت ہو گئی، کہ خدا کو گناہوں کا نیکی بنا دینا آتا ہے پھر جب کفر کے زمانہ کے گناہوں کو کہ وہ نسبت گناہان ایام ایمان کے گناہوں سے زیادہ ہی ہوتے ہیں، خدا کو نیکی بنا دینا آتا ہو تو ایام ایمان کے گناہوں کا نیکی بنا دینا تو سہل ہی ہو گا پھر جس کی خدا اور ائمہ ہدیٰ تعریف فرمائیں اس کے ایمان اور بزرگی میں اسے ہی شک ہو سکتا ہے جس کو خدا اور ائمہ ہدیٰ کی بات میں شک ہو غرض جب ایمان اور صلاحیت اعمال ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بشہادت خداوندی اور بگواہی ائمہ ہدیٰ ثابت ہو گئی تو اس بات میں کیوں تامل ہے کہ ان کے گناہ نیکیاں ہو جائیں۔

گناہ سے توبہ پر جنت میں داخلہ سب کو مسلم ہے اور اگر یوں کہیئے کہ گناہوں کا نیکیاں بن جانا توبہ کے ساتھ معلق ہے ابو بکر صدیق کا ہے سے معلوم ہو کہ توبہ کر کے مرے ہیں تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ اگر معلق ہو بھی تو گناہوں کے نیکیاں بنا دینے کا وعدہ معلق ہو گا کچھ امکان تو معلق نہیں پھر جب خداوند کریم اور ائمہ دین ان کی تعریف فرمائیں تو اگر ان سے یہ خطا ہوئی بھی تھی۔ تب بجز اس کے ان کی تعریف کی اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ ان کی خطا کو بھی جناب باری تعالےٰ نے نیکی بنا دیا ہو گو انہوں نے توبہ نہ کی ہو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر توبہ ہی پر تبدیل سیئات بحسنات موقوف ہے تو خداوند متین اور ائمہ دین کی تعریف خود اس بات کی گواہ ہے کہ وہ توبہ کر کے اس عالم سے تشریف لے گئے، نہیں تو وہ قابل تعریف تو کجا البتہ لائق ہجو اور مستوجب سزا تھے۔

ہاں اگر شیعہ یہ گرفت کریں کہ خداوند علیم نے تو تعریف پہلے کی تھی یہ خطا ان سے بعد میں سرزد ہوئی تو اس کا جواب ہمارے پاس بجز اس کے کچھ نہیں کہ البتہ شیعوں کا خدا

ایسا ہی ہو گا جیسے چار دن کے بعد کی بھی خبر نہ ہو ہمارا خدا عالم الغیب ہے، ازل سے ابد تک سب اس کے پیش نظر ہے، اگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حسب گمان بد شیعہ بُرے ہی ہوتے، تو خداوند کریم ہرگز تعریف نہ فرماتا، اس کو کیا ضرورت تھی کہ ایک غلط بات کہہ کے آج شیعوں سے شرماتا۔ اگر خدا کی نہیں مانتے تو نعوذ باللہ ائمہ ہدیٰ تو بزعم شیعہ خدا سے بھی بڑھ کر ہیں، خدا کو تو بدا بھی واقع ہوا، ائمہ کو تو بدا بھی نہیں ہوتا پھر اس پر علم ماکان اور علم مایکون ان کو حاصل، ان کی تعریف کا تو بجز اس کے کچھ جواب ہی نہیں کہ حضرت صدیق اکبر کے گناہ بھی نیکیاں ہی بن گئے ہوں۔

توبہ کا ثبوت بروایت شیعہ اور یہ بھی نہ سہی ہم اور جواب رکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ روایات شیعہ اس بات کی شاہد ہیں کہ ابو بکر صدیق گناہِ غصب فدک سے تائب ہو کر مرے ہیں چنانچہ ان شاء اللہ تعالےٰ قریب ہی بحوالۂ روایات کتب شیعہ یہ مضمون مرقوم ہو گا کہ ابو بکر صدیق نے گو فدک غصب کر لیا تھا، لیکن پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی کے حوالہ کر دیا اور نیز یہ بھی مرقوم ہو گا کہ حضرت فاطمہ ان سے راضی ہو گئیں اب فرمایئے توبہ اور کسے کہتے ہیں اسی کا نام توبہ ہے۔

نیکیاں زیادہ ہونے پر جنت میں داخلہ متفق علیہ ہے اور اگر اس پر بھی شیعوں کے دل کا کفر نہ جائے تو اس کی اور بھی تدبیر ہے آخر شیعوں کے نزدیک بھی اتنی بات مسلم تھی کہ قیامت کو حساب کتاب کے بعد جس کے اچھے عمل زیادہ نکلیں گے وہ جنت میں جائے گا جس کے برے عمل زیادہ ہوں گے وہ دوزخ میں۔ اور اگر منظور دوراندیشی ہے تو اس عقیدہ میں کچھ شک بھی آ جائے تو لیجئے یہ کلام اللہ کی آیت موجود ہے اور کلام اللہ میں سے عم ہی کے سیپارہ کی، اس میں سے بھی اول ہی کی سورتوں میں کی، جو شیعوں کے یاد بھی نہیں مثل یاد تو ضرور ہی ہوں گی وہ آیت یہ ہے۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ نَارٌ حَامِيَةٌ یعنی جنکے عمل تول میں بھاری ہوں گے تو وہ اچھے، اور جن کے عمل ہلکے نکلیں گے ان کا ٹھکانا ہاویہ ہے اور تجھ کو کیا معلوم وہ کیا ہے؟ وہ ایک آگ ہے گرم دھکتی فقط۔ اب کچھ تکرار کی بات باقی نہیں۔

سو اس صورت میں خداوند علیم اور ائمہ تعلیم جس کی تعریف فرمائیں وہ اگر خطاوار بھی تھا، تب معلوم ہوا کہ اس کے اچھے عمل زیادہ تھے پھر ان خطاؤں کے باعث ان سے رنجیدہ رہنا ویسا ہی ہے جیسا کسی نے کہا ہے "مدعی سست گواہ چست"، یا عربی کی مثل ہے رَضِیَ الْخَصْمَانِ وَمَا رَضِیَ الْقَاضِیْ، یعنی مدعی مدعا علیہ تو راضی ہو گئے، پر قاضی جی راضی نہ ہوئے خداوند کریم اور ائمہ دین تو راضی ہو جائیں پر شیعی راضی نہ ہوں۔

مہاجرین اولین سے جنت عدن، مغفرت، رضا کا وعدہ ہو چکا، اور خدا وعدہ خلافی نہیں کرتا

اور اس پر بھی خاک ڈالو ابوبکر صدیق کے اچھے عملوں کا زیادہ ہونا بھی شیعوں کو ناگوار ہو، تو اس میں تو کچھ دھوکا ہی نہیں کہ وہ مہاجرین اولین اور مصاحبان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ سو مہاجرین اولین اور ہمراہیانِ رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کا حال آیت والسابقون الاولون من المہاجرین والانصار اور آیت محمد رسول اللہ الآیۃ کی شرح کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے کہ خدا ان سے راضی ہے اور وہ خدا سے راضی اور اللہ تعالے نے ان کے لئے جنات عدن تیار کر رکھی ہیں اور اللہ تعالے نے ان سے وعدہ مغفرتِ گناہان اور وعدہ اجر عظیم کا کر لیا ہے۔ سو اگر بالفرض والتقدیر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گناہ ہی زیادہ تھے یا فرض کرو کہ وہ سراپا گناہ اور ہمہ تن ظلم و جفا ہی تھے تب اس صورت میں جائے طعن باقی نہ رہی کیونکہ خداوند کریم اپنے وعدہ کا سچا اور بات کا پکا ہے، مثلِ حضرات شیعہ نہیں، جن کے دین کی باتوں میں بھی جھل ہے۔ دنیا کا تو کیا ذکر؟ سو ہم کو یقین ہے کہ خدا ان سے راضی ہے گو شیعہ ناراض ہوں، وہ ناراض ہوں گے خدا کو ناراض اور اہل بیت کو رنجیدہ کرینگے، کیونکہ اہل بیت تو ایسے نہیں کہ گوشۂ عنایت خداوندی کسی طرف کو دیکھیں پھر اس طرف کو نہ جھکیں بلکہ ان کی سعادتِ ازلی اور ہدایت لم یزلی سے یوں یقین کامل ہے، کہ اگر بفرض محال حسب مقالہ شیعہ ابوبکر صدیقؓ نے کچھ ان پر ظلم اور تعدی بھی کی ہو تب اپنے حقوق سے درگذریں اور بلحاظ رضا خداوندی حسب مثل مشہور، ہر عیب کہ سلطان بہ پسند د ہنر است، اپنے اوپر جفا کو وفا سمجھیں، نقل مشہور ہے، جدھر رب ادھر سب، اور اہل بیت اپنے حقوق سے آپ کیا درگذرینگے اور کیا راضی ہوں گے خداوند کریم جب راضی ہو کا سب کو راضی کر دے گا آخر کلام اللہ میں موجود

ہے وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِھِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ یعنی خداوند کریم بعضے جنتیوں کے حق میں فرماتے ہیں، "اور نکال ڈالے ہم نے جو کچھ ان کے دلوں میں رنج تھے، بھائی ہو گئے تختوں پر بیٹھے ہوئے" فقط۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ بعضے جنتی ایسے بھی ہوں گے کہ ان کے باہم دنیا میں رنج و عداوتیں تھیں، پر جب خداوند کریم ان کو جنت میں داخل کرے گا ان رنجوں کو ان کے دلوں سے نکال ڈالے گا سو اسی طرح یہاں بھی تصور فرما لینا چاہیے۔ آخر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جنتی ہونا بشہادت کلام خدا اور کلام ائمہ ہدیٰ شیعوں کو جبراً قہراً تسلیم کرنا تو پڑا ہے، اور اہلبیت کے جنتی ہونے کا پہلے ہی سنیوں، شیعوں کو بالاتفاق یقین ہے اور اگر شیعہ سنیوں کی ضد میں ان کے جنتی ہونے میں کلام کرنے لگیں تو ان کی ہٹ دھرمی سے کچھ بعید بھی نہیں غرض جب دونوں فریق جنتی ہوئے تو ان کے کینے اور عداوتیں خداوند کریم آپ نکال دے گا۔

حضرت کلیم کا بچھڑے کو جلانا مبنی بر حکمت تھا

اور اگر بایں ہمہ فہمائش بلیغ متبعان عبد اللہ بن سبا کو کچھ اثر نہ ہو . . . . اور جیسے سامری کے ایک کرشمے پر بنی اسرائیل بہک گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہزار معجزوں پر بھی ڈھیٹ راہ پر نہ آئے اس دغاباز کے سخن بے سروپا پر ایسے جمے کہ میرے ان دلائل محکم اور مستحکم سے بھی اکھڑ جائیں تو جیسے حضرت موسے علیہ السلام نے دستاویز ضلالت آمیز سامری کو باطل کر دیا یعنی اس سونے کے بچھڑے کو جو برکت خاکپائے حضرت جبرئیل علیہ السلام بولنے لگا تھا اور بنی اسرائیل اسے پوجنے لگے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جلا کر دریا میں ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیا، تاکہ ہر کس و ناکس سمجھ جائے کہ اگر یہ معبود بحق اور خدا برحق ہوتا تو بندوں کے ہاتھوں سے یوں کیوں ذلیل ہوتا۔ اسی طرح میں بھی حیلہ ہائے حجت نمائے مولوی عمار علی صاحب کو کہ ہو بہو طرز و انداز میں عبد اللہ بن سبا ثانی اور دغا ہائے تازہ کے بانی مبانی ہیں بلکہ ان کی حجتیں اسی سرگروہ شقاوت پژدہ کی تراشی ہوئی باتیں ہیں۔ اور اسی کی پرانی خرافاتیں ہیں۔ سو ان دلائل قاطعہ سے قطع نظر کر کے مولوی صاحب کے ہاتھ، کاٹے دیتا ہوں تاکہ ہر کوئی جان جائے کہ سخنان پریشان مولوی صاحب اگر قابل پذیرائی اہل انصاف ہوتے۔ تو یوں مثل گوزشتر ہوا کے

سہارے نہ اڑ جاتے۔

غصب فدک پر آیۃ ذالقربیٰ سے استدلال سو گوش گذاران مولوی صاحب کو یہ بات یاد رہے کہ درباره غصب فدک جو کچھ مولوی صاحب نے مکاری کر کے زیب رقم فرمایا ہے۔ بزعم خود بہت ہی چالاکی کی تھی۔ لیکن جن کا خدا حافظ ہو ان کو ایسے دھوکوں سے کیا اندیشہ۔

چہ باک از موج بحر آں را کہ باشد نوح کشتیبان

ہاں ایسے عقل کے اندھے جیسے (گستاخی معاف) ملازمان مولوی صاحب ہیں۔ البتہ اس جال میں پھنس جاتے ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے، مولوی صاحب اپنے نامہ موسومہ میرزا نادر علی صاحب میں کہ مثل نامہ سیاہ مولوی صاحب کے خوبی کا اس میں نام و نشان نہیں یوں رقم فرماتے ہیں، کہ جلال الدین سیوطی نے تفسیر درمنثور میں اور شیخ علی متقی نے کنز العمال میں اور ابو یعلی موصلی نے اپنی مسند میں اور صاحب معارج النبوت نے اور سوا اس کے اور علمائے اہلسنت نے روایت کی ہے کہ جس وقت نازل ہوئی آیت وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ یعنی دے تو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم قریبوں کو حق ان کا۔ تو اس وقت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل سے پوچھا کہ قریب میرے کون ہیں؟ اور حق ان کا کیا ہے؟ جبرئیل نے عرض کی کہ قریب تمہارے فاطمہ ہیں اور حق اس کا فدک ہے۔ فدک اس کو دے دو، اس وقت رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کو فدک دیدیا پس تحریر سے انکی ثابت ہوا کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کو فدک دیا۔ اور فاطمہ مالک فدک کی تھی جب رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے رحلت فرمائی اور ابوبکر خلیفہ ہوئے، تو فدک کو فاطمہ سے چھین لیا اور ان کا قبضہ اٹھا دیا۔ اب فرمائیے کہ یہ غصب نہیں تو کیا ہے۔ انتہی۔ یہاں تک مولوی صاحب کی عبارت تھی۔

غصب فدک کے بہتان کا تاریخی جائزہ اب ہماری سنئے کہ یہ اعتراض غصب فدک ایک پرانی بات ہے کچھ ملازمان مولوی صاحب ہی کو نہیں سوجھی، سارے شیعہ اسے ہی گاتے رہے ہیں القصہ مولوی صاحب وہی پرانی قے چاٹتے ہیں جو اگلے اگلتے چلے آئے ہیں پر افسوس یہ ہے کہ ابتدا میں کسی نے یہ دروغ بے فروغ اگر زبان سے نکالا تھا تو جب تک علماء اہل سنت کو اس کی خبر بھی نہ تھی، نکالا تھا لیکن جس وقت علماء اہلسنت نے جوابات دندان شکن سی شیعوں کے

دانت توڑ دیئے۔ تب تو غیرت کی بات یہ تھی کہ اس بات کو منھ پر بھی نہ لاتے اگر صواقع اور صواعق کمیاب تھے تو بفضلہ تعالے تحفہ اثنا عشریہ تصنیف شاہ عبد العزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ، اور منتہی الکلام وغیرہ مصنفات مناظر بے بدل مولوی حیدر علی سلمہٗ ربہٗ کہ علماء لکھنؤ بھی ان کے سامنے بول گئے تھے کثرت سے موجود ہیں ان میں اس دروغ بیفروغ کے جو کچھ جواب لکھے ہیں پہلے ان کو رد کرنا تھا جب کہیں اس بات کو زبان پر لانا تھا اگر خدا سے شرم نہ تھی کیا غیرت دنیاوی کو بھی طاق میں اٹھا دھرا، کیسا ہی کوئی نامعقول کیوں نہ ہو، پر اپنی بات کا جواب معقول سن کر ایک دفعہ تو چپ ہی ہو رہا کرتا ہے۔

ہاں نامرد بیحیا کا یہ کام ہے کہ اگر دلاوران شجاعت نژاد کسی نا سزا کی سزائیں کچھ سرزنش کرتے ہیں اور ہاتھ پاؤں سے معقول کرتے ہیں تو وہ چونکہ ہاتھا پائی سے مارا ہوا ہوتا ہے۔ اپنی زبان چلانے سے باز نہیں آتا اور اپنی وہی مرغی کی ایک ٹانگ گائے جایا کرتا ہے۔ مثل مشہور ہے مرد کے ہاتھ چلیں نامرد کی زبان، سو یہی وطیرہ حضرات شیعہ کا ہے کہ اہل سنت کے جوابات دندان شکن سنکر بھی منھ بند نہیں کرتے، اور وہی بکے جاتے ہیں اس موقع میں مناسب تو یوں تھا کہ ہم بھی جوابات سابقہ پر اکتفا کرتے لیکن چونکہ مولوی عمار علی صاحب نے اپنے عندیہ میں میدان خالی دیکھ کر یہ ہاتھ پاؤں ہلائے ہیں۔ تو ہم کو بھی لازم ہے کہ ان کو ان کی حقیقت دکھلا دیجئے۔

یہ آیت مکیہ ہے مکہ میں فدک کہاں تھا؟ سو عرض یہ ہے کہ ملازمان مولوی صاحب کو تو کلام اللہ زیادہ نہ یاد ہو، اگر یقین نہ ہو تو کوئی صاحب بھی پوچھ دیکھیں کہ یہ آیت کون سے سیپارہ میں ہے؟ بالجملہ اگر مولوی صاحب اور مہربان مولوی صاحب کو کلام اللہ یاد ہوتا تو اس آیت کو فدک کے باب میں زبان پر بھی نہ لاتے، بلکہ اگر ہم کبھی کہتے جب بھی نہ مانتے، وجہ اس سخن کی یہی کہ یہ آیت کل دو جگہ کلام اللہ میں آئی ہے، ایک سورہ بنی اسرائیل میں، دوسری سورہ روم میں، سو دونوں کی دونوں خیر سے مکہ میں نازل ہوئیں تھیں۔ علماء تو اس بات کو جانتے ہی ہیں۔ پر عوام کی تفہیم اور تسکین کے لئے اتنا اشارہ بہت ہے کہ دنیا میں ہزاروں کلام اللہ موجود ہیں کھولکر دیکھ لیں ان دونوں سورتوں کے اول میں مکیہ لکھا ہوا ہوگا، اور اگر کوئی الٹی کا سمجھن ہار مصحف

کا باایں وجہ اعتبار نہ کرے، کہ کلام اللہ تو سنیوں ہی کی سی کہے گا تو لیجئے شیعوں ہی کی گواہی موجود ہے۔ طبرسی نے تفسیر مجمع البیان میں لکھا ہے سورۃ الروم مکیۃ الا قولہ فسبحان اللہ الخ یعنے علامہ طبرسی جس کے حوالے سے یہ مذکور ہوگا کہ جب آیت فات ذالقربےٰ نازل ہوئی۔ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فدک حضرت فاطمہ کو عطا فرمایا وہی تفسیر مجمع البیان میں رقم فرماتے ہیں کہ سورۂ روم سوا آیت فسبحان اللہ الخ سب مکی ہے اب کوئی مولوی صاحب سے پوچھے کہ مکہ میں فدک کہاں تھا؟ فدک تو ہجرت سے چھٹے ساتویں سال بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آیا تھا۔ اس صورت میں تو سنیوں کی معتبر کتابوں میں بھی اگر تبصریح یوں لکھ دیتے۔ کہ یہ آیت بعد خیبر کی فتح کے نازل ہوئی ہے تب بھی اعتبار نہ کرنا تھا۔

کسی آیت کے مکی یا مدنی ہونے سے کیا مراد ہے؟ بالجملہ پیشوایان مذہب شیعہ نے بات تو بنائی تھی۔ لیکن کیا کریں کلیہ ہے۔ دروغ گو را حافظہ نہ باشد۔ تقدیر سے چوک گئے۔ باقی کسی کو یہ شبہ ہو۔ کہ مکی اسے بھی کہتے ہیں کہ مکہ معظمہ یا نواح مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہو۔ خواہ قبل ہجرت ہو یا بعد ہجرت، سو ہو سکتا ہے کہ غزوہ فتح میں مثلاً یہ سورتیں نازل ہوئی ہوں اور اس سبب ان کو مکی کہتے ہوں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو سورہ بنی اسرائیل کی اس آیت وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ الخ اور سورہ روم کی پہلی آیت کی شانِ نزول خود اس بات پر شاہد ہے کہ ان کا نزول ہجرت سے پیشتر ہے۔

علاوہ بریں مولوی دلدار علی صاحب رسالہ ضیغمیہ میں سنیوں کے اس استدلال پر کہ آیت اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ حرمت متعہ پر دلالت کرتی ہے۔ جو اعتراض کرتے ہیں تو یہ کرتے ہیں کہ یہ آیت مکی ہے سو یہ اعتراض جب ہی وارد ہو سکتا ہے کہ مکی مدنی سے یہی مشہور اصطلاح مراد ہو یعنی مکی وہ ہے جو قبل ہجرت نازل ہوئی ہو اور مدنی وہ جو بعد ہجرت نازل ہوئی ہو، اور مولوی دلدار علی صاحب اس باب میں ہمارے موافق ہوں مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں آیت وآت ذاالقربیٰ کی یہ تفسیر جو مولوی عمار علی صاحب اور سوا ان کے اور شیعہ کرتے ہیں سراسر غلط ہوگی

ذالقربیٰ سے سیدہ، درحقہٗ سے فدک مراد ہو تو کئی محذور لازم آئیں گے۔ پہلا محذور خویش پروری ماسوا اس کے اہل فہم و دانش سے یہ التماس ہے کہ خدا را میری رو رعایت نہ کریں پر انصاف

کرنا بھی تو کچھ اہل بیت پر ظلم کے برابر نہیں جو اتنا پرہیز ہے کیا ذالقربیٰ کے یہی معنے ہیں اور حقہٗ کا یہی ترجمہ ہے جو اس روایت میں مذکور ہے، بھلا سنیوں کو اول تو پاس ایمان، دوسرے یہ خبر بھی ہے کہ یہ روایت ساختہ و پرداختہ حضرات شیعہ ہے، پر جیسے یہودی، نصرانی، ہندو عربی خوان کہ نہ ان کو یہ خبر ہے، کہ یہ خبر سراسر غلط ہے، اور نہ کچھ پاس عزت و عظمت رسول اکرم نبی محترم صلے اللہ علیہ وسلم، اگر اس آیت کو دیکھیں گے تو کیا کہیں گے سو بدولت عنایات حضرات شیعہ بجز اس کے اور کیا ہوگا کہ دشمنان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بہ تہمت دنیا طلبی اور حیلہ پردازی متہم کر کے یوں کہیں گے کہ یہ جبرئیل کا حوالہ فقط اس لئے گھڑ لیا تھا کہ اپنی بیٹی کے دینے میں کوئی تکرار نہ کرے۔ ورنہ کلام اللہ کے الفاظ سے اس تفسیر کو کچھ مساس نہیں، ذالقربیٰ ایک لفظ کلی ہے بمعنی قرابت، فقط حضرت فاطمہ میں کیوں کر منحصر ہو جائے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قرابتی کچھ ایک دو نہ تھے ہزاروں تھے خاص کر حضرت زینب حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم جو بہ شہادت قرآن اور اصح الکتب شیعہ کافی کلینی قرابت میں حضرت فاطمہ ہی کے برابر تھیں، کچھ کم نہ تھیں، چنانچہ سند اس کی اوپر مرقوم ہو چکی، اور اگر یوں کہیئے کہ یہ دونوں صاحبزادیاں اس آیت کے نزول سے پہلے وفات پا چکی تھیں تو یہ تو غلط کیونکہ یہ مکی ہے اور ان دونوں کا انتقال مدینہ میں ہوا۔

دوسرا بلاغت کی مخالفت تیسرا بقیہ اقربا پر ظلم اور سلمنا حضرت علی اور حضرت عباس اور حضرات حسنین اور حضرت جعفر وغیرہ تو فدک کے قبضہ میں آنے کے وقت موجود تھے۔ اور یہ سب باتفاق عالم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قرابتی ہیں، تو اس صورت میں حضرت فاطمہ کو حق کیا دیا۔ اور سب قرابتیوں کا حق تلف کر دیا، اور اگر ہمارا یقین نہ ہو تو ان معنوں کی تصدیق کے لئے ہم۔۔۔۔ مولوی عمار علی صاحب کو ہی شاہد لاتے ہیں، دیکھ لیجئے وہ خود اس آیت کے معنے یہی لکھتے ہیں کہ دے تو اے محمد قریبوں کو حق ان کا، دوسرے حقہٗ کی تفسیر میں فدک کا کہنا بعینہ ایسا ہی مہمل جواب ہے، جیسا کسی نے اپنا نام ہجوں سے بتلایا تھا، ع ف زبر عف غ ت زبر غف، میرا نام محمد یوسف۔ بھلا ایسی پوچ باتیں اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف نسبت کرنے میں انہیں اتنا بھی خیال نہیں آتا کہ ہمیں کسی نے کچھ کہہ لیا تو کہہ لیا، پر خدا اور

رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی کیا کہے گا، شاید ان افترا پردازیوں سے یہ غرض ہو کہ ہم سے اگر خدا اور رسول کے موافق نہیں ہوا جاتا، آؤ جتنا ہو سکے خدا اور رسول ہی کو اپنے موافق کرلیں۔ سبحان اللہ ان تیرہ درونوں سے یہ تو نہ ہوا کہ اعجاز کلام اللہ اور شرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو آب و تاب دیں اور ظاہر کر دکھلائیں، پر ایسی باتیں کرکے دونوں کو چھپالیا بلکہ ایسی باتیں تراشیں کہ جن کو سنکر ناواقفوں کے تو ایک دفعہ کان کھڑے ہو جائیں، اور جی میں متردد ہوں کہ یہ بلاغت اور فصاحت کلام اللہ کا شہرہ اسی خوبی پر ہے تو بلاغت اور فصاحت معلوم، اس چیستان لاحل بولنے سے کیا حاصل تھا اگر وآتِ فاطمہ فدک فرما دیتے تو لفظ مختصر اور معنی واضح ہو جاتے۔

چوتھا آنحضرت کی طرف ادائیگی حقوق میں کوتاہی کی نسبت

ہاں اگر اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے بیع یا ہبہ وغیرہ سے حضرت فاطمہ زہرا کی ملکیت فدک میں ثابت ہو جاتی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے دینے میں کسی وجہ سے نعوذ باللہ کچھ تقصیر ہوئی ہوتی تو البتہ اس صورت فدک کی جگہ حقہٗ کہنے کا موقع بھی تھا، کیونکہ اگر کوئی کسی کی کوئی چیز دبالیتا ہے تو اس کو کہا کرتے ہیں کہ فلانے کا حق دے دو۔ القصہ جہاں مخاطب کے پاس کوئی کسی کی خاص چیز دبی ہوتی ہے یا کسی کے ذمہ کوئی حق معلوم ہوتا ہے تو وہاں البتہ اس چیز کا یا اس حق کا لفظ حقہٗ سے تعبیر کرنا بجائے خود ہوتا ہے، چنانچہ اہلِ فہم پر پوشیدہ نہیں، کم فہم نہ سمجھیں تو بلا سے نہ سمجھیں۔

سو اگر مولوی صاحب کا کہنا سچ بھی ہو۔ اور پیغمبر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ احتمال محال ہو بھی سکے تب بھی کام نہیں چلتا۔ کیونکہ اس صورت میں لازم آتا ہے کہ فدک اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے حضرت فاطمہ کی ملک میں ہو، حالانکہ یہ بات خلاف مزعوم شیعہ ہے۔ کیونکہ بیع کے انعقاد سے تو شیعوں کو بھی انکار ہے۔ باقی رہا ہبہ، سو وہ ان کے اعتقاد کے موافق بعد نزول اس آیت ہی کے واقع ہوا، اس لئے کہ وہ اس آیت ہی کو قبالہ ہبہ سمجھتے ہیں، چنانچہ اس آیت مذکورہ سے صاف ظاہر ہے اور ظاہر ہے کہ شے موہوب قبل از ہبہ واہب ہی کے ملک میں ہوتی ہے، تو پھر فدک کو حقہٗ کی تفسیر میں کہنا روایت کے

بنانے والے کی کمال خوش فہمی پر دلالت کرتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے، عیب کرنے کو ہنر چاہیئے۔

پانچواں بنی ہاشم کے لئے خمس حرام

اور اگر بپاس خاطر حضرات شیعہ مولوی صاحب کی بات کے بنانے کے لئے موافق نقل مشہور ،، دروغے راجزا باشد دروغے ،، ہم بھی یوں کہنے لگیں کہ ہاں سچ ہی یہ روایت سچی ہے اور ذالقربیٰ سے مراد حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حقہ کے معنے فدک ہی ہیں تو مولوی صاحب اس کا کیا جواب دیں گے کہ اس صورت میں جہاں کہیں کلام اللہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اقربا کا ذکر بلفظ ذالقربیٰ ہوگا تو لازم ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی مراد ہوں اور جب یہ قرار پایا تو بعد حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے کسی اور کو بنی ہاشم میں سے خمس کا حصہ لینا درست نہو اور وجہ اس نادرستی کی (درصورت مرقومہ) یہ ہے کہ آیت وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ کا ترجمہ یہ ہے ،، اور جان رکھو کہ جو کچھ تم غنیمت لاؤ کچھ چیز، سو اللہ کے واسطے ہے اس میں سے پانچواں حصہ اور رسول کے واسطے اور قرابت والے کے واسطے اور محتاج کے لئے اور مسافر کے لئے ،، فقط ،، اب خمس کی یہ تقسیم جو اس آیت میں مذکور ہے ہماری تمہاری مقرر کی ہوئی نہیں خدا کی مقرر کی ہوئی ہے اس میں کمی و بیشی مسلمانوں سے تو ہو ہی نہیں سکتی، پھر جب کہ ذالقربیٰ حضرت فاطمہ ٹھہریں تو بعد ان کے اور کسی کو اولاد میں سے یا بنی ہاشم میں سے ان کے خمس میں سے لینا درست نہو، حالانکہ مذہب شیعہ اس باب میں یہ ہے کہ نصف خمس امام وقت کا اور نصف باقی یتامیٰ اور مساکین اور ابن السبیل کے لئے، اور ظاہر ہے کہ امام شیعوں کے نزدیک سوا دوازدہ ائمہ کے اور کوئی نہیں۔ سو وہ سب کے سب بالاتفاق شیعہ معصوم ہیں، سو شیعوں کی تقسیم کے موافق جو کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں خمس میں سے لیا، یا حضرت امام مہدی رضی اللہ عنہ لینگے بفتوائے روایتِ مرقومہ بالا ظلم اور حرام ہوگا اور اگر کوئی شیعہ مذہب جودت طبع کو کام فرما کر یوں کہے کہ ہر چند ذالقربیٰ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی ہیں۔ اور خمس اصل میں انہیں کے لئے ہے لیکن ائمہ کو بوجہ میراث خمس کا لینا جائز ہے تو میری یہ عرض

ہے کہ اول تو میراث بقدر حصہ وارث چاہیئے، سو کیا بعد حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اماموں کے وقت میں سوا اماموں کے سادات میں سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا اور کوئی وارث ہی نہ تھا؟ جو نصف خمس سارے کا سارا امام کے لئے تجویز ہوا۔

چھٹا، بعد وفاتِ سیدہ جو غنائم آئیں وہ ان کی ملک نہ تھیں۔ تو حقہٗ کیوں فرمایا؟

اور مسلّما کہ حضرت زہرا کے مال کی وراثت انہیں اشخاص معدودہ کے لئے ہی لیکن جو چیز کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ اور حضرت امام مہدی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں غنیمت آئی یا آئے گی وہ حضرت فاطمہ کی ملک ہی میں نہیں، مالک ہونے کے لئے حیات ضروری ہے تو اس صورت میں اول تو خداوند علیم حکیم کے اس فرمانے کے کیا معنے ہوں کہ جو کچھ غنیمت لاؤ اس کا خمس ذالقربیٰ یعنی حضرت فاطمہ اور یتامیٰ وغیرہ کے لئے ہے۔؟

ساتواں، مالِ غنیمت ائمہ کے لئے حرام ورنہ دیگر مستحقین کے لئے بھی جائز

دوسرے جب وہ حضرت فاطمہؓ کی ملک ہی نہ ہوئی تو بوجہ وراثت اماموں نے کیوں لیا، اور یہ بھی نہ سہی خمس وراثت میں نہ آیا ہو بلکہ استحقاق خمس وراثت میں آیا ہو۔ لیکن یہ کیا انصاف ہے کہ ذالقربیٰ یعنی حضرت فاطمہ کا استحقاق خمس تو بطور وراثت اولاد میں منتقل ہو جائے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یتیموں اور مساکین اور مسافروں کا استحقاق خمس بطور وراثت ان کی اولاد میں منتقل نہ ہو، اگر یہی توریث ہے تو اس زمانے کے یتامیٰ اور مساکین اور ابناء سبیل کی اولاد بھی ہر چہ بادا باد یتیم ہوں کہ نہ ہوں، اور مساکین ہوں کہ غنی، مسافر ہوں یا مقیم مصرف خمس ہوں اور اماموں کے زمانہ کے یتیم اور مسکین اور ابناء سبیل کو اس میں سے دینا درست نہ ہو وہ یوں ہی خاک پھانکتے پھریں، معہٰذا جو سخن شناس ہیں وہ اس لفظ فاٰت ذالقربیٰ حقہٗ سے یوں سمجھتے ہیں کہ جناب باری کا حضرت رسالت پناہی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یوں ارشاد ہوا ہے کہ ذالقربیٰ کا حق پورا پورا ادا کر دو،

آٹھواں، سیدؑ کیلئے صرف فدک اور اغیار کے لئے سب کچھ

سو اگر ذالقربیٰ حضرت فاطمہ ہو ہیں۔ اور ان کا حق فدک ٹھیرا، تو اس صورت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے تو ادا ہو گئے، باقی جو کچھ بچا اور جو کچھ

سوا اس کے بطور نئی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آیا، یا اس کے بعد غنیمتوں میں سے خمس میں آیا یا اس سے پہلے غنیمت میں سے خمس میں آیا تھا، یا سوا اس کے جو کچھ اس آیت کا مفہوم قرار دیجئے، وہ سب مساکین اور ابن سبیل کا رہا، اور ظاہر ہے کہ فدک اس قدر مجموعہ کے ساتھ ہزارویں حصہ کی نسبت بھی نہیں رکھتا، سو موافق گفتار شیعان ”قدر شناسی عالم بالا معلوم“، اس تقسیم میں خدا سے بھی بڑی افراط تفریط ہوئی، کہ حضرت فاطمہ سیدۃ النساء جگر گوشۂ سید المرسلین صلوات اللہ علیہ وعلی آلہ اجمعین کے لئے تو فقط فدک اور باقی ساری دولت اغیار کے لئے اگر دنیا سے بچانا تھا تو اس قدر کی بھی کچھ ضرورت نہ تھی قوت لایموت تو فدک سے پہلے بھی ملے تھا نعوذ باللہ منہا خداوند کریم عادل کجا اور یہ تقسیم ناموزوں کجا، یہ بعینہٖ ایسی ہی تقسیم ہے جیسا کہ مشہور ہے ”از صحن خانہ تا بلب بام از آن من وز بام کاخ تا بہ ثریا از آن تو۔

نواں، خدا پر بے انصافی کا الزام

سنیوں کے طور پر تو اس تقسیم کے جواز کی ایک صورت بھی ہے، وہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی شان وہی ہے جیسے کلام اللہ میں ہے ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ۔ لیکن شیعہ تو خداوند احکم الحاکمین کے ذمہ عدل بمعنی معلوم ایسے امور میں واجب بتلاتے ہیں۔ سو بڑے حیف کی بات ہے کہ نعوذ باللہ خدا ہو کر ایسی ناانصافی کہ زیادہ استحقاق والوں کو کم، اور کم استحقاق والوں کو زیادہ۔ اور اگر کوئی صاحب یوں ارشاد فرمائیں کہ یہ روایت سنیوں کی کتابوں کے حوالوں سے مولوی صاحب نے بیان فرمائی ہے، اگر غلط ہو تو شیعوں کو کیا نقصان، سنیوں کے الزام کے لئے اتنا بھی بہت ہے کہ ان کی کتابوں میں یہ روایت موجود ہے۔ تو اس کا جواب ہم سے سنئے۔ اول تو یہی غلط کہ روایت شیعوں کی نہیں، کیونکہ مجمع البیان طبرسی میں حضرت ابو سعید خدری اور حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق کے حوالہ سے یہ روایت موجود ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ کو فدک عطا فرمایا اور اس کو ان کے سپرد کر دیا۔

اہل سنت کے یہاں روایت کے صدق وکذب کا معیار قرآن مجید ہے

باقی رہا یہ سنیوں کی کتابوں میں یہ

روایت پائی جاتی۔ تو اس کا جواب معقول ہم سے سنئے۔ جناب من یہ روایت سراسر دروغ ساختہ پرداختہ حضرات شیعہ ہے چنانچہ تقریر ماسبق میں بخوبی اس بات کی تحقیق مندرج ہو چکی ہے۔ لیکن مزید تسکین کے لئے اتنا اور بھی سنئے کہ سنی اول تو ایسے بے عقل نہیں، کہ جھوٹ سچ کی تمیز ان کو نہ آتی ہو، تس پر کلام اللہ کے حرف حرف کے اکثر سنی حافظ اور محافظ، ان کو ہر آیت کے سیاق سباق پر نظر رہتی ہے اور ایک مضمون کی جتنی آیتیں ہوتی ہیں ان سب کی خبر رکھتے ہیں جیسے شیعہ بسبب اپنی تیرہ درونی اور کج عقلی اور کلام اللہ کے محفوظ نہ ہونے اور موقع استدلال کے سیاق سباق کے یاد نہ ہونے کے باعث صحیح مطلب کی جگہ غلط سمجھ جاتے ہیں سنی غلط نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ وہ بفضلہ تعالے ان عیوب سے پاک ہیں، بلکہ جیسے کسوٹی پر چاندی سونے کو لگا کر کھرا کھوٹا پرکھ لیتے ہیں سنی روایات کو کلام اللہ پر مطابق کر کے صحیح ضعیف کو دریافت کر لیتے ہیں، سو وہ کیونکر ایسی روایات بے سند کو کہ قطع نظر بے سند ہونے کے اس آیت کا سیاق اور سباق بلکہ خود اس روایت کے لفظ اور معنے اس کے غلط ہونے کے گواہ ہوں۔ اپنی کتب میں درج کریں، یہ سب مقتدایان شیعہ کی چالاکی ہے تاکہ عوام اہلسنت کو اس تلبیس ابلیس سے جادہ مستقیم سے برطرف کر دیں۔

روایت فدک آیت کے سیاق سباق کی مخالف ہے

اول سیاق سباق آیت کی مخالفت تفسیر مذکور سے گوش گذار اہل انصاف ہے، خدارا غور سے سنیں، میں نہیں کہتا کہ میری رو رعایت کریں، ہاں البتہ انصاف کا خواہاں ہوں، سورہ بنی اسرائیل میں دوسرے رکوع وَقَضٰى رَبُّكَ سے لے کر مابعد تک آیت وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ کو ملاحظہ فرما کر دیکھیں کہ حروف خطاب سے مقصود فقط نفس نفیس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا تمام امت؟ سو اہل فہم جانتے ہیں کہ مقصود خطاب سے تمام امت کا خطاب ہے۔ کیونکہ لَا تَعْبُدُوْا اور رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ الخ اور وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ وغیرہ میں تو ضمائر جمع ہی کے ہیں۔ باقی رہا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى وغیرہ میں ہر چند بظاہر بوجہ وحدت خطاب اور بقرینہ وَقَضٰى رَبُّكَ جس میں ظاہراً خطاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب معلوم ہوتا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى وغیرہ میں خطاب خاص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے

مگر نظر بعموم حکم وبلحاظ قرینہ لَا تَعْبُدُوْا وغیرہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب ہر شخص کے لئے ہے اور اس کا مخاطب ہر عام وخاص ہے، اس میں اور لَا تَعْبُدُوْا میں اگر فرق ہے تو یہی ہے کہ وہاں اعنی لَا تَعْبُدُوْا وغیرہ میں مخاطب متعدد، پر خطاب ایک، اور یہاں دونوں متعدد ہیں، جتنے مخاطب، اتنے ہی خطاب۔

رہی یہ بات کہ بقرینہ وَقَضٰى رَبُّكَ خطاب بجانب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام وعلی آلہ الکرام معلوم ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہی، کہ جملہ وَقَضٰى رَبُّكَ اس امر کے لئے جب ہی قرینہ ہو سکتا ہے کہ جملہ وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى وغیرہ اس پر معطوف ہوں، سو اس بات کو اہل معانی وبیان سے دریافت کرنا چاہیئے کہ انشا، کا عطف خبر پر اور ماضی کا عطف امر پر درست ہے کہ نہیں؟ حق یہی ہے کہ جملہ وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى اگر معطوف ہی تو لَا تَعْبُدُوْا پر معطوف ہے اور اگر یوں کہیئے کہ وَقَضٰى رَبُّكَ اگرچہ بظاہر خبر ہے پر حقیقت میں بمعنی امر ہے قرینہ لَا تَعْبُدُوْا موجود ہے، تو اس کا جواب یہ ہی کہ اس صورت میں بھی لَا تَعْبُدُوْا کا قرینہ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ اگر یہ جملہ خبر بمعنی امر ہی تو خطاب بھی عام ہے۔

ہاں یہ بات اس صورت میں قابل استفسار ہے کہ جب دونوں جگہ مخاطب تمام امت ہی تھی تو نظم ونسق عبارت یوں مختلف کیوں ہوا؟ یا دونوں جگہ ضمیر جمع ہوتی؟ یا دونوں جگہ ضمیر واحد آتی؟ سو وجہ اس تغیر وتبدیل کی بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کوئی حکم احکام متعددہ میں سے جو ایک ساتھ صادر فرمائے جائیں، بہ نسبت اور احکام کے زیادہ عظیم الشان ہوتا ہے یا بہ نسبت کسی خاص حکم کے مخاطبوں کی طرف سے تقاعد اور تکاسل کا گمان ہوتا ہے تو ایسی صورت میں حکام والاشان بنظر مزید تاکید ہر ہر فرد بشر کی طرف خطاب کر کے حکم کیا کرتے ہیں سو یہاں بھی یا بلحاظ کہ شرک کی برائی اور بر والدین کی بھلائی ہر عاقل کی عقل میں خود بخود جمی ہوئی ہے اس کی ضرورت نہ دیکھی کہ تہدید منع فرمائیں اور بتاکید راہ پر لائیں فقط تقدیم ذکری پر کہ یہ بھی ایک قسم کی تاکید ہے۔ اکتفا فرمایا۔

ہاں ادا حقوق ذوی القربیٰ علیٰ ہذا القیاس بلحاظ صرف بیجا میں، اکثر بشر قاصر اور غافل نظر آئے، مناسب مقام یہ ہوا کہ زیادہ تر اہتمام کیا جائے۔ علاوہ بریں امر نہی دربارہ توحید

دشرک سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ خالق سے کیونکر معاملہ رکھنا چاہیئے، ادھر اوامر ادائے حقوق اہلِ حقوق اور نواہی اسراف و تبذیر سے یہ غرض ہوتی ہے کہ خلائق کیساتھ کیونکر رہنا چاہیئے۔ غرض معاملات کی دو قسمیں ہیں ایک خالق کے ساتھ ایک مخلوق کے ساتھ علیٰ ہذا القیاس اور امر و نواہی بھی منقسم بدو قسم ہیں چونکہ اصلاح معاملات منظور ہے اور ہر معاملہ دو ہی شخصوں سے تمام ہوتا ہے سو معاملہ خالق میں تو تمام مخلوق برابر ہیں ایک ہی خالق اور پھر سب کے ساتھ ایک ہی نسبت اس لئے اس کو تو ایک ہی معاملہ تصور کیجیئے، اور معاملہ مخلوق میں ہر شخص کا حال جدا، کیونکہ اوّل تو ہر ایک کے اقربا جدا، پھر اقربا میں سے بھی ہر شخص سے جدا قرابت، اس لئے ہر قرابتی کے ساتھ ایک جدا ہی معاملہ ہوگا، جب یہ بات ذہن نشین ہوچکی تو اب سنئے کہ اول صورت میں تو بلحاظ وحدت معاملہ ایک ہی خطاب مناسب ہے، اور صورت ثانی میں بنظرِ تعدّد معاملہ خطاب بھی جدا جدا چاہیئے۔

وآتِ ذی القربیٰ میں مخاطب خاص اور خطاب عام ہے

اور اگر اب بھی کسی کے دل سے خلجان نجائے تو پھر بجز اس کے اور کیا کہا جائے کہ یہ تعصب بیجا ہے مگر تاہم ہمارا مطلب کہیں نہ گیا اگر خطاب خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف ہوگا تب بھی صحیح یہ ہے کہ مخاطب ساری ہی امت رہے گی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ الخ کے معنی یہی ہیں اگر پہنچ جائیں تیرے سامنے بڑھاپے کو ماں باپ میں سے ایک یا دونوں، تو نہ کہہ ان کو ہوں اور نہ جھڑک ان کو، اور کہہ ان کو بات ادب کی الخ فقط۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر بعد چالیس برس کے کلام اللہ نازل ہونا شروع ہوا اور والدین آپ کے بچپن ہی میں گذر گئے تھے۔ پھر جو آپ کو یہ حکم سنایا گیا تو بجز اس کے اور بھی کچھ معنے ہیں کہ امتیوں کو سنا سنا کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتے ہیں، سو اسی طرح لفظ آتِ ذا القربیٰ کو سمجھنا چاہیئے۔ اور بیشتر اس قسم کے خطاب کہ سب بڑے کو منہ پر دھر لینا وہاں کہا کرتے ہیں کہ کسی وجہ سے اس کام کا زیادہ تر اہتمام اور عوام کی طرف سے اس میں کسی طرح کا تقاعد ظہور میں آیا ہو یا تقاعد کا گمان ہو تو ایسے میں بڑے محبوبوں اور مقربوں اور افسروں کو منہ پر دھر کے کہا کرتے ہیں تاکہ سب سمجھ جائیں کہ جب

ایسے محبوب اور مقرب کو اس حکم کی یہ تاکیدیں ہیں تو ہمارا تو کیا ذکر ہے ہم کو بدرجہ اولیٰ اس حکم کی رعایت چاہیئے، بالجملہ اِمَّا یَبْلُغَنَّ کے قرینہ سے مثلِ آفتاب روشن ہے کہ گو مخاطب خاص ہے پر خطاب عام ہے چنانچہ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا بھی فی الجملہ اس کی طرف اشارہ کرے ہے۔ کیونکہ تبذیر سے منع کرنا کچھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں اور پھر یہ بات بھی قرینہ مذکورہ سے واضح ہوگئی کہ ماں باپ بھی ذا القربیٰ میں داخل ہیں، بلکہ اس آیت میں زیادہ تر لحاظ انہیں کی طرف ہی لیکن خطاب عام جبھی ہوسکتا ہے کہ لفظ حقہ سے مطلقاً صلہ رحمی مراد ہو، چنانچہ ظاہر اور متبادر بھی یہی ہے، ورنہ حقہ کا مصداق اگر فدک ہی ہو تو پھر کس کس مومن مسلمان کے پاس فدک ہے جو اقربا کے حوالہ کرے۔ بالجملہ سیاق سباق آیت اٰت ذا القربیٰ الخ مندرجہ سورہ بنی اسرائیل تو بشہادت وجوہ مذکورہ اس تفسیر سے انکار کرتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس سورہ روم کو خیال فرمایئے کیونکہ اللہ یبسط الرزق سے لفظ آتِ ذا القربیٰ کے مابعد تک اگر بغور تامل کیا جائے۔ تو صاف واضح ہوجائے کہ یہاں بھی گو مخاطب خاص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں لیکن خطاب عام ہے کیونکہ پہلے تو یہ مضمون ہے کہ اللہ کو اختیار ہے جس کو چاہے روزی فراخ دے جس پر چاہے تنگ کردے، اسی پر تفریع کرکے فرماتے ہیں کہ تو قرابتیوں اور مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دیتا رہ۔ یعنی ہم نے اپنی بے نیازی سے کسی کسی کو مفلس اور تنگدست بنا دیا سو تو ان میں سے اس ترتیب کے موافق خبر لیتا رہ۔ پھر اس کے بعد یہ مضمون ہے کہ یہ بات بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور وہی لوگ فلاح کے پہنچنے والے ہیں۔ اور اس کے بعد اور بھی ایسے ہی مضمون عام ہیں۔ الغرض یہ جو لفظ ذالک کا اشارہ ہے یعنی یہ جو ارشاد ہوا کہ یہ بات بہتر ہے یہ اسی قرابتیوں کے حقوق اور مساکین اور ابناء سبیل کے حقوق کے ادا کرنے کی طرف اشارہ ہے، سو اسی طرح سے اشارہ فرماکر کہنا کہ یہ بات بہتر ہے ایمان والوں کے لئے، جبھی صحیح ہوسکتا ہے کہ کوئی حکم عام ہو۔ سو درصورتیکہ فدک مراد ہو تو اس تفسیر کا حال ہم تو نہیں کہہ سکتے۔ ایسا ہوجائیگا جیسے نعوذ باللہ مشہور ہے۔ من چہ می گویم وطنبورِ من چہ می گوید۔ الغرض دستاویز ہبہ فدک د

فرمان عطاء فدک شیعوں کے نزدیک سورۂ روم کی آیت تھی۔ سو اس کے سیاق سباق کا بھی حال معلوم ہو گیا۔

حقّہٗ کا معنی فدک کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا

معہذا حقہٗ کی تفسیر فدک ہی ہو تو دو حال سے خالی نہیں یا معنے حقیقی ہو یا معنے کا ایک فرد ہو۔ اور جیسے کوئی شخص گھوڑے کو نہ جانتا ہو۔ اور وہ کسی سے پوچھے کہ گھوڑا کیا شے ہوتا ہے۔ اور اتفاق سے کوئی گھوڑا اسوقت سامنے آجائے تو وہ دوسرا کہنے لگے کہ دیکھو یہ ہے گھوڑا، تو یہ جواب بیان معنی اور تفسیر حقیقت نہیں۔ بلکہ حقیقت اسی کے ایک فرد کو بتا کر گویا یوں سمجھا دیتا ہے کہ باقی افراد بھی اسی پر قیاس کر کے حقیقت مشترکہ کو سمجھ لو۔ ایسے ہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حقیقتِ حقِ ذی القربیٰ کو نہ جانتے ہوں؟ اور حضرت جبریل نے ایک فرد کو افراد حقوق ذی القربیٰ میں سے بتلا کر مطلب کا راہ نکال دیا ہو؟ یا یوں کہیئے کہ نہ یہ معنی لغوی ہیں، اور نہ کوئی فرد معین منجملہ افراد کے۔ بلکہ جناب سرور کائنات فقط مقدار حق ذی القربیٰ کو نہ جانتے ہوں، سو اسی کا سوال کیا اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اس مقدار ہی کا ذکر فرمایا۔ بالجملہ ان تین احتمال سے زیادہ اور کوئی احتمال نہیں جس کو غرض اصلی تفسیر مذکورہ کی قرار دیجئے اور حقیقت میں دیکھئے تو ایک بھی احتمال نہیں مطلب آیت کا ظاہر ہے تفسیر کی کچھ حاجت نہیں۔

سو خیر اگر اس معنے کو معنے لغوی قرار دیجئے تو یہ تو ظاہر ہے کہ ظاہر البطلان ہے کونسا کودن یوں کہدے گا کہ اس لفظ کے معنی لغوی اور موضوع لہ مطابقی یہ معنے ہیں؟ اور اگر یوں کہیئے کہ مدینۃ العلم اور معدن حکمت یعنے سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوات والتسلیمات حقیقت حق ذی القربیٰ کو نہ جانتے تھے اور حضرت جبرئیل نے، ایک فرد کا بیان فرما کر حقیقت الامر سے مطلع فرما دیا تو یہ جرأت بھی مولوی عمار علی صاحب جیسے صاحبوں سے ہو سکتی ہے اہل فہم کی زبان تو ایسی باتوں کے لئے نہیں اٹھتی۔ عاقل چھوڑ دیوانے بھی اتنا تو جانتے ہیں کہ حقیقت حق ذا القربیٰ یہی دینا دلانا ہے چنانچہ لفظ آیت خود صاف یہی کہتا ہے پھر جب کبھی کچھ دینے دلانے کا اتفاق ہو گا۔ وہی ایک فرد اس حقیقت کا ہو جائے گا۔ باقی رہا تیسرا احتمال بادی النظر میں البتہ فی الجملہ کچھ آیت مذکورہ کے پاس پاس کو پھرتا ہے لیکن بغور دیکھئے تو جواب خیر سے یہ بھی بعید ہے کیونکہ اول تو اقربا کے حق کی کوئی حد نہیں۔

شیعہ سنیوں کا سب کا اس پر اتفاق ہے کہ جتنا کرے اتنا تھوڑا، دوسرے اس صورت میں لازم تھا کہ بگھوں سے یا جریبوں سے مثلاً، یا باعتبار ربع یا ثلث مال کے تعین مقدار بیان فرماتے، اس صورت میں اس سوال وجواب کی وہی مثل ہو جائے گی۔ سوال از آسمان جواب از ریسمان نعوذ باللہ اگر اس احتمال پر حضرات امامیہ جمیں، تو غرابیہ کے اس عقیدہ کو بھی منظور فرمالیں کہ خداوند کریم کی طرف سے حکم حضرت علی کے پاس وحی کے لے جانے کا ہوا تھا۔ پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے غلطی کے باعث حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو وحی پہنچا دی۔ کیونکہ اس جواب سے بھی حضرت جبرئیل کی خوش فہمی کچھ اس خوش فہمی سے جو غرابیہ کے طور پر در بارہ وحی رسانی ان سے ظہور میں آئی ہے کم نہیں۔

القصہ یہ تینوں احتمال اس تفسیر کے ابطال سے مالامال ہیں۔ ہاں اگر فدک پہلے سے مملوکہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہوتا۔ اور بوجہ غلطی مثلاً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں ہوتا تو البتہ یہ تفسیر باعتبار ظاہر ٹھیک ہو جاتی لیکن اس کو کیا کیجئے کہ اتنی بات کے سنی تو درکنار شیعہ بھی قائل نہیں بلکہ باتفاق شیعہ فدک مملوک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تھا، پر بعد نزول اس آیت کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالہ کر دیا علیٰ ہذا القیاس ذا القربیٰ کی تفسیر میں جو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا نام ہے اس میں بھی ان تینوں احتمالوں کا بطلان سمجھئے۔

ابن سبیل اور مسکین بھی استحقاق میں ذا القربیٰ کے ہم پلہ ہیں

اور ان سب باتوں کو جانے دیجئے اگر ذا القربیٰ۔ اور حقہ کے معنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہ تھے تو لفظ مسکین اور ابن سبیل بھی اس طرح کے اشکال اور خفاء معنی میں کچھ ذا القربیٰ اور حقہٗ سے کم نہ تھا۔ علی الخصوص تعین مقدار حقِ مسکین اور حق ابن سبیل۔ کہ ان دونوں کا عرف میں بھی کوئی قانون نہیں بخلاف قرابتیوں کے کہ ان کے لینے دینے کا ہر قوم میں ایک دستور بندھا ہوتا ہے، پھر کیا وجہ، کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ذوی اقربا کے حقوق کو تو حضرت جبرئیل سے پوچھا اور مسکین اور ابن سبیل بیچاروں کی بات بھی نہ پوچھی؟ اگر یہ عذر ہے کہ اس روایت

میں نہ سہی، کسی اور روایت میں ہوگا تو مسلم۔ لیکن کسی دوسری ہی روایت سے مثل ذالقربیٰ کے مسکین اور ابن سبیل کے اشخاص معیّن کیجیے۔ اور تعینِ مقدارِ حقِ مسکین اور ابنِ سبیل بیان فرمایئے اور قطع نظر اس بات کے جناب باری تعالےٰ اس آیت میں ایک ساتھ تینوں کو ذکر فرماتا ہے آیت واعلموا انما غنمتم وغیرہ کے ملاحظہ سے بھی یوں سمجھ میں آتا ہے کہ مسکین اور ابن سبیل استحقاق میں ذالقربےٰ کے ہم پلہ ہیں، جیسا ان کا دینا ضروری ہے، ویسا ہی ان کا، پھر کیا وجہ ہوئی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ذاالقربےٰ کے حق کے ادا کرنے کا تو فکر ہوا، اور اس باب میں کنج کاؤ اور تفتیش اور استفسار فرمایا اور در بارۂ مسکین اور بیچارۂ ذلیل ابن سبیل کچھ لب کشا نہ ہوئے۔؟

باقی رہی روایات طرفین کی جو درباب فضیلت خدمت گذاریٔ مساکین اور ابناء سبیل کے وارد ہیں، سو ایسی روایتیں صلہ رحمی کے فضائل میں بھی صدہا مشہور معروف ہیں، اگر مساکین اور ابن سبیل اور ان کے حقوق کی تفصیل اور تحقیق کا پہلے سے معلوم ہونا اس قسم کی روایات سے معلوم ہوتا ہے تو ذاالقربیٰ اور ان کے حقوق کی تفصیل اور تحقیق کا معلوم ہونا بھی صلہ رحمی کے فضائل کی روایات سے معلوم ہوتا ہے مسکین اور ابن سبیل کے باب میں اگر پوچھنے کی حاجت نہ تھی تو یہاں بھی نہ تھی۔ اور اگر احادیث فضائل صلہ رحمی میں یہ احتمال ہے۔ کہ شاید بعد اس آیت کے نزول کے لب مبارک نبوی سے صادر ہوئی ہوں تو یہاں بھی وہی احتمال، نہ انکی کسی کے پاس تاریخ لکھی ہوئی نہ انکی۔

آیت ذالقربیٰ اگر مدنی ہے تو واعلموا کی طرف اشارہ ہے

یہ سب ردوکد تو اس صورت میں ہے کہ جیسا تمام امت خاص کر شیعہ اس آیت کو مکی کہتے ہیں مکی ہی کہیں۔ اور اگر سارے جہان کے برخلاف جیسے مولوی صاحب نے واقدی اور بشیر بن ولید کے حوالہ سے اس آیت کا مدنی کیا بعد خیبر کے نازل ہونا بیان فرمایا ہے۔ ہم بھی اس کے بعد خیبر کی فتح کے قائل ہوں تب ایک بات میں جھگڑا ہو چکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر یہ آیت بعد خیبر کے نازل ہوئی تو آیت وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ پہلے نازل ہو لی ہے کیونکہ یہ تقسیم آیت واعلموا میں ہے اسی تقسیم کے موافق فتح خیبر سے پہلے ہمیشہ غنیمتیں تقسیم ہوتی رہیں۔ سو اس صورت میں

کیا حاجت تھی۔ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل سے پوچھا؟ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس تقدیر پر آیت آت ذاالقربیٰ حقہ میں تقسیم مذکور کی طرف اشارہ ہوگا، اور چونکہ اس تقدیر پر ذوی القربیٰ او مسکین اور ابنِ سبیل تینوں کے حق سے شرح مشرح معلوم ہو جائے گی، تو جو جو خرابیاں بر تقدیر صحت روایت معلومہ معلوم ہوتی تھیں سب کی طرف سے اطمینان حاصل ہو جائیگا، بہرحال چار طرف وجوہات متعددہ اور قرائن داخلی خارجی اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ روایت محض دروغ اور سراسر بہتان ہے، بالجملہ باعتبار روایت کے تو سنیوں کو اس روایت کے غیر معتبر ہونے میں ان وجوہ سے تامل نہیں اور بے تامل یہ سمجھتے ہیں کہ مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ مومنو اقربا اور مساکین اور مسافروں سے سلوک کرتے رہو۔ اور اقربا میں سے ہر ایک کے ساتھ درجہ بدرجہ احسان اور محبت اور ادب اور تواضع سے پیش آؤ۔ ماں باپ کے ساتھ ادب اور خدمت گذاری، اور اولاد کے ساتھ محبت اور خبرداری، اور بھائی بند کے ساتھ حسن اخلاق اور مددگاری سے ملتے رہو۔ القصہ علی العموم سب مومنوں کو یہ حکم ہے۔ گو مخاطب فقط رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، نہ یہ کہ فقط رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک حضرت فاطمہ زہرا رض کو فقط فدک حوالہ کر کے اس بار حکم سے سبکدوش ہو کر فارغ البال ہو جائیں۔

روایت مذکورہ کے وضعی ہونے کی دلیل خود عمار علی ہے۔

باقی رہا بطور قواعد روایت کے اس روایت کا غلط ہونا سو اول تو اس روایت کے غلط ہونے میں اس وجہ سے شک و شبہ نہیں کہ مولوی عمار علی صاحب اس بات کے ناقل ہیں، کہ یہ روایت سنیوں کی معتبر کتابوں میں ہے۔ اس سے زیادہ اس روایت کے غلط ہونے کی اور کیا نشانی ہوگی؟ کیونکہ مولوی صاحب کا صدق مقال اور راستی گفتار در بارہ نقلیات (ان تحریروں سے جو قریب ہی حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم دختران مطہرہ حضرت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ام کلثوم جگر گوشہ حضرت بتول رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقدمہ میں گذری ہیں بلکہ سوا اس کے اور تحریروں سے بھی) واضح ہو چکا ہے، پھر جب مولوی صاحب روایت میں ایسے امانت دار ٹھیرے کہ شیعوں کی ضد میں اپنے علما اور اپنی معتبر کتابوں کو جھوٹ کی طرف نسبت کر دی ہو اور اپنے سب

دین وآئین کا اعتبار کھو دیا ہو۔ سنیوں کے ذمے ایک بہتان باندھتے ہوئے ان کو کیا اندیشہ رہ گیا۔؟ ایسی باتوں میں یا خدا کا ڈر ہوتا ہے یا دنیا کی شرم ہوتی ہے سو قربان جائیے تقیہ کے اس کے صدقہ سے دونوں کو بغل میں مارا مگر باایں ہمہ منتظروں کے اطمینان خاطر اور ناظرین کے دفع خلجان کے لئے لازم ہے کہ کچھ مفصل بھی بیان کیا جائے۔ تاکہ یہ جو بالاجمال مولوی صاحب کا جھوٹا ہونا ثابت ہوا ہے۔ خوب دل نشیں ہو کر اہل فہم کو اہل سنت کی حقانیت اور شیعوں کا بطلان کالعیان ہو جائے۔ مگر شاید مولوی صاحب کو اپنی اہانت کی شکایت ہو سو ملازمان مولوی صاحب کی خدمت میں یہ التماس ہو کہ معاذ اللہ ہم سے ایسا کب ہو سکتا ہے؟ آپ کے دین کو تو دروغ ہی سے فروغ ہے۔ سو فروغ کی باتوں میں اگر آپ کی استقامت ہماری تقریر یا تحریر سے ثابت ہو جائے تو ہمارا ممنون احسان ہونا چاہیئے۔

فصل، کتابِ مصنف کتاب کے قابل قبول ہونے کی چھ شرطیں بالجملہ مزید اطمینان کے لئے اس باب میں کچھ دل لبریز نوک زیر قلم ہے مگر اول بطور تنبیہ یہ گذارش ہے کہ کتابیں آدمیوں ہی کی تصنیف ہوتی ہیں، جیسے آدمی سب طرح کے ہوتے ہیں جھوٹے سچے معتبر غیر معتبر، فہمیدہ غیر فہمیدہ۔ ایسے ہی کتابیں بھی سب طرح کی ہوتی ہیں۔ ملحدانِ بے دین نے بہت سی کتابیں تصنیف کر کے اچھے اچھے بزرگوں کے نام لگا دیئے ہیں۔ اور اس میں اپنے واہیات سینکڑوں بھر دیئے ہیں اور جو کتابیں کہ بزرگان اہل سنت کی تصنیف ہیں۔ اس میں سے بھی اکثر ایسی ہیں کہ وہ لوگوں کی فیض رسانی کے لئے تصنیف نہیں ہوئیں بلکہ بطور بیاض کے جمع کی گئیں، تاکہ نظر ثانی کر کے ان کی روایات کا حال معلوم کریں، اور اتفاق سے نظر ثانی کا اتفاق نہ ہوا یا ہوا اور کسی وجہ سے وہ بیاضیں لوگوں کے ہاتھ پلے پڑ گئیں۔ اور بعض کتابیں ایسی ہیں کہ وہ بہت کمیاب اور بدرجہ غایت نادر الوجود بلکہ بمنزلہ مفقود ہیں۔ اور وہ ملحدوں اور متبدعوں کے ہاتھ لگ گئیں ہیں انہوں نے اپنی گھڑی ہوئی روایتیں اس میں داخل کر دیں ہیں۔ یا اہل سنت کے مقابلے کے وقت کسی روایت کو ان کتابوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ تاکہ اہل سنت خاموش ہو جائیں۔

سو اہل تشیع اکثر ایسا ہی کرتے ہیں اور ایسی ہی کتابوں کا حوالہ دیا کرتے ہیں اس لئے

اہل حق کو لازم ہے کہ جب کسی شیعہ سے کسی کتاب کا حوالہ سنے تو اول تو یہ دریافت کرے کہ یہ روایت اس کتاب میں ہے کہ نہیں؟ دوسرے اس کتاب کا حال تحقیق کرے کہ معتبر ہے کہ نہیں۔؟

پہلی شرط اور معتبر ہونے کی یہ صورت ہے کہ کسی کتاب کی روایات کے معتبر ہونے میں چند باتیں ضروری ہیں۔ اول تو یہ کہ اس کتاب کے مصنف کو تفریح طبائع محزونہ کے لئے فقط قصہ گوئی اور افسانہ خوانی مدِ نظر نہ ہو، بلکہ واقعات واقعی کے مشتاقوں کی تسکین کے لئے اس کتاب کو تصنیف کیا ہو۔ ورنہ چاہیئے کہ بہار دانش اور بوستان خیال کے افسانے، اور چہار درویش اور بکاؤلی کی کہانیں، اور فسانہ عجائب اور فسانہ غرائب کے طومار، سب کے سب دستاویز خاص و عام ہو جائیں۔

دوسری شرط دوسرے یہ کہ مصنف کتاب کسی کی رو رعایت اور کسی سے بغض و عداوت نہ رکھتا ہو اور اس کا حفظِ اخبار اور صدق گفتار اس درجہ کو مشہور ہو کہ اس کی تحریر کی نسبت کسی کے دل میں شک و شبہ نہ ہو، ورنہ طومار کے طومار اخباروں کے لڑکیوں کی زبانوں میں اپنے بزرگوں کی شجاعت اور ان کے غنیموں کی بزدلی سے مشحون ہوا کرتے ہیں، بالاتفاق مسلم ہو جائیں؟ اور یہ جو زبان زدِ خاص و عام ہے کہ اخباروں کا کیا اعتبار؟ ایک حرف بیجا اور عقیدۂ ناسزا ہو جائے اور شیعہ سنیوں کی، اور سنی شیعوں کی سندیات بر سر و چشم رکھنے لگیں اور ہر کس و ناکس کی بات قبول کرنے لگیں، اور یہ فرق قوت و ضعف، حفظ و تفاوت، صدق و کذب، اور علی ہذا القیاس یہ تہمت رو و رعایت، اور کینہ و عداوت، ہرگز قابل لحاظ نہ رہے۔

تیسری شرط تیسرے یہ کہ مصنفِ کتاب باوجود صدق و دیانت اور حفظ عدالت کے اس فن میں جس فن کی وہ کتاب ہے۔ دستگاہ کامل اور ملکہ کما ینبغی رکھتا ہو۔ نہ یہ کہ دین میں مثلاً نیم ملا ہو جس سے خطرۂ ایمان ہو۔ یا طب میں مثلاً نیم طبیب ہو کہ بیمار دل کو خطرۂ جان ہو۔

چوتھی شرط چوتھے یہ کہ وہ کتاب باوجود شرائط مذکورہ کے قدیم سے مشہور و معروف اور ایسے قسم کے لوگوں کے واسطے سے جو مجموعہ اوصاف مرقومہ ہوں دست بدست ہم تک پہنچی ہو

ورنہ لازم کیا الزم تھا کہ انجیل اور توراۃ جو کلام ربانی ہیں اور اس خدا کی تصنیف ہیں جو بوجہ اتم جامع اوصاف مذکورہ کیا مجموعہ جمیع صفات کمال اور معدن جملہ کمالات جلال و جمال ہے۔ اعتبار اور اعتماد میں ہم پلہ قرآن مجید اور فرقان حمید کے ہو جائے؟

پانچویں شرط پانچویں یہ کہ روایت کی کتاب میں اعتبار کے لئے ضروری ہے کہ مصنف کتاب نے اول سے التزام اس بات کا بھی کیا ہو کہ بجز صحیح روایتوں اور محقق حکایتوں کے اور روایتیں اپنی کتاب میں درج نہ کروں گا۔ جیسے صحاح ستہ کہ ان کے مصنف نے یہ شرط کر لی ہے کہ بجز صحیح روایت کے اپنی کتاب میں درج نہ کرینگے۔ اسی واسطے ان کتب کا نام صحاح ستہ مشہور ہو گیا سو اگر کوئی کتاب کسی کی بیاض ہو کہ اس نے اس میں ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں اور صحیح غلط حکایتیں اس غرض سے فراہم کر لی ہیں، کہ بعد میں نظر ثانی کر کے صحیح صحیح کو قائم رکھ کر باقیوں کو نقل کے وقت حذف کر دوں گا۔ جیسا امام بخاری اور امام مسلم نے کیا یا صحیح کو صحیح تبلا کر موضوع یعنی بنائی ہوئی باتوں اور گھڑی ہوئی حکایتوں اور ضعیف وغیرہ کو لکھ کر اس کے بعد لکھ جاؤں گا کہ یہ موضوع ہے یا ضعیف ہے مثلاً جیسے امام ترمذی نے کیا لیکن اتفاقات تقدیر سے ان کا یہ ارادہ پیش نہ گیا، اور یہ آرزو پوری نہ ہونے پائی تھی، جی کی جی ہی میں تھی کہ اجل نے آ دبایا، تو ایسی کتاب کی روایات کا ہرگز اعتبار نہ ہو گا۔ ورنہ کونسا مصنف نہیں کہ اس نے اول ایک مجموعہ بیاض بطور کلیات کے فراہم نہیں کیا؟ امام بخاری سے بہت سندوں سے منقول ہے کہ انہوں نے چھ لاکھ حدیثوں سے چھانٹ کر بخاری شریف کی حدیثیں نکالیں ہیں اور عبدالرزاق بخاری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے کوئی تین دفعہ حدیثوں کی بیاض لکھی کی تھی۔ چھانٹ کر بخاری شریف کا مسودہ کیا تھا۔ چنانچہ یہ مضمون بخاری شریف مطبوعہ دہلی مطبع احمدی کے مقدمہ کی دوسری اور تیسری فصل میں مندرج ہے۔

بہرحال ایسی بیاضوں کا جمع کرنا ایسے ایسے ائمہ حدیث کی نسبت بھی ثابت ہے سو اگر اتفاق سے امام بخاری مثلاً بعد فراہمی بیاض تیجے قبل اس کے کہ بخاری شریف کی حدیثیں اس میں سے چھانٹ کر بخاری تصنیف کریں، اس دار فانی سے کوچ کر جاتے تو گو وہ بیاض امام بخاری ہی کی تصنیف سمجھی جاتی لیکن کوئی بتلائے تو کیا وہ قابل اعتبار کے ہو جاتی؟ سب جانتے ہیں کہ

اگر وہ ایسی ہوتی تو امام بخاری کو چھانٹنے ہی کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس صورت میں خود امام بخاری ہی اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ میری بیاض قابل اعتبار نہیں، پھر ہم کیونکر فقط اس سبب سے اس کا اعتبار کرنے لگیں کہ وہ ایسے بڑے محدث امام المحدثین کی تصنیف ہے۔ کہ جہان میں نہ کوئی ثانی ان کا ہوا ہے نہ ہو۔ غرض اگر کوئی کتاب اس قسم کی کسی کو مل جائے اور اس کے مصنف کو کتنا ہی بڑا محدث کیوں نہ ہو، اس کی تہذیب اور تالیف کا اتفاق نہوا ہو تو وہ کتاب کسی طرح علما کیا جہال کے نزدیک بھی بشہادت عقل قابل اطمینان نہیں۔ ہاں مولوی عمار علی صاحب جیسے ماہر فن حدیث کا ذکر نہیں کہ وہ الٹی کے سمجھن ہار ہیں۔ وہ اگر ایسی نامعقول بات کہہ پڑیں چنانچہ ان کا خط ایسی باتوں سے مشحون ہے۔ تو اس کا جواب بجز اس کے کچھ نہ ہو گا کہ باضافت مصدر الی المفعول کسی نے کہا ہے۔ جواب جاہلان باشد خموشی۔ بہرحال یہ نکتہ محفوظ رکھنا چاہیئے کہ بسبب اس کے ملحوظ نہ رہنے کے اکثر عالم نام سے گرفتار دام اوہام ہو جاتے ہیں چہ جائیکہ جاہل؛

چھٹی شرط چھٹے یہ کہ اگر چند روایتیں باہم مختلف ہوں اور پھر اختلاف بھی حد تضاد یا تناقض کو پہنچ جائے دونوں کا صحیح ہونا فقط مستبعد ہی نہو تو پھر ترجیح باعتبار قوت سند ہی کے ہو گی ورنہ لازم ہے کہ شیعوں کے نزدیک روایات شیعہ اور روایات اہل سنت جو مخالف روایات شیعہ ہیں دونوں صحیح ہوں، ایسے ہی کلینی کی یہ روایت کہ کلام اللہ کی سترہ ہزار آیتیں تھیں ... لیکن ماسوا، مندرجہ مصاحف متداولہ کے سب چوری گیئں، اور ابن بابویہ صدوق کی روایت کہ کلام اللہ اتنا ہی تھا جتنا اب ہے، دونوں صحیح ہو جائیں۔ سو سب جانتے ہیں کہ اجتماع نقیضین اور ارتفاع نقیضین دونوں محال ہیں جب یہ بات مقرر ہو چکی، تو گوش گذار اہل انصاف ہو کہ اول تو یہ روایت اور نیز باقی روایتیں جو الزام اہل سنت کے لئے اہل سنت کی کتابوں کے حوالہ سے مولوی عمار علی صاحب نے اپنے رقیمہ میں درج فرمائی ہیں ان کتب میں نہ سمجھنی چاہیئے۔ کیونکہ اعتبار کے ساقط ہو جانے کے لئے آدمی کا ایک جھوٹ بھی بہت ہے۔ مولوی صاحب کا دروغ تو امور متعددہ میں متحقق ہو چکا۔ چنانچہ ناظران ابحاث متعلقہ نکاح حضرت ام کلثوم جگر گوشہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور ملاحظہ کنان تقریر نسب حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم بنات مطہرہ

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم خود جانتے ہیں۔ گذارش مکرر کی کچھ حاجت نہیں۔ اگر یاد نہ رہا ہو تو پانچ سات ورق پلٹ کر ملاحظہ فرمالیں معلوم ہو جائے گا کہ جب مولوی عمار علی صاحب نے اپنی کتب مشہورہ معتبرہ کی مرویات سے چشم پوشی کر کے ایک غرض خفیف یعنی سنیوں کی بات کے ہلکا کرنے کے لئے رقیمہ موسومہ میرزا نادر علی صاحب میں بہت سا کچھ خلاف واقع لکھدیا، اور پھر جراُت کر کے یہ کہہ دیا کہ اگر سند مطلوب ہو تو روانہ کر دی جائے۔ اور یہ خیال نہ فرمایا کہ ہماری صحیح روایتیں غلط ہوئی جاتی ہیں اگر سنیوں کے سر پر بھی ایک طوفان دھر دیں تو اس میں تو یہ بھی اندیشہ نہیں اور بڑی دلیل اس بات کی یہ ہے کہ جن کتابوں کے حوالہ سے یہ روایت درج رقیمہ مولوی صاحب ہے، خود انہیں کتب کے مصنفوں کی مشہور کتابیں اس روایت کو رد کرتی ہیں۔ چنانچہ انشاء اللہ تعالےٰ آئندہ مذکور ہوگا۔

اہل سنت کی کتب میں اہلِ تشیع کے الحاقات

اور سلمنا کہ یہ روایتیں سنیوں کی بعضی کتابوں میں ملتی ہیں لیکن وہ کتابیں ایسی غیر مشہور ہیں کہ کمیابی میں بیضہ عنقا سے کم نہیں سنیوں کو اُن کتابوں کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا حفظ اور ضبط تو درکنار۔ سو اگر یہ روایتیں اُن کتابوں میں ہوں بھی تو بیش بریں نیست کہ جیسے بعض سیہ کاران قبیلۂ یہود نے منافقانہ نصرانی بن کر انجیل میں بہت سی خرافات خلافِ عقلِ صریح اور مناقضِ نقلِ صحیح درج کر دی ہیں، ایسے ہی مقتدیان عبداللہ بن سبا یہودی منافق اعنی حضرات شیعہ بھی کہ بالیقین تبدیل و تحریف میں کوچک ابدال یہود مردود اور موافق نقل مشہور "سگ زاد برادر شغال" تیرہ درونی میں ان کے ہمرنگ اور قساوت قلبی اور سنگدلی میں ان کے ہمسنگ ہیں، قدیم سے درپئے تخریب دینِ احمدی اور ہمہ تن مصروف تحریفِ آئینِ محمدی علیہ وعلےٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام رہے ہیں اور اہلسنت وجماعت کی جماعت پر دانت پیستے چلے آئے ہیں لیکن بایں وجہ کہ امتیان مسیح علیہ السلام کو نہ حفظ و محافظت انجیل سے کچھ کام تھا۔ اور نہ اس کی تلاوت اور یادداشت میں چنداں اہتمام تھا، یہود مردود کا انجیل پر بھی داؤ چل گیا، چہ جائیکہ دیگر کتب زائد غیر مشہور۔

اہل سنت کا نظام حفاظت

لیکن یہاں یہ حال ہے کہ ایک ایک حرف قرآن پر لکھو کھا سنیوں نے جھونپڑا باندھ رکھا ہے۔ اور ہر ہر روایتِ صحاح ستہ وغیرہ کتب صحاحِ احادیث پر ہزار دل

محدثین بیدار مغز نے تنقیح اور تفتیش اور حفظ وضبط کی یہ نوبت پہنچادی کہ کسی ملحدِ بے دین کو مجال زیادہ کم کرنے کی باقی نہ رہی، چنانچہ کثرت حفاظ قرآنی اور شیوع محدثین ربانی فرقہ اہلسنت میں اس درجہ کو پہنچی ہے کہ مابہ الامتیاز اور مابہ الافتراق اہل سنت اور شیعہ ایک یہ بات بھی ہوگئی ہے الغرض اس وجہ سے کتاب اللہ اور صحاح ستہ وغیرہ کتبِ مشہورہ اہلسنت تک تو ان تیرہ درونوں کا دستِ تطاول نہ پہنچا۔ گو بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے اور وعدہائے اِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ اور وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُورِهِ نے ان نابکاروں کی سعی بیجا کو انجام تک نہ پہنچایا۔ لیکن نقل مشہور ہے "اصل بد از خطا خطا نہ کند"۔ جیسے اس بات سے ہارے تھے جھک مار کر چپ ہو رہتے۔ لاچار ہو کر کتب غیر مشہورہ کی طرف متوجہ ہو کر اپنے دل کے پھپولے پھوڑے اور بہت سے طوفان ایسے جوڑے کہ عوام کیا بعض علماء سادہ لوح بھی ایک دفعہ کو بچل جائیں سو منجملہ ان کے روایاتِ مندرجۂ رقیمۂ مذکور بھی ہیں۔ لیکن بحمداللہ فرقہ اہلسنت جماعت کہ ایک جماعت کلاں ہے۔ محققین سے کبھی خالی نہیں رہا، ان کو خداوند کریم جزائے خیر دے وہ لوگ ان کی دھوکہ بازیوں کو سمجھ گئے، اور بامدادِ خداوندی انہیں روایات میں سے علامات اور اماراتِ کذب و دروغ نکال کر عاقلوں کو متنبہ کر دیا اور عاقلوں کو طریقہ تمیز حق و باطل کا بتلادیا چنانچہ ان روایات کے ابطال کی تقریر کو دیکھ کر انشاء اللہ یہ دعوےٰ مدلل ہو جائے گا۔

القصہ دغابازان شیعہ کی یہ چالاکی کتب غیر مشہورہ میں چل گئی، اسی واسطے علمائے اہل سنت ان کتب کو ہمسنگ تورات و انجیل سمجھتے ہیں اور ان کی روایات کو معتبر نہیں رکھتے ہاں ان کی روایات کو روایاتِ صحاح ستہ ودیگر کتبِ صحاح مشہورہ پر پیش کر کے جو مطابق نکلے اس کو بر سر وچشم رکھتے ہیں، اور جو مخالف نکلے اس کو ملحدانِ بدعت کیش دروغ پیشہ شیعہ وخوارج وغیرہ کے سر مارتے ہیں اور جو روایات خلاف ووفاق سے برطرف ہو اگر دلائل عقلیہ کے مخالف ہو تو اس کا بھی یہی حال ہے، ورنہ اگر تکذیب نہیں کرتے تو تصدیق بھی نہیں کرتے۔ بہرحال جو روایت کہ ان کتب میں بلاشرکت غیر بھی پائی جائے اگر روایت صحاح کے مخالف بھی نہ ہو تب بھی قابل تمسک اور لائقِ حجت نہیں سمجھتے۔ اور مثل مرویات اہلِ کتاب بلکہ خود

انجیل و توراۃ نہ ان کی تصدیق کرتے ہیں نہ تکذیب۔

مصنف معتبر ہو تو ضروری نہیں کہ تصنیف بھی معتبر ہو۔

سو اگر کسی شیعہ کم فہم کو ان کتب کے غیر معتبر ہونے میں اس وجہ سے وثوق نہ ہو کہ اُن کتب کے مصنف منجملہ مقتدایانِ اہلسنت ہیں تو کوئی ان سے پوچھے کہ انجیل و توراۃ کے مصنف تو خود خداوند اکرم الاکرمین ہیں اگر مصنف کا معتبر ہونا موجبِ اعتبارِ کتاب ہو جائے تو قرآن تو قرآن انجیل و توراۃ شیعوں کے نزدیک معتبر ہو جائیں، ورنہ لازم آئے کہ نعوذ باللہ جناب خداوند تعالےٰ کا شیعوں کے نزدیک کچھ اعتبار نہ ہو؟ مگر ہم جانتے ہیں کہ شیعوں کو اس الزام سے کچھ اندیشہ نہیں، کیونکہ وہ اب کون سے خدا کا اعتبار کرتے ہیں، اس سے زیادہ اور کیا بے اعتباری ہوگی کہ خدا کی رائے اور علم کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے اور بدا کے قائل ہو گئے لعنۃ اللّٰہ علیٰ ہٰذا المذہب۔ بہرحال اہلسنت و جماعت کتب غیر مشہور غیر متداولہ کو ہرگز قابل اعتقاد نہیں جانتے اور بملاحظۂ عداوت اور بتجربۂ عادتِ دروغ بزرگواران شیعہ اس سے مطمئن نہیں۔۔۔کہ جیسے انجیل و توراۃ کو دشمنانِ دین نے تحریف کر دیا کتب غیر مشہورہ کو ان حضرات نے حسب مطلب بدل دیا ہو،

مصنفِ تحفہ کی ایک عبارت

اور اگر کوئی سادہ لوح میری اس بات کو کو دنوں کی بات اور واہیات سمجھے، تو بڑوں کی بات تو بڑی ہوتی ہے دیکھئے شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو شیعوں سے بھی زیادہ شیعوں کی عادات اور اصول و فروع مذہب سے واقف ہیں تحفہ اثنا عشریہ میں باب مکائد شیعہ میں جو دوسرا باب ہے کیا فرماتے ہیں، احتیاطاً بعینہا انھیں کی عبارت بلاغت آمیز نقل کرتا ہوں۔

کید سی و دوم آنکہ جمعی کثیر از علماء ایشان سعی بلیغ نمودہ اند، و در کتب اہل سنت خصوصاً تفاسیر کہ بیشتر دستمال علماء و طلباء باشند و بعضے از کتب احادیث کہ شہرہ ندارند، و نسخ آن کتب متعدد بدست نمی آید، اکاذیب موضوعہ کہ مؤیدِ مذہب شیعہ و مبطل مذہب سنیان باشد الحاق نمایند، چنانچہ قصۂ ہبۂ فدک در بعض تفاسیر داخل نمودہ اند کہ سیاق آن حدیث چنین روایت نمودہ کہ لَمَّا نَزَلَتْ وَآتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ دَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ وَاَعْطَاهَا فِدَكَ، اما بحکم آنکہ

دروغ گو را حافظہ نباشد بیاد شان نماند کہ این آیت مکی است و در مکہ فدک کجا بود؟ و نیز بایستے کہ برائے مساکین و ابن السبیل نیز چیزے وقف می کرد تا عمل بر تمام آیت میسر میشد و نیز اعطاھا فدک دلالت صریح بر ہبہ و تملیک نمی کند بس لفظ وہبہا بایستے وضع کرد۔ و علیٰ ہذا القیاس در تفاسیر دسیر جستہ جستہ الحاقات ایشان یافتہ میشود، و درین کید ہم اکثر مغفلان از علمائے اہلِ سنت خبط می کنند و تشویش می کشند، و در شہر دہلی در عہد بادشاہ محمد شاہ دو کس بودند از امراء این فرقہ کہ کتب اہل سنت را مثل صحاح ستہ و مشکوٰۃ و بعض تفاسیر بخط خوش مے نویسانیدند و در آن حدیثِ مطلب خود از کتب امامیہ برآوردہ داخل نمودند، و آن نسخ را مجدول و مطلا و مذہب نمودہ بقیمتہ سہل در گذر رے میفروختند، و در اصفہان آغا ابراہیم ابن علی شاہ کہ یکے از امراء کبار سلاطین صفویہ بود، ہمیں اسلوب عمل کردہ، لیکن بایں کید ایشان حاصلے نشد، زیرا کہ کتب مشہورہ اہلسنت بجہتہ کمالِ شہرت و کثرت نسخ قابل تحریف نیستند و کتب غیر مشہورہ را اعتبارے نہ، ولہٰذا محققین اہلسنت از کتب غیر مشہورہ نقل را جائز نداشتہ اند، مگر در ترغیب و ترہیب، و در حکم صحائف انبیاء پیشین می شمارند کہ ہیچ عقیدہ و عمل را از ان اخذ نتوان کرد بجہت احتمال تحریف انتہی، کلامہ الشریف۔

ترجمہ:۔ بتیسواں مکر۔ ان کے علماء کے بڑے گروہ نے بے حد کوشش کی ہے کہ کتبِ اہلِ سنت میں خصوصاً تفاسیر میں (جو ان کے طلباء و علماء کی دستمال نبی رہتی ہیں، اور بعض کتب احادیث میں جو غیر مشہور ہیں اور ان کے متعدد نسخے ہاتھ نہیں لگتے) خود ساختہ ایسے بڑے جھوٹ شامل کر دیں۔ جو شیعہ مذہب کی تائید کریں اور مذہب اہل سنت کی جڑ کاٹ دیں۔ چنانچہ ہبۂ فدک کا قصہ بعض تفاسیر میں داخل کر کے یوں روایت لاتے ہیں کہ جب آیت وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ نازل ہوئی۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کو بلایا اور ان کو فدک عطا فرمایا۔ لیکن موافق مثل مشہور۔ «جھوٹے کی یادداشت نہیں ہوتی»، ان کو یہ یاد نہ رہا کہ یہ آیت مکی ہے اور مکہ میں فدک کہاں تھا؟ اور یہ بھی تو چاہیئے تھا کہ آپ ابن سبیل اور مساکین کے لئے بھی کچھ وقف کرتے تاکہ پوری آیت پر تو عمل ہوتا۔

نیز اَعطاھا فدک یہ الفاظ ہبہ وتملیک پر صریح دلالت بھی نہیں کرتے وھبہا کا لفظ گھڑنا چاہیئے تھا۔ الغرض اس جیسی کئی مثالیں تفسیرات اور کتب سیرت میں پائی جاتی ہیں۔ اور اس چال میں کئی سیدھے سادھے علمائے اہل سنت بھی پھنس جاتے ہیں، شہر دہلی میں محمد شاہ کے عہد میں دو آدمی جو فرقۂ شیعہ کے امراء میں سے تھے، اہلسنت کی کتابیں مثل صحاح ستہ مشکوٰۃ اور بعض تفسیریں خوشخط لکھتے۔ اور ان میں کتب شیعہ سے ایسی روایتیں داخل کر دیتے جو ان کے مطلب کی ہوتیں، پھر ان کی اعلےٰ جلد بندی، جس پر سونے چاندی کا کام بنا ہوا ہوتا کرا کے سستے داموں کسی راہ گذر میں فروخت کر دیتے۔ اسی طرح اصفہان میں آغا ابراہیم ابن علی شاہ جو سلاطین صفویہ کے بڑے امراء میں سے تھا یہی چال چلتا تھا لیکن اس مکر سے ان کو کچھ حاصل نہ ہوا، کیونکہ اہل سنت کی مشہور کتابیں بے حد شہرت اور کثرت تعداد کی وجہ سے تحریف اور تبدیل کو قبول نہیں کرتیں اور غیر مشہور کتابیں ان کے ہاں معتبر ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محققین نے کتب غیر مشہورہ سے سند لانے کو جائز نہیں رکھا سوائے ترغیب و ترہیب کے، بلکہ ان کو صحف انبیاء جیسا سمجھا ہے جن پر عقیدہ وعمل کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ " کلام مبارک ختم ہوا۔ ترجمہ از ناشر۔

عمار علی نے بعض کتب شیعہ بھی اہل سنت کی طرف منسوب کر دیں

اگر ہم بپاس خاطر مولوی عمار علی صاحب اور بھی چشم پوشی کریں اور ان کے اور ان کے بزرگواروں کے ذمہ اس بات کی نسبت نہ کریں کہ انہوں نے اپنے مطلب کے موافق بعض روایتیں سنیوں کی غیر مشہور کتابوں میں رلا ملا دی ہیں، تب بھی مولوی عمار علی صاحب کی بات کا پتہ معلوم، کیونکہ جن کتابوں کا حوالہ مولوی صاحب نے درج رقیمہ کریمہ فرمایا ہے۔ ان میں بعض کتابیں تو ایسی ہیں کہ سنیوں میں سے کسی نے ان کا نام بھی نہیں سنا اور نہ ان کے مصنفوں کا اہل سنت میں سے کوئی نام نشان جانے، مثل تاریخ آل عباس کہ علماء سنت نے اس کتاب کو شاید کبھی سنا بھی نہ ہو بلکہ اس قسم کی کتابیں ہیں جیسے شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے۔

"کید بست ونہم آنکہ کتابے را نسبت کنند بیکے از کبراء اہل سنت و در آن مطاعن صحابہ و مبطلات مذہب اہلسنت درج نمایند الے آخرہ "

ترجمہ۔ از ناشر: اکیسواں مکر:۔ کسی کتاب کو اکابر علمائے اہلسنت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ پھر اس میں مطاعن صحابہ اور اہل سنت کے مذہب کو باطل کرنے والی روایتیں گھڑ گھڑ کر داخل کر دیتے ہیں۔

سو اگر یہ کتاب موجود بھی ہو تب کسی شیعہ مکار کی ہو گی اور بعضی کتابیں اس قسم کی ہیں کہ ان کے مصنفوں کو فن حدیث اور فن تاریخ میں دستگاہ کامل اور تمیز صحیح و غلط ہرگز نہ تھی، جیسے معارج النبوۃ، ہاں مدارج النبوۃ کا حوالہ اگر زیب رقیمہ ہوتا تو ہمارے بر سر و چشم تھا۔ لیکن ایسی معتبر کتابیں سے مولوی صاحب کے ہاتھوں میں کیا آتا۔ ؟

علامہ سیوطی کی تصانیف پر مصنف کتاب کی رائے

اور بعضی کتابیں ایسی ہیں کہ ہر چند ان کے مصنف فن حدیث میں مہارت کامل اور مشق کما ینبغی اور تبحر وافر رکھتے تھے، جیسے شیخ جلال الدین سیوطی وغیرہ، لیکن انہوں نے اپنی ان کتابوں میں جن کا حوالہ مولوی صاحب کے رقیمہ میں مندرج ہے یہ التزام نہیں کیا کہ بجز روایات صحیحہ اور کچھ داخل نہ کریں گے بلکہ رطب و یابس بطور بیاض کے جمع کر لیا ہے، جیسے جمع الجوامع، کہ اس کا نام ہی اس بات پر شاہد ہے اور نیز اس کا حال شہرہ علمائے آفاق ہے، یا بالغرض تفریق و تمیز صحیح و غلط جمع کیا ہے جیسے تفسیر در منثور اور علےٰ ہذا القیاس موضوعات ابن جوزی۔ کہ ان دونوں کتابوں میں اگرچہ ہر قسم کی مخالف موافق روایتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ان روایتوں کے ساتھ اس میں یہ بھی ساتھ ہی لگا ہوا ہے کہ یہ روایات غلط ہیں اور یہ اس واسطے کیا ہے کہ کل کو مولوی عمار علی صاحب جیسے مکار دغاباز ان روایتوں کے بھروسے کسی سادہ لوح کو دھوکا نہ دے بیٹھیں۔ اور اسی غرض کے لئے متقدمین محدثین بھی ایسا کرتے ہیں، چنانچہ امام ترمذی اور امام ابوداؤد اکثر جگہ لکھ جاتے ہیں ہٰذا حدیث ضعیف۔

اور بعضی کتابیں ایسی کمیاب ہیں۔ کہ اگر مولوی عمار علی صاحب یوں فرمانے لگیں کہ اس کی تمام روایتیں ہو بہو مطابق مذہب شیعہ اور اصول و فروع شیعہ تمامہا اس کی روایات کے مطابق ہے، تو بوجہ کمیابی ان کتب کے مولوی صاحب کی کسی سے زبان نہ پکڑی جائے، سچا تو خدا سے ڈرے جھوٹے کو کس کا ڈر، اس کی زبان کو لگام بھی نہیں ہوتی مگر جتنا کچھ اس خط میں مولوی صاحب نے کیا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں، اور انہوں نے کیا کیا، یہ

مکاریاں اور دغا بازیاں تو میراث بزرگوارانِ شیعہ ہے چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی قدس سرہ العزیز رقم فرماتے ہیں۔

"کید بست ودوم آنکہ مطاعن صحابہ ومبطلات مذہب اہلسنت از کتب نادر الوجود کمیاب ایشان نقل نمایند حالانکہ در آن کتب اثرے ازان بنا شد وبسبب آنکہ آن کتب پیش ہرکس ودر ہر وقت وہر مکان موجود نمیشود اکثر ناظران در شبہ وشک افتند وبخاطر شان رسد کہ اگر ایں نقل صحیح باشد تطبیق درمیان او ودیگر روایات اہل سنت چہ قسم خواہد بود۔ حالانکہ ایں بیچارہا عبث درد سرمے کشند ونمی فہمند کہ اگر بالفرض نقل صحیح ہم باشد محتاج تطبیق وقتے خواہیم باشد کہ ہر دو روایت در یکدیگر باشند از شہرت وصحت ماخذ وصراحت دلالت وکمیت رواۃ وچوں این امور دران نقل مخفی مستور است مقابل روایات مشہورہ صحیحۃ الماخذ صریحۃ الدلالۃ چرا باید کرد وکتا بہائے کہ ازان فرقہ شیعہ برائے الزام اہلسنت نقل می کنند ہمہ ازیں قبیل است کہ نادر الوجود کمیاب میباشند وعلی تقدیر الوجدان مصنف آن کتب التزام صحت جمیع ما فیہا نہ کردہ اند بلکہ بطریق بیاض رطب ویابس دراں جمع نمودہ محتاج نظر ثانی گذاشتہ اند اردبیلی صاحب کشف الغمہ وحلی صاحب الیقین از ہمیں قبیل دفتر دفتر نقل کنند وبزعم خود گوئے از میدان مناظرہ بزند وابن طاؤس نیز در مؤلفات خود از ہمیں جنس خرمہرہا پر کردہ وباعتقاد خود اہلسنت را الزام دادہ انتہے کلامہ الشریف"

ترجمہ از ناشر:۔ بائیسواں مکر:۔ یہ ہے۔ کہ اہلسنت کی نادر الوجود کمیاب کتابوں سے صحابہؓ کی اہانت کرنے والی اور اہل سنت کے مذہب کو باطل کرنے والی روایات نقل کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کتابوں میں ایسی روایات کا نام نشان بھی نہیں ہوتا لیکن چونکہ ہر جگہ ہر وقت ہر ایک کے سامنے نہیں ہوتیں لہٰذا اکثر سننے دیکھنے والے شک وشبہ میں پڑ جاتے ہیں اور ان کے دل میں یہ آتا ہے کہ اگر یہ نقل صحیح ہوئی تو اس میں اور دیگر روایات اہل سنت میں مطابقت کس طرح ہوگی حالانکہ یہ بیچارے مفت پریشان ہوتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے اگر بالفرض یہ روایت صحیح بھی ہو تو تطبیق کی ضرورت اس وقت پڑے گی جب دونوں روایتیں شہرت وصحت ماخذ وصراحتِ دلالت وعددِ رواۃ وغیرہ میں برابر ہوں اور جب یہ باتیں اس مخفی روایت

کے بارے میں معلوم ہی نہیں۔ تو روایات مشہورہ صحیحۃ الماخذ وصریحۃ الدلالت کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے اور وہ کتابیں جن سے اہل شیعہ اہل سنت کو الزام دینے کے لئے روایات نقل کرتے ہیں وہ ایسی ہی ہیں جو ہاتھ نہ آنے والی اور کمیاب ہوں۔ اور اگر ملیں بھی تو ایسی ایسی ہوتی ہیں کہ مصنف نے ان میں مندرجہ تمام روایات کی صحت کا التزام نہیں کیا ہوتا۔ بلکہ بطریق بیاض رطب ویابس اس میں جمع کرکے نظر ثانی کے لائق چھوڑا ہوتا ہے۔ اردبیلی صاحب کشف الغمہ اور حلی صاحب الیقین اس قسم کی روایتوں کے دفتروں کے دفتر نقل کرکے اپنے خیال میں گویا میدان مناظرہ میں جیت جاتے ہیں اور ابن طاؤس نے بھی اپنی مؤلفات اسی طرح کی دھوکہ بازیوں سے بھر رکھی ہیں اور بزعم خود اہل سنت کو بڑے بڑے الزام دے دیئے ہیں

بہرحال جب ان بزرگواروں کی ایسی ایسی بزرگیاں تجربہ معلوم ہو چکی ہوں، تو پھر کتب کمیاب کے حوالہ کا کیا اعتبار رہ گیا؟ اول تو یہی یقین کرنا چاہیئے کہ ان کتب میں اصل سے ان روایات کا نام ونشان بھی نہیں اور اگر اس پر تسکین نہ ہو تو بالفرض اگر ایسی روایتیں ان کتب میں ملیں بھی تو وہ انہیں کذابوں کی تراشی ہوئی ہیں۔ پھر تیسیر اکثر یہ کتابیں بطور بیاض کے مجموعۂ رطب ویابس ہیں ان کے مصنفوں کو نظر ثانی کا اتفاق نہ ہوا۔ جو تلخیص کرکے صحیح صحیح روایتیں جدا کرکے باقیوں کو حذف کر دیتے، یا لکھ جاتے کہ یہ روایتیں موضوع ہیں یا ضعیف ہیں۔

واقدی کے بارے میں ائمہ محدثین کی رائے

معہذا مولوی صاحب نے بعض ایسی کتابوں کا حوالہ لکھ دیا ہے کہ نہ ان کتابوں کو کوئی جانے نہ اس کے مصنف کو کوئی پہچانے، جیسے تاریخ آل عباس، پھر جرأت تو۔ دیکھو کس دلیری سے کہتے ہیں کہ تاریخ آل عباس اہلسنت کی معتبر کتابوں میں سے ہے پھر تیسیر اس کتاب میں یہ روایت بھی ہے تو واقدی کی روایت ہے جن کی جھوٹی تو جھوٹی سچی بات بھی جھوٹی ہی سمجھی جاتی ہے ان کی تعریف میں جو کچھ محدثین نے لکھا ہے دیکھئے پیش نظر کرتا ہوں، مجمع البحار میں امام نسائی کے حوالہ سے جو فن حدیث میں امام ہیں اور ان کی کتاب منجملہ صحاح ستہ ہے یوں لکھا ہے کہ امام نسائی نے فرمایا ہے کہ ایسے کذاب جو حدیثوں کے بنانے میں معروف ہیں، چار ہیں۔ ابن ابی یحییٰ مدینہ میں

واقدی بغداد میں، مقاتل بن الیمان خراسان میں، محمد بن سعید مصلوب شام میں، اور پھر زیف نے شرح الشفاء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ واقدی کے ضعف پر سب کا اتفاق ہے بعدازاں امام شافعی کا قول واقدی کی شان میں مقاصد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ واقدی کی کتابیں جھوٹی ہیں۔ اب مولوی صاحب انصاف فرمائیں کہ جب تاریخ آل عباس کا تو یہ حال ہو کہ علماء اہل سنت میں سے کوئی اسے جانتا ہی نہیں اور پھر ان کے راوی ایسے نورعلی نور، دروزیرے چناں شہریارے چنیں، تو پھر اہلسنت کیونکر ان روایات پر اعتماد کریں اگر شیعوں کی طرح سنیوں کے دین کا جھوٹ پر دارومدار ہوتا تو البتہ مضائقہ نہ تھا، سو ایسی کتابوں کا ناواقفان اہلسنت کے سامنے حوالہ دینا کمال بددیانتی اور دغا بازی اور بیحیائی کی بات ہے، اہل فہم پر مثل آفتاب روشن ہے، کہ یہ کتاب اگر ہے بھی، تو کسی شیعہ دغاباز کی تصنیف ہے۔

عارعلی کی تاریخ دانی پر اس دغا کا حوصلہ مولوی صاحب کا تو معلوم نہیں ہوتا ہاں البتہ کسی پرانے ابلیس طینت کی کرتوت ہے۔ ورنہ اس استعداد اور اس سلیقہ پر کہ مامون عباسی کے نام پر لفظ رشید بھی بڑھا دیا، یہ فتنہ گری ممکن معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ عیب کرنے کو ہنر چاہیئے۔ ؎

فلک کا منہ نہیں اس فتنہ کے اٹھانے کا ÷ ستمگر ایک تیرا ناز ہے سارے زمانے کا

سبحان اللہ مولوی صاحب کو اس تبحر اور اس علم و فضل پر کہ اب تک یہ بھی نہیں جانتے کہ ملقب برشید ہارون تھا یا مامون تھا؟ دربارہ غصب فدک یہ یقین ہو گیا ہے کہ خدا کی وحدانیت اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا شاید اب تک آپ کو اتنا یقین نہ ہو؟ اور تنہائی میں سنیوں پر یہ جوش و خروش ہے کہ جامہ سے باہر نکلے جاتے ہیں۔

فدک فئی تھا موہوب مملوک نہ تھا کوئی مولوی صاحب کو تھامے تو ہم مولوی صاحب کو سارے مراتب سمجھا کر اتنا اور سمجھائیں کہ اگر ہم ان سب مراتب سے درگذریں تو ہمیں ابھی اور بہت گنجائش باقی ہے کیونکہ اول تو آیت مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ جو سورہ حشر میں واقع ہے اس بات پر شاہد ہے کہ قریہ فدک ہو یا غیر، بالاتفاق از قسم فئی تھا مملوک رسول اللہ صلے اللہ

علیہ وسلم ہی نہ تھا چنانچہ انشاء اللہ بحث میراث میں جو حدیث لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ سے متعلق ہے معلوم ہو جائے گا یہ ہبہ ہونے کی کونسی صورت ہے جو روایت ہبہ فدک کو صحیح سمجھئے؟ بلکہ بالیقین غلط ہو گی کیونکہ اس صورت میں روایت ہبہ کلام اللہ کی مخالف ہو گی اور جو روایت کہ کلام اللہ کے مخالف ہو وہ بالاجماع بالیقین غلط ہے، معہذا مشہور کتابوں میں جو تمام علماء کی دستمال رہتی ہیں اور اعتبار میں قریب قریب کلام اللہ کے ہیں، وہ روایتیں موجود ہیں کہ وہ فدک کے ہبہ نہ ہونے پر ایسی واضح دلالت کرتی ہیں کہ مولوی صاحب نے جو روایتیں اپنے صحیفہ میں درج فرمائی ہیں وہ فدک کے ہبہ ہونے پر اتنی دلالت نہیں کرتی، سو ان روایتوں کی شہرت اور صحت اور صراحت دلالت کو چھوڑ کر ایسا کون نادان ہو گا کہ مولوی صاحب کے ان ہذیانات پر کان لگائے گا۔ اور سوائے مولوی صاحب کے ایسا کون ہے کہ ان افسانہ ہائے بے سند پر تکیہ جائے گا اگر باور نہ ہو تو ملاحظہ فرمائیے۔

فدک کے مختلف تاریخی دور مشکوۃ شریف جو اشہر کتب اہلسنت ہے اس میں یہ روایت موجود ہے۔ ابوداؤد کی روایت سے حضرت مغیرہ کے واسطے سے بیان کرتے ہیں کہ جب عمر بن عبدالعزیز بن عمر بن مروان خلیفہ ہوئے تو انہوں نے مروانیوں کو جمع کیا اور کہا کہ

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَهٗ فَدَكُ فَكَانَ يُنْفِقُ مِنْهَا وَيَعُوْدُ مِنْهَا عَلٰى صَغِيْرِ بَنِيْ هَاشِمٍ وَيُزَوِّجُ مِنْهَا اَيِّمَهُمْ وَاِنَّ فَاطِمَةَ سَأَلَتْهُ اَنْ يَّجْعَلَهَا لَهَا فَاَبٰى فَكَانَتْ فِيْ حَيَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى مَضٰى بِسَبِيْلِهٖ فَلَمَّا اَنْ وَلِيَ اَبُوْبَكْرٍ عَمِلَ بِهَا بِمَا عَمِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَيٰوتِهٖ حَتّٰى مَضٰى بِسَبِيْلِهٖ فَلَمَّا اَنْ وُلِّيَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَمِلَ فِيْهَا بِمَا عَمِلَا حَتّٰى مَضٰى بِسَبِيْلِهٖ ثُمَّ اَقْطَعَهَا مَرْوَانُ ثُمَّ صَارَتْ لِعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ فَرَأَيْتُ اَمْرًا مَنَعَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ وَاِنِّيْ اُشْهِدُكُمْ اَنِّيْ رَدَدْتُهَا عَلٰى مَا كَانَتْ يَعْنِيْ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ وَاَبِی بَکْرٍ وَعُمَرَ"

حاصل اس کا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فدک تھا سو اس میں سے خرچ کیا کرتے تھے، اور دیتے رہتے تھے بنی ہاشم میں کے یتیموں کو اور بے شوہر عورتوں کے نکاح اس مال میں سے کرا دیا کرتے تھے، اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے یہ درخواست کی کہ فدک حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُن کو عنایت فرمائیں اور ہبہ کردیں، سو آپؐ نے اس بات سے انکار فرمایا اور بدستور مذکور اسی طرح آپ اس میں سے تادم واپسیں خرچ مذکور نباہتے رہے، یہاں تک کہ آپؐ اس عالم سے تشریف لے گئے۔ بعد میں جب حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو انہوں نے بھی جیتے جی یہی عمل کیا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے یہاں تک کہ وہ بھی واصل بحق ہوئے، پھر جب حضرت عمر والی ہوئے تو وہ بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق کے موافق عمل کرتے رہے یہاں تک کہ وہ بھی چل دیئے، پھر جب مروان کا (یعنی اپنے وقت میں) قابو چڑھا تو اس نے اسے اپنی جاگیر کرلیا پھر رفتہ رفتہ مجھ تک نوبت پہنچی اور یہ چیز میرے قبضہ میں آئی، سو میری رائے میں یوں آتا ہے کہ جو چیز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو نہ دی ہو مجھے سزاوار نہیں اور میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ میں نے فدک کو اسی انداز پر کردیا۔ جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں تھا۔ فقط"

یہاں تک حاصل مطلب روایت تھا اب اول تو عرض یہ ہے کہ اس روایت میں جو بعد حضرت عمر کے ذکر کے مروان کی جاگیر بنا لینے کا ذکر ہے تو مولوی صاحب یا کوئی ان کا ہمرنگ ہمسنگ یہ نہ سمجھ جائے کہ حضرت عمر کے بعد متصل ہی فدک پر اس کا قبض وتصرف ہو گیا تھا۔ بلکہ یہاں قصہ کو مختصر کرکے یوں کہدیا ہے کہ انجام کار مروان کے قبض وتصرف میں آگیا، ورنہ باتفاق اہل تواریخ حضرت عثمان کے زمانہ میں بھی بدستور سابق ہی رہا، اور قصہ کے مختصر کرنے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اول تو لفظ اقطعہا اس بات کو تقاضا کرتا ہے کہ یہ کام اس نے اپنی خلافت میں کیا چنانچہ عربی دان جانتے ہیں کہ اقطاع کے معنے جاگیر کر دینے کے ہیں، - - - - ...... سو جاگیر کر دینے کا اختیار بجز خلیفہ اور کسی کو نہیں ہوتا، دوسرے اگر قصہ مختصر نہ ہو تو یہ معنی ہوں کہ بعد حضرت عمر کے متصل ہی مروان قابض ہو گیا، اور علی الاتصال قابض رہا اور پھر بعد اس کے متصل ہی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے قبض وتصرف میں آگیا۔

سو واقفان فن تاریخ پر روشن ہے کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں، بعد حضرت عمر کے حضرت عثمان کے اختیار میں تھا اور ان کے بعد باتفاق شیعہ وسنی حضرت علی کے اختیار میں تھا، پھر جب کبھی مروان کا زمانہ ہوا تو البتہ اس نے اس کو اپنی جاگیر کرلیا، پھر اس کے مرنے کے بعد کئی خلیفہ ہوئے ان کے بعد کہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی نوبت آئی۔ اور یہ قصہ کا مختصر کرنا کلام اللہ میں بیسیوں جگہ موجود ہے حضرت موسٰی اور حضرت یوسف کے قصہ کو ملاحظہ فرما دیکھیں۔ بہرحال قصہ مختصر یہ ہی باجماع اہل سیر وتواریخ وعلمائے حدیث ثابت اور متحقق ہے کہ فدک وغیرہ متروکۂ نبوی حضرت عمر کی خلافت میں حضرت علی اور حضرت عباس کے قبضہ میں تھا، پھر حضرت علی ہی کا قبضہ رہا حضرت عباس کا دخل اٹھ گیا حضرت علی کے بعد حضرت حسن حضرت حسن کے بعد حضرت امام حسین پھر امام زین العابدین اور حضرت حسن بن حسن کا قبضہ رہا، اس کے بعد زید بن حسن برادر حسن بن حسن کا قبضہ رہا رضی اللہ عنہم اجمعین، یہاں تک تو اس کا جمع خرچ بدستور قدیم رہا ان سب کے بعد مروان کے پنجوں میں پھنس گیا یہاں تک کہ نوبت حضرت عمر بن عبدالعزیز کی آئی، انہوں نے بسبب کمال عدل کے پھر بدستور قدیم کردیا۔

جب یہ گذارش ہو چکی تو اب یہ التماس ہے کہ مشکوٰۃ تو شہرۂ آفاق ہی ہے۔ ابوداؤد صحاح ستہ میں سے ہے تو جو روایت کہ ایسی کتابوں میں ہو اس کی صحت اور شہرت کو خیال کرنا چاہیئے کہ کس قدر اور کس مرتبہ کی ہوگی۔ معہذا یہ روایت کتنی صاف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تادم واپسیں فدک جناب سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوٰۃ و اکمل التحیات کے قبضہ میں رہا، اور باوجود استدعا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے آپؐ نے ان کو فدک عنایت نہ فرمایا بلکہ جیسے حکیم تیماردار بیمار سے ان چیزوں کے دینے سے انکار کیا کرتا ہے جو اس کو خلل کریں، ایسے ہی حضرت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے خدا ہمہ اہلبیت

سے فدک کے دینے سے جو مال دنیا تھا انکار فرمایا۔ (اور کیونکر انکار نہ فرمائیں آیت إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا۔ جس کا یہ حاصل ہو کہ "اللہ کا ارادہ اے اہلبیت یوں ہے کہ تم سے ناپاکی دور کردے اور تم کو خوب پاک کردے" اس مال دنیا ہی کی طلبگاری کے مقدمہ میں نازل ہوئی ہے)

ہبہ اور عطا میں فرق

بہر حال یہ روایت فدک کے ہبہ نہ ہونے پر مثل آفتاب روشن دلالت کرتی ہے، اور وہ روایت جو بزعم شیعہ دستاویز ہبہ ہے، ہبہ کے ہونے پر صراحتًا دلالت نہیں کرتی کیونکہ عربی کی روایت میں جس کا ترجمہ مولوی صاحب نے زیب رقم فرمایا ہے لفظ اَعْطَاھَا ہے سو یہ لفظ عام ہے ہبہ میں بھی بولا جاتا ہے اور عاریت میں بھی استعمال کرتے ہیں سر مو تفاوت نہیں، دونوں موقع میں بلا تفاوت بولتے ہیں، اور بڑی دلیل اس کے عموم کی یہ ہے کہ اعطاء کا ترجمہ ہندی زبان میں دینا ہے۔ سو سب جانتے ہیں کہ بسا اوقات عاریتًا کو کہا کرتے ہیں کہ فلانے شخص کو دی ہے یا دے رکھی ہے، القصہ لفظ اعطا سے ہبہ ثابت نہیں ہو سکتا، سواب روایت مشکوٰۃ کو تو ایک طرف دھریئے اور اس روایت کو جو مولوی صاحب نے درج صحیفہ شریفہ فرمائی ہے، ایک طرف رکھئے، اور پھر اسکی صحت اور شہرت اور صراحت دلالت کو اس روایت کے ضعف اور اخفا، اور عدم دلالت مقصود سے موازنت فرمایئے اور پھر فرمایئے کہ کس طرف پلّہ جھکتا ہے؟ سو اگر مولوی صاحب عقل کو کار فرمائینگے تو بیشک اس بات کو تسلیم فرمائیں گے کہ واقعی قابل اطمینان اور لائق اعتماد روایتِ مشکوٰۃ ہی ہے۔ اس روایتِ مندرجہ مشکوٰۃ سے صاف واضح ہو گیا کہ اگر بفرض محال روایت ہبۂ فدک کتب مذکور میں ہو بھی اور یہ کتابیں بھی سب کی سب ایسے لوگوں کی تصنیف ہوں جو موصوف بشرائط اعتبارِ روایت یعنی صدق و صلاح و فہم و فراست و حفظ و دیانت ہوں اور پھر اس کے بعد اعطاء سے مراد بھی ہبہ ہی ہو تو بیش برین نیست کہ ان کتب کے مصنفوں نے یہ کتابیں بطور بیاض کے اکٹھی کر لی تھیں، اور رطب و یابس غلط صحیح سب ان میں جمع کر لیا تھا، تاکہ بعد انفراغ جمع نظر ثانی کر کے تلخیص کرینگے، چنانچہ سب مصنفین کرتے ہیں لیکن اتفاقاتِ تقدیر سے ان کی عمر نے وفا نہ کی یا فرصت نہ ملی سو اس لئے بہت سی روایتیں شیعوں کی بنائی

ہوئی ان کی کتب میں درج ہو گئیں اور کم فہم اپنی غلطی فہم سے ان روایات کو اکابر محدثین کی تصنیفات میں دیکھ کر بچل گئے

اہل شیعہ کی مستندات رطب ویابس سے زیادہ نہیں

چنانچہ شاہد اس کا موجود ہے شاہ عبد العزیز صاحب جو عمدۃ المحدثین اور زبدۃ الموخین ہیں تحفہ میں رقم فرماتے ہیں کہ "صاحب جامع الاصول نے نقل کیا ہے کہ خطیب نے جو متاخرین محدثین اہلسنت سے ہے، شریف مرتضٰے سے جو اجلۂ علمائے شیعہ میں سے ہے اور علامہ رضی شیعہ مذہب کا بھائی ہے شیعوں کی حدیثیں اسی غرض سے نقل کیں کہ بعد جمع و تالیف کے ان میں نظر کرے کہ ان کی کچھ اصل بھی ہے کہ نہیں، اور اس سے اوّل شاہ صاحب عمدۃ المحدثین شاہ عبد العزیز صاحب ہی رقم فرماتے ہیں کہ جو محدثین کہ فرقہ اہلسنت میں آخر میں پیدا ہوئے ہیں انہوں نے جو دیکھا کہ پہلے محدث روایات صحیحہ اور حسنہ کو تو خوب ضبط کر گئے ہیں اور ان میں سعی کی گنجائش نہیں، تو وہ ایسی حدیثوں کی طرف جن کی سندیں ضعیف ہیں یا وہ جھوٹی بنائی ہوئی ہیں یا غلطی سے کسی حدیث کی سند کسی متن کے ساتھ لگ گئی ہے، ایسے متوجہ ہوئے تاکہ سب کو بطور بیاض کے ایک جا فراہم کر کے نظر ثانی کریں، اور موضوعات کو حسان وغیرہا سے جدا کردیں، لیکن بسبب کوتاہیٔ عمر اور قلّتِ فرصت کے یہ مہم ان سے تمام نہ ہو سکی، مگر جو محدث کہ ان کے بھی بعد پیدا ہوئے انہوں نے ان کی بیاضوں کی حدیثوں میں باہم امتیاز کر دیا چنانچہ ابن جوزی نے جسکا حوالہ مولوی صاحب بھی اپنے رقیمہ میں رقم فرماتے ہیں موضوعات کو جدا کر دیا۔ اور اس کے مقابل میں حسان لغیرہا کو مقاصدِ حسنہ میں جدا لکھ دیا۔ اور ایسے ہی سیوطی نے تفسیر درمنثور میں کیا، اور خود ان محدثوں نے اپنی کتابوں کے مقدمہ میں جو بطور بیاض کے ہیں اس غرض کو کھول کر لکھ دیا ہے انتہٰی"

اہلسنت نے جو روایات بغرض تردید نقل کی ہیں شیعہ انکو سند بناتے ہیں۔

اس نقل سے ہر کس و ناکس سمجھ جائے گا کہ جن کتب کا حوالہ مولوی صاحب نے اپنے خط میں درج کیا ہے وہ اکثر ایسی ہیں کہ ایسی ایسی روایتوں کے رد کرنے اور حقیقت حال کے تبلانے

کے واسطے جمع کی گئیں تھیں جن روایتوں کو مولوی عمار علی صاحب آذران کے پیشوا گاتے پھرتے ہیں لیکن اتفاقات سے ان کے مصنفوں کو اجل نے آ دبایا، اور بعضی ایسی کتابیں ہیں، جیسے تفسیر دُر منثور اور کتاب ابن جوزی، کہ ان میں اگر ایسی روایتیں ہیں بھی جن سے شیعہ تمسک کرتے ہیں تو وہ اس طور پر ہیں جیسے تحفہ اور منتہی الکلام اور صواقع وغیرہ میں ہبہ فدک کی روایت مندرج ہے، تو ایسا کون ہے جو یہ نہیں جانتا کہ تحفہ میں اس روایت کو لکھ کر یہ لکھدیا ہے کہ یہ روایت بنائی ہوئی ہے۔ سو مولوی عمار علی صاحب بڑے چوکے کہ تحفہ اثنا عشریہ اور منتہی الکلام وغیرہ تصنیفات مولانا حیدر علی کا نام نہیں لکھا۔ اس میں دو فائدہ تھے ایک تو کتابوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی، جس سے ہر کسی کے ایک دفعہ کو کان کھڑے ہو جاتے دوسرے عوام اور جہال اہل سنت شاہ عبد العزیز اور مولوی حیدر علی صاحب کو جس قدر جانتے ہیں۔ اتنا متقدمین کو نہیں جانتے، اور پھر تس پر یہ مشہور ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے رد رفض پر کمر چست باندھ رکھی ہے، سو اگر ان صاحبوں کا نام بھی ہوتا، تو چنداں جھوٹ بھی نہ تھا اور عوام کو ایک بار تو یہ وہم ہو ہی جاتا کہ جب شاہ عبد العزیز صاحب نے باوجود شہرۂ علم و فضل و تبحر فن حدیث و با اینہمہ صرف ہمت دربارہ رد روافض اس روایت کو اپنی کتاب میں درج کر دیا، تو ہو نہ ہو یہ روایت صحیح ہی ہوگی، مگر شاید یہ اندیشہ ہوا ہو کہ یہ کتابیں فارسی زبان میں اور پھر کثیر الوجود اور فارسی خوان بکثرت مبادا قلعی کھل جائے۔

بہرحال زوف ہے اس دینداری پر اور اس پرہیزگاری پر، اگر شیوہ دغا بازی اختیار ہی کرنا تھا تو اس کے لیے بھی دنیا جیف تھی۔ دین کو کیوں بٹہ لگایا، اور دین احمدی کو خراب کرنے کا ارادہ کیا، لیکن پھر بھی خیر گذری کہ آپ نے سنیوں کے دغا دینے کا ارادہ کیا، جو ایسے ایسوں کو لاحول میں اڑا دیتے ہیں، اور ایسے ویسے دام میں نہیں آتے۔ لیکن شیعوں کی خیر نظر نہیں آتی، کیونکہ جب ان کے ایسے مقتدا کا یہ دماغ چلا ہے۔ کہ یہ تمیز باقی نہیں رہی کہ فلانی روایت فلانی کتاب میں کس غرض سے بیان کی ہے

آیا بطور رد کے یا بطور اعتبار کے اور اعتماد کے، تو لاجرم عنقریب ہی مولوی صاحب اس بات کو تشہیر کریں کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا وند کریم ساحر اور مجنون اور کاہن اور مفتری فرماتا ہے، اور پھر شیعوں کی اندھی عقل سے یقین ہے کہ اس کو تسلیم کر جائیں اور یہ نہ سمجھیں کہ کلام اللہ میں کفار کا قول منقول ہے۔ اور وہ بھی بایں غرض کہ ان کے قول کو رد فرماتے ہیں، بہرحال مولوی صاحب کی یہ چالاکیاں دیکھ کر محبان دینی اور دینداران یقینی کی خدمت میں یہ عرض ہے۔ کہ ان مکاریوں پر نہ جائیں۔ ایسے ہی دجالوں نے دین میں رخنہ ڈالا ہے اس علم کے پردہ میں انہوں نے جاہلوں کے نام کو بھی عیب لگایا، عالم تو درکنار۔

درمنثور کے حوالہ کی حقیقت | اب آگے عرض یہ ہے کہ مجملاً تو اس روایت کا ہونا نہ ہونا بہ نسبت سب کتابوں کے معلوم ہو گیا۔ لیکن اگر مفصل بھی کچھ بیان کیا جائے تو اور اچھا ہے اس لئے ایک دو کتابوں کو بالخصوص ذکر کر کے ان میں اس روایت کا ہونا نہ ہونا بیان کرتا ہوں تاکہ موافق مثل مشہور "مشتے نمونہ خروارے" مولوی صاحب کے سب جوابوں کا حال معلوم ہو جائے، مگر چونکہ ان سب کتابوں میں سے تفسیر درمنثور کا حوالہ عوام تو عوام بعض علماء سادہ لوح کو بھی شاید متردد کر دے کیونکہ مصنف شیخ جلال الدین سیوطی خاتم المحدثین اور خلاصۃ المفسرین ہیں۔ اور بسبب کثرت تصانیف اور رواج جلالین وغیرہ کے ان کا نام شہرہ آفاق ہو گیا ہے تو اس لئے میں بھی انہی کی کتابوں کی نسبت اس روایت کے ہونے نہ ہونے کی تحقیق کرتا ہوں، سو اس لئے گوش گذار اہل انصاف ہوں کہ تفسیر درمنثور میں اس روایت کے ہونے کا کچھ مضائقہ نہیں، کیونکہ وہ موضوعات وغیرہا ہی کے امتیاز کے لئے تصنیف ہوئی ہے۔ سو اس میں یہ کیا اور بہت سی موضوع روایتیں ہیں، لیکن موقع سند میں اس کا نام لینا مولوی صاحب کی کمال حیا اور خوبیٔ ذہن و ذکا پر دلالت کرتا ہے سو اگر یہی استدلال ہیں تو کل کو کہنے لگیں گے کہ حضرت عیسے خدا کے بیٹے ہیں۔ کیونکہ کلام اللہ میں موجود ہے۔

جلالین اور اتقان میں ذالقربیٰ اور حقہ کی تفسیر

اور اگر بوجہ کمیابی درمنثور اس بات کی تسلیم میں تامل ہو تو جلالین اور اتقان تو کثیر الوجود ہیں یہاں تک کہ دونوں چھپ گئی ہیں خصوصاً جلالین، کہ تفسیروں میں میزان الصرف کا حکم رکھتی ہے۔ بلکہ تفاسیر کی بسم اللہ کہیئے۔ سو اُس میں ملاحظہ فرما دیکھیں کہ آیت وآتِ ذَاالقُربیٰ کی تفسیر میں ذاالقربیٰ اور حقہ کی کیا تفسیر کی ہے اگر ان کے نزدیک روایت متنازع فیہا معتبر اور صحیح ہوتی تو اوّل تو مع حوالہ اس حوالہ کو لکھتے، نہیں تو اختصار ہی کرتے تب بھی اس میں کیا دریغ تھا کہ ذاالقربیٰ کے بعد حضرت فاطمہ زہرا کا نام اور حقہ کے بعد لفظ فدک لکھ جاتے؟ حالانکہ اور جا ایسا ہی کیا کہ جو تفسیر کسی لفظ کی کسی صحیح حدیث سے ثابت ہوئی ہے وہی بعینہ لکھدی ہے۔ بلکہ حدیثوں کے حوالہ تک لکھ دیئے ہیں۔ معہٰذا اتقان کے مضامین سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ روایت جھوٹی بنائی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس میں اول ہی نوع میں اسانید متعددہ سے کہ جن میں سے بعضی سندوں کو اپنے آپ جیّد لکھتے ہیں۔ سورہ روم اور سورہ بنی اسرائیل کا مکّی ہونا مرقوم ہے اور پھر بعد اس کے سور قرآنی کی تفصیل کی ہے کہ فلانی فلانی سورتوں میں اختلاف ہے کہ مکّی ہے یا مدنی؟ اور فلانی فلانی میں اتفاق ہے کہ یہ مکّی ہے یا مدنی، اور پھر تیسر سورہ روم اور سورہ بنی اسرائیل کو ان میں داخل رکھا ہے جو باتفاق مکّی ہیں، کسی ایک متنفس کو بھی اس کے مکّی ہونے میں خلاف نہیں اور اسی اثنا میں یہ بھی تحقیق کی ہے کہ فلانی سورہ اگر مکّی ہے تو اس میں فلانی فلانی آیت مدنی ہے۔ پر ان دونوں سورتوں میں سے کسی آیت کو استثنا نہیں کیا، اور اس بات کی سند بھی وہی سند ہے جس کو وہ جیّد لکھتے ہیں۔ اور اگر بعضے علما کے اقوال کے موافق ان دونوں سورتوں میں سے کسی آیت کا استثنا کیا بھی ہے تو اور ہی آیتوں کا استثنا کیا ہے پر اس آیت کو کسی نے یوں نہیں کہا کہ یہ مدنی ہے۔ الغرض اتقان کی عبارت باواز بلند یوں کہتی ہے کہ یہ دونوں سورتیں خاص کر یہ دونوں آیتیں باتفاق اہل ملت مکّی ہیں۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ شیعہ بھی اس بات میں سنیوں کے

موافق ہیں۔ چنانچہ طبرسی صاحب مجمع البیان کا قول پہلے مرقوم ہو چکا ہے کہ سورہ روم سوا آیت فسبحان اللہ کے سب مکّی ہے۔ الغرض اول تو اتقان کی اس تحقیق سے محقق ہو گیا کہ آیت آتِ ذاالقربیٰ مکہ ہی میں نازل ہو چکی تھی۔ تو اس صورت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سوال وجواب میں حضرت جبرئیل کا یوں کہنا کہ ذاالقربیٰ حضرت فاطمہ ہیں ان کا حق فدک ہے۔ ہرگز درست نہیں ہو سکتا۔ اور ایسا جواب نامعقول حضرت جبرئیل سے نہیں ہو سکتا، ہاں اگر حضرت جبرئیل شیعہ مذہب ہوتے تو البتہ کم فہمی کا احتمال ہو سکتا تھا۔

سیوطی نے اس روایت کو موضوع سمجھ کر نقل نہیں کیا۔

دوسرے انھترویں [۶۹] نوع میں جو درباره معرفت شروط مفسر ہے۔ فصل اختلاف تفسیر میں یوں رقم فرماتے ہیں، کہ ایسی تفسیریں جن کی سند صحیح ہو بہت کم ہیں۔ اور پھر اس میں بھی ایسی جن کی سند رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچی، اور بھی کم ہیں، اور پھر وعدہ کیا کہ میں ان سب کو برابر ترتیب وار بیان کروں گا، چنانچہ موافق اپنے وعدہ کے بترتیب سور قرآنی ان تفاسیر کو مع بیان ماخذ بیان کیا، اور تیسیر نہ سورہ بنی اسرائیل میں اس روایت متنازع فیہا کو بیان کیا۔ اور نہ سورہ روم میں جس کی آیت کو شیعہ دستاویز ہبہ فدک سمجھتے ہیں۔ بلکہ والناس کے متعلق کی جو روایت تھی اس کو لکھ کر آخر میں یہ لکھا کہ یہ ہے جو کچھ مجھے معلوم ہے اور حاضر ہے تفاسیر مرفوعہ میں سے جن کے مرفوع ہونے پر لوگوں نے تصریح کی ہے۔ خواہ وہ صحیح ہیں۔ خواہ حسن ہیں خواہ ضعیف۔۔۔ خواہ مرسل خواہ معضل لیکن موضوعات اور اباطیل کو میں نے نہیں لیا۔

اب عرض یہ ہے کہ اس وعدہ اور وعدہ کے قرینہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جو روایت لکھی ہے وہ سمجھ کر لکھی ہے، اور جو با وجود معلوم ہونے کے چھوڑ دی ہی وہ سمجھ کر چھوڑ دی، بھولے چوکے نہیں چھوڑی۔ سو یہ روایت متنازعہ فیہا جو نہیں لکھی، تو دیدہ و دانستہ نہیں لکھی۔ اس کو موضوعات اور اباطیل میں سے سمجھا ہوگا جو نہیں لکھا، ورنہ اس کتاب میں ضعیف اور مرسل اور معضل تک نہیں چھوڑا، تو

اس سے معلوم ہوا کہ اہل سنت کی کتابوں میں کسی ضعیف طریق اور ضعیف روایت سے بھی یہ نہیں ثابت ہوتا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بعد نزول آیت مذکورہ کے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو فدک ہبہ کیا ہے۔ جو روایت اس بات پر دلالت کرے وہ لاریب موضوع ہے، بلکہ صحیح یہی ہے کہ فدک تا دم واپسیں جناب پاک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں تھا۔ چنانچہ روایت صحیح اس مضمون کی گذر چکی۔

> فدک کے معاملہ میں حضرت علی کا رویہ اس روایت کے بطلان کی بڑی دلیل ہے

اور قطع نظر قوت سند اس روایت کی بڑی دلیل اس کی صحت کی (اور دلیل بھی کونسی جس کو شیعہ بھی مان جائیں) یہ ہے کہ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے بھی موافق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے فدک میں عمل کیا، اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے وارثوں پر اس کو تقسیم نہ کیا۔ بلکہ بدستور قدیم فقراء اور مساکین اور ابن سبیل میں تقسیم کرتے رہے، اگر اپنا حصہ خدا کی راہ میں دیا تھا تو سب وارثوں کو کیوں محروم رکھا؟ اور یہ بات شیعوں کے نزدیک بھی مسلم ہے۔ اسی واسطے اس کے چار جواب دیتے ہیں، ان چاروں جوابوں کو مع ان کی تردید کے پیش نظر کرتا ہوں تاکہ خوش فہمی اور انصاف پرستی علماء شیعہ ہر کس وناکس پر آشکارا ہو جائے۔

> اہل شیعہ کی طرف سے حضرت علی کے رویہ کی پہلی تاویل

اول تو یہ کہ اہل بیت رضی اللہ عنہم غصب کی ہوئی چیز کو نہیں لیا کرتے، چنانچہ حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر کو جو بعد ہجرت کے کفار نے دبا لیا تھا کفار سے نہ لیا، یہ اسی قسم کا جواب ہے۔ جیسا مثل مشہور ہے کہ مرد کے ہاتھ چلیں اور نامرد کی زبان چلے۔

> تاویل کا جواب

جناب من رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اول تو مکان ہی بذات ثابت ہوگا۔ کیونکہ اول تو آپ کے والد اپنے والد کے آگے مر گئے تھے، دوسرے نبی کے وارث ہونے میں کلام، ہاں حضرت علی کے مکان کی نسبت کہئے تو بجا ہے

اور اگر بوجہ وصیت عبد المطلب کوئی مکان آپ کا بذات خود مملوک بھی ہو، جیسے بعض علماء کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے یا کوئی اور وجہ فرض کیجئے، تو اس صورت میں البتہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اپنے گھر کو نہ لینا تو مسلم۔ لیکن یہ کاہے سے شیعوں کو محقق ہو گیا کہ آپ نے اس وجہ سے نہیں لیا؟ نہ لینے کے لئے بہتیرے احتمال ہو سکتے ہیں۔ اول تو یہ کہ بسا اوقات اپنی چیز چور کو یا غاصب کو معاف کر دیتے ہیں اور معاف کرنا وہاں ہی ہوتا ہے جہاں آدمی اپنے آپ بھی لے سکتا ہے اور اگر اس کو اس کا لینا درست ہی نہ ہو تو پھر معافی کے کیا معنے؟ سو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی معاف کر دیا ہو، پھر معاف کرنا اپنے حق کا تو صحیح ہو سکتا ہے۔ دوسرے کے معاف کرنے کے کیا معنے؟ سو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اگر فدک کا لینا ہی درست نہ تھا۔ تو یہ تو اس دلیل سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور اگر بوجہ معافی نہیں لیا تو اپنا حق معاف کیا ہوتا۔ حسنین کا اور ان کی بہنوں کا حق کیوں معاف کر دیا؟ معہذا معاف کرنے کے تو یہ معنے ہیں کہ غاصب یا اس کی اولاد کو چھوڑ دے نہ یہ کہ اپنے قبضہ میں رکھے اور اوروں کو دیا کرے۔

دوسرا احتمال یہ ہے اور یہ صحیح بھی ہے کہ جب کسی چیز پر کفار کا غلبہ اور تسلط ہو جائے، اور مسلمانوں کی حکومت باقی نہ رہے اور نہ کوئی ایسا حاکم رہے کہ جس سے مظلوم فریاد کر کے اپنی داد کو پہنچے، بلکہ خود حکام کفار ہی اس کو دبا لیں، تو وہ چیز کفار کی ملک میں آ جاتی ہے اور ان کے سب تصرفات بیع شرا وغیرہ اس میں جاری ہو جاتے ہیں، اور مشتریوں کو وہ چیز حلال طیب ہو جاتی ہے اور یہ حکم اس لئے جائز رکھا گیا کہ اگر یوں نہ کیا جائے تو ایک عالم کی مصیبت آ جائے اور سب کے سب حرام خوار ٹھیریں۔ یا ہزاروں تکلیفیں اٹھائیں، کیونکہ ایک ولایت والوں کو دوسری ولایتوں کی چیزوں کی ضرورت رہتی ہے۔ سو جس ولایت کی چیز کی ضرورت ہو اگر کفار اس کو فتح کر لیں اور وہاں کے اسباب و متاع کو لوٹ کر نیلام کرنے لگیں تو دوسری ولایت والے اگر خریدیں اور استعمال کریں، تو ظالم اور مرتکب حرام کے ٹھیریں، اور اگر نہ خریدیں

یا خریدیں اور استعمال نہ کریں بلکہ اصل مالکوں کو ہٹا کر دیدیں۔ تو یہ سخت دشوار ہے۔ ہر چیز میں اور ہر شخص سے نہیں ہو سکتا۔ اس حکمت کے لئے یہ حکم شارع نے تجویز کیا۔

چنانچہ علماء اہل سنت نے کلام اللہ ہی میں سے اس کی طرف اشارے پائے ہیں۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر کے نہ لینے کو اسی پر محمول کیا ہے۔ ورنہ اگر گھر کے نہ لینے کی یہ وجہ ہو کہ اہل بیت شئے مغصوب کو نہیں لیا کرتے، جیسے شیعہ فرماتے ہیں، تو یہ تو بشہادت مولوی عمار علی بلکہ بشہادت عام اسلاف شیعہ غلط ہے کیونکہ مولوی عمار علی صاحب اپنے رقیمہ کریمہ میں رقم فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی خلافت میں بلکہ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں بھی حضرت علیؓ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم نے دعوائے فدک کا کیا۔ سو اگر شئے مغصوب اہلبیت نہیں لیا کرتے تھے تو حضرت علی نے کس لئے یہ دعوائے کیا تھا۔؟

اور اگر یوں کہیئے کہ ان دونوں خلافتوں میں دعوائے کیا سنیوں کی روایتوں کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ ان کو اس سے الزام نہیں دیا جا سکتا تو یہ شیعوں کے نزدیک بھی مسلم ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق نے فدک غصب کر لیا اور زہرا کا دعوے ہبہ نہ سنا تو حضرت زہرا نے میراث کا دعوائے کیا۔

ازروئے قواعد شیعہ سیدہ رضی کا مطالبہ فدک غلط تھا۔

سو اگر اہلبیت نبوی رضی اللہ عنہم شئے مغصوب کو نہیں لیا کرتے تو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے پھر کیوں فدک طلب کیا؟ اور اگر عقلاء شیعہ سنیوں کی ضد میں عقل و انصاف کو طاق میں دھر کر یوں فرمانے لگیں کہ یہ دونوں دعوے اگرچہ بصورت دو ہیں۔ لیکن چونکہ متصل بلا فصل واقع ہوئے ہیں ہم ایک ہی دعوائے اسے قرار دیتے ہیں، سو بعد گفت و شنود کے ختم ہو جانے کے غصب متحقق ہوا اور پہلے غصب تھا ہی نہیں، جو کچھ خرابی لازم آوے۔

تو اس کا جواب تو یہ ہے کہ یہ ہمارا احسان ہے کہ ہم ایسے ایسے فقروں میں درگذر کر جاتے ہیں۔ ورنہ اسی بات سے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا فدک مغصوب کی نسبت دعوے

کرنا ثابت کیا؟ مثل آفتاب روشن ہے۔ لیکن چونکہ علماء شیعہ خصوصاً مولوی عمار علی صاحب کی عقل کی رسائی معلوم ہے۔ اس لئے اس بات سے چشم پوشی کر کے ہم اور جواب دیتے ہیں وہ یہ ہے، کہ یہی فدک عمر بن عبد العزیز کے وقت میں حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ نے لیا۔ اور وہ انہیں کے ہاتھ میں رہا۔ پھر خلفاء عباسیہ اس پر متصرف ہو گئے، یہاں تک کہ سنہ دو سو بیس میں مامون عباسی نے اپنے عامل قثم بن جعفر کو لکھا کہ فدک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہ کی اولاد کے حوالہ کر دے۔ سو اس وقت امام علی رضا نے لیا، پھر متوکل عباسی اس پر متصرف ہو گیا۔ بعد ازاں معتضد نے پھر ہٹا دیا۔ چنانچہ یہ سب قصہ مفصل قاضی نور اللہ نے مجالس المومنین میں لکھا ہے اگر کوئی سنی لکھتا تو شیعوں کے نزدیک اعتبار کے قابل بھی نہ ہوتا

قواعد شیعہ کی رو سے حضرت علی رض کا خلافت قبول کرنا بھی درست نہ تھا

اور اس کو بھی جانے دیجئے، مجالس المومنین کا حال تو پڑھے لکھے یا صحبت یافتہ علماء جانتے ہوں گے

یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے بعد شہادت حضرت عثمان کے خلافت مغصوبہ قبول کی اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ یزید پلید سے خلافت مغصوبہ کے طالب ہوئے، یہانتک کہ نوبت شہادت کی پہنچی، اور اگر ان امور میں سے ایک بھی ظہور میں نہ آتا، تو شئے مغصوب کے لینے کے جواز میں اور دلانے کے وجوب میں عقلائے اولو الالباب کے نزدیک پھر بھی کچھ تامل نہ تھا کیونکہ سابق میں محقق ہو چکا ہے کہ آیت وآتِ ذا القربی میں گو مخاطب خاص ہے لیکن خطاب عام ہی ہو۔ اگر ذا القربی سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے قرابتی مراد ہوں تو ان کے حق کا دلانا سب کے ذمہ واجب ہو۔

اور نیز وجوب عدل و انصاف کی فرضیت سے کلام اللہ بھرا ہوا ہے اور عدل و انصاف اسے ہی کہتے ہیں کہ اہل حق کے حقوق دلائے جائیں۔ سو بعد غصب کے اگر مالک کا حق باقی رہتا ہے تو حضرت علی کے ذمہ فدک کا حضرت زہرا کے وارثوں کو پہنچانا فرض تھا۔ اور اگر بعد غصب اہل بیت کا حق ساقط ہو گیا۔ تو اس میں اور عفو میں

کیا فرق ہے ؟ جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے باب میں یہ زبان درازیاں ہیں۔

حضرت علی کے رویہ کی دوسری تاویل دوسرا جواب علمائے شیعہ نے حضرت علی کے فدک میں تصرف مالکانہ نکرنے کا اس طرح دیا ہے، کہ حضرت علی نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا اقتدا کیا۔ یعنے جیسے انہوں نے فدک سے کچھ انتفاع نہیں اٹھایا،

اس جواب پر تو مناسب یوں ہے کہ علمائے شیعہ کے قربان ہو جائیے۔ سبحان اللہ کیا فہم کی رسائی ہے۔ خیر فہمیدہ لوگوں کے لئے تو اس جواب کی تردید کی کچھ ضرورت نہیں۔ کیونکہ عقل خود اس جواب کے مضمون کو ایسے اگلتی ہے جیسے مکھی کو معدہ۔

تاویل کا جواب لیکن چونکہ سب ایک قسم کے نہیں ہوتے۔ تو اس لئے یہ گذارش ہے کہ جن اماموں نے بعد حضرت علی کے باقرار سرگروہ شیعہ قاضی نور اللہ فدک کو لیا، چنانچہ ابھی مذکور ہوا ہے، انہوں نے حضرت فاطمہ بلکہ حضرت امیر کا بھی کس لئے اقتدا نہ کیا ؟ اور نیز یہ اقتدا فرض تھا یا نفل ؟ اگر فرض تھا، تو اور اماموں نے کیوں نہ کیا ؟ اور اگر نفل تھا تو اول تو ائمہ اہلبیت سے ایسی سنتِ معمول بہا حضرت علی اور حضرت فاطمہ بلکہ معمول بہا حسنین اور معمول بہا حضرت امام زین العابدین کا ترک کرنا مستبعد ہے، اور معمول بہا ہونا حسنین اور امام زین العابدین کا خود ظاہر ہے۔ کیونکہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا جیسے بنا چاری فدک سے منتفع نہ ہوئیں تھیں، ایسے ہی یہ بزرگوار بھی بنا چاری منتفع نہ ہو سکے، دوسرے حضرت امیر المومنین نے اس نفل کے واسطے حقداروں کے حق پہنچانے کو جو ان کے ذمہ فرض تھا کیوں ترک کیا۔ ؟

اقتدا کن افعال میں ہوتا ہے اور نیز کسی کا اقتدا احتمال اظہاریہ میں ہوا کرتا ہے افعال اضطراریہ میں کوئی کسی کا اقتدا نہیں کیا کرتا، ورنہ لازم آئے کہ حضرت امام مہدی حضرات ائمہ ماضیین کا اقتدا تقیہ میں جو بوجہ ناچاری وہ کیا کرتے تھے، کریں، اور ایسے ہی حضرت امام حسین تقیہ میں اتباع حضرت امیر کرتے، سو اگر حضرت زہرا کسی کے ظلم و ستم کے باعث فدک سے منتفع نہ ہو سکیں تو ناچار تھیں حضرت [illegible] اپنے

وقت خلافت میں اس مظلومیت کے اقتدا کے کیا معنے ؟ بااین ہمہ اگر حضرت امیر کو حضرت زہرا کا اقتدا ہی کرنا تھا۔ اپنے حصہ میں کیا ہوتا حضرات حسنین اور ان کی بہنوں کو کیوں محروم المیراث کر دیا۔

اہل شیعہ کی تیسری تاویل تیسرا جواب جو شیعوں نے اعتراض معلوم کا دیا ہے وہ یہ ہے۔ کہ حضرت امیر اس لئے فدک سے منتفع نہ ہوئے تاکہ لوگوں کو متحقق ہو جائے کہ حضرت امیر کی گواہی دربارہ ہبہ فدک حسبتہً للہ تھی اپنے نفع کی امید پر نہ تھی۔

تاویل کا جواب یہ جواب بھی مثل جوابہائے سابق سرتاپا خلل ہے، اول تو جو لوگ اس مقدمہ میں حضرت امیر کی طرف سے گمان فاسد رکھتے ہیں، وہی لوگ ہوں گے، جنہوں نے حضرت امیر کی گواہی کو قبول نہ کیا، سو وہ لوگ پہلے ہی اس جہان سے چل بسے تھے، ان کی خلافت میں ان میں سے کون تھا۔ جو اس کے جتلانے کے لئے آپ نے فدک نہ لیا۔ ؟ اور اگر مردوں کا جتلانا مدِ نظر تھا تو اول تو ان کو اطلاع نہیں ہو سکتی، دوسرے اپنے مرنے کے بعد ان کو خود حضرت امیر کی حقانیت اور اپنا ظالم ہونا معلوم ہو گیا ہو گا۔ سو یہ نہ لینا یوں ہی رائیگاں گیا، بوجہ حضرت امیر نے مال حلال کو ہاتھ سے کھویا، نہ نفع دین نہ نفع دنیا،

اور اگر یوں کہئے کہ خلفاء ثلثہ مر گئے تھے تو کیا ہوا، ان کے معتقد اور نواصب تو موجود تھے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یوں تو یہ احتمال پھر بھی باقی رہا۔ جب آپ کی بعض اولاد نے لیا۔ خصوصاً مامون کے زمانہ میں، کہ وہ مائل بہ تشیع تھا اور فدک کو حق اہل بیت ہی سمجھ کر حضرت امام علی رضا کے حوالہ کیا، جب بھی آخر نواصب کو یہ شبہ پیدا ہوا ہو گا کہ حضرت امیر کی گواہی اس پیش بندی کے لئے تھی، بلکہ بیشتر اولاد ہی کے لئے ایسی ایسی تدبیریں دور دراز کیا کرتے ہیں۔ سو نواصب بحکم المرء یقیس علی نفسہ کے بالضرور یہ سمجھے ہوں گے کہ حضرت امیر کی گواہی فقط اس لئے تھی کہ اگر یہ تیر ہمارے زمانہ میں نشانہ پہ نہ بیٹھا، تو کبھی نہ کبھی تو کارگر ہو گا ہی۔ سو اگر یہی رفع تہمت مدِ نظر تھا۔ تو لازم تھا کہ اپنی اولاد کو وصیت کر جاتے کہ ہرگز اس

مال کو نہ لیجیو نہیں تو میری شہادت میں خلل آجائے گا۔

اہل شیعہ کی چوتھی تاویل

چوتھا جواب شیعوں کی طرف سے یہ ہے کہ یہ سب پرہیزگاری اور فدک سے دست برداری تقیہ کی وجہ سے تھی، القصہ شیعہ لاچار ہوکر اپنیوں پر آگئے۔ لیکن "دروغ گورا حافظہ نباشد" علمائے شیعہ کو اس جواب کے وقت یہ یاد نہ رہا، کہ سب آدمیوں کا مذہب تقیہ میں یہ ہے، کہ جب امام جہاد کے لئے تیار ہو اور قتل و قتال میں مشغول ہو تو پھر اس پر تقیہ حرام ہو جاتا ہے۔ اس لئے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے ہرگز تقیہ نہ کیا۔ سو اگر حضرت امیر اپنی خلافت کے زمانہ میں تقیہ کرتے تو اور الٹے مرتکب فعل حرام کے ہوتے، نعوذ باللہ اس جواب والوں نے حضرت علیؓ کی وہی مثل کردی ہے۔ جیسے کہا کرتے ہیں "یکے نقصان مایہ دیگر شماتت ہمسایہ" مال کا مال گیا وبال گناہ پلّہ بندھا، خدا نادانوں سے باہ نباہ نہ ڈالے، کسی نے سچ کہا "دشمن دانا بہتر از نادان دوست۔"

تاویل کا جواب

معہذا اگر تقیہ خلفائے ثلثہ سے تھا تو وہ خود پہلے ہی اس جہان سے چل بسے تھے اور مُردوں سے تو نامردوں کو بھی اندیشہ نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ علی شیر خدا رضی اللہ عنہ، یا باقیماندوں سے؟ سو وہ یا تو آپ کے لشکری تھے اور شیعہ مخلص، یا منجملہ رعیت، سو رعیت میں سے ایسے امور میں اگر اندیشہ ہوتا ہے تو ان سے ہوتا ہے جن کی آمدنی کم ہو جاتی ہے۔ سو یہاں وہ فقرا اور مساکین اور ابنِ سبیل تھے، ان سے ڈرنا بھی ہموزن خوف مُردگان ہے۔ سوائے ان کے اور کسی کی بلا کو کیا غرض تھی کہ فدک کے سبب حضرت علی رضؓ کے مقابل ہوکر اپنی جان کو خطرہ میں ڈالتا۔؟

اور اگر بفرض محال یہ صورت ظہور ہی پکڑتی، تو اول تو حضرت امیر کے برابر کسی میں زور اور بل اور شجاعت اور لشکر نہ تھا، اگر کچھ گمان ہو بھی تو امیر معاویہ یا حضرت عائشہ کی طرف ہوتا ہے سو انہوں نے اب کونسی کمی کی؟۔ دوسرے ایسے مفسدے

بجز اس کے کہ رعیت بادشاہ کے مقابلہ پر مجتمع ہو جائے ------ تصور میں نہیں آتے۔ حضرت ابوبکر صدیق جب خلیفہ ہوئے تو زیر حکم اسلام سوا ملک عرب اور کچھ نہ تھا، سو وہ بھی بمجرد وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سب کے سب منحرف ہوگئے، چنانچہ مختصراس کا بیان ہو چکا ہے۔

لیکن ابوبکر صدیق با ایں ہمہ تنہائی کہ سوائے سکانِ مکہ و مدینہ اور کوئی ان کا یار اور مددگار نہ تھا، اور لشکرِ عظیم حضرت اسامہ کے ساتھ بنی غسان کی طرف بھیج چکے تھے، ہرگز نہ ڈرے۔ اور مانعین زکوٰۃ کی نسبت باوجودیکہ اکثر صحابہ بسبب قلت اعوان و انصار کے ان پر جہاد کرنے سے اندیشہ مند تھے، یوں فرمایا، کہ واللہ اگر وہ ایک رسی بھی جو خدا کی راہ میں دیا کرتے تھے نہ دیں گے، تو میں ان سے جہاد کروں گا۔ بلکہ یوں بھی کہا کہ اگر اور کوئی نہ جائے گا تو میں تن تنہا جاؤں گا۔

خلیفہ چہارم کے پاس خلیفہ اول کی نسبت اعوان و انصار کی کثرت

جب ابوبکر باوجود اس بے سروسامانی اور کثرت اعداء کے ایسی ناچیز چیزوں پر تن تنہا جہاد کرنے کو تیار ہو جائیں۔ تو حضرت امیر تو اشجع الناس تھے۔ اور لشکر کثیر جس میں سے اکثر وہ لوگ جنہوں نے ایک بنی بنائی خلافت کو درہم برہم کر دیا، ان کے ہمراہ، اور جس مال پر تکرار وہ مالیت فراوان، اور حق بھی ایسے مظلوموں کا کہ ان پر ظلم ہونا دوسری قیامت پھر نہ جانے کہ حضرت علی کے تقیہ ہونے کے کیا معنے؟ بہرحال جوابات شیعہ تو جیسے ہیں، سب ہی جان گئے، ان جوابوں سے حصول مطلب شیعہ بھی معلوم ہو گیا،

لیکن انہیں ان جوابوں سے نفع ہو کر نہ ہو، سنیوں کو یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ حضرت علی کا فدک میں تصرف مالکانہ نہ کرنا، اور بدستور سابق رہنے دینا۔ جو سنیوں کا دعوٰے تھا، سچا ہے، پھر جو ان جوابوں کی تردیدوں کو دیکھے گا، وہ آپ سمجھ جائے گا کہ حضرت علی کا فدک کو بدستور سابق رہنے دینا فقط اسی وجہ سے تھا، کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تادم وفات کسی کو ہبہ نہیں کیا تھا، اور پھر متروکِ نبی میں وراثت جاری نہیں ہو سکتی، چنانچہ عنقریب انشاء اللہ مشروحاً مفصلاً اس

کا اثبات آتا ہے جب یہ بات محقق ہو چکی تو ہر دانا و نادان کو محقق ہو گیا کہ روایت متنازع فیہا جو مستند شیعہ ہے، سراسر بہتان اور دروغ تراشیدہ حضرات شیعہ ہے۔ اور جیسے حسب درایت اس کا غلط ہونا صحیح ہو گیا تھا باعتبار قوانین روایت بھی ایک افسانہ بے اصل نکلا، علیٰ ہٰذا القیاس مامون عباسی کے زمانے میں اولاد حسنین کا بہ نسبت فدک دعوے کرنا، اور اس کا دو سو علماء اہل سنت کو جمع کر کے دربارہ فدک استفسار کرنا، الیٰ غیر ذلک بمنزلہ خیالات بوستانِ خیال اور حکایات باغ بہار ہے اگر سراسر غلط نہیں تو مثل مرویات صحیحہ بالکل صحیح بھی نہیں۔

اتنی بات بیشک ظہور میں آئی کہ مامون عباسی نے بوجہ میلانِ تشیع فدک کو اولاد حسنین کے حوالہ کر دیا، القصہ جب ان افسانوں کا جھوٹا ہونا ثابت ہو گیا تو دعوئے ثبوتِ ہبہ جس پر مولوی عمار علی صاحب بیڑا اٹھا کر عزم اثبات غصب کیا تھا، مثل خانہ شیخ چلی کہ سوائے خیال اور کچھ نہ تھا، بنا بنایا ڈھ گیا۔ اور بعد ازیں ہم کو کچھ ضرورت تردید نہ رہی۔ کہ اہلِ انصاف کے لئے فدک کے غصب نہ ہونے میں آنا ہی سامان سامانِ علم الیقین ہے، اور حضرات شیعہ جیسے ناانصافوں کے لئے اسی قدر جواب دندان شکن اور قاطع ہر مہین و کہین ہے۔

کتب اہل سنت میں دعوئے سیدہ برائے فدک بروایت ضعیف بھی مذکور نہیں۔

لیکن بایں ہمہ اور زیادہ طریق تنزل مناظرہ میں علامت حقانیت ہوتا ہے۔ اس لئے بطور تنزل معروض ہے، کہ اہل سنت کی کتابوں میں سند ضعیف سے بھی یہ روایت نہیں کہ بعد وفات سرورِ کائنات علیہ وعلیٰ آلہ ..... افضل الصلوٰت واکمل التحیات حضرت فاطمہ زہرا نے دعوے ہبہ فدک کیا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق نے ان کا دعوے نہ سنا اور گواہ مانگے، اور حضرت زہرا حضرت علی اور حضرت ام ایمن یا حسنین رضی اللہ عنہم اجمعین کو علی اختلاف الروایات گواہ لائیں۔ اور حضرت ابوبکر صدیق نے بسبب نہ ہونے دو مردوں یا ایک مرد و دو عورتوں کے ان کی گواہی کو رد کر دیا، یہ سب خوبی اور بزرگی انہی بزرگوارانِ شیعہ کی ہے، کہ ان روایات کو گھڑ کر زادِ راہِ جہنم تیار کیا اور سرمایۂ

نعمت ابدی بہم پہنچایا۔ اور پھر جرأت تو دیکھو کہ علمائے اہلسنت سے جواب طلب ہے۔

محبانِ دین کی خدمت میں یہ التماس ہے کہ اہلِ سنت کا شیوہ یہ نہیں کہ وقت پڑے پر جھوٹ بول جائیں۔ ان کے مذہب میں تقیہ کے جواز کی بھی کوئی صورت ہوتی تو مضائقہ نہ تھا، اس لئے جو امور واقعی ہیں۔ اگرچہ ظاہر نظر میں جائے گرفت اور محل طعن ہوں، اپنی کتابوں میں درج کرتے ہیں۔ اور انکار نہیں کرتے مثلاً حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا میراث کا دعوے کرنا اور حضرت ابوبکر صدیق کا نہ دینا، اور قضیہ قرطاس اور واقعہ جمل کہ یہ سب امر واقعی ہیں، اور ان کے جواب معقول رکھتے ہیں، اگر جھوٹ ہی بولتے تو جیسے شیعہ وقت پڑے پر جاہلوں کے سامنے اپنی مرویات صحیحہ سے بھی انکار کر جاتے ہیں، سنّی بھی ایسے امور سے انکار کیا کرتے، لیکن جو بات اصل سے بے اصل ہو اس کو کیونکر سر دھریئے۔

پر اس عداوت اور اس دیانت کو دیکھئے۔ کہ سنیوں کے دین کی خوبی کے حسد میں مقتدایانِ شیعہ اور پیشوایان امامیہ اپنے دین کو بھی خراب کرنے لگے، اور جھوٹی روایتیں تراش کر سنیوں سے گریباں گیر ہونے لگے، سو دروغ پسندوں کو جھوٹی باتیں ہی سنکر اطمینان ہوتا ہے، اس لئے ہم بھی ان کی خوشی کے لئے یہی کہتے ہیں کہ جو کچھ شیعہ فرمائیں سب سچ ہے۔ ع۔ دروغے را جزا باشد دروغے

روایت ہبہ کے غلط ہونیکی دو دلیلیں

مگر بپاس خاطر اہل صدق اس روایت کے غلط ہونیکی دو دلیلیں بیان کرتا ہوں، ایک سنیوں کی طرف سے، ایک شیعوں کی طرف سے، سنیوں کی طرف کی دلیل تو ایسی لیجئے کہ جس سے اپنے دل کا تردد رفع ہو جائے۔ اور دشمن کا اعتراض دفع ہو جائے سو وہ وہی روایت مشکوۃ ہے جس میں عمر بن عبد العزیز کا فدک کو بدستور سابق کر دینا مذکور ہے۔ اس روایت کی صحت اور شہرت کی طرف پہلے بھی اشارہ گذرا اور اب بھی کہنا پڑا کہ مشکوۃ کی شہرت تو سب ہی کو معلوم ہے۔ اور ابو داؤد جو اس روایت کا ماخذ ہے۔ وہ خود صحاح ستہ میں سے ہے۔

بالجملہ یہ روایت صحیح سنیوں کی کتابوں میں موجود پھر جو روایت اس کے مخالف

ہوا اور وہ بھی ایسی کہ نہ اس کی سند اس کی سند کے برابر، اور نہ اس کا ماخذ اس کے ماخذ کے برابر، وہ ہرگز صحیح نہیں ہو سکتی۔ پھر اسکے بعد اگر کوئی کہے کہ سنیوں کی کتابوں میں بطریق صحیح ایسی حدیث موجود ہے جس سے ہبہ ہونا فدک کا ثابت ہوتا ہے، تو نادان بھی سنکر یقین کرلے گا کہ یہ بات غلط ہے۔ اور اگر صحیح بھی ہو تو یہ معنے ہوں گے کہ بطور تردید کے، یعنی اس بات کے تبلانے کے لئے کہ یہ روایت غلط ہے۔ اس روایت کو کسی کتاب میں داخل کیا ہوگا، یا کسی نے اپنی کتاب میں اور رطب یابس کے ساتھ اس روایت کو بھی داخل کردیا ہوگا، کہ بعد میں نظر ثانی کر کے صحیح غلط میں امتیاز کردیا جائے۔ سو علماء شیعہ نے بوجہ چالاکی اور غلط انداز سے ایسے مواقع سے اس قسم کی روایات کو چن لیا ہے۔

دوسری دلیل شیعوں کی طرف سے جس سے وہ الٹے الزام کھائیں اور خاموش رہ جائیں، سو وہ حضرت علی کا فدک کو بدستورِ سابق فقراء اور مساکین اور ابن سبیل پر تقسیم کرنا، اور آپ نہ لینا، اور حضرت زہرا کے وارثوں کو نہ دینا ہے جس کو شیعہ برسر و چشم رکھتے ہیں، اور اس کے واقعی ہونے سے انکار نہیں کرتے۔ چنانچہ اس کی تحقیق اوپر گذر چکی ہے، اور یہ بھی گذر چکا کہ شیعوں نے اس کے غدر میں ہرچند بہت دست و پا مارے لیکن سب رائیگاں گئے۔ بالجملہ اس قضیہ مسلم الثبوت طرفین اور نیز روایت مشکوۃ سے ہبہ کا معین ہونا سراسر بہتان اور غلط ہے۔ پھر کیا امکان کہ سیدۃ النساء، جگر گوشۂ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جو شیعوں کے نزدیک معصوم اور ہمارے نزدیک محفوظ ہیں، ایسا دعوائے دروغ بایں بزرگی سرزد ہوا؟ اور پھر حضرت علی اور حضرت حسنین جو باعتبار طرفین یا معصوم ہیں یا محفوظ، شہادتِ زُور جو ہمسنگ کفر ہے اس طرح برملا علے الاعلان ادا کریں۔

بہرحال یہ روایت سنیوں کی کتاب میں اصلاً موجود نہیں۔ شیعوں کا افترا اور بہتان ہے، پھر ایسی روایتوں سے سنیوں کے الزام کے درپے ہونا اور ان سے ان کا جواب طلب کرنا کمال سفاہت اور عین حماقت کی دلیل ہے۔ باقی یہ جو مولوی صاحب نے نو دس کتابوں کے نام لکھ دیئے ہیں، یہ وہی قدیمی کید ہے، اور پرانی دغا اور فریب کی بات ہے

جو مولوی صاحب کو سینہ بسینہ پہنچی ہے، اور ہم نے اس کی طرف بحوالہ تحفہ اشارہ کیا، جس کا یہ مضمون ہے کہ شیعہ اکثر اپنے مطلب کی باتیں کمیاب نادر الوجود کتابوں سے نقل کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کتابوں میں اس بات کا نشان بھی نہیں ہوتا۔ اور اگر ایک دو نسخہ میں کسی کتاب کی یہ روایت ہووے بھی، تو وہ بھی بیشک ایسے ہی دغا بازوں کی چالاکی ہے۔ کیونکہ ان کی ایک یہ بھی عادت ہے کہ کتب غیر مشہورہ میں جو خال خال ملتی ہیں، اکثر روایات اپنے مذہب کی یا اپنے آپ تراش کر داخل کر دیتے ہیں، چنانچہ تحفہ ہی کے حوالہ سے یہ بات بھی مفصل مرقوم ہو چکی ہے۔

کتب محوّلہ کے مؤلفین نے صحت کا التزام نہیں کیا

اور اگر فرض کیجئے کہ ان سب کتابوں کے سبھی نسخوں میں یہ روایت ہے، تو اول اس بات کا اثبات چاہیئے کہ ان کتابوں کے مصنفوں نے التزام کرلیا ہے کہ جو کچھ ہم ان کتابوں میں درج کریں، یہ صحیح صحیح درج کرینگے، ضعیف اور موضوع درج نہ کرینگے۔ سو اس بات کا ثابت ہونا تو معلوم، البتہ معاملہ برعکس ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رسالہ اصولِ حدیث کے آخر میں جو مشکوۃ مطبوعہ مطبع دہلی کے اول میں لگا ہوا ہے۔ یوں رقم فرماتے ہیں کہ شیخ جلال الدین سیوطی نے جمع الجوامع میں کوئی پچاس کتابوں سے زیادہ کتابوں کی حدیثیں جمع کی ہیں اور پھر اس میں صحیح حسن ضعیف ہر قسم کی حدیثیں لائے ہیں، اسی پر اور کتابوں کو بھی قیاس کر لیجئے "مشتے نمونہ خروارے"، ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا

الغرض ان کتابوں کے مصنفوں نے یہ التزام نہیں کیا کہ ان میں بجز صحاح کے ضعیف حدیثیں داخل نہ کریں گے اور یہ بات ویسے بھی تو ظاہر ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو ان کو بھی بمنزلہ صحاح ستہ سمجھتے، اور صحاح میں داخل رکھتے، اور اگر فرض کیجئے کہ ان کے مصنفوں نے اپنی طرف سے التزام ہی کیا تھا، کہ بجز صحیح اور کسی قسم کی روایت ان میں درج نہ کریں گے، تب بھی اطمینان کے قابل نہیں، کیونکہ اہلِ سنت کے نزدیک صحت و ضعفِ حدیث کے باب میں ایک آدھ کا کہا نہیں چلتا، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی غلطی کھا جاتا ہے، اس لئے ان امور میں ضروری ہے کہ اگر سب محدثین کا اتفاق

بھی نہ ہوں تو اکثر تو اس کی صحت کے یا ضعف کے قائل ہوں۔

اور یہ بات اول تو بشہادت عقل ضروری ہے، دویم بہت سے شیعہ خبیث باطن نے بوجہ تقیہ متورع اور متقی بنکر اول تو اپنا اعتبار پیدا کیا۔ اور پھر محدثین اہلسنت کی خدمت میں رہ کر ان سے صحیح حدیثیں روایت کیں، اور انہیں سندوں سے اپنے مطلب کی باتیں بھی ان کے ساتھ رلا کر عالم میں پھیلا دیں اور بوجہ تقوائے ظاہر اور بپردۂ تقیہ یہ پیچ ان کا چل گیا۔ اکثر ثقات نے بھی ان کو متورع اور متقی گمان کر کے ان کی روایتیں قبول کر لیں اور بوجہ حسن ظن استاد کو ثقہ سمجھا اور سوا اس کے اوپر کے اساتذہ کو ائمۂ حدیث پایا، اس کی وجہ سے ان کی روایات کو منجملہ صحاح سمجھا، اور اس دغا میں آگئے۔

تقیہ کے پردہ میں اہل شیعہ کی خطرناک خیانت

گو متاخرین نے بامداد خداوندی اس دغا کو سمجھا اور ان حدیثوں کو موضوع قرار دیا۔ اور مردود اور متروک ٹھیرایا۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب تحفہ میں باب مکایدمیں مکاران شیعہ کی شان میں رقم فرماتے ہیں۔ "کید شانزدہم آنکہ جماعت از علماء ایشان خود را از محدثین اہل سنت وانمودہ بعلم حدیث مشغول شدند، و از ثقات محدثین اہل سنت سماع حدیث حاصل کردند، و اسانید صحیحہ آنرا یاد گرفتند، و بظاہر بحلیۂ تقوے و ورع متحلی گشتند تا طلبا را اعتقاد صادق در حق آنہا بہم رسید، و اخذ علم حدیث از انہا شروع نمودند و احادیث صحاح وحسان روایت کردند، و در اثناء روایت بہمان اسانید صحیحہ موضوعات را کہ مطابق مذہب ساختہ بودند نیز در جملہ مرویات درج نمودند، این کید ایشان راہ بسیاری از خواص اہلسنت زدہ است چہ جائے عوام،

زیراکہ تمیز درمیان احادیث موضوعہ وصحیحہ برجال سند است، و چون رجال بسبب این دغل و تلبیس متحد شدند تمیز مشکل افتاد، و مابہ لامتیاز مفقود گشت، اما چوں عنایت الہی شامل علوم اہلسنت بودہ، ائمہ این فن بعد از تحقیق و تفتیش این دغل را دریافتند و متنبہ شدند بعد انکشاف حلیہ حال طائفہ از ایشان بوضع اقرار نمودند

وطائفہ صریح اقرار نہ نمودند لیکن امارات اقرار در انہا قائم شدہ وتا حال آں احادیث درمعاجم مصنفات واجزاء وائمہ سائر است، و اکثر تفضیلیہ و متشیعین بداں احادیث تمسک کنند،

اول کسیکہ این دغل را موجد شد جابر جعفی است، کہ بعد از تحقیق حال او بخاری و مسلم بنابر احتیاط مطلق مرویات او را از درجہ اعتبار ساقط و مطروح ساختند، وترمذی و ابوداؤد ونسائی با متعابعات وشواہد قبول کنند، وآنچہ او بدان منفرد است رد نمایند وابوالقاسم سعد بن عبداللہ ابی خلف قمی نیز دریں باب استاد برکارست۔ اکثر ناواقفان اہلسنت بجہت تلبیس اسانید او گمان برند کہ از رجال معتبرین ماست، حالانکہ چنین نیست نجاشی کہ صاحب نقد رجال شیعہ است او را فقیہ طائفہ وجیہ طائفہ قرار دادہ انتہیٰ بلفظہ"

ترجمہ۔ پندرھواں مکر یہ ہے کہ اہل شیعہ کے علماء میں سے ایک جماعت اپنے آپ کو محدثین اہل سنت ظاہر کر کے علم حدیث میں مشغول ہوئی۔ اور ثقات محدثین اہل سنت سے سماع حدیث حاصل کیا۔ اور ان کی اسانید صحیحہ کو یاد کر لیا اور بظاہر تقوی و پرہیزگاری سے آراستہ ہو گئے، حتی کہ طلباء علم کو ان کے بارے میں سچی عقیدت پیدا ہو گئی اور انہوں نے ان سے استفادۂ علمی شروع کر دیا۔ اور صحیح اور حسن حدیثیں روایت کیں اور اثنائے روایت میں اسناد صحیحہ کے ساتھ اپنے مطلب کی وضع کی ہوئی روایات بھی درج کر دیں۔

علمائے شیعہ کے اس مکر نے بہت سے خواص اہلسنت کا راستہ کاٹ دیا ہے عوام کا تو ذکر ہی کیا۔ وجہ یہ کہ احادیث صحیحہ اور روایات موضوعہ میں امتیاز تو صرف رجال سند ہی سے ہو سکتا ہے۔ جب اس مکر و فریب سے رجال سند ہی گڈمڈ ہو گئے تو تمیز مشکل ہو گئی۔ اور جس امر سے امتیاز حاصل ہوتا وہ مفقود ہو گیا۔

لیکن چونکہ تائید خداوندی اہل سنت کے علوم کو حاصل تھی۔ اس لئے ائمہ فن نے تحقیق و تفتیش کے بعد اس فریب کو سمجھ لیا۔ اور متنبہ ہو گئے۔ پھر حقیقت حال کے ظہور کے بعد علماء شیعہ کے ایک گروہ نے وضع احادیث کا اقرار کر لیا۔ اور دوسرے

نے صریح اقرار تو نہ کیا۔ لیکن ان روایات میں اقرار کی علامتیں قائم ہو گئیں۔ اور اس وقت بھی وہ روایات معاجم، مصنفات واجزا میں دائر وسائر ہیں۔ اور اکثر تفضیلیہ اور متشیعین ان سے تمسک کرتے ہیں۔

پہلا شخص جو اس فریب کا موجد ہے وہ جابر جعفی ہے کہ اس کی حقیقت کھل جانے کے بعد بخاری و مسلم نے احتیاطاً اس کی تمام مرویات کو ساقط الاعتبار اور مطروح قرار دیا۔ اور ترمذی اور ابو داؤد اور نسائی اس کی روایات کو شواہد اور متابعات ملنے پر قبول کرنے لگے۔ اور جن روایات کے شواہد ومتابعات نہیں ملے، ان کو مردود قرار دیا۔ نیز ابو القاسم سعد بن عبداللہ ابی خلف قمی بھی اس فریب کاری میں استاد پُر کار ہے۔ اکثر ناواقفانِ اہلسنت اسانید کی گڑبڑ کی وجہ سے خیال کرتے ہیں۔ کہ وہ ہمارے راویانِ موثقہ میں سے ہے۔ حالانکہ یہ خیال خلاف واقعہ ہے۔ نجاشی جو ناقدِ رواۃِ شیعہ ہے۔ اس نے قمی کو نقیہ طائفہ اور وجیہ طائفہ قرار دیا ہے۔ انتہی ترجمہ از اشر

اب عرض یہ ہے کہ شاہ صاحب کا لکھنا تو آنکھوں کے دیکھے کے برابر ہے۔ شیعہ سنی سب ان کے علم اور تاریخ دانی اور تبحر مذہب طرفین کے قائل ہیں، حتی کہ علم اہلسنت تو اپنا علم تھا علم مذہب شیعہ بھی اس قدر رکھتے تھے کہ علما شیعہ کو بھی میسر نہیں چنانچہ تحفہ اثنا عشریہ اس کے لئے گواہ موجود ہے۔ لیکن اگر شاہ صاحب نہ فرماتے۔ کوئی اور کہتا تب بھی اس بات کا شیعوں کی نسبت یقین بیساختہ ہو جاتا۔ کیونکہ اس نقیہ کی وجہ پر جھوٹ کو ان کیلئے حلال طیب کیا واجب اور فرض تک کر دیا ہے۔

لسان المیزان میں چند فریب کاروں کی نشاندہی۔

لسان المیزان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام بہت سے شیعان نابکار نے کیا ہے، منجملہ حارث بن غصین ہے جو اعمش سے روایت کرتا ہے، اور اسی قبیل سے حارث بن محمد معکوف ہے۔ اور از انجملہ حسن بن علی بن زکریا بن صالح ابو سعید عدوی مصری ہے، جو ثقات کے نام سے جھوٹی باتیں روایت کرتا ہے۔ خیر کہاں تک بزرگواران شیعہ کی بزرگی کی تعریف اور مدح میں رطب اللسان رہیئے، کہ اس قسم کے مضمون بہت بھی تھوڑے ہیں۔

پر رفع استبعاد اور تسکین خاطر سادہ لوحان کے لئے یہ معروض ہے کہ آیت فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا سے جس کا یہ ترجمہ ہو کہ ان سے زیادہ اور کون ظالم ہو گا، جنہوں نے ۔۔۔۔ اللہ کے ذمہ بھی بہتان لگا دیئے۔" یوں معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ایسا بھی کرتے ہیں کہ امت کے ذمہ طوفان جوڑ لیا کرتے ہیں، اور کم عقلوں اور سادہ لوحوں کو بمنزلہ شیاطین راہ سے بے راہ کر دیتے ہیں۔ سو اس آیت میں، اس فن میں حضرات شیعہ سے زیادہ اور کوئی چالاک معلوم نہیں ہوتا۔ اور کیوں نہ ہو، جھوٹ سے ان کے دین کا قوام ہے۔ اگر یہ جھوٹ نہ بولیں، تو اور کون بولے۔ سو ان کی نسبت جتنا کچھ کہئے تھوڑا ہے، بالجملہ اگر کتب مذکورہ میں روایت دعویٰ فدک ہو بھی ؟ تو بوجہ حسنِ ظن علمائے اہل سنت اور تقیہ مکارانِ مذہب شیعہ اول وہ روایت سایر ہو گئی، پیچھے سے محققین نے گو اس کے بطلان کا اشتہار کر دیا لیکن تاہم کہاں تک ؟ پھیلی ہوئی بات کا سمیٹنا چھوٹے ہوئے تیر کے ہٹانے کے برابر ہے۔

بہرحال وہ روایتیں مشہور ہو گئیں۔ اور مغفلین کو سراسیمہ کر دیا، اور متشیعین اور مردمان تفضیلی کے لئے سامان اضلال ہو گئیں، جیسا کہ تورات وانجیل کی تحریفات باعث ضلال واضلال عالم ہو گئیں، پر۔ جیسے قرآن مجید نے تورات وانجیل کی غلطیوں کی اصلاح کر دی، اور قسمت والوں کو ظلمات سے نکال کر نور میں پہنچا دیا، ایسے ہی روایات صحاح اور تحقیقات محققین اولو الالباب نے بھی ان تحریفات کا تدارک کر دیا۔ اور جن کا مادہ قابل اصلاح تھا۔ ان کو ہدایت کر دی۔ اور ضلالت سے نکال دیا۔ باقی مولوی عمار علی صاحب یا ان کے اقران وامثال کی اگر اصلاح نہ ہو تو کیا بعید ہے ؟ جن کے دلوں پر مہر لگی ہوئی تھی ان کے لئے قرآن جیسی حقانی کتاب سے اصلاح نہ ہوئی، بلکہ تحریفات آبائی اور تبدیلات اسلاف کے پابند رہے۔ ایسے ہی مولوی عمار علی صاحب بھی اس بات میں انہیں کے قدم بقدم ہیں اور موافق نقل مشہور۔ ؎

کند ہم جنس باہم جنس پرواز ∴ کبوتر با کبوتر زاغ بازاغ

کذابوں کی روایات پر جم گئے اور اہل صدق کی بات کو نہ مانا۔ سو وہ کیا کریں ؟

مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ

دعوئے فدک کی روایت اگر صحیح بھی ہو تو بھی کام نہیں چلتا

اور اگر ہم تسلیم کریں اور مناظرہ میں شیعوں سے نرمی ہی برتیں، اور اس بات کے قائل ہوں کہ اس روایت میں کسی طرح کا قصور نہیں، باون تولہ پاؤرتی ہے۔ تب بھی شیعوں کی آنکھوں میں خاک ہی رہے گی۔ کیونکہ اگر یہ روایت صحیح ہے۔ تو مشکوٰۃ کی روایت اصح ہے، اور یہ قوی ہے تو وہ روایت اقویٰ ہے، اس کو اس پر ترجیح نہیں ہو سکتی۔ وہی بہر طور مرجح رہے گی اور یہ بات کچھ ہمیں نہیں کرتے کہ اصح اور اقوی کو صحیح اور قوی پر مقدم رکھتے ہیں، تمام عالم ہی کرتا ہے عقل اسی بات کی شاہد ہے، شیعہ ہر چند عقل سے کچھ غرض نہیں رکھتے۔ اسی طریق پر چلتے ہیں۔ اور اگر یہ نہ کریں تو پھر دین سے دست بردار ہوں، کیونکہ ان کے یہاں کے اختلاف کے برابر کسی مذہب میں اختلاف ہی نہیں، چنانچہ ناظران تحفہ اثنا عشریہ اور منتہی الکلام وغیرہ مصنفات مولانا حیدر علی پر پوشیدہ نہ رہے گا، اور قدر قلیل کچھ اس کا پتہ اس رسالہ میں سے بھی ملے گا۔

اور دور کیوں جائیے، مولوی عمار علی صاحب تو یوں فرماتے ہیں۔ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے اور کوئی بیٹی ہی نہ تھی، اور کلینی بصراحت، اور نہج البلاغت بلکہ خود کلام ربانی تعدد بنات نبوی پر شاہد ہیں چنانچہ اوپر مفصل مذکور ہوا۔

تو اب ہم مولوی صاحب سے استفسار کرتے ہیں کہ آپ اگرچہ جھوٹے ہیں، پر بزعم خود تو سچے ہی ہیں، اور معتقدوں کے نزدیک تو آپ کی بات سے پھرنا، خدا کی بات سے پھرنا ہے۔ تو آپ کی روایت بھی خواہ مخواہ آپکو صحیح ماننی پڑی، اور کافی کلینی خود اصح الکتب ہے اور نہج البلاغت بمنزلہ وحی آسمانی، اور قرآن خود وحی آسمانی ہے۔ پھر آپ نے باینوجہ کہ خدا کے فرمودہ میں تو بدا کا احتمال ہے، اور کافی اور نہج البلاغۃ میں ائمہ کا قول اس بات میں منقول ہے، اور ان کے علوم، علم خداوندی اور علم نبی کے ماخوذ ہیں، اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم بھی خدا ہی سے لیتے ہیں، تو اس صورت میں ان کے

اقوال میں بھی وہی احتمال رہا، اور آپ کو نہ خدا سے واسطہ نہ رسول صلے اللہ علیہ وسلم سے واسطہ، آپ نے جو اپنے ہذیان اور بکواس کو کافی کی روایت اور حضرت امیر اور خدا کی شہادت سے اصح سمجھ کر مقدم رکھا، یہ ترجیح آپ کے نزدیک صحیح ہے یا غلط؟۔ اگر صحیح ہے تو فہو المراد، ورنہ "چشم ما روشن دل ما شاد"، یہ بات تو آپ مانیں گے۔ کہاں میرا[1] یہ قول کہ "سوائے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی بیٹی ہی نہیں"، غلط ہے۔ باقی اس ترجیح کو کہ صحیح اصح پر راجح ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ہم مرجوح کر دینگے۔ جو نہج البلاغۃ میں مندرج ہے۔

اَلْزَمُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّ یَدَ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ وَاِیَّاکُمْ وَالْفُرْقَۃَ فَاِنَّ الشَّاذَّ مِنَ النَّاسِ لِلشَّیْطَانِ کَمَا اِنَّ الشَّاذَّ مِنَ الْغَنَمِ لِلذِّئْبِ ط

یعنی گروہ اعظم کے ساتھ رہو، اس لئے کہ اللہ کا ہاتھ بڑی جماعت کے سر پر ہے اور دیکھو مجمع سے الگ مت ہو، اس لئے کہ مجمع سے نکلا ہوا آدمی شیطان کے لئے ہے، جیسا کہ ریوڑ سے الگ رہی ہوئی بکری بھیڑیئے کے لئے ہوتی ہے فقط، سو بالفرض بفرض محال مولوی صاحب کی جھوٹی بات یعنی فقط حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی کا بیٹی ہونا اگر سچ بھی ہو تب مرتبہ صحت سے تو آگے چلنے ہی کی نہیں، پھر اس کو اصح اقوال پر ترجیح دینے میں تمام عالم سے علیحدہ ہونا ہے۔ سو اس وجہ سے شیطان کے زمرہ میں داخل ہونا مولوی صاحب کو مبارک سبحان اللہ ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند　　مہر او اندر دلش انداختند

شیعوں کو خداوند کریم نے غلطی ہی پر جمے رہنے کے لئے پیدا کیا ہے، جو ایسے ایسے براہین قاطعہ سن کر بھی باز نہیں آتے، اور جیسے اندھا دن کو بھی نور آفتاب سے فیضیاب نہیں ہوتا، یہ کوران دین بھی ان دلائل سے جو مثل آفتاب روشن ہیں مستفیض نہیں ہوتے، الغرض روایت مشکوٰۃ کے مرجح ہونے میں وہی متردد ہو سکتا ہے۔ جو دن کو آفتاب کے ہونے میں متردد ہوتا ہے۔

[1] یعنی مولوی عمار علی کا۔

شیعوں کی پیش کردہ روایت سے بشرط صحت بھی ہبۂ فدک ثابت نہیں ہوتا

لیکن ایسے محتی لاثانیوں کی حجت جواب بھی نہ مانیں ہمیں بھی ختم کر دینی ہے، اس لئے ہم کہتے ہیں کہ سلمنا علماء شیعہ کی رائے غلط ہی صحیح سہی، اور روایت مشکوٰۃ کو روایت مندرجہ صحیحہ مولوی صاحب پر ترجیح نہ سہی، لیکن جھوٹی بات کسی طرح پاؤں نہیں چلتی، اب بھی شیعوں کی مطلب براری اس روایت سے نہیں ہو سکتی، کیونکہ جو روایت اس مضمون کی شیعوں کی چالاکی سے بعض گمنام کمیاب سنیوں کی کتابوں میں داخل ہو گئی ہے، تب اس میں ایسا لفظ کوئی نہیں جس سے ہبہ ثابت ہو جائے، بلکہ لفظ اَعْطیٰ واقع ہے۔ جو ہبہ اور عاریت دونوں میں استعمال کرتے ہیں۔ دفع تردد کے لئے اس روایت ہی کو بعینہ نقل کئے دیتا ہوں۔

صواعق محرقہ میں جو درباب ردّ روافض تصنیف ہوئی ہے، ابن حجر مکی کی (فضائل) میں ابوبکر صدیق کے، اس روایت سے اگرچہ شیعوں کی گھڑی ہوئی ہے، ابوبکر صدیق کی فضیلت ہی نکلتی ہے اور شیعوں نے ہر چند طعن کی بات گھڑی تھی پر خوبی قسمت سے تعریف ہو گئی ہے گو مولوی صاحب اور ان کے اتباع کو وہ پھر بھی عیب ہی نظر آئے۔

؎ چشم بد اندیش کہ برکندہ باد ٭ عیب نماید ہنرش در نظر

خیر وہ روایت یہ ہے۔

اخرج الحافظ ابن شیبۃ اِنَّ زَیْدًا ھٰذَا الامام الجلیل قِیْلَ لَہٗ اِنَّ اَبَا بَکْرٍ اِنْتَزَعَ مِنْ فَاطِمَۃَ، فَقَالَ اِنَّہٗ کَانَ رَحِیْمًا وَکَانَ یَکْرَہُ اَنْ یُغَیِّرَ شَیْئًا تَرَکَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَتَتْہُ فَاطِمَۃُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا فَقَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَعْطَانِیْ فَدَکَ فَقَالَ ھَلْ لَکِ شَاھِدٌ فَشَھِدَ لَھَا عَلِیٌّ وَاُمُّ اَیْمَنَ فَقَالَ لَھَا فَرَجُلٌ وَامْرَاَۃٌ تَسْتَحِقَّیْنَھَا ثُمَّ قَالَ وَاللّٰہِ لَوْ رَجَعَ الْاَمْرُ فِیْھَا اِلَیَّ لَقَضَیْتُ بِقَضَاءِ اَبِیْ بَکْرٍ۔

حاصل یہ ہے وہ حافظ عمر بن شیبہ نے کسی سند سے بیان کیا ہے، کہ حضرت زید سے

جو امام جلیل القدر ہیں یعنی زید بن امام زین العابدین سے کسی نے کہا کہ ابوبکر صدیق نے حضرت فاطمہ سے فدک چھین لیا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ بڑے رحم دل ہیں (یعنی ان سے ایسا کام کب ہو سکتا ہے یہ تو سنگدلوں کا کام ہے وہ تو بڑے رحم دل تھے۔ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی انداز کے بدلنے کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا، اور اس کے بدلنے سے ان کو کراہت آتی تھی، سو حضرت فاطمہ ان کے پاس تشریف لائیں اور یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مجھکو فدک دے گئے تھا، سو انہوں نے فرمایا کہ تمہارا کوئی گواہ ہے، اس پر حضرت علی اور حضرت اُمِّ ایمن نے گواہی دی، انہوں نے فرمایا کہ ایک مرد اور ایک عورت سے تو حق ثابت نہیں ہو سکتا، اس کے بعد حضرت زید فرماتے ہیں کہ واللہ اگر یہ مقدمہ میرے یہاں رجوع ہو تو میں اس میں وہی حکم دوں جو ابوبکر صدیق نے حکم دیا۔ فقط،،

اب غور فرمایئے کہ یہ ہر چند افترا کردہ کذّابان شیعہ ہی جو بظاہر بحیلہ تقیہ متقی اور بباطن بدکردار تھے۔ لیکن موافق مثل مشہور، ”حق برزبان جاری شود“ لفظ وَھَبَھَا جو صریح ہبہ اور تملیک پر دلالت کرتا تھا، واضعان روایت کو نہ سوجھا، لیکن تعریف صدیق اکبر صاف کہنی پڑی، اور یہ تعریف بھی کیسی کچھ؟ اور وہ بھی امام زادہ سے، اور امام زادہ بھی کون؟ جو خود بھی جلیل القدر اور والد ماجد تو ہیں ہی،

خیر منصفوں کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ اگر یہ روایت جملہ عیوب قادح اعتبار سے مبرا ہو، اور پھر ہمدرجہ روایت مشکوٰۃ بھی ہو تب بھی اعطاء سے بدو وجہ ہبہ ثابت نہیں ہوتا۔ اوّل تو یہ کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ جواب از قبیل مماشات مع الخصم، یعنی بطور تنزل اور تسلیم ہے۔ یعنی اگر تسلیم کیجئے کہ چھین ہی لیا تھا۔ تو اس کی تلافی وجہ بھی، مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس روایت سے ہبہ کا ثبوت نہ ہو گا، بلکہ انکار نکلے گا۔

لفظ عطا، ہبہ اور عاریت میں مشترک ہے، اس پر مسلمہ حدیث سے استدلال

دوسرے یہ کہ اردو میں اعطاء کا ترجمہ دینا ہے۔ سو جیسے ہبہ میں دینا اور اعطاء بولتے ہیں ایسے ہی عاریت میں بھی یہ دونوں لفظ دونوں زبانوں میں مستعمل ہوتے ہیں اور سند اس کی حدیث صحیح

۳۸

مقبول الطرفین ہے، وہ حدیث یہ ہے۔ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یَوْمَ خَیْبَرَ لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَةَ غَدًا رَجُلًا یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَهٗ وَیُحِبُّهُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُهٗ الخ مطلب یہ ہے کہ غزوۂ خیبر میں حضرت علی کے جھنڈا عنایت کرنے سے ایک روز پہلے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ کل کو لشکر کا جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا محب اور خدا و رسول صلعم کا محبوب ہے فقط،، اب غور فرمائیے کہ اس حدیث میں بھی اعطا کا مادہ موجود ہے، پر کسی نادان کو بھی یہ وہم نہیں ہو سکتا کہ جھنڈا ہبہ کر دیا، بلکہ جیسا دستور ہے کہ چپراس سپاہیوں کو، اور قلمدان وزارت وزیروں کو، اور خزانہ کی کنجیاں خزانچیوں کو دیدیا کرتے ہیں، اور وہ دینا بطور امانت ہوتا ہے اسی لئے جب ان کو معزول یا موقوف کر دیتے ہیں، تو یہ سب اشیاء چھین لیتے ہیں، ایسے ہی سپہ سالاران کو جھنڈے کا دیدینا بھی بوجہ دیانت ہوتا ہے خصوصاً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہیں کہ اس زمانہ میں بلکہ اصحاب کرام کے زمانہ میں ہر مہم کیا ہر لڑائی کا ایک جدا ہی افسر ہوتا تھا، اور اس لڑائی میں تو خود سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوات واکمل التحیات ہی سپہ سالار تھے، فقط لڑائی کے وقت حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کو اس قدر انبوہ کا افسر کر دیا تھا، جو مقابلہ پر بھی بھیجے گئے تھے، الغرض جھنڈا عطا کرنا بطور امانت تھا۔

اور جب عطاء اور اعطا امانت میں بھی مستعمل ہوا تو ہو سکتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا یہ فرمانا اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَعْطَانِیْ فِدَکَ یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھکو فدک عطا فرما دیا ہے۔ بایں معنے ہو کہ فدک مجھکو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کھانے پینے کے لئے مستعار دے رکھا ہے۔ اور محاصل اس کا میرے لئے معاف تھا۔ سو گو اس کو اپنا مملوک نہیں سمجھتی۔ لیکن آخر تم کسی نہ کسی کو اس کو یا اس کے محصول کو دو گے ہی، سو مناسب یوں ہے کہ ہمارے ہی پاس رہے۔ کیونکہ ہمارے پاس پہلے سے بھی ہے، اور اس کے محصول کو ہم مدت سے کھاتے ہیں، تم اس کے محصول کو مثل محصولِ دیگر متروکہ نبوی علے صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام

کے فقراء اور مساکین اور ابن سبیل پر تقسیم نہ کرو۔

اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے گواہوں کا طلب کرنا باوجودیکہ رحم دل تھے چنانچہ حضرت زید نے فرمایا ہے۔ اور رحم دلوں کا یہ کام نہیں کہ ایسی سنگدلی برتیں، اور وہ بھی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا بنت رحمت اللعالمین صلے اللہ علیہ وسلم سے کہ جن پر مکافات رحمت پدری تمام عالم کو رحم کرنا چاہیئے۔ چہ جائیکہ ابوبکر صدیق جیسا با نیاز رحمدل) اس وجہ سے تصور فرمانا چاہیئے، کہ مثلاً قریب وفات سرور کائنات علیہ وعلے آلہ افضل الصلوٰۃ واکمل التسلیمات نے فدک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو برائے چندے مستعار عطا فرمایا ہو، پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ قصہ معلوم نہ ہوا ہو، بلکہ بایں نظر کہ مدام فدک میں تصرف مالکانہ حضرت سرور کائنات صلے اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم ہی کو کرتے ہوئے دیکھا تھا، بجائے خود یہ سمجھے ہوئے تھے کہ فدک بھی حسب ایما حدیث مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَةٌ کے (جس کا مذکور عنقریب ہی آتا ہے انشاء اللہ تعالیٰ) وقف عام ہے، اس میں اچانک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے یہ بات سن کے اس وقت جانِ صدیق رض عجب شکنجہ میں آگئی کہ نہ ادھر ہوتے بنے۔ نہ ادھر ہوئے، رعایت رضاء حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ایک طرف، اور پابندی اتباعِ سنت نبوی علے صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام جس کی طرف حضرت زید نے بایں لفظ اشارہ فرمایا وَکَانَ یَکْرَهُ اَنْ یُغَیِّرَ الخ ایک طرف، اور دونوں جانبیں واجب الرعایت

مگر چونکہ رعایت جانب حضرت زہرا رضی اللہ عنہا بھی مبنی وجوب اتباع نبوی واقتدار مصطفوی صلے اللہ علیہ وسلم ہی پر تھی، اور پاسداری قرابت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ضرورت اور فرضیت ہر چند بمراتب موکد ہے، لیکن لِمّ اوسکی یہی ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے ،،بمرگش من گیرتا بہ تپ راضی شود،، تو جیسا کہ آیت لَا تَقُلْ لَهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا میں ممانعت تو بظاہر ہوں کہنے اور جھڑکنے سے ہے۔ لیکن مطلب یہ ہے کہ جب ہوں کہنے اور جھڑکنے سے رکیں گے تو گالی گفتار اور جوتی بیزار بدرجہ اولےٰ نہ ہو گی، تو

ایسے ہی یا سداری قرابت سے بھی مقصود یہی ہے کہ جب امور دینی میں بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ناخوشی گوارا نہ کریں گے۔ تو امور اخروریہ میں تو بالاولی مطیع و منقاد رہیں گے۔ کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا رسول کرکے بھیجنا اصل امور دینی کی اصلاح کے لئے ہے، خصوصاً حقوق مالی میں اور وہ بھی فدک۔ کہ بشہادت دستور نبوی صلے اللہ علیہ وسلم فقراء اور مساکین اور ابن سبیل کی حق تلفی کا فی الجملہ خلجان ساتھ لگا ہو۔

کیونکہ تادم آخریں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم یہ لوگ مصرف فدک رہے، معہذا اہل حق موقع رعایت میں رعایت والوں کو زیادہ دبایا کرتے ہیں۔ اس لئے انصاف والے اپنوں کی رعایت نہیں کیا کرتے، تو ان وجوہ سے مرجح اور موجہ یہی تھا کہ محاصل فدک میں دستور نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کو ہرچہ بادا باد دستور العمل رکھے۔

لیکن بحکم مَا لَا يُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا يُتْرَكُ كُلُّهٗ کے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بسبب کمال اخلاص اور نہایت پاس و نیاز کے اس بات کے جویا ہوئے، کہ تا مقدور دلداری حضرت زہرا کی جائے، اور جس قدر بن سکے خاطر مبارک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا پر میل نہ آنے دیجیے، بایں ہمہ اپنی غلط فہمی کا جدا احتمال۔ اس لئے طالب شہود ہوئے۔ تاکہ شاید کسی گواہ کی تقریر سے کوئی اشارہ نبوی اس بات کی طرف پایا جائے۔ کہ گو ترکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وقف عام ہے لیکن پھر بھی مستعیر یا اقربا حضرت صلے اللہ علیہ وسلم اولیٰ اور اقدم ہیں، چونکہ حضرت ابوبکر صدیق بوجہ پاسداری قرابت نبوی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سامنے دوٹوک بات کہنے میں متامل اور متردد تھے اور اپنا مافی الضمیر (یہ بات کہ میں وہی کروں گا۔ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے) بلحاظ دل سوزی جگر گوشہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آشکارا نہیں کہہ سکتے تھے۔

تو خدا ساز غیب سے تدارک ہوا۔ اور بحکم وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا یعنے جو شخص خدا سے ڈرے۔ خدا اس کے لئے بلاؤں سے نکاسی کی صورت کر دیتا ہے" وہ لطیفہ غیبی پیدا ہوا کہ جس سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی رنجش کا کھٹکا بھی جاتا

رہا، یعنے گواہ ملے تو ایک مرد اور ایک عورت ہی ملی، نصاب شہادت بھی پورا نہ ہوا، جو کسی کو کچھ کہنے کی گنجائش باقی رہے، بلکہ ایک عذر معقول ہاتھ آیا اور عذر معقول اہل عقل اور دینداروں کے نزدیک مقبول ہی ہوتا ہے وَالْعُذْرُ عِنْدَ كِرَامِ النَّاسِ مَقْبُوْلٌ اس لئے ہم بالیقین جانتے ہیں کہ یہ بات موجب مزید اقتدار حضرت ابوبکر صدیق نہیں تو باعث رفع رنج قلب پاک حضرت زہرا تو ضرور ہی ہوئی ہوگی،

چنانچہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے راضی ہو جانا جو شیعوں کی کتابوں کے حوالہ سے عنقریب انشاء اللہ مذکور ہوگا۔ اس بات پر شاہد ہے۔ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ قول وَاللّٰهِ لَوْ رَجَعَ الْاَمْرُ اِلَیَّ لَحَكَمْتُ فِيْهَا بِمَا حَكَمَ اَبُوْ بَكْرٍ یعنی واللہ اگر یہ مقدمہ میرے پاس رجوع ہوتا تو میں وہی حکم کرتا جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا، باآواز بلند یہ کہتا ہے کہ حضرت زہرا کو حضرت ابوبکر سے کچھ ملال نہ تھا، اور تھا تو انجام کار باقی نہیں رہا، بلکہ مبدل بخوشی ہو گیا تھا ورنہ اگر ابوبکر صدیق سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اس جہاں سے ناخوش تشریف لے جاتیں تو اہلبیت میں سے ایک بھی ابوبکر کو بھلائی سے یاد نہ کرتا، چہ جائیکہ ایسی بڑھ کے تعریف ؟" القصہ اگر علمائے شیعہ کو ہمارا یہ کہنا کہ یہ روایت موضوع ہے مسلم ہو تو فبہا، ورنہ اس روایت میں کوئی بات خلاف اہل مذہب تشیعت کو نہیں پہنچتی، جو علمائے شیعہ دہن دریدہ ہو کر زبان دراز کریں۔ اور الزام اہلسنت کے لئے اس روایت کو زبان پر لائیں، ہاں اگر توجیہ وجیہہ جو مذکور ہوئی، نہ بن پڑے تو البتہ شیعوں کی فی الجملہ کچھ بن پڑے۔

لفظ عطا کو بمعنے ہبہ بنانے کی ناکام کوشش

مگر شاید علمائے شیعہ بعد تجسس بسیار و جد و جہد بیشمار یوں بات بنانے لگیں کہ ہرچند عاریت کے موقع میں اعطا کا مستعمل ہونا مسلم، لیکن یہ معنے حقیقی ہیں اور عاریت معنے مجازی، اس لئے استعمال میں جب تک کوئی قرینہ صارفہ معنی ہبہ سے نہ پایا جائے، تب تک معنے عاریت مفہوم نہیں ہو سکتے، سو اول تو یہ بات ہی غیر مسلم، مستدل و مدعی کو لازم ہے کہ دعوے بے دلیل زبان پر نہ لائے، ورنہ

ایک حرف خفیف لا نسلم میں وہ دعوائے مسترد ہو جائے گا۔

اور یہ بھی نہ سہی، جیسے علمائے شیعہ ایک دعوائے بے دلیل پیش کر کے بزعم خود اہلسنت کے سامنے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، ہم بھی ایک بے دلیل یوں دعویٰ کرتے ہیں، کہ یہ لفظ ان دونوں فردوں میں مشترک معنوی ہے، یا ان دونوں معنوں میں مشترک لفظی ہے اور یہ دعوے ایک وجہ سے بہ نسبت دعوی علمائے شیعہ معقول بھی ہے کیونکہ اصل یہی ہے کہ لفظ اپنے معنی موضوع کہ میں مستعمل ہو، سو اس صورت میں ہر ایک معنی کے لئے کوئی قرینہ چاہیئے۔ جو دوسرے معنے سے صارف ہو۔

تعین معانی کے لئے قرائن کی بحث

معہذا یہ کچھ ضرور نہیں کہ قرینہ مذکور لفظی ہی ہوا کرے، اور وہ بھی لفظ کثیر المعنے کے پس و پیش ہی لگا ہوا ہو، بلکہ قرینہ کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ مخاطب کو فہم مطلب میں غلطی نہ پڑے، سو ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے بعد زیب دینے مسند خلافت اس بات کی تحقیق کی ہو، کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ترکہ مملوکہ کیا کیا ہے، سو اس تحقیقات میں یہی متحقق ہو گیا ہو کہ فدک تادم بازپسیں مملوکہ مقبوضہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی رہا۔ بلکہ خود حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور دیگر اہلبیت کے اقراروں سے یہ بات ثابت ہو گئی ہو۔ اور ظاہر بھی یہی ہے۔ کیونکہ ایسی بات گھر ہی کے لوگ جانا کرتے ہیں۔

لیکن جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بطور خود اس کا بندوبست اور جمع خرچ کرنا چاہا، تب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا باایں وجہ کہ مجھ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دے رکھا ہے، مزاحم حال ہوئی ہوں، اور اس حجت سے یہ غرض ہو کہ گو فدک ہمارا مملوک نہیں لیکن اولیٰ یہ ہے کہ یہ ہمارے پاس ہی رہے، اور اس کی آمدنی ہمارے ہی پاس آیا کرے، اب منصفان شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ لشہادت قواعد علم مناظرہ مدعی کے خصم کے لئے بھی تو احتمالات ممکنہ خلاف دعوائے مدعی ہی کفایت کرتے ہیں۔ سو اس احتمال کے امکان میں اہل عقل تو کیا امکان ہے جو انکار کریں؟ اور ایسے ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ بعد وقوع اس ماجرا کے حضرت زہرا کا یہ فرمانا کہ مجھ کو رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، بجز عاریت اور کسی معنے پر محمول نہیں ہو سکتا۔ اور باوجود مملوک نہ ہونے کے پھر اتنا تحکم بوجہ ناز اہل بیت و نیاز صدیق اکبر جو خصوصًا اس موقع میں کہ رعایت بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہو، کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کئے اور کہے کے بھروسے ہر صحابی خلفاء پر تحکم کر لیتا تھا، چہ جائیکہ اہلبیت؟ اور ان میں سے بھی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور وہ بھی حضرت صدیق اکبر پر، کہ نیازمند خاص اہلبیت تھے، رضوان اللہ علیہم اجمعین،

حضرت عمر کا بوجہ قرب مسجد حضرت عباس کے پرنالے کا توڑ ڈالنا، اور ان کا یہ تحکم کہ یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کا لگایا ہوا تھا تم نے کیوں توڑا؟ اور پھر حضرت عمر کا اس پرنالے کو اپنے ہاتھ سے درست کرنا کتابوں میں مذکور ہے لیکن۔ ع:۔ ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد ؛ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا یہ تحکم برسر، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بوجہ حدیث مَاتَرَکْنَا صَدَقَۃٌ جس کا ذکر قریب ہی انشاء اللہ تعالےٰ آتا ہے۔ مجبور تھے، اور پھر گواہوں کی تقریر سے بھی کچھ عقدہ کشائی نہ ہوئی، کوئی اشارہ کسی قسم کا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے پاس رہنے دینے پر گواہوں کی تقریر سے ظاہر نہ ہوا۔

فدک کے لئے سیدہ کی شہادت بھی نامکمل تھی

معہذا گواہی بھی اپنی مقدار معین کو نہ پہنچی، اور اوپر شہادت دستورِ نبوی شرکت فقراء اور مساکین اور ابن سبیل کی جس قسم اور جس مرتبہ کی کہی جائے، اس مال میں ثابت، القصہ روایت متنازع فیہا، اگر بپاس خاطر شیعہ ہم تسلیم ہی کریں! تو کوئی بات خلاف مذہب اہلسنت اور منافض حدیث مشکوٰۃ اس روایت سے نہیں نکلتی۔ بلکہ الٹی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعریف نکلتی ہے۔ سو علمائے شیعہ اگر اس روایت کو موضوع سمجھیں تو فبہا۔ ورنہ اگر تسلیم کریں تو بجمیع اجزائہا تسلیم کریں۔

حضرت زید کے بارے میں دریدہ دہنی اور اسکا جواب

اور اگر یہ عذر نامعقول پیش کریں، کہ ہر چند یہ روایت صحیح ہے۔ لیکن حضرت زید ہمارے عقیدہ کے موافق نعوذ باللہ منہا

کافر مرے ہیں، کیونکہ امامت حق حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا تھا کہ وہ امام وقت تھے۔ اور امام ہر زمانہ میں ایک ہی ہوتا ہے، پھر جو انہوں نے جہاد کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے آپ کو امام سمجھتے تھے، اور جو شخص کہ امام نہ ہو اور بایں ہمہ دعوی امامت کا کرے، تو وہ بعینہ ایسا ہی ہے، جیسا کوئی نبی نہ ہو اور پھر دعوے نبوت کا کرے، سو جیسا وہ کافر ہے، بلکہ کافروں میں بھی اشد، ایسا ہی یہ ہے۔ پھر ان کی بات کا اپنے مذہب کی تائید میں کیا اعتبار؟ ہاں ہبہ ہونا فدک کا جو مخالف مذہب حضرت زید یعنی مذہب اہلِ سنت ہے البتہ مقبول ہوتا، لیکن اس کو توجیہ عاریت نے نہ چلنے دیا۔ تو اس کا جواب قاضی نور اللہ صاحب، سنیوں کی طرف سے آپ دے گئے ہیں، اس لئے ہم کو کیا ضرورت کہ حضرت زید کی بزرگی کے اثبات میں دردسر اٹھائیں؟ ان کی روایت نقل کئے دیتا ہوں، کہ ان کا لکھا شیعوں کے نزدیک وحی آسمانی سے بھی زیادہ ہے، مثل نوشتۂ تقدیر کوئی اس کو مٹا نہیں سکتا، قاضی نور اللہ صاحب مجالس المومنین میں فضیل بن یسار کے اقوال میں امالی شیخ ابن بابویہ نقل کر کے بروایت فضیل بن یسار ہی رقم فرماتے ہیں کہ "گفت[1] در محاربہ زید بن علی با طاغیانِ لشکرِ ہشام با او ہمراہ بودم، و چوں بعد از شہادت زید بمدینہ رفتم و بخدمت حضرت امام جعفر صادق رسیدم، آنحضرت از من پرسید کہ اے فضیل باعم من در قتالِ اہلِ شام حاضر بودی؟ گفتم بلے، آنگاہ پرسید کہ چند کس را از ایشان کشتی؟ گفتم شش کس را فرمود مبادا ترا شکے در استحلال خون ایشان باشد؟ گفتم اگر شکے دران میداشتم چرا ایشان را می کشتم آنگاہ شنیدم

[1] ترجمہ از ناشر "فضیل نے کہا کہ زید بن علی کی لڑائی جو طاغیان ہشام کے ساتھ ہوئی تھی میں اس میں شریک تھا حضرت زید کی شہادت کے بعد جب مدینہ گیا اور حضرت امام جعفر صادق کی خدمت میں پہنچا۔ تو آپ نے مجھ سے پوچھا کہ اہل شام کے ساتھ جو میرے چچا نے قتال کیا۔ تو اس میں حاضر تھا؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ اس وقت آپ نے پوچھا کہ تو نے کتنے شامی قتل کئے؟ میں نے عرض کیا چھ آدمی۔ فرمایا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں ان کا خون حلال ہونے میں شبہ ہو؟ میں نے عرض کیا کہ اگر مجھے کوئی شک ہوتا تو میں ان کو قتل کیوں کرتا۔ اس وقت میں نے سنا کہ آنحضرت نے فرمایا۔ الخ

کہ آنحضرت گفت، أَشْرَكَنِي اللّٰهُ فِي تِلْكَ الدِّمَاءِ وَاللّٰهِ زَيْدٌ عَمِّي هُوَ وَأَصْحَابُهُ شُهَدَاءُ مِثْلَ مَا مَضَى عَلَيْهِ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ وَأَصْحَابُهُ انتہی بلفظہ" فارسی کا ترجمہ تو اکثر جانتے ہی ہیں پر عربی کا ترجمہ لکھنا پڑا۔ وہ یوں ہے "خدا مجھکو ان خونوں کے ثواب میں شریک کرے، واللہ حضرت زید میرے چچا اور انکے اصحاب سب شہید ہیں، اور یہ سب قصہ ایسا ہی ہے۔ جیسا حضرت علی اور ان کے یاروں پر گذرا فقط" اب حضرت امام ناطق بحق امام جعفر صادق کی اس تمنا اور اس تشبیہ کو دیکھنا چاہیئے! امام کے منہ سے جو لفظ نکلے تو سراسر صحیح ہے، سو اگر یہ تشبیہ صحیح ہو تو یہ معنے ہوں کہ حضرت زید کا حال حضرت امیر المومنین کے حال کے ہم پلہ تھا۔ تو اس صورت میں حضرت زید کا کافر ہونا تو غلط۔ البتہ زبدہ اولیا اور عمدہ اتقیاء میں سے ہوں گے۔ ورنہ شہید ہونا کجا۔؟ اور پھر حضرت امیر کے حال کا ان کے حال سے مماثل ہونا تو محال ہی ہوگا؟ یہ بات جب ہی ہو سکتی ہے کہ عقیدۃً اور عملاً اور حالاً حضرت زید متبع اور مطابق حضرت امیر کے ہوں، فرق ہو تو مقدار ہی کا ہو۔ یعنے جیسے چھوٹی تصویر اپنے سے بڑے ذی تصویر کے ہر بات میں سوا مقدار کے مطابق ہے، حضرت زید بھی حضرت علی کے رسوائے عظمت اور زیادتی مراتب کے ہر بات میں مطابق ہوں، سو یہ فرق اور ائمہ میں بھی ہے۔ حضرت امام باقر اور حضرت امام جعفر صادق وغیرہم بلکہ حسنین رضی اللہ عنہم اجمعین درجہ میں کون سے حضرت علی کے برابر ہیں۔؟

فدک کے بارہ میں حضرت زید کا قول ہی صحیح ہے

بہر حال حضرت زید کی بات باون تولہ پاؤ رتی کی ہوگی خصوصاً ایسی اختلافی بات کہ جس میں بے غور لب کشائی نہیں کی جاتی۔ کیونکہ سنی شیعہ دونوں کے قول کے موافق بالاتفاق اس خلاف میں ایک طرف جنت اور ایک طرف جہنم ہے، بالجملہ روایت متنازع فیہا بالیقین موضوع ہے، اور بایں ہمہ موضوعیت جو سنیوں کی بعضی کتابوں میں پائی جاتی ہے، تو اول تو اس کا حال خوب مفصل معلوم ہو چکا دوسرے اس روایت کو بغرض الزام شیعہ بھی درج کرتے ہیں کہ جو روایت تمہاری بنائی ہوئی اور تمہاری دستاویز اعتراض ہے، وہی روایت ہمارے مفید مطلب ہے

چنانچہ صواعق محرقہ میں حضرت ابوبکر صدیق کے فضائل ہی میں اس کو لکھا ہے۔ پر جو الٹی کے سمجھن ہار ہیں۔ وہ الٹی ہی سمجھتے ہیں، اور بے سوچے سمجھے ایسے ایسے مواقع میں سے بھی لوگوں کے دھوکا دینے کو (جیساکہ مولوی صاحب نے کیا ہے) نقل کر دیتے ہیں چنانچہ مولوی عمار علی صاحب نے ایسا ہی کیا ہے۔ اور پھر ہرگز شرم وحیاء پاس کو بھی نہیں پھٹکتی۔

شیعہ قرآن وحدیث کے کسی لفظ کے معنی متبادر مراد نہیں لے سکتے

اور اگر اس پر بھی علماء شیعہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئیں! اور شرم کی آنکھیں بند کرکے یوں فرمانے لگیں کہ گو اعطاء بمعنے عاریت بھی آتا ہے لیکن تاہم متبادر معنی ہبہ ہی ہیں خصوصًا۔ اس روایت میں، تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ متبادر ہونا ہبہ کا لفظ اعطی سے اس روایت میں مسلم، لیکن اول تو شیعہ ملفوظاتِ ائمہ خصوصًا کلمات مرتضوی کے جو صحابہ کرام اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی مدح میں صادر ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے کچھ اس رسالہ میں بھی منقول ہوئے ہیں، معنی متبادر ہی لے کر شیعہ ہونے سے دست بردار ہوں، اور ایسے ہی آیات قرآنی جو صحابہ کی مدح میں وارد ہوئی ہیں، ان کو اپنے معنے متبادر ہی پر رکھ کر بدل وجان معتقد ہو جائیں، اس وقت اگر ہم ۔۔۔ سے اس قسم کی درخواست کریں، تو فی الجملہ بجا بھی ہے۔ اگر وہاں وہ مان جائیں، تو خیر جوں توں یہاں ہم مان جائیں۔ دوسرے اگر معنے متبادر ہی ہر کلام کے لئے جایا کریں تو پھر یہ فرق باریک فہمی وغیرہ سراسر لغو ہو جائے، اور اکثر غلط فہمیاں درست ہو جائیں کیونکہ بیشتر سبب غلط فہمی کا یہ تبادر فہم ہوتا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے۔

اور اختلافات ائمہ اہلسنت اور ایسے ہی اختلافات باہمی مجتہدین شیعہ مبنی اس اصل پر ہیں، خاص کر اصولیوں اور اخباریوں کا اختلاف جو شیعوں میں باہم پیدا ہوا ہے اس کی وجہ یہی ہے، کہ اخباری ظاہرہ پر عمل کرتے ہیں۔ اور جو معنی متبادر ہوتے ہیں۔ اسی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اور اصولی اپنے عندیہ میں غور کرکے معنی مقصود شارع پر عمل کرتے ہیں، اور تبادر معانی ظاہر اخبار کا لحاظ نہیں کرتے، سو حضرت مولوی عمار علی صاحب اگر اس روایت میں بوجہ تبادر معنے ہبہ ہم سے الجھنے کو تیار ہوتے ہیں، تو پہلے اپنے مذہب اصولیین سے دست بردار ہو کر اخباری بن جائیں۔ پھر ہم سے دوچار ہوں۔ اس وقت ہم بھی ناچار بحکم کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ اس ردوکد سے (کہ عاقل کو ہر جگہ معنی متبادر ہی ملحوظ رکھنا چاہیئے، جیسے عوام کا کام ہے؟ یا معنے محقق کی تحقیق ضروری ہے۔ جیسے محققین کا شیوہ ہے؟) اعراض کرکے دوسری طرح مولوی صاحب کے کان کھولیں گے۔

روایت فدک منقطع ہے

اعنی ہم نے مانا کہ لفظ اعطاء کے معنی روایت متنازع فیہا میں یہی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فدک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو ہبہ ہی کر دیا تھا۔ لیکن مولوی عمار علی صاحب بلکہ تمام علمائے شیعہ اس میں کیا ارشاد کرینگے کہ یہ روایت منقطع ہے، حضرت زید اس زمانہ میں کہاں تھے؟ جب حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق سے دعوائے ہبہ فدک کیا؟ یہ بات اگر بالفرض واقع میں وقوع میں آئی ہے۔ تو قریب وفات حضرت سرور کائنات علیہ وعلٰی آلہ افضل الصلوت والتسلیمات ظہور میں آئی ہے۔ بلکہ متصل بعد وفات ہی۔ چنانچہ سب جانتے ہیں۔ سو اس زمانہ کے وقائع کا مشاہدہ اور ان کی روایت اور شہادت بجز صحابہ اور کسی کا کام نہیں۔

الغصہ حضرت زید کا یہ قول ایک قول بے سند ہے۔ کوئی بات بے سندِ متصل لائق اعتبار نہیں، ہاں اگر حضرت زید شیعوں کے امام ہوتے تو علم غیب کی وجہ سے سنیوں کو نہیں، تو شیعوں ہی کے نزدیک اُن کا قول حجت ہو جاتا؟ پر شیعوں کے نزدیک تو مومن بھی نہیں، چہ جائیکہ علم غیب اور امامت؟ ہاں منکرِ امامت امام وقت تھے۔ جس سے دلی بھی کافر ہو جائے، اور سنیوں کے نزدیک گو حضرت زید کا برا اولیاؤں میں سے ہوں۔ لیکن تاہم آدمی ہیں۔ جب تک سند نہ ہو کیونکر معلوم ہو کہ انہوں نے جس سے یہ بات سنی ہے وہ معتبر ہے کہ نہیں؟ صحابہ کی ملاقات میں تو احتمال ہے، باقی رہے تابعین سو ان میں جھوٹے سچے نیک و بد سب طرح کے ہیں۔

اور اگر بالفرض کسی معمر صحابی سے ان کی ملاقات ہوئی بھی تو بھی کیا لازم ہے کہ وہ صحابی اس وقت حاضر ہی تھے؟ یا ان کو کسی دوسرے صحابی سے یہ بات پہنچی ہی تھی، اور پھر حضرت زید نے بھی انہیں سے سنا ہو! احتمال ہے کہ جس صحابی سے ان کی ملاقات ہوئی ہو۔ ان کو یہ بات معلوم نہ ہوئی ہو؟ اور اگر معلوم بھی ہو تو انھوں نے ان سے نہ سنا ہو بلکہ کسی تابعی سے سنا ہو؟ بلکہ زبان زد عوام ایک بات دیکھ کر اسی کے موافق نقل کر دیا ہو، یا بطورِ تسلیم قول معترضین یہ بات فرمائی ہو؟ بہر حال احتمالات چند در چند قادح اعتبار روایت موجود ہیں، پھر بایں ہمہ احتمالات کوئی کیونکر اس روایت کو دربارۂ دعوئے ہبہ فدک قبول کر لے۔

مشکوٰۃ کی روایت مرفوع متصل ہے | خصوصًا درصورتیکہ آیت اور روایت صحیح متصل بلکہ مرفوع یعنی روایت مشکوٰۃ اس کے مخالف موجود ہو مگر شاید کوئی کم فہم اس کے وقوع ہونے میں اس وجہ سے کلام کرے کہ روایت مشکوٰۃ میں بھی عمر بن عبدالعزیز سے جو تابعی ہیں ایک روایت بے سند منقول ہے۔ کیونکہ وہ بھی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود نہ تھے۔ سو گو ہم کو بعد غیر معتبر ہو جانے روایت متنازع فیہا کے اس روایت کا غیر معتبر ہونا مضر نہیں لیکن تاہم بپاس خاطر شیعہ اس کسر کو بھی مٹائے دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ روایت مشکوٰۃ میں ہر چند حضرت عمر بن عبدالعزیز ہی کا قول ہے۔ لیکن اس قول کو مغیرہ بن شعبہ جو صحابی ہیں۔ نقل کرتے ہیں۔ اور صحابی کا ایسی بات کو بیان کرنا۔ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔ یا فرمایا ہے، حکمًا مرفوع ہی چنانچہ واقفانِ اصولِ حدیث جانتے ہیں۔

معہذا قرینہ نقلیہ بھی اس بات کو تقاضا کرتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ فرمانا صحیح ہو۔ کیونکہ اس قول کو حجت (نہ لینے فدک کی) قرار دیتے ہیں، کوئی بات مفید مطلب اس سے ثابت نہیں کرتے، اور نہ لینے کے لئے جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک کا نہ دینا حجت ہو سکتا ہے، اس سے بڑھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ہبہ کر دینا ہو سکتا ہے۔ سو اگر یہ قضیہ ان کے نزدیک صحیح نہ ہوتا۔ بلکہ الٹا ہبہ کا

کرنا صحیح ہوتا تو ان کو کیا ضرورت تھی، کہ نقصان دنیا تو یوں کرتے کہ فدک کو دے دیا، اور نقصان دین یوں کرتے کہ جھوٹ بولا، اور جھوٹ بھی کس پر؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر! جس کی سزا میں جہنمی ہونے کا وعدہ ہے، اور وعدہ بھی متواتر، کیوں کہ حدیث مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ جس کا ترجمہ یہ ہے "جو شخص جان بوجھ کر میرے ذمہ کوئی جھوٹی بات لگا دے۔ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں کر لے"، بالاتفاق محدثین کے نزدیک متواتر ہے، بلکہ متواتر باللفظ اگر ہے تو یہی ہے۔ بہر حال اگر روایت حضرت زید بن علی بن الحسین رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ہم موضوع نہ کہیں، اور چشم پوشی کر کے یوں تسلیم ہی کر لیں، کہ واقعی یہ بات حضرت زید ہی کی فرمائی ہوئی ہے۔ تب اس کے آگے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک مٹ گیا ہے۔

فدک تا دم آخر خاتم الانبیا کے تصرف میں تھا | معہذا جیسے علامات صحتِ روایت مشکوٰۃ ظاہر ہیں، چنانچہ مذکور ہو چکا، ایسے ہی روایت متنازعہ فیہا کے علاوہ بے سند ہونے کے امارات کذب بھی ظاہر و باہر ہیں۔ کیونکہ باتفاق مورخین فدک تا دم بازپسیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں تھا۔ اور بے قبض ہبہ موجب ملک موہوب لہ نہیں ہوتا۔ واہب ہی کی ملک میں رہتا ہے۔ اور ملک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حال خود حضرت ابوبکر صدیق کو معلوم تھا کہ بعد وفات وقف ہو جاتی ہے، پھر جو دربارۂ ہبہ گواہ طلب کئے، تو یوں کہیئے، ابوبکر صدیق کی دنیا کی ہوشیاری اور ان مسائل کی واقف کاری کے کہ جو امور دنیا میں مفید پڑیں شیعہ بھی معتقد ہیں۔ جب نہ دنیا ہی ٹھیرا۔ تو ایسی مشکل راہ کیوں چلے جس میں اندیشہ ہار جانے کا ہو۔؟

کیونکہ اگر گواہ اپنی مقدار معین کو پہنچ جاتے تو پھر یہ عذر بھی بے جا تھا۔ کہ ہبہ بے قبض تمام نہیں ہوتا، ہر کوئی یوں جانتا کہ سارے نہ دینے کے بہانے ہیں۔ اگر یہ عذر قابل سماعت تھا۔ تو پہلے ہی کیوں نہ پیش کیا اور گواہوں کے طلب کرنے کو

شیعہ محمول تحقیق حق پر کرتے ہیں، تو اسکے بعد جو کچھ پیش آیا، وہ خواہ مخواہ عدل و انصاف ہوگا۔ کیونکہ حکم خداوندی ہی کے موافق عمل کیا ہے، کوئی قاعدہ نہیں گھڑ لیا، باقی ہیں نے جو کچھ تقریر در بارۂ طلب گواہان لکھی ہے، اگر اس کو شیعہ تسلیم کر لیں تو "چشم ما روشن و دل ما شاد"، ورنہ ان کی کوتاہ فہمی سے امید تو یہ نہیں۔

اگر فدک ورثہ تھا تو شخص واحد کا قبضہ بقیہ ورثاء پر ظلم تھا

علاوہ بریں جب بالاجماع یہ بات مقرر ہوئی۔ کہ فدک تادم آخر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض میں رہا، تو باتفاق شیعہ وسنی اگر آپ نے ہبہ کیا بھی، تب بھی حضرت فاطمہ کی ملک میں نہ آیا پس حضرت فاطمہ جو شیعوں کے نزدیک معصوم اور ہمارے نزدیک محفوظ ہیں کہیں ایسا غلط دعوے کرتیں جس میں بہر حال حق تلفی خلائق ہے؟ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری ہوتی ہے تو وارثوں کی حق تلفی ظاہر ہے، ورنہ فقراء اور مساکین کی حق تلفی، یہ بھی نہ سہی بلکہ آپ کا ترکہ وقف ٹھیرا خلیفہ کو اختیار ہے جسے چاہے دیدے۔ پس اگر حضرت فاطمہ کے پاس آگیا۔ تو اور بھی اچھا ہے، لیکن اس طرح فن و فریب سے لینا فریب بازوں اور دنیا سازوں کا کام ہے

بہر حال علامات صدق روایت مشکوٰۃ اور امارات کذب روایت متنازع فیہا اہل فہم کے نزدیک تو ایسی روشن ہیں، جیسے اہل نظر کے سامنے آفتاب، یوں مولوی عمار علی صاحب یا ان کے اقران و امثال اگر نہ سمجھیں تو پھر ہمیں کوئی یوں نہ کہے کہ یہ کیا کہتا ہے، ان کے حسب حال پھر یہ شعر پڑھا جائے گا۔ ؎

گر نہ بیند بروز شپر چشم ؛ چشمہ آفتاب را چہ گناہ

غرض روایت مشکوٰۃ کی وہ روایت ہم پلہ نہیں ہو سکتی جو اس کو چھوڑ کر اس روایت پر یقین کریں۔ بلکہ موافق قواعد مرقومہ بالا کے لازم ہے کہ بسبب تعارض روایت مشکوٰۃ کے (کہ وہ درحقیقت روایت ابوداؤد ہے، جو صحاح ستہ میں سے ہے اور صحاح ستہ کی روایات کی صحت اور قوت کو یہی بہت ہے کہ ان کا نام صحاح ہے) اس روایت کو جو حضرت زید کے نام لگا رکھی ہے، رد کریں۔

دعوئے ہبہ بغیر قبض مسلم نہیں، علامہ حلی کا فرمان

اور سلمنا کہ روایت بھی صحیح اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا ہبہ کا دعوائے کرنا بھی درست لیکن اتنی بات سنی و شیعہ کے نزدیک بالاتفاق مسلم ہے کہ ہبہ بے قبض تمام نہیں ہوتا، تاوقتیکہ قبض و تصرف واہب کا رہے گا، اسی کی ملک بھی رہے گی، چنانچہ ارشاد علامہ حلی میں مطلب اوّل مقصد دعوے میں مرقوم ہے فَلَا تُسْمَعُ دَعْوَى الْهِبَةِ مُجَرَّدَةً عَنْ دَعْوَى الْقَبْضِ یعنی نہ سنا جائے گا دعوئ ہبہ بے دعوئے قبض کے،، اور فدک بالاجماع تادم واپسیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے قبضہ میں تھا، آپ حین حیات تک فدک میں تصرف مالکانہ کرتے رہے۔ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا دخل آپ کی زندگی میں نہیں ہونے پایا، اس بات میں مورخین طرفین، بلکہ محدثین فریقین متفق ہیں۔ مورخین کے اخبار کے لکھنے کی اول تو اس وجہ سے حاجت نہیں کہ کتب تواریخ پر ہر کسی کو عبور میسر آسکتا ہے، پر علم حدیث تک نوبت کسی کسی کی پہنچتی ہے۔ اکثروں کو مضامین احادیث کی اطلاع نہیں ہوتی۔ دوم تواریخ کی بات اعتبار میں احادیث کے ہم پلہ نہیں ہو سکتی۔

دعوئے ہبہ فدک کے بطلان پر احادیث طرفین سے استدلال

اس لئے طرفین کی روایات احادیث ہی کی طرف اشارہ کئے جاتا ہوں، پہلے تو یہ وقف ہونے کے معنے میں ہی نہیں تراشتے، سنیوں کی روایت لیجیئے، اول تو وہی روایت مشکوٰۃ جو مرقوم ہو چکی اس بات پر بتصریح شاہد ہے۔ دوسرے مشکوٰۃ ہی میں ابوداؤد کی حدیث بروایت مالک بن اوس بن الحدثان مرقوم ہے جس میں اس بات کا بیان ہے کہ حضرت عمر نے اس بات کے استدلال میں کہ مال فئے قابل تقسیم نہیں کچھ ایسا بیان کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ تین چیزیں جدا جدا مصرف کے لئے وقف رکھیں تھیں۔ بنو النضیر، خیبر، فدک، سو فدک کے مصرف کے بیان میں فرماتے ہیں، وَاَمَّا فَدَكُ فَكَانَتْ حُبُسًا لِاَبْنَاءِ السَّبِيْلِ یعنی فدک مسافروں کی خدمت گزاری کے لئے وقف ہے اب بحکم قواعد مناظرہ تو ہمیں اپنی ہی کتابوں کا حوالہ بہت ہے، کیونکہ ورود اعتراض کے

لئے ضروری ہے کہ ایسی بات ہو، کہ جس پر وہ اعتراض ہو، اس کے مسلمات اور مانی ہوئی باتوں کے خلاف ہو۔ اور درصورتیکہ اس کے مسلمات کے خلاف نہ ہو تو اعتراض اعتراض ہی نہیں۔ سو درصورتیکہ ہم نے اپنی کتابوں سے یہ ثابت کر دیا کہ فدک تا دم بازپسیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے قبضہ میں رہا اور پھر کتاب بھی ایسی معتبر، کہ حجت، منجملہ صحاح ستہ ہے، تو پھر از روئے دعوائے ہبہ اعتراض ہی لغو ہو گیا۔ کیوں کہ ہبہ بالاتفاق طرفین بے قبض موجب ملک ہی نہیں۔

لیکن معترض کا سکوت اور ہے، اور اطمینان کچھ اور، اتنی بات سے شیعہ ساکت ہو جائیں گے۔ لیکن بجائے خود سنیوں کی بات سے ان کا دل مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اس لئے گذارش دیگر ہے، محاج السالکین جو کتاب معتبر امامیہ ہے، اور نیز دیگر کتب معتبر امامیہ میں روایت ہے جس کا اس جگہ فقط مضمون ہی لکھے دیتا ہوں۔ عبارت بعینہا انشاء اللہ آئندہ مرقوم ہو گی۔ اس کا مضمون یہ ہے

"جب ابو بکر صدیق نے دیکھا کہ حضرت فاطمہ ان سے کھنچنے لگی۔ اور ملنا ملانا چھوڑ دیا، اور پھر فدک کے مقدمہ میں کچھ نہ بولیں تو یہ بات انہیں بڑی دشوار معلوم ہوئی۔ اسلئے یوں چاہا کہ انہیں راضی کیجئے، سو ان کے پاس جا کے عرض کیا، کہ اے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی آپ کا دعوے سچا ہے پر کیا کروں، میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ تمہارے خرچ کے موافق تمہیں دیکر اور عاملوں کی مزدوری دے کر جو کچھ بچتا تھا، اسے فقراء اور مساکین اور ابن سبیل میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے، انہوں نے فرمایا۔ تو اچھا اسی طرح کرتے رہو۔ جس طرح میرے باپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے، حضرت ابو بکر صدیق نے عرض کی، کہ لو میں قسم کھاتا ہوں کہ جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے، ویسے ہی کئے جاؤں گا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کیا قسم بھی کھاتے ہو کہ اس طرح ہی کرو گے؟ آپ نے مکرر عرض کی کہ قسم خدا کی میں اسی طرح کروں گا، اس پر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے یوں فرمایا، کہ خدایا تو گواہ رہ، سو اس بات پر راضی ہو گئیں اور عہد لے لیا۔ اور حضرت ابو بکر صدیق ان کا خرچ

دے کے باقی کو فقراء اور مساکین اور ابن سبیل کو دیدیا کریں تھے فقط"

سنئے کہ حضرت ابو بکر صدیق کا یہ عذر کرنا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے، اس لئے آپ کے حوالہ کرنے میں معذور ہوں، اور پھر حضرت فاطمہ کا اس میں کچھ انکار نہ کرنا، بلکہ یوں فرمانا کہ اچھا یونہی کئے جاؤ۔ اور پھر اس پر خوشی سے راضی ہو جانا، صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تا دم بازپسیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کا قبض و تصرف تھا۔ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔

پس حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے دعوئے ہبہ میں تکذیب نہیں کی۔ تصدیق ہی کی، لیکن قانون شرعی کے موافق عمل کیا، تاکہ آپ ناحق دینے کے وبال سے، اور حضرت فاطمہ ناحق لینے کے عذاب و نکال سے محفوظ رہیں، اور رہا انہیں جو گواہ طلب کئے۔ تو اسی لئے طلب کئے ہوں، کہ اگر گواہوں سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ واقعی فدک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیا تو گو بسبب عدم قبض کے اب تک ان کی ملک میں نہیں آیا۔ لیکن پھر اولے یہی ہے، کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالہ کیا جائے، پر اس کو کیا کیجئے کہ شہادت اپنے نصاب کو نہ پہنچی، اور مجرد دعوے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا جو ان کے حوالہ نہ کیا تو اسکی وجہ انشاء اللہ آگے مذکور کی جائے گی، امیدوار باید بود۔

مگر شاید کسی شیعی مذہب کو یہ خلجان ہو کہ ابو بکر صدیق کی یہ احتیاط کہ حضرت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہبہ میں بھی (اور ہبہ بھی حضرت فاطمہ کے لئے) وہی شرط قبض و تصرف ملحوظ رہی، کچھ دل کو نہیں لگتی، بلکہ از قبیل دغا و فریب معلوم ہوتی ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تو اشارہ بھی کافی تھا، آپ کا اشارہ اور اوروں کا فعل تام بھی برابر نہیں ہو سکتا، سو اس وہم کو خدا ہی دل سے کھوئے تو کھوئے، یہ اسی قسم کا وہم ہے جو ہنود اور یہود اور نصارے اور مجوس کے دل میں بہ نسبت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور خوارج کو بہ نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کھٹکتا ہے، ان مردودوں کو

بھی یہی گمان ہے۔کہ یہ دعوئے رسالت اور امامت جو ان دونوں صاحبوں سے منقول ہے۔ ایک دنیا طلبی کا ڈھنگ تھا، کچھ دل کو نہیں لگتا۔ بلکہ از قبیل دغا و فریب معلوم ہوتا ہے۔ ع۔ بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس۔"

دوستو! اہل عقل اور اہلِ انصاف سے بات کہئے ہر کسی کا دل شاد ہوتا ہے، پر جاہل نادان نا انصاف دریدہ دہان دراز زبان سے بات کہہ کے بجز اس کے کہ اپنا مغز خالی ہو، اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ان کا علاج تو دُرّہ ہے، یہاں حدیث و قرآن اور دلائل عقلیہ کا بیان نہیں چلتا، پر یوں سمجھ کر کہ جہاں چار نادان ہوتے ہیں، وہاں ایک عاقل بھی ہوتا ہے۔ مولوی صاحب سے امید فہم نہیں تو کیا سارے علماء شیعہ ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے ہیں؟ اپنا ما فی الضمیر عرض کرتا ہوں۔

مسئلہ شہادت اور شاہدین کی تعداد پر محققانہ بحث۔

جناب من اگر یہ ماجرا اور یہ سرگذشت بلا کم و کاست اس طرح ہو جس طرح شیعہ گاتے پھرتے ہیں۔ اور بالفرض محال حضرت ابوبکر صدیق نے گواہ طلب کئے ہی، تو اول تو اس کی وجہ کہ کیوں گواہ طلب کئے؟ مذکور بھی ہوئی ہے۔ دوم انشاء اللہ اور وجہ بھی معلوم ہو جائے گی، لیکن درصورتیکہ یہ مقدمہ کسی وجہ سے ہو۔ گواہ طلب کرنے کے قابل ہو، تو بلا شبہ پھر گواہ گواہوں ہی کی طرح چاہیئے۔ نہیں تو مفت کا دردِ سر تھا۔ سو علماء شیعہ ہی فرما دیں، کہ گواہوں کی کیا مقدار کلام اللہ میں بیان فرمائی ہے؟ اور اس میں پھر کسی کی کچھ تخصیص بھی ہے۔ کہ فلانی قسم کے آدمی ہوں؟ تو پھر کچھ اس عدد اور اس کیفیت کی ضرورت نہیں، معہذا صدقِ نیت حضرت ابوبکر صدیق پر یہ بات گواہ ہے۔ کہ ان کی خلافت میں جو حضرت عثمان نے ان سے یہ بات کہی، کہ میں نے مرض وفات میں سرور کائنات علیہ افضل الصلوات و اکمل التحیات سے حکم کے بلوا لینے کی اجازت لے لی ہے، تو انہوں نے ان سے بھی گواہ طلب کیا۔ اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو معاذ اللہ کچھ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے بزعم شیعہ کاوش بھی تھی تو حضرت عثمان سے تو بزعم شیعہ و سنی محبت اور موافقت اور دوستی ہی تھی، پھر کچھ

دنیا بھی نہیں پڑتا تھا شیعہ مذہب نہ تھے۔ جو تقیہ کا احتمال ہو، پھر جو حضرت عثمان سے انھوں نے گواہ طلب کئے۔ تو کیوں کئے؟ یہ باتیں کمال دیانت اور استقامت پر دلالت کرتی ہیں۔

لیکن شیعہ اپنی عداوت سے ناچار ہیں۔ کینۂ بیجا نے ان کا قلب تیرہ و تار کر دیا ہے، حق و باطل کی تمیز نہیں رہی، اچھی باتوں کو بُرا اور بری باتوں کو اچھا سمجھتے ہیں۔ سو اس کا جواب تو ہماری طرف سے چھ سو برس پہلے شیخ سعدی کہہ گئے ہیں۔

؎ چشم بداندیش کہ برکندہ باد ✿ عیب نماید ہنرش در نظر۔

باقی یوں کہنا کہ گواہ ثبوت دعوے کے لئے ہوتے ہیں۔ اور جب مدعی کی طرف سے خاطر جمع ہو کہ یہ جھوٹ نہیں بولتا، تو پھر کیا ضرورت ہے کہ گواہ طلب کئے جائیں، تو اس کی جوابدہی خدا کے ذمہ ہے۔ کیونکہ خدا ہی نے علی الاطلاق یہ حکم دیدیا ہے کہ بدوں دو گواہ اعتبار نہ کیا کرو، یہ قانون سنیوں نے نہیں گھڑ لیا۔ بہر حال خداوند کریم نے اہل بیت یا اصحاب یا کسی ولی یا صالح کا استثنا نہیں کیا۔ سنیوں کو تو خدا کے اتباع سے کام ہے۔ شیعہ بھی اگر اتباع خداوندی کریں تو فبہا، نہیں اپنا سر کھائیں۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو سنی یہ حکم کاہے کو مانتے۔ کہ ابر کے دن اگر کوئی شخص چاند دیکھے اور اس کی گواہی بسبب تنہائی یا اتہام فسق و فجور قاضی قبول نہ کرے تو لازم ہے کہ وہ سب کے شریک حال رہے۔ اور روزہ رکھے۔ با گرد و غبار میں محاق کے دو روز کے اعتبار سے اگر کبھی انتیسویں کا چاند ہوتا تو انتیسویں کو افطار کر لیا کرتے۔ علیٰ ہذا القیاس صلحا اور علماء یا صالحات عورتوں کی گواہی میں یہ قید لغو ہو جاتی بلکہ جن کفار کا صدقِ مقال تجربہ معلوم ہو جاتا ہے۔ اور بہت سے نام کے مسلمانوں سے زیادہ سچے نکلتے ہیں ان کا کہنا خواہ ایک ہو یا زیادہ قبول ہوا کرتا، بالجملہ اس بات میں اپنے اطمینان کا اعتبار نہیں، پابندی قوانین مدِ نظر ہے، تاکہ امتحان عبودیت اور خود مختاری ہو جائے۔

ہاں حکمت اور مصلحت اس قانون میں البتہ یہی ہے کہ ثبوت حق ہو جایا کرے

ہوا کرد ائے پر حکام وقت کے چھوڑا جائے، تو اول تو اندیشہ رد و رعایت، دوسرے ہر کسی کو یہ دعوٰے ہو سکتا ہے کہ میری بات قابل اطمینان ہے. بس جس صلح اور انتظام کے لئے حکام مقرر کیئے جاتے ہیں، وہ صلح اور انتظام تو در کنار؟ البتہ فساد اور جنگ و جدال کی توقع ہے. اس لئے قانون کلی مقرر کر دیا جس میں اکثر مصلحت مذکورہ پائی جائے، سو برخلاف اس کے اگر کسی صورت میں کبھی مصلحت مذکورہ نہ بھی پائی جائے گی تو اس کا اعتبار نہ ہو گا۔

الغرض یہ وہم (کہ حضرت فاطمہ کے صدق مقال کے بالاتفاق شیعہ و سنی قائل ہیں. پھر کیا ضرورت ہوئی. کہ گواہ طلب کیئے گئے.؟ اس مطالبۂ گواہان سے حضرت فاطمہ کی طرف سے بدگمانی ٹپکتی ہے) یا نادھندی کی بو آتی ہے، بسبب کوتاہ فہمی کے پیدا ہوتا ہے. یہاں فہم والوں سے کلام ہے. نادانوں سے کام نہیں۔

سیدٗ تو ضابطۂ شہادت کی بہت زیادہ پابند ہوں گی

معہذا سب جانتے ہیں کہ مدار بزرگی اطاعت خداوندی پر ہے. چنانچہ کلام اللہ میں خود فرماتے ہیں اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ یعنی بیشک اللہ کے نزدیک زیادہ تعظیم تکریم اسی کی ہے. جو زیادہ پرہیزگار ہو، تو اس صورت میں لازم پڑا کہ ان قوانین کی رعایت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو زیادہ تر ہو اور جو ان قوانین کی رعایت کرے وہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو زیادہ محبوب اور اسکی آپ کے دل میں زیادہ جگہ ہو. سو حضرت ابوبکر صدیق کا گواہوں کا طلب کرنا بقرینہ آیت مذکورہ موجب نشاط خاطر مبارک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ہوا ہو گا. پھر نہ معلوم کہ شیعہ کیوں لڑے مرتے ہیں. یہ وہی مثل ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ تو راضی ہو گئے. پر قاضی جی راضی نہیں ہوتے۔

اور اس تقریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ گواہوں کا جھوٹا جاننا کچھ اور ہے اور ان کی گواہی کے موافق حکم نہ دینا کچھ اور ہے؟ جب تک کہ شہادت اپنی مقدار کو نہ پہنچے، یعنی دو مرد عاقل بالغ یا ایک مرد اور دو عورتیں بایں صفت موصوف نہ ہوں تب تک حاکم کو جائز نہیں، کہ ان کے کہے کے موافق مدعی کی ڈگری کر دے. اگرچہ کیسے ہی معتبر کیوں نہ ہوں. اور ان کے کہنے سے کتنی ہی تسلی کیوں نہ ہو جائے

سو اس حکم نہ دینے اور ڈگری نہ کرنے کو کوئی نادان ہی یوں سمجھے تو سمجھے. کہ گواہوں کی تکذیب کی، ہاں درصورتیکہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ایک مقدمہ میں موافق مدعی کے متفق اللفظ ایک بات کہیں، تو پھر بجز عدم اعتبار گواہان کے کوئی صورت ڈگری نہ کرنے اور مدعا علیہ سے قسم لینے اور مدعی کے دعوے کے نہ سننے کی نہیں. سو شیعوں کے کہے موافق اگر اس روایت کو ہم تسلیم بھی کر لیں تب ظاہر ہے کہ حضرت علی اور حضرت ام ایمن کی گواہی نصاب مذکور کو نہیں پہنچی بلکہ حضرت حسنین کی گواہی مل کر بھی (جیسا کہ جناب دروغ مآب مولوی عمار علی صاحب بچپڑ لگاتے ہیں) مقدار مذکور اور حد مسطور کو نہیں پہنچی کیونکہ دونوں صاحبزادے اس زمانہ تک نابالغ تھے۔

سو اس گواہی کے موافق حکم نہ کرنے میں یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو اور ان کے گواہوں یعنی حضرت علی اور حضرت ام ایمن اور حسنین کو جھوٹا جانا، ہاں ان کی استقامت، شریعت اور سنت پر ثابت ہوتی ہے. لیکن نقصان فہم کا کچھ علاج نہیں، بیوقوفوں کی اصلاح انبیاء سے بھی نہیں ہوتی، ہم تو کس شمار میں ہیں. شاہد اس کا یہ ہے، کہ امام غزالی کی بعضی کتابوں میں کچھ ایسا لکھا ہے. کہ ایک بار حضرت عیسٰے علیہ السلام کوہسار کی طرف بھاگے جاتے تھے. کسی نے عرض کی، آپ ایسے افتاں خیزاں اس طرف کیوں جاتے ہیں. آپ نے فرمایا کہ ایک نادان آتا ہے، اس نے عرض کی کہ پھر آپ کو کیا اندیشہ؟ آپ نے ارشاد فرمایا. کہ بیوقوفی کا کچھ علاج نہیں وہ کسی کے فیض صحبت یا برکت نصیحت سے زائل نہیں ہوتی، الٹے اسی کا اثر پڑ جائے، تو پڑ جائے فقط، اور کسی نے سچ کہا ہے. کہ ؎

لِکُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ یُسْتَطَبُّ بِہٖ ۔۔۔ اِلَّا الْحَمَاقَۃَ دَاءٌ لَا دَوَاءَ لَہَا

یعنی ہر بیماری کا کچھ نہ کچھ علاج ہے جس سے اس کے زائل ہونے کی تدبیر کی جاتی ہے پر حماقت ایسی بیماری ہے. کہ اس کا کچھ علاج ہی نہیں۔

منہج الکرامت کی روایت کے مطابق حضرت صدیق نے فدک سیدہ کو دے دیا تھا۔

اور اگر باین ہمہ بیان واضح شیعوں کی دل کی گھٹ نہ کھلے، اور حضرت صدیق جیسے صادق کی طرف گمان فاسد ہی رہے، تو لیجئے اب تو زبان کو لگام دیجئے اور اپنا کام کیجئے، یہ روایت کتاب منہج الکرامت میں جو شیخ ابن مطہر حلی کی تصنیف ہے۔ موجود ہے۔ انہوں نے سنیوں کی طرف سے جواب شافی وکافی لکھ رکھا ہے۔ القصہ اہل سنت کو تخفیف تصدیع ہوئی۔ اور انہیں کی لاٹھی انہیں کا سر۔

وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا۔ وہ روایت یہ ہے

لَمَّا وَعَظَتْ فَاطِمَةُ اَبَابَكْرٍ فِيْ فَدَكَ كَتَبَ لَهَا كِتَابًا وَرَدَّهَا عَلَيْهَا

یعنی جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق کو دربارہ فدک وعظ و پند کیا، تو ابوبکر صدیق نے فدک کی جاگیر کا کاغذ حضرت فاطمہ کے نام لکھ کر فدک انہیں کو ہٹا دیا فقط،، درصورتیکہ یہ روایت صحیح شیعوں کی ایسی معتبر کتاب میں جسکا نام منہج الکرامت اور پھر تصنیف ایسے علامہ کی جس کا نام ابن مطہر حلی ہو پائی جائے تو پھر سنیوں سے کیوں الجھتے پھرتے ہیں؟ اس روایت کے قربان جایئے۔ اس روایت نے تو شیعوں کو تین پانچ کے قابل نہیں رکھا۔ اب تک مولوی صاحب نے ہبہ اور میراث ہی کا دعوےٰ کیا تھا۔ وصیت یا بیع یا کسی عمل کی اجرت کا احتمال باقی ہے۔ سو ہماری طرف سے اس کی بھی اجازت ہے کہ لگتے ہاتھ ان وجوہ سے بھی طعن کریں کسر نہ چھوڑیں۔ سنیوں کا کچھ لحاظ نہ کریں، اول تو ان کو یہ روایت مل گئی ہے، دوسرے ان کی پشتی پر خدا ہی، جہاں اس روایت کا پتہ لگا دیا، آگے بھی وہ کام چلا دے گا۔

اب سننے کی بات ہے کہ مولوی صاحب ہر بات میں اپنی کتابوں سے جھوٹے ہوتے جاتے ہیں، اور سنیوں کی کتابوں سے مات کھاتے جاتے ہیں، یہانتک تو ناظرین کو معلوم ہی ہو گیا، اور آگے اور انشاء اللہ معلوم ہو جائے گا۔ سو سخنہائے گزشتہ کے دروغ ہونے سے علاوہ اب جس بات کا جتلانا مدنظر ہے۔ وہ یہ ہے کہ اول تو مولوی صاحب کا یہ طوفان دیکھیے۔ کہ حضرت علی اور ام ایمن کی گواہی کا بیان لکھتے لکھتے یہ جولانیوں پر آئے کہ حضرات

حسنین کو بھی ساتھ سان لیا۔ یہ نہ شرمائے کہ الزام خصم کے لئے ضرور ہے کہ وہ بات لکھئے۔ جو اس کے نزدیک بھی مسلّم ہو۔ سو مسلم ہونا تو معلوم؟ جو روایت کہ سنیوں کے نام لگا رکھی ہے حضرات حسنین کا نام تو اس میں بھی نہیں۔ اور اگر اپنے بہتانوں اور اپنے کتب خانوں کے بھروسے سنیوں کو الزام دیتے ہیں، تو یہ الزام تو مثل فوارہ انہیں کے سر پر پڑے گا، ورنہ یوں تو پھر ہر ہر بات ہر ہر شخص سے ہارینگے۔

حضرت عمر پر عمار علی کا بہتان

دوسرے مولوی صاحب کا یوں رقم فرمانا کہ ابوبکر صدیق نے تو جاگیرنامہ حضرت زہرا کے نام لکھ دیا تھا، پر حضرت عمر نے پھاڑ ڈالا، مولوی صاحب نے کیا سمجھ کر لکھا ہے؟ یا بے سمجھے ہی لڑنے کو دوڑتے ہیں، سنیوں کی کتابوں سے اگر لکھتے ہیں تو سنیوں کی کتابوں میں تو اس بات کا پتہ بھی نہیں۔ اور اگر اپنی کتابوں کے بھروسے پر زبان درازیاں ہیں تو اس کا اول تو یہ جواب ہے کہ ،،جواب جاہلاں باشد خموشی،، سبحان اللہ ایسا مناظرہ کسی نے نہ سنا ہوگا، کہ اپنی کتابوں کے کیا۔ بلکہ اپنے خوابوں کے بھروسے دوسروں کو الزام کا ارادہ رکھیں، دوسرے منہج الکرامت کونسی سنیوں کی کتاب،، اور شیخ ابن مطہر حلی کون سے سنی؟ یا حضرت عمر اور حضرت ابوبکر کی حالا کے بیٹے تھے؟ جو اتنا جملہ زائدہ یعنی پھاڑ ڈالنے کا قصہ ہضم کر گئے۔؟

مولوی صاحب تو نئے ہی مفتری ہیں، شیخ ابن مطہر حلی ان کے بھی پیشوا اور استاد ہیں، اور متقدمین سابقین میں سے ہیں، جو بات مولوی صاحب میں ماشاء اللہ بھر دی گی۔ وہ ان میں من بھر سمجھنی چاہیئے۔ اگر اس بات کا جھوٹا سچا کچھ بھی پتہ ہوتا، تو وہ تو سوئی کو بھالا کر دکھاتے، ہاں مجھ سے غلطی ہوئی۔ بہت سے شاگرد رشید استاد سے بڑھ جاتے ہیں، شیخ مطہر حلی میں ایک بڑا قصور رہ گیا تھا، وہ مایۂ عقل تو رکھتے تھے، پر چشم بد دور مولوی صاحب اس قصور سے بھی مبرا ہیں۔

حضرت صدیق کے حضرت جابر کو بغیر شہادت کے مال دینے کے وجوہ

اب مولوی صاحب کی یہ شکایت باقی رہی، کہ ابوبکر صدیق نے حضرت جابرؓ کی بات تو بے گواہوں کے مان لی، پر ستم تو یہ ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا کی بات باوجود ایسے معتبر گواہوں کے بھی نہ مانی، سو اس کا

اول جواب تو یہی ہے کہ یہ روایت اگر سنیوں کی کتابوں میں ہوتی تو البتہ اس شکایت
ہا کم فہموں کے نزدیک محل اور موقع تھا ہو اس روایت کا سنیوں کی کتابوں میں
ہونا نہ ہونا اور اس کا موضوع ہونا نہ ہونا دیکھنے والوں پر انشاء اللہ بخوبی واضح ہو جائے
گا۔ اور بے لسکے کہ سنیوں کی کتابوں میں یہ روایت پائی جائے۔ یہ شکایت کرنی اپنی فہم
و فراست کی خوبی بیان کرنی ہے۔

اگر یہی الزام ہوا تو کل کو سنی پنڈتوں کی پوتھیوں اور سکھوں کی گرنتھ اور یہود و
نصاریٰ کی تورات و انجیل محرف کے لکھے ہوئے سے ملزم ہو جائیں گے؟ اور ان کتابوں کی
باتیں مان جائیں گے، اور شیعوں کو تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ان کا سب طرف لیکھا ہے۔
ہندو یا سکھ بن جاتے ہیں تو انہیں کچھ نقصان نہیں، اور یہود و نصاریٰ کے ہم مذہب ہو جاتے
ہیں، تو انہیں کچھ زیاں نہیں، اگر اندیشہ تطویل نہ ہوتا۔ تو تبلا دیتا۔ کہ شیعوں کو ان سب کے
ساتھ ایسی نسبت ہے، جیسے حیوان مشہور مسمی بہ اشتر گاؤ پلنگ کو اونٹ اور بیل اور
چیتے سب کے ساتھ نسبت مشابہت ہے۔

اور سلمنا کہ یہ روایت سنیوں کی ان کتابوں میں جن کا حوالہ مولوی صاحب دیتے
ہیں کسی ایک دو نسخہ میں ہے بھی؟ تو اول تو وہ کتابیں غیر مشہور اور غیر معتبر، دوسرے
وہ بھی شیعوں کا الحاق ہے، چنانچہ تحقیقات مسطورہ بالا کو دیکھ کر ناظرین کو انشاء اللہ شبہ
نہ رہے گا۔ اور بایں ہمہ پھر وجہ طلب گواہان معلوم ہو چکی ہے، اس کے ملاحظہ سے آپ
واضح ہو جائے گا کہ حضرت جابر کا قصہ (یعنی ایسے مال کا بے شاہد دے دینا جو ایسوں ہی
کے دینے کے لئے ہے۔ اور قسم کا ہی اعتبار کر لینا) اس کو حضرت فاطمہ زہرا رض کے قصہ
کے ساتھ (جس میں بے تحقیق دیدینے میں اندیشہ حق تلفی فقراء و مساکین و ابن سبیل تھا)
کچھ نسبت نہیں۔ جو اس کو اس پر قیاس کیا جائے یعنی گواہوں کا طلب کرنا قضیۂ فدک
میں ہو سکتا ہے۔ کہ بوجہ خیر خواہی حضرت فاطمہ رض زہرا ہو۔

تفصیل اس اجمال کی ہر چند معلوم ہو چکی، پر نا انصافوں سے کام پڑا ہے۔ اس
لئے مکرر عرض ہے، کہ باتفاق شیعہ و سنی اس میں تو کلام ہی نہیں کہ تادم بازپسیں

فدک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں رہا، پھر جب ابو بکر صدیق کو
یہ بات معلوم ہو چکی ہو کہ متروکہ انبیاء وقف ہو جاتا ہے۔ اور ہبہ بے قبض مفید ملک نہیں
ہوتا۔ تو اس میں تو کلام ہی نہ تھا۔ کہ یہ چیز حضرت فاطمہ زہرا کی ملک تو نہیں، پھر جو گواہ
طلب کئے جائیں۔ تو اس لئے تو ہو ہی نہیں سکتا کہ تحقیق ملکیت مد نظر تھی۔ جو کسی نادان
کو یہ شبہ پڑے کہ ہائے افسوس حضرت فاطمہ کی بات تو گواہوں کی گواہی سے ثابت ہو، اور
جابر کی خبر بے گواہوں کے سنی جائے۔ اور بے تکرار مسلم ہو۔ بجز اس کے اور کوئی احتمال نہیں
کہ شاید گواہوں کی تقریر سے کوئی اشارہ نبوی اس جانب پایا جائے، کہ فدک کو حضرت
زہرا ہی کو دیدینا چاہیئے۔ اب کوئی عاقل غور کر کے فرمائیں۔ کہ یہ بات حضرت فاطمہ کی دوستی
اور خیر خواہی کی بات ہے یا دشمنی اور بدخواہی کی۔

حضرت جابر کو نہ دینے میں خلاف وعدہ کا احتمال آنحضرت کی طرف عائد ہوتا ہے

مگر مولوی صاحب کی عقل تو حاشیہ نشین لے اڑے
ہیں، وہ بھی سمجھتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق کو حضرت
فاطمہ زہرا رض کا اعتبار نہ ہوا، اور حضرت جابر کا اعتبار ہوا معہذا حضرت جابر کے نہ دینے میں
یہ احتمال تھا کہ ہر خبر جھوٹی تو ہوتی ہی نہیں۔ اگر واقعی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے
وعدہ کیا تھا۔ اور پھر ان کو اس وعدہ کے موافق نہ دیا جائے گا تو ایک گونہ خلاف وعدہ
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف عاید ہو گا۔ اور یہ خلاف وعدگی ہر چند مجبوری تھی کیونکہ
تادم آخر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس مال بحرین نہ آیا۔ لیکن شان نبوت بہت
رفیع ہے اور پھر نبوت بھی کس کی نبوت؟ اس مرتبہ رفیع پر اتنا قصور بھی نازیبا ہے خصوصاً
جب یہ لحاظ کیا جائے۔ کہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم روضۂ مبارک میں زندہ، اور حضرت
ابو بکر بمنزلہ داروغہ آپ کے کارکن، اور مال بحرین موجود، اگر واقع میں وعدہ وقوع میں آیا
ہے۔ اور در صورت طلب گواہان حضرت جابر کے پاس گواہ نہ نکلے؟ کیونکہ کچھ ضروری
نہیں کہ کسی کے سامنے ہی وعدہ کیا ہو، تو اس صورت میں لاریب عاقلوں کے نزدیک
اخلاف وعدہ بجانب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عاید ہو گا۔

القصہ مقتضائے احتیاط ایسے امر میں یہی تھا کہ بے طلب گواہان ان کا مطالبہ

پورا کیا جائے۔ اگر وعدہ واقعی تھا تو فبہا۔ ورنہ کچھ نقصان نہیں، آخر وہ مال صحابہ ہی پر تقسیم ہوا۔ بخلاف فدک کے کہ اس کے دینے میں لاریب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نظر آتی تھی، بسبب قبضہ مستمرہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کہ تا دم آخر فدک مملوک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تھا۔ اور جب آپ کی وفات ہوئی۔ تو وہ بمقتضائے حدیث مَاتَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ کے جس کی تحقیق کا ہم وعدہ کرتے چلے آتے ہیں، اور اب انشاء اللہ تعالے بہت ہی قریب اس کا ذکر آتا ہے، وہ وقف ہو چکا تھا۔ کسی بیٹا بیٹی یا بھائی برادر بیوی باندی کا اس میں حق نہ تھا۔ پھر اس کو کسی کے دعوے کے باعث دے دینا۔ اس حدیث کے موافق عمل نہ کرنا ہے۔ مگر مولوی صاحب کے مذہب میں جو ارشادات نبوی پر چلے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ایفاء وعدہ اور ادا قرض کا بے وصیت خیال رکھے۔ اس سے برا کوئی نہیں۔ آپ عمل نہیں کرتے۔ پھر جو عمل کرے گا، وہ آپ برا لگے گا۔

اہلِ انصاف کے نزدیک تو اتنی بات بھی (کہ بعد وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب ابوبکر صدیق رضی خلیفہ ہوئے۔ اور مال بحرین آیا، تو انہوں نے یہ منادی کر دی کہ اگر کسی کا کچھ قرض رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ہو، یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی سے کچھ وعدہ کیا ہو تو وہ ہمارے پاس آئے ہم اسکو بھگتا دیں گے اور پھر بے دستاویز بے گواہ دینا شروع کیا۔ چنانچہ حضرت جابر رض نے اسی منادی کے باعث پندرہ سو کما لئے۔) اس بات کے لئے دلیل کامل ہے کہ ابوبکر صدیق رض کو حق تلفی اہلبیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کا خطرہ بھی نہیں گذرا، چہ جائیکہ کوئی چیز دبا لیں۔ کسی عاقل کے تصور میں آسکتا ہے کہ جو شخص فقط اس خیال پر کہ مبادا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذمہ کسی کا قرض رہ جائے یا آپ کی بات میں فرق آجائے۔ بے تحقیق تھیلیوں کا منہ کھولدے۔ ایسا کھلا ہوا حق پھر وہ بھی جگر گوشہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اس طرح سے دبا بیٹھے۔

علاوہ بریں نہ آپ کھایا نہ اپنوں کو کھلایا، بلکہ بدستور قدیم اہل بیت اور مصارف مقررہ میں صرف کیا۔ اور مفت دنیا کی ملامتیں اور بار عذاب آخرت سر پر لیا، کوئی حضرات

شیعہ سے پوچھے، کہ ابوبکر جیسے ہوشیار کو کہ جس کی ہوشیاری کی قسم کھائی جائے، غصب کرنا بھی نہ آتا تھا اور ان سب کو جانے دیجیے۔ ایسا فرق لیجیے۔ کہ اہل عقل حضرات ابوبکر کی فہم و عقل پر آفرین اور علماء شیعہ کی کجی عقل اور بلادت طبع پر نفرین کریں۔ وہ فرق یہ ہے کہ دعوے ہبہ فدک جو حضرت زہرا رض سے بزعم شیعہ ظہور میں آیا، تو سنیوں کے طور پر تو منشاء حدیث صحیح مَاتَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ کے جس کا عنقریب انشاء اللہ ذکر آتا ہے۔ معارض اور مخالف تھا، اور شیعوں کے طور پر استحقاق ورثہ نبوی کے مناقض اور دعوائے جابر رض کے کوئی استحقاق یا کوئی حدیث معارض اور مخالف نہ تھی۔ کیونکہ جس مال میں سے انکو دیا گیا۔ وہ مال کسی کے ترکہ کا نہ تھا، اور نہ کوئی حدیث اور نہ آیت اس کے بیان تصرف کے لئے نازل یا وارد ہوئی تھی، بلکہ وہ مال یا خمس یا عشر یا خراج کی قسم کا تھا سو حضرت جابر بہر طور اس کا استحقاق رکھتے تھے۔

اور یہ بھی اہل عقل پر ظاہر و باہر ہے کہ گواہ تعارض کے رفع کے لئے ہوتے ہیں۔ اور ایک جانب راجح کر دیتے ہیں۔ اسی واسطے دو متخاصمین کے رفع مخاصمت کے لئے گواہوں کی ضرورت پڑی، اور در صورتیکہ کوئی خبر یا دعویٰ بلا مزاحم عقلی یا نقلی، یا خبری یا عیانی کے پایا جائے۔ اور مخبر اور مدعی بھی مومن مسلمان ہو، تو پھر حکم نبوی یہ ہے کہ ظُنُّوا الْمُؤْمِنِیْنَ خَیْرًا۔ اب التماس یہ ہے کہ حضرات شیعہ اگر دو چار گھڑی کے لئے کسی سے عقل مستعار لے کر اس فرق میں غور فرمائیں، تو اس فرق کے مان جانے میں کچھ کلام نہیں، ورنہ ایسے ہی عقل کے دشمنوں کے لئے کلام اللہ میں اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ آیا ہے۔ اگر بوجہ یاد نہ ہونے کلام اللہ کے یہ خطاب کان تک نہیں پہنچا۔ تو یہ سفارت ہمیں کرتے ہیں۔

جب نوبت یہاں تک پہنچی، تو اب یہ اور التماس ہے، کہ دقیقہ سنجان معانی اس پر تقریر سے واضح ہو گیا ہوگا، کہ حضرت جابر سے گواہوں کا طلب نہ کرنا، چنانچہ روایات صحاح میں موجود ہے۔ اور نیز حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے گواہوں کا طلب کرنا، اگر بالفرض والتقدیر بفرض محال جیسے حضرات شیعہ فرماتے ہیں، واقع میں وقوع میں آیا ہو؟ تو

حضرت ابوبکر صدیق کی کمالِ ہمم، اور نہایت اطاعت واتباع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر دلالت کرتا ہے، اگرچہ یہ دونوں باتیں معیوب ہیں، تو مولوی صاحب ابوبکر صدیق پر بایں وجہ طعن کرنے میں معذور رہیں، اور لاجرم طاعنانِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مصیب بصواب اور ماجور رہیں لیکن اس صورت میں بڑی تعریف کی بات یہ ہوگی، کہ فلانا بڑا گدھا ہے اور سرتاپا بیوقوف ہی فسق وفجور میں یکتائے روزگار، دروغ وبد دماغی میں مشہور ہر کوچۂ بازار۔

سو اس صورت میں ہم کو مولوی صاحب کی تعریف کرنی لازم ہے مگر نظم تو سر دست بن نہیں پڑتی، ملازمان مولوی صاحب کی خدمت میں یہ عرض ہے، کہ آپ عنایت فرماکے یہ قدر قلیل نثر ہی قبول فرمائیں۔ سبحان اللہ اس فہم وفراست پر اصحاب کبار پر یہ زبان درازیاں؟ پھر اس پہ یہ دھوکے بازیاں؟ کہ عوام کو ایک بار تو یہی یقین ہوجائے کہ مولوی صاحب کی بات سراسر بجا ودرست۔ اعنی آپ میرناد رعلی صاحب کو رقم فرماتے ہیں "اب فرمائیے یہ غصب نہیں تو کیا ہے۔ سوا اس کے اور غصب کس کو کہتے ہیں۔ اور یہ عداوت ہے یا دوستی؟ اور مروّت اور رعایت حق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم؟ اور حق اور سچ تو یہ ہے کہ اہل بیت کی دشمنی میں حق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بھی رعایت نہ کی، آپ نے لکھا تھا۔ مجھے غصب فدک کی کسی سے صحت نہیں ہوتی۔ اب آپ کو چاہیئے کہ میری صحت علمأ اہلسنت سے کرائیے، اور میری باتوں کا جواب لکھوا کر بھجوائیے، کہ کیا سبب ہے کہ جابر کو سچا جانا اور فاطمہ کو جھوٹا سمجھا؟ اور اس مظلومہ کے گواہوں کو بھی رد کیا انتہی بلفظہ،، سو منصفان فہمیدہ اور فہیمان سنجیدہ کی خدمت میں یہ عرض ہے، کہ مولوی صاحب کو میرے لکھے ہوئے جواب سمجھا کر یہ سمجھا دیں کہ دیکھو یوں جواب لکھا کرتے ہیں۔ لیکن اس کا کچھ علاج نہیں، کہ مولوی صاحب کی یہ درخواست ہے کہ میری صحت علماء سنت سے کرائیے۔ مولوی صاحب تو سراپا غلط ہیں۔ غلط کا صحیح کرنا اور صحیح کہنا سنیوں کو نہیں آتا، ہاں غلط کی جگہ صحیح بنا سکتے ہیں۔ اس لئے اتنا ہوسکتا ہے، کہ ملازمان مولوی صاحب سے یہ کہا جاوے،

کہ مولوی صاحب غلط ہیں، جب ہی تو اپنی صحت کراتے ہیں: ظاہر وباطن سے صحیح علماء اہل سنت ہیں۔ اگر ہدایت منظور ہے تو غنیمت سمجھو

خیر یہ قصہ تو بہت دور دراز ہے۔ مولوی صاحب کی ہذیانات بے معنے کا جواب چاہیئے۔ اور ان کی حقیقت الامر کھول کر دکھلایئے، تاکہ معلوم ہوجائے کہ مولوی صاحب اپنے ہوش میں نہیں۔ اس بیداری میں جو اوروں کے خواب سے بدتر ہے۔ مولوی صاحب بڑے برّاتے ہیں، ورنہ عقل کا کام نہیں، کہ باوجود ایسے ایسے دلائل واضحہ کے جن کا مذکور ہوچکا۔ پھر بھی غصب فدک کا ان کے دل میں خیال آئے، اور ابوبکر صدیق جیسے عادل متقی اور مطیع خدا ورسول صلّی اللہ علیہ وسلم کو ظالم ٹھیرائے، ابوبکر صدیق کے پاس اگر اور فضائل گوناگوں نہ ہوتے تو یہی حکایت ان کی فضیلت کے لئے بہت تھی، کیونکہ عاقل سمجھتے ہیں۔ کہ ملامت دنیا خاص کر اہل عزت سے بے سبب نہیں اٹھائی جاتی۔ دیندار دین کی عزت اور دنیادار دنیا کی عزت کو جان ومال سے عزیز سمجھتے ہیں، اور عزت بھی عزیز نہ ہو تو پھر کونسی چیز عزیز ہوگی، اسی کا عزیز ہونا ہے، کہ عورتیں باوجودیکہ مرد نہیں نامرد ہیں۔ غیرت کے پتے جان کو تلف کردیتی ہیں، اور ڈوب مرتی ہیں، یا زہر کھالیتی ہیں، مردوں کا تو کیا ذکر؟

ابوبکر صدیق کا جان بوجھ کر ہدف تیر ہائے ملامت ناکسان ہونا کیونکہ ایسے مواقع میں ہر کوئی جانتا ہے کہ یہی انجام ہوتا ہے۔ بجز اس کے نہیں ہوسکتا ہے، کہ پابندی خداوند علیم اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے مجبور تھے، ورنہ جو شخص نہ خود کھائے۔ نہ اپنوں کو کھلائے۔ کاہے کے لئے کسی کی چیز دبائے؟ ایسا شخص اگر ایسے موقع میں ایسے شخصوں سے تو گواہ طلب کرے۔ اور حضرت جابرؓ سے طلب نہ کرے، رقطع نظر وجوہ مذکورہ بالا کے) بجز اس کے اور کوئی احتمال نہیں ہوسکتا۔ کہ انصاف اور اہل انصاف کو لازم ہی ہے۔ کہ رد ورعایت کے موقع میں زیادہ تشدد اور سخت گیری سے پیش آیا کریں۔ اور غیروں سے بہ نسبت اپنوں کے نرم رہا کریں۔ اور ظاہر ہے کہ اپنے اقربا کی رد ورعایت نہ کرنے میں بوجہ محبت فقط اپناد ل

ہی دکھا کرتا ہے۔ کچھ اندیشہ ملامت نہیں ہوتا۔ بلکہ امید کلمۃ الخیر ہوتی ہے
اور اپنے پیرزادوں اور بزرگ زادوں کی رو رعایت نہ کرنے میں مریدان
جان نثار کا بوجہ محبت دل جدا دکھا کرتا ہے۔ اور بوجہ اندیشہ ملامت
جان پر جدا ہی بنا کرتی ہے۔

سو جب اپنے قرابتیوں کی رو رعایت نہ کرنی اور غیروں سے نرمی برتنی محمود خلائق ہوئی، تو پیرزادوں کی رو رعایت نہ کرنی اور بھی زیادہ سمجھنی چاہیئے۔ اور جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جیسی پیرزادی ہو، کہ نہ اس رتبہ کا کوئی پیرزادہ ہوا ہے، نہ ہو، اور ابوبکر صدیق جیسا مرید ہو۔ جس کی صدق و وفا اور جاں نثاری اور الفت اور محبت اور خدمت گذاری کے کلام اللہ اور اقوال عترت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم چنانچہ گذرا، دو گواہ عادل کیا۔ بلکہ اس بات کے گواہ ہوں کہ ایسا یار وفادار نہ کوئی ہوا ہے۔ نہ ہو۔ کیونکہ ایسے رتبہ والے ایسے ویسے کی ایسی تعریف نہیں کیا کرتے۔ تو اس صورت میں حکم خداوندی پر قائم رہنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے مرد کا کام ہے، نہ وہ ہوں نہ اتنی دشواری۔ اور اس قدر ملامت عوام کالانعام اور دشنام ہائے خبیثان نافرجام اپنے سر پر اٹھا ئیں، پر زور ہے شیعوں کی عقل پر کہ ان کو خوبیاں بھی برائی ہی نظر آتی ہیں۔ ؎

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد ٭ عیب نماید ہنرش در نظر
مطیعان خدا پر طعن اور تشنیع کرتے ہیں ٭ سمجھتے ہی نہیں یہ رافضی انکو خدا سمجھے

شیعوں کی اہلبیت سے اور نصاریٰ کی حضرت عیسےٰ سے ایک جیسی محبت ہے

طرفہ تماشا ہے کہ بیدین دینداروں پر بے دینی کی تہمت لگائیں، اور مخلصانِ قدرشناس کو مقتدیانِ عبداللہ بن سبا یہودی دشمن اہل بیت بتائیں۔ اگر قدرشناسوں سے حد سے گذر جانے والے ... بڑھ جایا کریں، اور قدرشناس دشمن سمجھے جایا کریں؟ تو نصاریٰ حضرت عیسےٰ کے محب اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت حضرت عیسےٰ کی دشمن ہونے چاہئیں۔ غور کر کے اگر دیکھیں مفرطفی المحبت اس کا محب نہیں جس

کی محبت کا مدعی ہوتا ہے۔ بلکہ اپنی خیالی تصویر کا محب ہوتا ہے، نصاریٰ جو دعوےٰ محبت حضرت عیسےٰ علیہ السلام کرتے ہیں، تو حقیقت میں ان سے محبت نہیں کرتے۔ کیونکہ دار و مدار ان کی محبت کا خدا کے بیٹا ہونے پر ہے۔ سو یہ بات حضرت عیسےٰ میں تو معلوم؟ البتہ انکے خیال میں تھی۔ اپنی تصویر خیالی کو پوجتے ہیں۔ اور اسی سے محبت رکھتے ہیں حضرت عیسےٰ کو خداوند کریم نے ان کی واسطہ داری سے برطرف رکھا ہے۔

ایسے ہی شیعہ بھی اپنی خیالی تصویر سے محبت کرتے ہیں، ائمہ اہلبیت سے محبت نہیں کرتے، اس محبت پر محبان قدرشناس کو دشمن اہلبیت سمجھنا ایسا ہی ہے، جیسا نصاریٰ بزعم خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کو دشمن عیسےٰ سمجھتے ہیں، دشمنی اہل بیت تو اسے کہتے ہیں کہ حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم دختران مطہرہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تو آپ کی بیٹیاں ہی نہیں سمجھتے۔ حالانکہ کلام اللہ اور احادیث کلینی وغیرہ اور اقوال حضرت امیرؓ اس بات پر شاہد ہیں۔ اور حضرت عائشہ محبوبۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ ممدوحہ جناب کبریا کو جن کی طہارت اور بزرگی میں سورہ نور میں آیات متعددہ موجود ہیں، اور سوا ان کے اور بیبیوں کو جو بشہادت آیہ کریمہ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ تمام مومنین کی مائیں ہیں اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ عم بزرگوار سید الابرار صلی اللہ علیہ وعلی آلہ الجبار القہار کو اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پھوپی کے بیٹے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو جو سوا اس کے اور بھی ناتے رکھتے ہیں، اور حضرت سید الشہدا شہید کربلا رضی اللہ عنہ کے داماد مصعب بن زبیر اور حضرت عمر فاروق داماد حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت زید شہید فرزند سعید حضرت امام ہمام زین العابدین رضی اللہ عنہ اور سوا ان کے اور اقربا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اولاد امجاد ائمہ اطہار کو جو بشہادت لفظ عترت اور اہل بیت میں داخل ہیں۔ شیعہ کافر اور مرتد سمجھتے ہیں اور دشنام ہائے نافرجام دیتے ہیں۔

چنانچہ کچھ کچھ اوپر گذرا، پھر ان بے حیاؤں کو غیرت نہیں آتی کہ صحابہ کو دشمن اہلبیت بتاتے ہیں، اگر ابوبکر صدیق کو حضرت فاطمہ سے عداوت ہوتی تو اہل سنت میں سے ابوبکر

صدیق کا کوئی نام بھی نہ لیتا یا مثل خوارج کوئی حضرت فاطمہ کو تنظیم یاد بھی نہ کرتا بلکہ ائمہ
نعوذ باللہ جیسے شیعہ اصحاب کبار پر تبرا کرتے ہیں، تبرا کیا کرتے، اب مولوی صاحب کی خدمت
میں یہ عرض ہے کہ آپ کا یہ کہنا کہ وائے بر دینداری اہلسنت الخ انصاف فرمائیے کہ صحیح ہے یا ہمارا یہ کہنا کہ وائے بر دینداری
و عقل و ہوشیاری شیعہ خصوصاً مولوی عمار علی صاحب کہ صحابہ کی دشمنی میں حق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
کی بھی رعائت نہ کی، بلکہ خدا کی شہادت اور ائمہ اطہار کی گواہی کو رد کیا۔ اہل بیت رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم میں جس کو یوں سمجھا کہ اس کا گوشہ عاطفت صحابہ کی طرف مائل ہے
اسی کو کافر اور مرتد جو جایا سو کہا۔

اگر عذر نامعقول تقیہ نہ ہوتا تو حضرت علی اور حسنین اور امام زین العابدین
اور امام محمد باقر اور امام جعفر صادق رضوان اللہ علیہم وعلی آلہم و متبعیہم اجمعین کی بھی
خیر نہ تھی۔ کیونکہ ان بزرگواروں نے اصحاب کبار کی تعریف میں کیا کمی کی ہے۔؟
خصوصاً حضرت علی اور حضرت حسنین رضی اللہ عنہم کہ ہمیشہ ممد اور معاون اور ہم نوالہ و ہم
پیالہ اصحاب کبار خصوصاً اصحاب ثلثہ رہے۔ پھر ہم سے تو اس بات کا فرق پوچھتے ہیں کہ
فاطمہ سے تو گواہ طلب کئے اور جابرؓ سے کیوں نہ طلب کئے۔ اب ان سے کوئی پوچھے۔ کیا
سبب ہے کہ حضرت علیؓ و دیگر بعض ائمہ کی تعریفوں اور معاونتوں اور موافقتوں کو تو
تقیہ پر محمول کرتے ہیں حضرت عمر اور حضرت عباس وغیرہم کی ابوبکر صدیق کے ساتھ
موافقتوں اور ان کے حق میں ان کی تعریفوں کو تقیہ پر کیوں نہیں محمول کرتے؟ یا مثل
حضرت عباس اور حضرت عمر اور حضرت زید شہید حضرت علی اور دیگر ائمہ اطہار کے
اقوال اور احوال کو نفاق اور ریا سے خالی کیوں نہیں سمجھتے؟

اور نیز کوئی ان سے یہ سوال کرے کہ
ہم نے مانا حضرت ابوبکر نے حضرت
علی اور حضرت ام ایمن وغیرہما کی گواہی کے موافق عمل نہ کیا۔ لیکن وہ حکم خداوندی
سے مجبور تھے، خداوند کریم کا حکم یہی ہے کہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہونی
چاہئیں۔ حضرات شیعہ جو خدا کی اس شہادت کو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ایک

اگر ام ایمن اور حضرت علی کی گواہی اتنی اہم ہے تو خدا اور
رسول، قرآن و ائمہ اہبیت کی گواہی صحابہ کے بارے میں کیونکر اہم نہ ہوگی

حضرت فاطمہ رض ہی نہ تھی بلکہ آپ کی کئی بیٹیاں تھیں تسلیم نہیں کرتے اور علی
حضرت علی کا اسی تعدد بنات میں ہمصفیر خداوندی ہونا جو شیعوں کے نزدیک سچا نہ
ان کا کہا مقبول نہ پڑا تو کیا بلا پیش آئی؟ یہاں تو یہ عذر بھی نہ تھا خدا تعالیٰ ا
علی دو اذن لِ کر تو دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں سے زیادہ ہی ہیں۔ پھر کیا
ہے کہ حضرت علی اور ام ایمن کی گواہی تو قابل سند ہو اور حضرت علی اور جناب
پاک کبریائی کی قابل سند نہ ہو؟

اور اگر مولوی صاحب کی خاطر سے اس طوفان ہی کو تسلیم کریں کہ حضرت
اور حضرت ام ایمن اور حسنین رض چاروں نے گواہی دی تھی؟ تب قطع نظر
کہ اب بھی مقدار مقررہ شہادت کو یہ شہادت نہیں پہنچی۔ اور شیعوں کو جا۔
دم زدن نہیں شیعہ اس کا کیا جواب دیں گے کہ مدائح صحابہ سے کلام اللہ
مشحون تھا ہی۔ اقوال عترت طاہرہ اور ملفوظات ائمہ اطہار بھی ان کی صف
و ثنا سے مملو ہیں۔ اور اماموں میں سے بھی ایک آدھا نہیں بلکہ تین چار کے تو
تو اس احقر نے بھی اس رسالہ میں نقل کئے ہیں۔ پھر باوجودیکہ اس گواہی میں
عدد ائمہ اطہار ہی دو سے بڑھ گیا خدا تو درکنار؟ پھر کیوں اعتبار نہیں کے
اب رد شہادت اسے نہیں کہتے تو اور کسے کہتے ہیں؟ وائے بر دینداری
شیعہ کہ صحابہ کی عداوت میں نہ خدا کا اعتبار کیا نہ ائمہ اطہار کا نہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کا خیال کیا نہ بزرگواران مذکور کے افعال حمید
اور احوال پسندیدہ پر دھیان دیا۔ پھر اُلٹے چور کوتوال کو پکڑیں اور اُلٹے
نکٹے ناک والوں کو ہنسیں؟ مولوی عمار علی اور ان کے ہم مذہب ابوبکر صدیق
پر طعن کریں جن کی بزرگی کا خدا بھی گواہ ہو۔ اور ائمہ اطہار بھی اقرار کریں۔ کفر اسے
نہیں کہتے تو اور کسے کہتے ہیں؟ اور دشمنیٔ اہلبیت یہ نہیں تو اور کیا ہے؟

تفصیل ان امور کی اور سندیں ان روایات کی سب اس رسالہ میں مندرج ہو چکی
ہیں اس لئے ان کی تکرار میں تقصیر کی۔ ناظرین رسالہ ہذا بے دماغی نہ فرمائیں بلکہ پلٹ کر دیکھ

کیا ستم ہے ؟ کہ اگر ایک روایت موضوع بے سند میں جس کا اعتبار کسی طرح نہیں ہوسکتا اور نہ اہل سنت کی کسی معتبر کتاب میں اس کا نشان ہے۔ یہ دیکھ لیا ہے کہ ابوبکر صدیق نے حضرت فاطمہ سے گواہ طلب کئے اور ان کی بات بے گواہوں کے نہ مانی۔ اور پھر گواہوں پر بھی ان کے دعویٰ کو مسترد کیا۔ تو ان سب خوان الشیاطین کا وظیفہ ہی یہ ہوگیا کہ ابوبکر صدیق نے حضرت فاطمہ اور حضرت علی اور حضرت ام ایمن کو جھوٹا جانا۔ حالانکہ اس روایت میں تکذیب اور سوء ظن کی بو تک نہیں آتی۔ بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ بسبب پابندی قانونِ خداوندی حکم موافق مرضی حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نہ دے سکے۔ اور اپنے آپ آیات قرآنی اور شہادت ائمہ ربانی کو جو بطرق متواترہ یا اسانید معتبرہ ثابت ہوتی ہیں۔ اور کسی طرح لائق اعراض و انکار نہیں بہر طور قابل اعتبار ہیں ہضم کئے بیٹھے ہیں۔ اور زبان تک نہیں لاتے حالانکہ اعتبار احادیث و آثار کے لئے باتفاق ایک راوی معتبر بھی کفایت کرتی ہے نصاب شہادت کی حاجت نہیں چہ جائیکہ تواتر اور تکاثر۔

چونکہ یہ قضیہ بہت دور جا پڑا اور جس قدر لکھا گیا گو قلیل ہے لیکن اہل فہم کیلئے کثیر ہے۔ اس لئے عرض رسا ہوں کہ اگر بالفرض بفرض محال روایت ہبہ اور قضیۂ طلب گواہان صحیح بھی ہو تب بھی دامن حال صدیق اکبر لوثِ خطا اور آلودگی جفا سے صاف مصفّٰی ہے۔ معہذا روایت منہج الکرامۃ ابن مطہر حلی سے یہ بات تو صاف ہی معلوم ہوگئی کہ گناہ حق تلفی فدک تو حضرت ابوبکر صدیق اپنے سر نہیں لے گئے۔ باقی رہا ان سے گواہوں کا مانگنا اور حضرت جابرؓ سے گواہوں کا نہ مانگنا۔ تو اول تو وجوہ متعددہ اس کے مرقوم ہوچکیں۔ اہل فہم سمجھتے ہیں کہ وہ وجوہ کیسی برجستہ اور ایک سے ایک چڑھتی ہوئی ہیں۔

سیدہ سے گواہی طلب کرنا خطاء اجتہادی بھی جو باعث قدح نہیں

علاوہ بریں ابوبکر صدیق کچھ معصوم نہ تھے ایک امام مجتہد تھے۔ اور مجتہد سے اہل سنت کے نزدیک خطا بھی ہوجاتی ہے۔ بلکہ مجتہد تو مجتہد انبیاء سے اجتہاد میں خطا ہوجاتی ہے۔ اور یہ بات شیعوں کو بھی چار ناچار ماننی پڑے گی کیونکہ سورۂ انبیاء میں رکوع وَنُوحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ کے شروع

ہی میں ایک کھیتی کے تنازع میں جو مقدمہ حضرت داؤد کے دربار میں پیش ہوا تھا مذکور ہے سو اس قصہ میں جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی رائے مختلف ہوئی اور خدا نے حضرت سلیمان کی رائے کو پسند کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمٰنَ (یعنی ہم نے سمجھا دیا وہ فیصلہ سلیمان کو) تو اس سے معلوم ہوا کہ حضرت داؤد سے جو بالاتفاق نبی ہیں اور معصوم ہیں اجتہاد میں غلطی ہوئی۔ سو اسی طرح حضرات شیعہ اگر ابوبکر صدیق کو بعذر غلطی اجتہاد معذور رکھیں۔ اور یوں سمجھیں کہ ابوبکر صدیق نے یا حضرت جابر سے گواہوں کے نہ طلب کرنے میں غلطی کی۔ یا حضرت فاطمہ سے گواہوں کے طلب کرنے میں غلطی کھائی تو کیا نقصان ہے ؟ بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ جس کی خدا اور ائمہ تعریف کریں اس کے برا کہنے سے بچ گئے۔

اور اگر یوں بھی ناک سیدھی نہیں ہوتی تو نہ سہی۔ حضرت ابوبکر صدیق کی نعوذ باللہ اول مرتبہ میں نیت بد ہی تھی ؟ اور اس سبب سے ٹالتے تھے کہیں گواہ طلب کئے کہیں جھوٹے خدا کہنے والوں کو پکڑے بنالے تھے۔ لیکن روایت منہج الکرامت ابن مطہر حلی اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے وعظ و پند سے انھوں نے فدک حضرت فاطمہ کے حوالہ کردیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اس گناہ سے توبہ کی کیونکہ وعظ کے سبب جو کوئی کسی گناہ سے باز آئے تو وہ توبہ ہی ہوتی ہے۔ توبہ کے اور کچھ سر سینگ نہیں۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ یعنی توبہ کرلے والا ایسا ہی ہے جیسے گناہ کا نہ کرنے والا یعنی جیسے وہ عذاب خداوندی سے ناجی ہے ایسے ہی یہ بھی ناجی ہے۔

حضرت سجاد اگر باوجود ابلیس کے کلی تصرف کے مومن ہیں۔ تو ابوبکر بطریق اولیٰ ہیں

معہذا اگر توبہ نہ کرتے جب کچھ اندیشہ نہ تھا کیونکہ بشہادت آیات مذکورۃ الصدر ان کے ساتھ خداوند صادق القول نے وعدہ مغفرت گناہان کرلیا ہے۔ سو سنیوں کو یہاں تک کچھ نہیں کیونکہ ان کی اصطلاح کے موافق ابوبکر صدیق ولی ہیں نبی نہیں۔ جو معصوم ہونا ضروری ہو۔ پر مشکل تو شیعوں کو ہے۔ شیعی اور اذ خوان جس نے صحیفہ کاملہ حضرت سجاد زین العباد دیکھا ہے یا سنا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حضرت سجاد جو موافق عقیدۂ شیعہ معصوم ہیں۔ اور دست برد شیطان سے مطمئن۔ اپنے حق میں

کیا فرماتے ہیں کہ قَدْ مَلَکَ الشَّیْطَانُ عِنَانِیْ فِیْ سُوْءِ الظَّنِّ وَ ضُعْفِ الْیَقِیْنِ وَ اِنِّیْ اَشْکُوْ سُوْءَ مُجَاوَرَتِہٖ لِیْ وَ طَاعَۃِ نَفْسِیْ لَہٗ یعنی شیطان نے میری باگ پکڑلی ہے بدگمانی اور ضعف یقین میں اور مجھے شکایت ہے اُس کے بُرے پڑوس اور اپنے نفس کے مطیع شیطان ہو جانے کی فقط)

اب التماس یہ ہے کہ امام کی بات جھوٹی تو ہو ہی نہیں سکتی۔ خاصکر شیعوں کے نزدیک نہیں تو کافر ہو جائیں۔ پھر جو شیطان کی حضرت زین العابدین پر یہ چیرہ دستی ہے تو اس کا کیا جواب ان کے لئے تو کلام اللہ میں کوئی ایسا وعدہ بھی نہیں جس کو سنکر اُن کے جنتی ہونے کا قطعی یقین ہو جائے۔ اور کسی طرح کا احتمال باقی نہ رہے۔ گو شیعہ ان کو بجائے خود معصوم و مغفور اور ہم محفوظ و مغفور سمجھتے ہیں۔

معہذا لفظ سوء ظن اور ضعف یقین اور طاعت نفس ایسے الفاظ ہیں کہ خطائی لااجتہادی پر بھی منطبق نہیں سکتے علیٰ ہٰذا القیاس نہج البلاغت میں جو مجموعۂ خطب حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ ہے اس میں بھی ایسے ایسے مضامین مندرج ہیں۔ اور ان سے بڑھ کر یہ ہے کہ کلام اللہ میں بہت سے انبیار کی نسبت تذکرۂ خطا ہے۔ حضرت آدم اور حضرت یونس کا قصہ مشہور و معروف ہے۔ سو ان سب کے مقابلہ میں حضرت ابو بکر صدیق سے فقط ارادۂ غصب بہت ہی تھوڑا ہے کیونکہ وہ معصوم نہ تھے۔ اے پروردگار بے نیاز اس سراپا نیاز و اخلاص کی جان لے تو آگاہ ہے کہ کس قدر میرے دل میں بہ نسبت حضرت زین العابدین و دیگر ائمہ اطہار و انبیار کبار اخلاص اور اعتقاد اور محبت اور نیاز ہے۔ یہ جو کچھ لکھا جاتا ہے بایں نظر نقل کفر کفر نباشد حضرات شیعہ کی کفریات کے مقابلہ میں لکھا جاتا ہے

فصل

حدیث ما ترکناہ صدقۃ کی تحقیق انیق | اب آگے سنئے مولوی صاحب کیا فرماتے ہیں۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں

اب اور سننا چاہیے کہ جب فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جانا کہ ابو بکر نے مجھے ہبہ فدک میں جھوٹا سمجھا تو اس معصومہ نے دعوے وراثت کا کیا۔ اور ابو بکر سے کہا کہ میں پیغمبر خدا

صلے اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہوں مجھے اُن حضرات کا مال ارث میں پہنچتا ہے۔ اور فدک میرے باپ کا مال ہے مجھے دیدے اس وقت ابو بکر نے ایک جھوٹی روایت قرآن کے خلاف بنا کر کہا کہ میں نے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ وہ حضرت فرماتے تھے کہ انبیار کا مال سب صدقہ ہے کسی کو ان کے وارثوں میں سے نہیں پہنچتا۔

اول تو یہ روایت خلاف قرآن ہے۔ دوسرے یہ کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے وارثوں میں نہ بیٹی سے نہ اپنی بیبیوں سے کسی سے نہ کہا کہ میرا مال صدقہ ہے ان کو نہیں پہنچتا تم دعویٰ نہ کرنا۔ اور حکم خدا کا جو ان کے واسطے تھا اس کو ان سے چھپا رکھا۔ اور ایک اجنبی شخص سے کہ اس کو کسی طرح کا دخل پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی وراثت میں نہ تھا اس کے کان میں کہدیا اور کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ کہا۔ انتہی بلفظہ

مولوی صاحب تو فرما چکے۔ اب ہماری بھی سنئے قدمار فریب بازان شیعہ بوجہ وراثت فدک کے نہ دینے میں ابو بکر صدیق پر طعن کیا کرتے تھے۔ جب اہل سنت سے جوابات معقول اس اعتراض کے ان نامعقولوں نے سنے۔ اور مجال دم زدن باقی نہ رہی۔ تو ان کے لواحق نے روایات ہبہ تراش کر برنگ دیگر طعن شروع کیا۔ اور اس دعوے کے ثبوت تک پہنچانے کے بہت سے حیلے کئے۔ یہاں تک کہ بعض کتب غیر مشہورہ اہل سنت میں بھی الحاق کیا۔ اور سنی بن کر طالب علمان اہل سنت کو دھوکا دیا اور اس روایت کو روایت کیا۔ لیکن یہ فریب بھی نہ چلا اور بسبب وضوح امارات کذب روایات مذکورہ۔ اور کھل جانے جعل راویان روایت۔ اور غیر معتبرہ اور غیر مشہور ہونے ان کتب کے۔ جن میں یہ روایت پائی جاتی ہے۔ اول تو یہ روایت پایۂ اعتبار سے ساقط ہو گئی۔ دوم خدا ساز دروغ و اصفان روایت کام آیا۔ اور بمقتضائے مثل مشہور "دروغگو را حافظہ نباشد" روایت تو بنائی پر بنائی نہ آئی۔ یہ بھول گئے کہ ہبہ بے قبض موہوب لہ مفید ملک نہیں۔ اور نیز ایک مرد اور ایک عورت یا دو لڑکوں سے مدعا ثابت نہیں ہو سکتا۔

گواہوں کی شرعی تعداد اور تھنگر کا دم آخر قبضۂ فدک۔ صدیق کی صفائی کا مضبوط سامان | بہر حال انھوں نے اپنی

طرف سے کمی نہیں کی لیکن قربان جایئے خداوند عظیم اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قدرشناسی اور طرفداری کے کہ ابوبکر صدیق کے طعن سے بری کرنے کی پہلے ہی وہ تدبیریں کر گئے جس کے سبب شیعوں کو طعن کرکے بجز غوغاء سگانہ اور شور غرابانہ اور کچھ حاصل نہ ہو۔ خداوند کریم نے تو گواہی کے اعتبار کے لئے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی قید لگا دی۔ اور جناب سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوات واکمل التحیات والتسلیمات نے تا دم آخر اپنا تصرف رکھا اس لئے ناچار ہو کر شیعیان خراب طینت کو مکرر اپنی عاقبت کے خراب کرنے کا فکر ہوا۔ وصیت کی روایت تراشی مگر پھر وہی بات ہے کہ جھوٹی بات کے پانوں نہیں چلتے یہ نہ سمجھے کہ وصیت تو اسی مال میں جاری ہوسکتی ہے جس میں میراث جاری ہو۔ جب میراث جاری ہی نہیں تو وصیت کے کیا معنے۔

القصہ جب اس طرف سے بھی قافیہ تنگ ہوا تو علماء شیعہ کو سخت دشواری پیش آئی کہ نہ طعن کئے بن پڑے اور نہ چپ رہے سے کام چلے ہے۔ اگر طعن کریں تو کس منہ سے کریں؟ اور خاموش بیٹھیں اور مذہب سے دست بردار ہوں تو عوام شیعہ کو کیا منہ دکھلائیں؟ اور نذر و نیاز کس سے لیں؟ اور اموال اموات کو کیونکر ہضم کریں؟ تو باقیماندگان شیعہ نے اپنے متقدمین کے انھیں گوز ہائے شتر مذکورۃ الصدر کو کمی بیشی کرکے زبان پر رکھا اور پھر زبان درازیاں شروع کیں سو مولوی عمار علی صاحب نے بھی اپنے رقیمہ کریمہ اسمی میرزا در علی صاحب میں ایسا ہی کیا۔ لیکن بحکم مثل مشہور "عیب کرنے کو ہنر چاہیے" ان کا یہ حوصلہ نظر نہیں آتا کہ مضامین مندرجہ رقیمہ کو جو فی الجملہ بطرز جدید ہیں۔ اپنے آپ تراشے ہوں۔ یہ بات کہیں حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے قبضہ کی پخ لگائی کہیں حضرت علی اور حضرت ام ایمن کی گواہی کے ساتھ حسنین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی گواہی بڑھائی، کہیں ہبہ اور میراث دونوں کی نسبت بہ ترتیب مذکور دعویٰ کرنے کا دعویٰ کیا کہیں حضرت عمر کے کاغذ پھاڑ ڈالنے کا بزعم خود الزام دیا

کسی بڑے مکار یکتائے روزگار کی چالاکی نظر آتی ہے۔ پر مولوی صاحب بحکم میلان طبیعت حیلہ دوست اور نیز بغرض فروغ مذہب سراسر دروغ ان بہتانوں کو نقل کرکے تنہائی میں جامہ سے باہر نکلے پڑتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے آجتک کسی سنی واقف کار کی کوئی بات نہیں سنی۔ نہیں تو یہ سب بوچھک بھول جاتے انھوں نے شاید یہ سمجھا ہو کہ بہت سی چھینا جھپٹی میں فدک میں سے کچھ تو ہاتھ آئے گا اور بہت سے جھوٹ ملکر ایک سچ کے برابر تو ہو جائیں گے۔

لیکن بفضلہ تعالیٰ مذہب اہل سنت میں یہ قوت ہے اور کیوں نہ ہو۔ سچی بات پکی ہی ہوتی ہے۔ کہ علماء تو ایک طرف امثال احقر ہیچمدان بھی جوابات دندان شکن سے شیعوں کے دانت توڑنے کو بہت ہیں۔ چنانچہ اعتراض سابق کا جو کچھ خاکہ اڑا ہے وہ تو ناظرین کو معلوم ہی ہوچکا۔ اسی پر اس اعتراض کو بھی قیاس کر لیجئے۔ ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا ÷ اور اگر بے جواب کے اس اعتراض کا دل سے کھٹکا نہیں جاتا تو لیجئے مولوی صاحب یوں رقم فرماتے ہیں۔

"کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے دعویٰ میراث کیا، اور حضرت ابوبکر صدیق نے ایک جھوٹی حدیث خلاف کلام اللہ کے بنا کر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی بات کو رلادیا۔

مخدوم من سچا آدمی سچی بات کو مان لیا کرتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے دعوئے میراث کیا۔ اگر ہم کو ہٹ دھرمی مدنظر ہوتی تو اس روایت کو کتابوں میں سے بھی حذف کر دیتے۔ فقط انکار تو درکنار کوئی موضوع روایت تو تھی ہی نہیں جو بعذر عدم اعتبار پیچھا چھڑا لیتے۔ اور اتنی ہی بات منصفوں کے نزدیک ہمارے اس دعوے کے معتبر ہونے کو کہ روایت ہبہ غیر معتبر ہی کفایت کرتی ہے۔ پر خداوند کریم ہم کو مولوی عمار علی صاحب کے ہمرنگ نہ کرے کہ نہج البلاغت اور کافی کلینی جیسی معتبر کتابوں میں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں ہونا ثابت اور متحقق ہو۔ اور پھر ان کی بیٹیاں

ہونے سے انکار کر جائیں اور الٹی الٹی حجتیں لائیں چنانچہ مذکور ہوا۔

حدیث مذکور کلام اللہ کے عین مطابق ہے

مگر مولوی صاحب کا یہ فرمانا کہ "حدیث خلاف کلام اللہ کے بنائی" خلاف واقع ہے۔ واقف کار تو اتنی بات سے سمجھ گئے ہوں گے کہ شیعوں کو کلام اللہ سے کیا سروکار؟ جس قوم میں کلام اللہ کا چرچا ہی نہ ہو وہ کلام اللہ کو کیا سمجھیں جو یہ سمجھیں کہ فلانی بات کلام اللہ کے موافق ہے فلانی مخالف۔ مگر علم الیقین عین الیقین کے برابر نہیں ہوتا اس لئے اتنی گذارش کرنی پڑی کہ علماء شیعہ خصوصاً مولوی صاحب اپنے قصور فہم سے ناچار ہیں۔ ورنہ کلام اللہ اور حدیث معلوم جس کی تحقیق کا ہم نے اوپر بھی وعدہ کیا ہے باہم مخالف نہیں بلکہ موافق کیا متعانق ہیں۔ مزید توضیح کے لئے اول سے تقریر مخالفت ایسی طرح بیان کیجئے جس سے شیعہ اور علماء شیعہ بھی ممنون احسان ہوں۔ بعد ازاں اثبات موافقت سے ان کو یہ شرمایئے کہ سر گریباں ہوں۔ مخدوم من ظاہراً مولوی صاحب دوسروں کے تیروں کے بھروسے لڑتے پھرتے ہیں۔ جس قدر کہیں سے سن لی وہی کہدی۔ ورنہ خیر و عافیت ہے جو یہ طرز نامعقول اختیار کیا کہ جو باتیں ان کے مفید مطلب تھیں وہی منہ پر مہر لگا کر بیٹھ رہے۔ ان کو لازم تھا کہ اول اثبات مخالفت کرتے جب کہیں کسی سے خواستگار جواب ہوتے۔ یہ کس نامعقول نے ان کو طرز مناظرہ سکھایا کہ دعوے بے دلیل پیش کرتے ہیں۔

انصاف کی رو سے تو اس کے جواب میں ہم کو فقط لانسلم کفایت کرتا ہے۔ یعنی اتنا بہت ہے کہ ہم یوں کہدیں کہ ہم نہیں مانتے اور اگر ہم بھی بے دلیل ایسے ہی دعوے کرنے لگیں۔ بلکہ تمام عقائد اہل سنت کو یوں ہی بے دلیل پیش کرنے لگیں تو کوئی پوچھے مولوی صاحب کے پاس کیا جواب ہے۔ معہذا ہم تو نہیں کہہ سکتے پر اگر کوئی ناصبی یا خارجی بہ نسبت ان روایات کے۔ جو فضائل ائمہ اور استحقاق امامت وغیرہ خصوصیات مذہب شیعہ حضرات شیعہ اماموں سے نقل کرتے ہیں۔ یوں کہنے لگے کہ اپنے مطلب کے لئے اماموں نے یا شیعوں نے خلاف قرآن یہ روایتیں

گھڑ لیں۔ تو پھر بجز اس کے کہ مولوی صاحب اپنی زبان کو منہ میں سمیٹے رہیں اور کیا کر سکیں گے لیکن ہمارے احسان کو دیکھئے کہ اول بقدر رسا شیعہ ہی بلکہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر تقریر مخالفت تحریر میں لاتے ہیں۔

اہل شیعہ کا حدیث ما ترکنا ہ صدقۃ پر اعتراض

واضح رہے کہ نہایت کوشش کر کے علماء شیعہ نے یہ بات نکالی ہے، کہ حدیث ابوبکر صدیق جس کا یہ مضمون کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا ہے۔ کہ ہماری انبیاء کا کوئی وارث ہی نہیں۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ وقف ہے۔ باوجودیکہ راوی فقط ابوبکر صدیق ہی ہیں کلام اللہ کے مخالف ہے۔ اور جو حدیث اللہ کے مخالف ہو اگر بالفرض اس کے راوی بہت سے بھی ہوں تب بھی چہ جائیکہ ایک راوی۔ بالخصوص اہل سنت و جماعت کے نزدیک کہ ان نزدیک کلام اللہ میزان صحت و ضعف و معیار صدق و کذب اخبار۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول تو حدیث مذکور اس آیت کے مخالف ہے یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ جس سے بالحصر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث کا جاری ہونا نکلتا ہے۔ کیونکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تم کو پہلے سے کہے دیتا ہے کہ تمھاری اولاد میں لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر ملا کرے۔ سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور احکام صوم صلوٰۃ حج زکوٰۃ میں شریک ہیں ایسے ہی اس حکم میں بھی امت کے شریک رہیں گے۔ معہذا اس آیت میں نبی غیر نبی کی کچھ تخصیص نہیں۔ پھر تو کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی وارث نہیں۔ اس آیت کی تکذیب کرنا ہے دوسری اور آیت وَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ کے (جیسے اور انبیاء کے ترکہ میں میراث کا جاری ہونا بھی نکلتا ہے) مخالف اور مناقض ہے۔ کیونکہ دوسری کا ترجمہ تو یہ ہے "کہ وارث ہوئے حضرت سلیمان حضرت داؤد کے۔ اور پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت زکریا

علیہ السلام جناب باری تعالیٰ سے یہ التجا کرتے ہیں کہ الٰہی مجھ کو اپنے پاس سے
ایک ولیعہد عنایت فرما جو میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوب کا بھی وارث
ہو فقط "۔

سو دوسری آیت سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام جو نبی
تھے ان کے ترکہ میں میراث جاری ہوئی۔ اور پہلی آیت سے گو یہ بات بتصریح نہیں
نکلتی لیکن اول تو حضرت زکریا علیہ السلام سے جو مشہور نبی ہیں ایسے قدیمی حکم
کے خلاف طلب کرنا مستبعد ہے۔ تصور میں نہیں آتا کہ جو حکم حضرت آدم علیہ
السلام کے زمانے سے لیکر ان کے زمانہ تک برابر معمول بہ رہا ہو ان کو بڑھاپے
تک معلوم نہ ہوا اور نہ اس باب میں کوئی وحی آئی۔ حالانکہ زمانہ پیری موت کا
مقدمہ ہوتا ہے ایسے وقت میں لازم ہے کہ جو موت نبی کے متعلق مسائل ضروری
ہوں ان کی اطلاع کی جائے تاکہ اس کے موافق وصیت کر جائے۔ ورنہ جو بات
نبی ہی کو معلوم نہ ہو تو پھر امتیوں کے معلوم ہونے کی کیا امید ہے۔

بایں ہمہ جیسے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کی نجات کی دعا کے جواب
میں بطور تنبیہ و عتاب اِنِّیٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ فرمایا اور اس
سے معلوم ہوا کہ یہ دعا خلاف مرضی جناب باری تعالیٰ تھی۔ حضرت زکریا کی
اس التجا کے جواب میں بشارت قبول دعا پہنچائی گئی۔ کچھ تنبیہ و عتاب نہیں
کیا۔ اس بات کا وہم جاتا کہ یہ عتاب اسی سبب سے ہوا کہ حضرت زکریا نے
وراثت کا کیوں نام لیا۔ بہرحال ان آیات سے اتنا ثابت ہوا کہ انبیاء کے مال
میں بھی میراث جاری ہوتی ہے۔

پھر یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی العموم سب انبیاء کو شامل
کر کے فرماتے ہیں کہ ہمارے گروہ کے کوئی وارث نہیں ہوتا کیونکر صحیح
ہو بلکہ ان دونوں آیتوں سے تو یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ جو بعضے روایات حدیث
مذکور میں لفظ لَا نُوْرِثُ بھی آیا ہے یعنی ہم بھی کسی کے وارث نہیں ہوتے یہ بھی

غلط ہے کیونکہ حضرت یحییٰ اور حضرت سلیمان علیہما السلام بھی بالاتفاق نبی ہیں جب وہ دونوں
اپنے اپنے والد کے وارث ہوئے تو یہ بات کہ کوئی نبی کسی کا وارث ہی نہیں ہوتا سراسر غلط نکلی
یہ ہے تقریر مخالفت کلام اللہ و حدیث مذکور۔ اس سے بہتر شاید شیعہ بھی تقریر نہ کر سکیں۔

اعتراض کا جواب

اب ہماری بھی تحقیق صحیح اور تنقیح فصیح کے ترانۂ عقل آشیانہ کی طرف متوجہ
ہو جیئے۔ کہ ماشاء اللہ کیا دلکشا اور راحت افزا ہے جس سے کان میں پڑتے ہی اطمینان
ہو جائے۔ ظاہری مخالفت کا خلجان انشاء اللہ تعالیٰ ایسی طرح دور ہو کہ پھر کبھی بھی دھیان
نہ آئے۔ بہ ترتیب آیات موافقت کی بات تحریر میں آتی ہے۔ لیکن چونکہ باریک مضامین
بے تمہید کے ادا نہیں ہو سکتے اس لئے اول یہ گذارش ہے کہ ہر چند کلام اللہ من اولہ الی
آخرہ حرفاً حرفاً خدا ہی کا تصنیف ہے اور اسی وجہ سے اس کو کلام اللہ کہتے ہیں۔
لیکن مراسلات اور خطوط بنی آدم کلام ربانی بھی دو قسم پر ہے۔ ایک تو جیسے کوئی شخص
اپنی طرف سے کسی کو خط لکھے یا کوئی شخص کسی قاصد کو پیام دے کر بھیجے۔ تو اس صورت
میں وہ عبارت بھی اسی منشی اور اسی شخص کی ہوتی ہے۔ اور وہ خط اور وہ پیام بھی اسی
کی طرف سے ہوتا ہے۔ خط رساں اور پیامبر فقط مثل ہوا ہوتے ہیں۔ کہ ایک کے
منہ کی آواز دوسرے کے کان تک پہنچا دیتے ہیں۔ اسی قسم کا تو اکثر کلام اللہ ہے مثال
کے لکھنے کی کچھ حاجت نہیں یعنی جیسے خدا کا تصنیف ہے ویسے ہی خدا کی طرف سے
امت کو۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا دونوں کو یا کسی خاص قوم کو خطاب ہے
سو اکثر تو عبارات ایسی ہی ہیں نشان دہی اور تحریر مثال کی کچھ ضرورت نہیں۔
پر شاید شیعہ بے لکھے نہ سمجھیں اس لئے یہ ایک دو مثال کافی و وافی مرقوم ہیں۔
یَا عِبَادِ فَاتَّقُوْنِ یَا بَنِیٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْ۔ یَآ اَیُّهَا الرَّسُوْلُ الخ یَآ اَیُّهَا النَّبِیُّ
الخ پہلی آیت میں بے تخصیص کسی نیک و بد کے سب بندوں کو یہ حکم ہے کہ اے میرے بندو مجھے
ڈرو۔ دوسری آیت میں بنی اسرائیل کو سنایا جاتا ہے کہ اے گروہ بنی اسرائیل میری فلانی
نعمت یاد کرو۔ اور دو آیتیں باقی ان میں خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو خطاب
ہے بہرحال جیسے یہ عبارات خدا کی تصنیف کی ہوئی ہیں۔ ایسے ہی ان کے مضامین بھی

خدا ہی کی طرف سے ہیں۔ کسی اور کا پیام سلام نقل نہیں فرماتے۔

دوسری یہ صورت ہے کہ جیسے لکھنا پڑھنا جاننے والے کسی ایسے جاہل کا خط جسے فارسی نہ آتی ہو فارسی میں لکھ دیا کرتے ہیں۔ تو عبارت گو اس منشی ہی کی ہوتی ہے کوئی نادان بھی یوں نہیں کہہ سکتا کہ یہ عبارت اس مرد جاہل کی ہے پر مضمون اس جاہل ہی کا ہوتا ہے۔ اور خط بھی اسی کا گنا جاتا ہے۔ یا جیسے کسی کو کوئی شخص کچھ تلقین کرے کہ تو اپنے فلانے مطلب کے لئے فلانے سے یوں کہیو۔ جیسے مختاروں اور وکیلوں سے لوگ مسودہ کرالیا کرتے ہیں، تو گو عبارت تلقین کرنے والے ہی کی بنائی ہوئی ہوتی ہے پر اس کا مضمون کہنے والے یا عرضی والے ہی کا سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی کلام اللہ میں بعض بعض عبارات ایسی ہیں کہ گو وہ بھی خدا ہی کی بنائی ہوئی ہیں لیکن ان کے مضامین بندوں کی طرف سے سمجھے جاتے ہیں جیسے قُل یاایّھا الکافرون اور قُل ھُو اللہ اور قُل اَعُوذُ بِرَبّ الفَلَق اور قُل اَعُوذُ بِرَبّ النَّاس اور سوا اس کے جہاں لفظ قل یا قولوا اول میں ہے۔ اور پھر بعد میں ایسے الفاظ ہیں کہ جس کے ملاحظہ سے یوں معلوم ہو کہ متکلم مخاطب ہیں۔ مثلاً قل اعوذ کے یہ معنی ہیں کہ کہہ اے محمد میں پناہ مانگتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ متکلم جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو بعد قل کے جتنی عبارت ہے اس سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے سمجھنی چاہئے۔

لیکن جیسے زبانی تلقین میں تو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ تلقین کرنے والا یوں کہے کہ تو یوں کہیو۔ عرض کے مسودہ میں اس کی ضرورت نہیں۔ کہ اس کے اول میں یوں لکھدیں کہ تو یوں کہیو بلکہ مسودہ کر کے یوں ہی حوالہ کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی کلام پاک خداوند کریم میں بھی بعضی عبارتیں ایسی ہیں کہ وہ بندوں کی طرف سے علی العموم فقط۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے ہیں۔ لیکن اس کے اول میں قل یا قولوا نہیں بلکہ بمنزلہ مسودہ وکلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یا سب کی طرف سے تصنیف کر کے ان کے حوالہ کر دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ فاتحہ اسی قسم کی ہے

خاص کر ایاک نعبد سے لیکر آخر تک۔ جس کا یہ مضمون ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں ہمیں سیدھی راہ چلا الخ۔ ظاہر ہے کہ یہ عبارت خداوند کریم نے بندوں کی طرف سے بنا کر ان کے حوالہ کر دی ہے۔ تا کہ وقت حضور دربار خداوندی یعنی وقت نماز کے اس طور پر خداوند کریم سے عرض معروض کیا کریں۔ ورنہ اگر خدا کی طرف سے کہئے تو خداوند تعالے شانہ سے زیادہ کون ہے جو خداوند کریم اس کی عبادت کرے اور اس سے مدد کا خواستگار رہو؟ اور پھر کون سے جناب باری تعالے بے راہی پر ہیں جو سیدھی راہ کی تمنا اور آرزو ہے ؟

جب یہ بات مقرر ہو چکی تو اب متوجہ ہو کر سنئے کہ آیت یوصیکم اللہ بلکہ ابتدا سورہ نساء سے لیکر یہاں تک۔ بلکہ عجب نہیں تمام سورۃ کی سورۃ بمنزلہ سورۂ فاتحہ جناب باری تعالی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تصنیف کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ فرما دی ہے تا کہ آپ بجائے خود لوگوں کو اس طرح سے سمجھا دیں۔ دلیل اس بات کی کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تصنیف کی گئی ہے خدا کی طرف سے نہیں یہ ہے کہ یُوصِیکُمُ اللہ فرمایا اور یَاعِبَادِ اُوصِیکُمُ مثلاً نہ فرمایا اگر خدا ہی کی طرف سے بندوں کے خطاب میں یہ آیت ہوتی تو لازم تھا کہ یَاعِبَادِ اُوصِیکُمُ مثلاً فرماتے۔ یہ عبارت جو اب موجود ہے صاف اسی پر دلالت کرتی ہے کہ متکلم اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور مخاطب امتی۔ آپ اپنی طرف سے ان الفاظ کے پیرایہ میں خداوند کریم کا حوالہ دے کر احکام میراث تعلیم فرماتے ہیں۔ کیونکہ معنی اس کے یہ ہیں کہ پہلے سے تمہیں خدا تعالی نے آگہی دی ہے کہ تمہاری اولاد میں بیٹوں کو دو بیٹیوں کے برابر ملا کرے۔

یہ ایسی بات ہے کہ جیسے سررشتہ دار جج یا کلکٹر کا حکم اہل مقدمہ کے سناتے وقت کہا کرتے ہیں کہ صاحب تمہاری نسبت یہ حکم دیتے ہیں۔ اور اگر حاکم خود کلام کیا کرتا ہے تو اہل مقدمہ کو اس کے نام یا لقب سے جیسے چودھری یا شیخ جی مثلاً پکار کر کہا کرتا ہے کہ ہم تمہیں یوں حکم دیتے ہیں۔ یا ہمارا تمہارے لئے یہ حکم ہے مثلاً۔ نہ یہ کہ اپنا نام لیکر

یوں نہیں کہ تمہیں فلاں شخص یوں کہتا ہے۔ پس درصورتیکہ یَا عِبَادِ اُوْصِیکُمْ نہ فرمایا جس کا یہ مطلب ہوتا کہ اے میرے بندو میں تمہیں کہے دیتا ہوں بلکہ یوں ارشاد ہوا کہ اللہ تمہیں یوں کہتا ہے تو بالیقین معلوم ہوگیا کہ جیسے سورۂ فاتحہ سب کی طرف سے بنادی ہے ایسے ہی یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بنادی ہے۔ تاکہ امت ایسے اس طرح سے باتیں کریں۔ اور ظاہر ہے کہ جب سررشتہ دار کسی اہل مقدمہ کو کوئی حکم سنایا کرتا ہے تو اس حکم سے اپنے آپ خارج ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ سوا سررشتہ دار جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں اگر اُس وقت موجود ہوں۔ اور یہ بھی سمجھی۔ کہ یوں کہے کہ حاکم تمھارے لئے یوں فرماتے ہیں۔ تب بھی اُس وقت کی گفتگو سے کوئی یوں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ سررشتہ دار بھی اس حکم میں داخل ہے۔

علیٰ ہذا القیاس جناب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جو اس حکم کے سنانے میں احکم الحاکمین کے سامنے بہ نسبت ہمارے بمنزلہ سررشتہ دار کے ہیں اس حکم سے خارج سمجھنا چاہیے۔ اور یوں سمجھنا چاہیے کہ حکم فقط امتیوں ہی کے لئے ہے۔ اور حدیث لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ اس دقیقۂ مخفی کے سمجھا دینے کے لئے۔ اس آیت کی تفسیر ہے۔ پر شیعہ بسبب اپنی کم فہمی اور نہایت کجی طبیعت کے باعث تفسیر کو تبدیل اور تغیر سمجھتے ہیں۔ اور حدیث و آیت میں تخالف جانتے ہیں۔ قصور تو اپنا اور طعن ابوبکر صدیق کے ذمہ۔ اس تقریر کے بعد تو یقین یوں ہے شیعہ اپنے دل میں پشیمان ہو کر مومن خاں کا یہ مصرع پڑھیں۔ ع میں الزام انکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

الغرض ذرہ برابر حدیث مذکور اور آیت معلوم میں تخالف نہیں۔ بلکہ حدیث مذکور آیت معلوم کی تفسیر ہے۔ اور سنیوں کی سب حدیثیں کلام اللہ کی تفسیر ہیں۔ اہل فہم سمجھتے ہیں اور کم فہم نہ سمجھیں تو اپنا سر کھائیں۔ اور اس حکم سے اور سوا اس کے جو حکم کہ ایسی ہی عبارات میں مندرج ہیں۔ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم خارج ہیں جیسے کبھی سررشتہ دار اہل مقدمہ یا رعیتِ حاکم کو حاکم کا کوئی حکم سناتا ہے اور حاکم کے دل میں سررشتہ دار کی نسبت بھی وہی حکم مکنون خاطر ہوتا ہے۔ تو آگے

پیچھے اس کو متنبہ کر دیتے ہیں کہ تمھارے لئے بھی یہی حکم ہے مثلاً کسی ضلع میں کوئی کلکٹر ہو اور اسی ضلع کا رہنے والا کوئی مالگذار اس کی کچہری کا سررشتہ دار ہو۔ اور بہ نسبت مالگذاروں کے کوئی حکم صادر ہو۔ اور وہ سررشتہ دار مالگذاروں کو یوں حکم سنائے کہ تمھارے لئے یہ حکم ہوا ہے۔ تو گو ان الفاظ سے یہ بات نہیں ثابت ہوتی کہ سررشتہ دار کے لئے بھی یہی حکم ہے۔ لیکن بایں وجہ کہ سابقاً خلوۃ جلوۃ میں اس کو یہ بات متحقق ہو چکی کہ سب مالگذاروں کے لئے ایک ہی حکم ہے۔ وہ سررشتہ دار بھی وقت تعمیل حکم اسی حکم کا پابند رہے گا۔

سو اگر بعض احکام میں مثل صوم، صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوں۔ اور پھر بالفرض وہ بھی ایسے ہی الفاظ سے کلام اللہ میں وارد ہوئے ہیں۔ کہ موافق تقریر مسطور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس حکم سے خارج ہونے چاہئیں۔ تو کسی اور قرینہ یا خطاب پنہانی سے آپ کو اپنا شمول اس حکم میں ثابت ہوا ہو۔ مگر چونکہ اس حکم میں یہ متحقق ہوگیا ہو کہ میں اس میراث سے خارج ہوں۔ بلکہ بالخصوص اس بات میں میرے لئے اور حکم ہے۔ تو بایں نظر کہ مبادا صوم و صلوٰۃ کا اشتراک دیکھ کر باقیماندگان یہ سمجھ جائیں کہ گو اس آیت سے آپ کا شمول اس حکم میں معلوم نہیں ہوتا لیکن کیا عجب کہ مثل صوم و صلوٰۃ اس حکم میں بھی کبھی وحی جدید کے باعث آپ شریک ہو گئے ہوں۔ اور یہ سمجھ کر اموال متروکہ کو جو بضرورت اخراجات روزمرہ کسی کو دیا نہیں گیا تھا تقسیم کر لیں۔ اور تصرف غیر واجبی سے انجام کار دین و دنیا کی خرابی اٹھائیں لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ فرمایا ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استثناء کی دیگر نظیریں۔

اور یہ تخصیص کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مال بعد وفات میراث میں نہیں آ سکتا کچھ نئی تخصیص نہیں۔ بہت سے حکم ایسے ہیں جس میں امت کے لئے کچھ حکم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ اور حکم تھا۔ بشہادت شروع سورۂ مزمل اور آیت وَمِنَ اللَّیْلِ فَتَہَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر باتفاق اکثر آپ پر فرض تھا۔ اور باقی تمام امت پر فرض نہیں، صوم وصال آپ کے حق میں موجب ثواب تھا باقی تمام امت کے لئے ممنوع۔ اگر کوئی عورت

اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کردیتی تو آپ کو وہ حلال تھی اوروں کے
لئے حلال نہیں۔ آپ کے ذمہ مہر اور عورتوں کے حق میں عدل یعنی سونے لیٹنے میں برابری
نبھانی فرض نہ تھی گو آپ نے تمام عمر عدل ہی سے گذاری اور مہر بھی دیا۔ اور باقی تمام
امت پر یہ دونوں باتیں ضروری ہیں۔ سب امت کے لئے چار عورت کے ساتھ
نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ چنانچہ اسی سورت کے شروع میں اس تعداد کا ذکر ہے
اور باتفاق امامیہ اثنا عشریہ بلکہ اکثر فرقہائے شیعہ وسنی اس کے یہی معنی ہیں کہ چار تک اجازت
ہے آگے نہیں۔ حالانکہ جناب سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوات واکمل التسلیمات
اس حکم سے خارج ہیں۔ آپ کے حق میں سب جانتے ہیں یہ قید نہ تھی۔

اور اس حکم سے آپ کے خارج ہونے کی وجہ بھی یہی نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام خدا
کی طرف سے نہیں بلکہ بمنزلہ آیت یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی
کی طرف سے ہے۔ جیسے کچہری کے عرضی نویس کسی کو عرضی لکھ دیتے ہیں۔ اور وہ عرضی
لکھوانے والے ہی کی سمجھی جاتی ہے عرضی نویس کی کوئی نہیں کہتا۔ ایسے ہی اس حساب
سے ان احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم احکام یعنی وعظ پند سمجھنا چاہئے
کیونکہ اس تعداد کے ذکر سے کچھ ہی پہلے شروع میں اس سورت کے اس طرح سے خطاب
ہے یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ یعنی اے لوگو ڈرو
تم اپنے رب سے جس نے تمھیں ایک جان یعنی حضرت آدم سے پیدا کیا فقط۔ سو یہ کلام اور
یہ خطاب ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے تو بندوں کو ہو ہی نہیں سکتا ورنہ یوں فرماتے
یا ایھا الناس اتقونی فانی ربکم الذی خلقکم یعنی اے لوگو مجھ سے ڈرو اس لئے
کہ میں تمھارا وہ رب ہوں جس نے تمھیں پیدا کیا ایک جان سے فقط۔

اب ہو نہ ہو یہ کلام اور یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے۔ اور
مخاطب اس پند کے امتی ہیں۔ تو لاجرم یہ احکام بھی بہ نسبت امتیوں ہی کے ہوں گے
تیماردار جو بحکم حکیم حاذق بیمار کو نصیحت کرتے ہیں کہ تو دوا پی لے اور بد پرہیزی مت
کر۔ تو کسی کے نزدیک (نہ بیمار کے نہ غیر کے) یہ لازم نہیں۔ کہ تیماردار خود بھی دوا پئے

اور پرہیز کرے۔ بلکہ سب کے نزدیک تیمارداران احکام سے خارج ہے۔ ا[یسے]
ہی جناب سرور کائنات علیہ السلام جو ہم بیماروں کے لئے بمنزلہ تیماردار کے ہیں بحکم
حکیم مطلق یہ احکام مندرجہ ذیل یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الیٰ آخر السورۃ سب
امتیوں کو سناتے ہیں۔ تو لاجرم آپ ان احکام سے خارج ہیں۔

اور اگر کسی حکم میں شریک بھی ہیں تو اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے اس
تیماردار کو بھی حفظ صحت کے یا کسی اور مصلحت کی رعایت کے لئے وہ حکیم کو[ئی]
دوا یا کوئی پرہیز ہی بتلا دے جو اس بیمار کے نسخہ اور پرہیز میں داخل ہے
اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ تمام سورۃ خاص کر شروع سے لیکر آخر رکوع
یوصیکم اللہ تک جتنے احکام مذکور ہیں وہ سب بہ نسبت امیتوں کے
صادر ہوئے ہیں۔ اس میں سے اگر کسی حکم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریک
امت ہیں بھی؟ تو کسی اور اشارہ کنایہ وحی وغیرہ کے سبب ہیں۔ اور یہ بھی
معلوم ہو گیا کہ یہ تمام سورۃ نہیں تو آخر رکوع مذکور تک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ہی کی طرف سے عبارت بنائی گئی ہے۔ بالجملہ جناب سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل
الصلوات واکمل التحیات اکثر احکام سے مستثنیٰ ہیں۔

اور مردان فہمیدہ سوا امثلہ مذکورہ کے دنیا کے کاروبار میں سے اور اس کی بہت
سی مثالیں نکال سکتے ہیں۔ مثلاً افسر بہ نسبت عوام ملازموں کے بہت سے احکام
سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ اور بہت سے احکام اسی کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔

پہرہ سپاہی دیتے ہیں افسروں سے معاف ہوتا ہے پہرہ بدلانا اور حکم بولنا اور انتظام کرنا (اور)
موجودات یعنی اور امور ضروری کی حکام بالادست کو اطلاع کرنی افسروں کے ذمہ
ہوتی ہے۔ الحاصل حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم مثل حکم تعداد منکوحات اس
حکم سے بھی خارج ہیں۔ اور جب خارج ہوئے تو یہ آیت اور وہ حدیث باہم مخالف
نہ ہوئی موافق اور متوافق ہی نکلی ہاں مخالفت اسے کہتے ہیں کہ شیعہ اپنے اماموں سے
روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد کے بعض وارثوں کو بعضے ترکہ کا حصہ نہیں دیا

بلکہ خود اپنے آپ سب لے لیا ہے جیسے شمشیر اور مصحف اور انگشتری اور پوشاک بدنی۔ سو جن روایتوں کی سند سے اماموں نے اوروں کو حصہ نہیں دیا اول تو وہ فقط انہیں کی روایت ہے۔ اور کوئی اس کا راوی نہیں۔ دوسرے یہ بات آیت یوصیکم اللہ کے ہر طور مخالف ہے تطبیق کی کوئی صورت نہیں۔

اب اگر بالفرض یہ حدیث غلط بھی ہو اور ابو بکر صدیق ہی نے بنا لی ہو تب مضمون صحیح ہی نکلا۔ حکم بہر حال یہی ہے کہ فدک و غیرہ متروکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں میراث جاری ہونے کا حکم نہیں۔ اور اس لئے اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں کہ اس حدیث کی صحت کے دلائل جمع کرکے پیش کریں۔ یا کوئی اور وجہ دربارہ تطبیق حدیث مذکور اور آیت یوصیکم اللہ بیان کریں۔ یا اس حدیث میں اور روایات باقیہ میں موافقت ثابت کرکے شبہ تخالف کو دور کریں۔ کیونکہ کلام فدک میں میراث جاری ہونے میں تھی۔ سو اس کی طرف سے اطمینان ہی ہو گیا لیکن تاہم بایں نظر کہ اولیائے کرام اور مقربان درگاہ خداوندی کی طرفداری اور ان کے بدگویوں کی دنداں شکنی میں امید نظر عنایت خداوند تعالےٰ و رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور توقع دعا و شفاعت اولیا، و مقربان خدا ہے۔ جن میں سے خاص ابو بکر صدیق کہ سرافسر مقربان اور سرلشکر اولیا ہیں۔ اس لئے اس آیت سے مطابقت کی بھی ایک اور وجہ مرقوم ہے۔ اور تطبیق آیات باقیہ بھی معروض خدمت اہل انصاف ہے۔ ازاں بعد بطور شیعہ و سنی کچھ بیان صحت و علامات صحت حدیث مذکور بھی انشاء اللہ کیا جائے گا۔

حدیث معاشر الانبیاء مخصص آیۂ توریث ہے۔ نہ کہ معارض

سو اول آیت یوصیکم اللہ کے ساتھ مطابقت کی ایک اور وجہ لیجیے۔ اگر بطور مذکور جس سے جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مستثنیٰ ہونا اس حکم سے معلوم ہو جائے یہ حکم بیان نہ ہوتا۔ بلکہ ایسے الفاظ ہوتے کہ جن سے باعتبار الفاظ عموم خطاب ہی سمجھا جاتا۔ یا کوئی عقل کا اندھا انہیں الفاظ کو یوں کہنے لگے کہ عموم پر دلالت کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم میں بہر نہج شامل ہی ہیں۔ تب بر تقدیر صحت حدیث مذکور کوئی دشواری ہی نہیں

بہت سے بہت ہوگا تو آیت مذکور کی تخصیص لازم آئے گی مخالفت پھر بھی نہیں۔ مخالفت تو تعارض اور تناقض کو کہتے ہیں تخصیص کی صورت میں استثنار کی صورت ہو جائے گی۔ مثلاً کوئی یوں کہے کہ میرے پاس سب آئے مگر زید نہیں آیا تو اس کلام کے اول اور آخر میں کوئی نادان بھی تعارض نہیں سمجھتا۔ حالانکہ یوں کہنا کہ سب آئے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ زید بھی آیا۔ یہ کہنا کہ زید نہیں آیا اس کے مخالف ہے سو اس کی لم یہی ہے کہ آخر کا کلام اول کا مخصص ہو گیا۔

باقی کوئی یوں کہے کہ اس مثال پر توجب قیاس کیا جائے کہ جیسے اس کلام میں جملہ مخصصہ ساتھ لگا ہوا ہے ایسے ہی مضمون حدیث کا کوئی لفظ اس آیت کے متصل آگے پیچھے لگا ہوتا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ مخصص کا لفظوں میں اور متصل ہی ہونا کچھ ضرور نہیں۔ اسی کلام میں کہ سب آئے مگر زید نہیں آیا ایک زید کی تخصیص تو لفظی ہے۔ باقی اور جو لاکھوں تخصیصیں اس کے ساتھ لگی ہوئی ہیں وہ لفظوں میں کہاں ہیں؟ توضیح اس کی یہ ہے کہ اس قسم کے کلام کا سبھی کو اتفاق پڑتا ہے اور با ایں ہمہ تمام مخلوقات بلکہ سب بنی آدم اور سارے روئے زمین کے رہنے والوں کا آنا بھی مثلاً مقصود نہیں ہوتا۔ ایک بستی کے یا ایک گروہ کے یا ایک ذیل خاص کے آدمی مراد ہوتے ہیں۔ سو یہ تخصیص کونسے لفظ سے نکل آئی اور اس پر تسکین نہ ہو تو اب کے ایسی مثال لیجیے کہ پھر کسی کو مجال دم زدن نہ رہے۔

جیسے آنحضرت فَانكِحُوا مَا طَابَ سے مستثنیٰ ہیں ایسے ہی یوصیکم اللہ سے ہیں

اول میں اسی سورت کے یہ حکم ہے فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ یعنی نکاح کرو عورتوں سے جس قدر تمہاری مرضی ہو دو دو۔ تین تین۔ چار چار فقط۔ اب عرض یہ ہے کہ باتفاق سنی و شیعہ خصوصاً امامی و اثنا عشری اس کے معنی یہی ہیں کہ چار نہایت درجہ ہے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں۔ سو اگر یوصیکم اللہ عام ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور غیر کو سب کو شامل ہے تو فانکحوا ما طاب لکم بھی عام ہے اور سب کو شامل ہے۔ کوئی لفظ ایسا جس سے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کا اس سے مستثنیٰ ہونا ثابت ہوا اس کے لیں ویلیں میں نہیں۔ پھر جیسے کسی کلام مفصل سے اس آیت کو تخصیص کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مستثنیٰ کرلیا ہے ایسے ہی حدیث مذکور سے آیت یوصیکم اللہ کو مخصوص کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مستثنیٰ کرلیا۔

اور اگر یوں کہیے کہ آیت فانکحوا کی تخصیص تو دوسری آیت ہی سے کی گئی سورۂ احزاب کی یہ آیت یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ تک اس پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے کیونکہ اس آیت کا یہ مطلب ہے۔

کہ اے نبی ہم نے حلال رکھیں تیرے لئے تیری عورتیں جن کے تو مہر دے چکا اور جو باندیاں تیری ملک میں آگئی ہیں اس لوٹ میں سے جو اللہ نے دلوادی ہے اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور تیری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور خالاؤں کی بیٹیاں جنھوں نے وطن چھوڑ دیا تیرے ساتھ ہیں۔ اور جو کوئی عورت ہو مسلمان اگر بخشے اپنی جان نبی کو اور نبی چاہے کہ اس کو نکاح میں لے آئے نری تجھی کو سوا اور مسلمانوں کے فقط۔"

سو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار سے زیادہ کی اجازت نہیں تھی تو اتنی کیوں گنا دیتے۔ سو جیسے آیۃ فانکحوا کی تخصیص اس آیت سے ہوگئی ایسے ہی کوئی آیت بتلادو جو آیت یوصیکم اللہ کی تخصیص اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مستثنیٰ ہونے پر دلالت کرے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تحکم بیجا کس سے روا ہوگیا۔؟ کہ کلام مخصّص بھی ہو تو آیت ہی ہو؟ عقل سلیم کو آیت اور غیر آیت اس بات میں دونوں یکساں نظر آتے ہیں اور عقل کے سلیم نہونے کے عذر سے یہ جواب مسلم نہیں۔ تو ہم کہتے کہ اول تو آیت فانکحوا کا مخصوص ہونا آیت انا احللنا سے مسلم نہیں ہے۔ کیونکہ مقام دعوی میں لازم ہے کہ ایسی دلیل پیش کی جائے جس میں خلاف دعوے کا احتمال نہ ہو۔ اور

اس آیت میں احتمال ہے کہ بمنزلہ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ اس امر کے بیا
واسطے نازل ہوئی ہو کہ تمھارے لئے اس قسم کی عورتیں حلال ہیں۔ نہ یہ کہ جتنی چ
نکاح کرلو۔ جیسے واحل لکم ما وراء ذلکم کے یہ معنی ہیں کہ تمھارے لئے سوا
مذکورہ کے سب قسم کی عورتیں حلال ہیں۔ بشرطیکہ مہروں سے ان کے
نکاح کرلو۔ سو اس سے یہ نہیں نکلتا کہ سوا محرمات مذکورہ جس قدر چاہو ان سے
کرلو۔ اور مؤید اس احتمال کی یہ بات ہے کہ سورۂ احزاب سورۂ نساء سے
نازل ہوئی ہے۔

چنانچہ تفسیر اتقان میں نوع اول میں ترتیب نزول سور نہایت قرآنی میں ای
حدیث متصل نقل کی ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہے۔ سو اب تک آیت فان
نازل ہوئی ہی نہ تھی جو آیت انا احللنا نازل ہولی۔ اور جب تک آیت فان
نازل نہیں ہوئی تھی تب تک نکاح کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
تخصیص؟ کسی کو بھی کوئی قید عدد نہ تھی۔ پھر کیا ضرورت تھی جو اس آیت کو نا
کر کے یہ اطلاع کی گئی کہ تمھارے لئے جتنے نکاح کرو درست ہیں؟ اس صور
میں لاجرم یوں ہی کہا جائے گا کہ آیت فانکحوا کی تخصیص کسی اور ہی وجہ سے ہ
اور اگر یوں کہیے کہ ترتیب مذکور باعتبار فواتح سور ہو۔ یہ کیا لازم ہے کہ سورۂ ا
کی تمام آیتیں سورۂ نساء کی تمام آیتوں سے پہلے ہی نازل ہولیں؟ چنانچہ حد
مشار الیہ سے کچھ ایسا ہی واضح ہوتا ہے۔ سو ہر چند یہ احتمال ہمیں ساکت نہیں کر
اسی لئے کہ مدافعت ان احتمالات کی ہمارے ذمہ نہیں۔ ہم کس بات کے مدعی ہی
احتمالات مخالفت کو رفع کریں؟ ہاں اس احتمال کا دفعیہ کہ شاید ساری ہی
یا فقط آیت اِنَّا احللنا۔ ساری سورۂ نساء یا فقط آیت فانکحوا اس سے پ
نازل ہولی ہو۔ ان کو ضروری ہے تاکہ ان کا دعوی تخصیص ثابت ہو۔

یوصیکم اللہ کی مخصص دوسری آیت بھی ہے۔

معہذا ہماری چشم پوشی دیکھیے کہ ہم اس سے بھی در
آیۃ یوصیکم اللہ کی مخصص بھی آیت ہی بتلاتے ہیں

آخر جو پارہ حدیث مشار الیہ سورۂ نسا رے سے بعد میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں یہ آیت موجود ہے مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ مطلب یہ ہے کہ "جو مال بطور فئی کے، خداوند کریم نے اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دلوا دیا۔ بستیوں والوں سے۔ (یعنی بے لڑے بصلح فتح ہوگئی) تو وہ اللہ کے واسطے اور رسول کے اور ناتے والے کے اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافر کے لئے ہے۔ تاکہ نہ آوے لینے دینے میں دولتمندوں کے تم میں سو فقط"

اب علماء اہل سنت اور منصفان علماء شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ مال فئی کی تقسیم جناب باری تعالیٰ نے چھ حصوں پر کی سو بعض علماء کا تو یہی قول ہے کہ چھ حصوں پر تقسیم کر کے خدا کا حصہ بیت اللہ اور مساجد کی تعمیر میں خرچ کیا جائے۔ پر اکثر امت کا مذہب یہ ہے کہ مال فئی کے پانچ ہی حصے ہیں لیکن چونکہ عبارت فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ الخ جو یہاں ہو بہو وہی عبارت ہے جو پارہ دہم کے شروع میں مصرف خمس کے بیان کے لئے وارد ہوئی ہے۔ اور شیعوں کا اس جگہ پانچ حصوں پر تقسیم کرنا بالیقین معلوم ہے۔ تو بالیقین معلوم ہوا کہ یہاں بھی شیعوں کے نزدیک وہی تقسیم ہوگی۔ سو اس مذہب کے موافق ذکر خدا کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ جو چیز خداوند کریم کے ارشاد کے باعث اس کی رضا کے موافق خرچ کی جاتی ہے تو اس کو خدا کے ساتھ اور نیز اُن کے ساتھ جو موافق ارشاد خداوندی اس کے مصرف مقرر ہوئے ہیں ایک نسبت حاصل ہو جاتی ہے۔

خدا کے ساتھ تو یہ نسبت، کہ اس کی راہ میں خرچ ہوئی۔ اور اہل مصرف کے ساتھ یہ نسبت کہ ان کے لئے مقرر ہوئی۔ تو اس کو خدا کے واسطے بھی کہہ سکتے ہیں چنانچہ عرف ہی یہ ہو گیا ہے کہ جو چیز بہ نیت ثواب دیا کرتے ہیں اس کو خدا کے واسطے کہا کرتے ہیں۔ اور اہل مصرف کے واسطے بھی۔ چنانچہ عرف میں ان کی طرف بھی نسبت کرتے ہیں اور بولا کرتے کہ فلانی چیز فقیروں کے یا مسکینوں کے

واسطے ہے مثلاً۔ تو اس صورت میں حاصل یہ ہوا کہ مال فئی خدا کے واسطے ہے اور فلانی فلانی قسم کے آدمیوں کے واسطے یعنی خدا کی رضا مندی کے لئے اُن کو دیا جائے۔ اور ضرورت اس کہنے کی یہ ہوئی کہ مال فئی تو اُسے کہتے ہیں کہ جو کفار کے پنجوں میں سے بے لڑے بھڑے بسبب رعب لشکر اسلام کے یا بطور صلح اہل اسلام کے قبضہ میں آ جائے سو یہ مال حقیقت میں تو جناب باری تعالیٰ نے اپنے فضل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبض و تصرف میں داخل کر دیا۔

لیکن چونکہ بظاہر اس کا باعث رعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوا ہے۔ اور رعب میں فی الجملہ جمعیت لشکر کو مداخلت ہے۔ تو لشکریوں کو اس میں طمع ہو سکتی تھی اس لئے یوں ارشاد ہوا کہ جو مال بے لڑے بھڑے ہم نے اپنے رسول کو دلوا دیا ہے اس میں تمہیں جانفشانی کی نوبت نہیں آئی کہ کسی قسم کی مشقت تم پر نہیں پڑی۔ سو مناسب یوں ہے کہ اس کو خدا کے واسطے چھوڑ دو۔ تاکہ مصارف مذکورہ میں صرف ہووے لیکن پہلی آیت میں جو یہ جملہ ہے فَمَآ اَوْجَفْتُمْ سے لے کر قَدِیْرٌ تک اس جملہ کے مناسب یوں ہے کہ یوں کہیے۔ کہ جب خداوند کریم نے تمہاری بے سعی و کوشش کے یہ مال اپنے رسول کو دلوا دیا تو اس میں تمہارا کچھ حق نہیں۔ جیسا مال غنیمت بسبب اس کے کہ بظاہر تمہاری جانفشانیوں کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ آیا تھا تم پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی جو مال فقط خدا کی عنایت سے ہاتھ آئے وہ خدا کا ہونا چاہیے۔ اور جو لوگ اللہ والے ہیں اور خدا کے نام پر بیٹھے ہیں یہ خدا کے نام کا مال اُن کو ملنا چاہیے۔

آنحضرت فدک کے مالک نہ تھے متولی تھے

بہر حال لفظ علی رسولہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبض و تصرف ثابت ہوا لیکن جیسا لفظ علی رسولہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبض و تصرف ثابت ہوا ویسا ہی لفظ فللّٰہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ قبض و تصرف مالکانہ نہیں بلکہ متولیانہ ہے یعنی آپ خازن اور امین ہیں مالک نہیں۔ ورنہ اس مصرف کے مقرر کرنے کے کیا معنی؟ مالک کو اپنی چیز کا اختیار

ہوتا ہے؟ اور اگر بالفرض والتقدیر مال فی مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو اور ایک قدر معین کے لئے ذوی القربیٰ اور یتامیٰ اور مساکین اور ابن سبیل کو مقرر کر دینا ایسا ہی ہو جیسا زکوٰۃ کے لئے (جو ایک حصہ معین ہے) فقراء اور مساکین وغیرہما کو مقرر کر دیا ہے۔ تو قطع نظر اس کے کہ یہ بات بشہادت عبارت آیۃ ظاہر البطلان ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ نعوذ باللہ سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوات والتسلیمات جو باتفاق سراسر معصوم ہیں۔ اس جہان سے بار حقوق مندرجہ آیت اپنے سر پر لے گئے سو اس کے قایل ہونے کی جرات شیعوں ہی میں نظر آتی ہے اہل سنت کو ایسی بات کہہ کے اپنا ٹھکانا نظر نہیں آتا۔

باقی رہا فئی کے اندر فئی کا مصارف مذکورہ میں خرچ کرنا۔ سو اس صورت میں اس سے کام نہیں چلتا کیونکہ لفظ افاء اللہ اس صورت میں صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ذوی القربیٰ اور یتامیٰ وغیرہ کو اصل زمین بانٹ کر دینی چاہئے۔ الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مملوک ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ پھر نہ معلوم کہ کس وجہ سے روایت ہبہ فدک کو علمائے شیعہ صحیح سمجھتے ہیں یا فدک کو تمام حق وارثان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم؟ بلکہ فقط حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حق خاص قرار دے کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بلکہ تمام اکابر صحابہ خصوصاً خلفائے ثلثہ پر زبان طعن دراز کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔ اگر پہلے سے عذر جہل تھا تو البتہ یہ عذر معقول ہے۔ لیکن بعد استماع ان کلمات طیبات اور مضمون آیہ سراپا ہدایت کے توبہ واستغفار میں کیا توقف ہے؟

ہاں اگر قریۂ فدک بطور فئی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قبض وتصرف میں نہ آیا ہوتا یا بعد ادائے قدر واجب منجملہ اراضی وسیعہ اور قریات کثیرہ قریہ فدک خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہ جاتا تو البتہ درصورت احتمال مفروض فی الجملہ جائے گرفت تھی لیکن شیعی ہی فرمائیں کہ فدک کا فئی ہونا اور پھر غیر مقسوم ہونا کس کے نزدیک مسلم نہیں؟ بلکہ انصاف سے دیکھئے تو اس قسم کی تقسیم بھی مفید مطلب شیعہ نہیں

کیونکہ اگر بالفرض قریات تقسیم ہوئی تھیں تو پھر ہر قریہ والوں سے جدا جدا صلح واقع ہوئی تھی کسی ایک کی سلطنت ہی نہ تھی جو فقط اسی سے صلح کرنی کافی اور مکتفی ہو جاتی سو اس صورت میں لازم تھا کہ ہر قریہ میں سے تقسیم کر کے حقوق واجبہ کو ادا کرتے۔ کیونکہ لفظ ما جو افاء اللہ میں ہے عموم اور شمول افرادی پر دلالت کرتا ہے بمثل غنیمت ہر فئی کو جداگانہ تقسیم کرنا چاہئے تھا۔

اور اگر کوئی عقل کا اندھا اور تعصب کا پورا سنیوں سے دامن چھڑانے کے لئے فدک کو کسی غنیمت کا حصہ خمس کہہ کے سنیوں کے سامنے آنکھیں کرنے کا ارادہ کرے تب بھی موافق مثل مشہور ع بہر کجا کہ رسیدیم آسمان پیداست :: وہی خرابی کی خرابی برسر رہے گی۔ کیونکہ جن الفاظ اور جس عبارت سے مال فئی میں سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصناف اربعہ ذی القربیٰ وغیرہ کے حقوق کا تعلق ثابت ہوتا ہے۔ وہی الفاظ بعینہا خمس کے مصرف کے بیان کے لئے جناب باری تعالیٰ نے ارشاد فرمائے ہیں۔ اگر علمائے شیعہ کو بوجہ یاد نہ ہونے کلام اللہ کے بحکم المرء یقیس علی نفسہ اس گفتار میں میری طرف دروغ کا احتمال ہو تو کلام اللہ تو ہر جا موجود ہے سیپارہ دہم کی پہلی آیت کو مطالعہ کر دیکھیں۔

معہذا خمس تو مال غنیمت میں سے ملتا ہے۔ سو اگر بالفرض فدک جنگ وجدال سے فتح ہوا ہوتا تو چار خمس تو پھر بھی غانمین کے ہوتے۔ علیٰ ہذا القیاس سوائے اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ اگر کہئے تو جو حال اور مجاہدین کا ہے وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ سو کسی طرح سارے فدک کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مملوک ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ یہ بھی احتمال نہیں کہ فدک کسی قریہ کے اس حصہ معین کا نام ہے جو بعد ادائے حقوق واجبہ رہ گیا تھا۔ کیونکہ بالاتفاق اہل لغت صاحب قاموس وغیرہ اس بات پر متفق ہیں کہ فدک ایک قریہ کا نام ہے علمائے شیعہ کو بھی اس میں کلام نہیں۔ اور جاہلوں سے اپنی کلام نہیں۔ بہرحال قبل اس بات کے کہ بعد تقسیم اراضی کثیرہ فدک خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پاس رہ گیا تھا۔

یہ احتمال باطل ہے کہ اراضی فی بلکہ اراضی خمس بھی مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہیں) مثل خیال محال مجانین پریشان ہی رہے گا۔

آیت کے ہر لفظ سے فدک کا مملوک نہ ہونا ظاہر ہے

مگر شائد کسی عقل کے دشمن کو اس احتمال کے بطلان کی حقیقت میں خلجان رہے۔ اس لئے ہم کو بھی لازم ہے کہ اس احتمال کے بطلان کے وجوہ جن سے مال فی بھی ثابت ہو جائے۔ بیان کر کے ابو بکر صدیق کی برارۃ بلکہ حقانیت اور علماء شیعہ کی خوش فہمی کو آشکارا کر دکھلائیں۔ سو اول تو اس احتمال کے بطلان کے لئے کہ فدک جو منجملہ اراضی فی ہے مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھا (اوران مصارف معلومہ کا مقرر کر دینا بعینہ ایسا ہے جیسا اموال مملوکہ میں قدر زکوٰۃ کے لئے فقراء اور مساکین وغیرہم کو مقرر فرما دیا ہے) قطع نظر اس کے کہ ادنیٰ سے عربی داں کو بھی یہ وہم نہیں گذر سکتا۔ چنانچہ ظاہر ہے یہی ایک لفظ فللہ کافی ہے کیونکہ مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہونا اموال فی کا اس لفظ سے ظاہر و باہر ہے۔ چنانچہ مطالعہ کنان تقریر مسطور بالا پر انشاء اللہ مخفی نہ رہے گا۔

دوسرے اگر لفظ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ تملیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دلالت کرتا تو پھر فَلِلرَّسُوْلِ کہنے کی کیا حاجت تھی؟ بلکہ مثل وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ الخ یہاں بھی جس قدر خداوند کریم کو مدنظر ہوتا کہ اس کی راہ میں خرچ کیا جائے اس کی تعیین فرما کر فللہ کے بعد وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى الخ فرما دیتے فَلِلرَّسُوْلِ نہ فرماتے۔ اور اگر یوں کہیے کہ لفظ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ سے تو تملیک نہیں ثابت ہوتی پر فَلِلرَّسُوْلِ تملیک پر دلالت کرتا ہے تو البتہ یہ بات نادانوں کے نزدیک دانائوں کی سی بات ہے لیکن سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ اگر فَلِلرَّسُوْلِ میں لام تملیک کے لئے ہو تو لاجرم فللہ وَلِذِي الْقُرْبٰى کا لام بھی تملیک ہی کے لئے ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ اس جگہ تملیک بے اس کے ہو ہی نہیں سکتی کہ جس جس کی ملک کیا گیا ہے پہلے سے اس کی ملک میں نہ ہو۔ بلکہ بعد افاءۃ یعنی مسلط کر دینے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ اصناف مندرجہ آیت مال فی کے

مالک ہوئے ہوں۔

کیونکہ اول تو بات ظاہر ہے قبل افاءۃ اموال فی میں کفار کے سب تصرفات مثل بیع و شرا و ہبہ وغیرہ کے سب کے نزدیک صحیح ہیں۔ معہذا اگر وہ قبل افاءۃ مسلمان ہو جائیں یا جزیہ قبول کر لیں تو بہ نسبت اموال کوئی ان کا مزاحم حال نہ ہو یعنی اس سے معلوم ہوا کہ قبل افاءۃ کفار ہی مالک تھے۔

لام تملیک کے لئے ہو تو اموال فی غیر مملوکہ خدا ہوں گے

دوسرے فاء تعقیب خود اس بات پر شاہد ہے کہ اگر لام لِلرَّسُوْلِ وغیرہ سے ملکیت ثابت ہوتی تب اس کا خداوند مالک الملک خالق ارض و سما کا پہلے سے مالک نہ ہونا شیعوں ہی کے نزدیک ہو سکے تو ہو سکے؟ کیونکہ پہلے سے مالک نہ ہونے کی وجہ اگر ہو تو یہ ہو کہ اموال فی قبل اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر قابض ہوں۔ کفار کے مملوک تھے۔ اور ایک شے کے تمام ایک وقت میں دو مالک نہیں ہو سکتے۔ پھر خداوند کریم کو بھی کس طرح مالک کہدیجئے لیکن یہ استبعاد جب ہی ہو سکے ہے کہ ملک خداوند کریم ہم پلہ ملک کفار ہو سو شیعہ برنگ معتزلہ جیسے بندہ مخلوق کو کہ افعال اختیاریہ کا خالق قرار دیکر خالق حقیقی کے برابر سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی اگر ملک میں بھی خالق اور مخلوق کو برابر سمجھنے لگیں تو کون روکتا ہے، عقیدہ غلط سے بجز عقل کے اور کوئی نہیں روک سکتا۔ سو وہ پہلے ہی نصیب دشمناں ہوئی۔ اور اہل سنت جو بندوں کے ملک کو مالک الملک کے ملک کے سامنے بمنزلہ قبضہ خزانچی بلکہ مستعیر مالک اصلی کے ملک کے سامنے سمجھتے ہیں تو ان کو مالک الملک کے ملک اور بندوں کے (خصوصاً کفار کے) ملک کے اجتماع میں کوئی محال نظر نہیں آتا۔

آیت کا مقصد بیان تملیک نہیں ہے

اور سلمنا کہ تملیک بمعنی مذکور نہ ہو بلکہ مقصود فقط بیان ملک ہو اور موافق عقیدۂ اہل سنت فللہ وللرسول کے یہ معنی ہوں کہ مالک حقیقی خداوند مالک الملک ہے اور مالک مجازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیکن لذی القربی الخ کے لام سے جو ذی القربی و یتامیٰ وغیرہ کی ملکیت ثابت ہوتی ہے

اس کا کیا جواب ؟

معہذا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ذی القربیٰ وغیرہ ہر ایک کو مثل خداوند مالک الملک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام تمام اموال فیٔ کا مالک کہیے۔ چنانچہ بظاہر للرسول اور لذی القربیٰ کا عطف اللہ ہی پر ہے اور وہ اسی بات کو مقتضی ہے۔ تب تو اس کے محال ہونے میں کلام ہی نہیں۔ اور اگر یوں کہیے کہ الذی القربیٰ کا عطف للرسول پر ہے۔ اور یہ دونوں معطوف معطوف علیہ مل کر اللہ پر معطوف ہیں۔ تب اس سے بھی کیا کم کہیے کہ اموال فیٔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصناف باقیہ میں اور خدا میں مشترک ہوں۔ سو یہ بات اول تو یوں کسی مسلمان کے دھیان میں نہیں آسکتی۔ کیونکہ اس صورت میں لازم تھا کہ جیسے غنیمت غانمین پر تقسیم کیجاتی تھی اموال فیٔ اصناف معلومہ پر تقسیم کیے جاتے تاکہ ہر کوئی اپنے حسب دلخواہ اس میں تصرف کرتا۔ ضرورت ہوتی تو کسی کے ہاتھ بیچ دیتا نہیں تو آپ رکھتا یا کسی کو دے دیتا۔ سو یہ وبال کس کی گردن پر رہا کہ مالکان اشیاء کو دخل نہ ملا؟

سو اہل سنت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو درکنار اُن کے خدام کی طرف بھی یہ وہم نہیں آسکتا۔ کہ ایسے ظلم عظیم کے مرتکب ہوئے ہوں۔ ہاں شیعی کہیں تو اُن سے کچھ دور بھی نہیں۔ اُن کی اور خرافات کو اگر ٹٹولئے تو اس سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں۔ دوسرے اگر تقسیم بھی وقوع میں آتی تب یہ بات تصور میں نہیں آسکتی کہ شرکاء غیر معیّن میں ایک چیز مشترک ہو۔ غانمین کی تو ایک تعداد معین ہوتی ہے۔ ان کو غنیمت میں شریک کہیے تو زیبا ہے۔ ذی القربیٰ اور یتامیٰ وغیرہ کا کوئی عدد معین کسی کو معلوم نہیں ہوسکتا اور معلوم بھی ہو تو سب کو اُن کا حق پہنچانا بندوں سے محال ہے۔ معہذا اصل زمین کا دینا تو ایک طرف اراضی فیٔ کی آمدنی بھی تمام ذی القربیٰ اور تمام جہان کے یتامیٰ اور مساکین اور ابن سبیل کو نہیں پہنچی۔ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے۔ اور اگر ان اصناف اربعہ کو اہل اسلام ہی میں منحصر رکھ کے کلام کیجیے تب بھی شیعوں کا قافیہ تنگ ہی رہے گا۔

اور اگر بالفرض بفرض محال مقصود جناب باری تعالیٰ فللّٰہ سے تو یہ ہو کہ مالک حقیقی جناب باری تعالیٰ ہے اور فللرسول سے یہ مطلب ہو کہ مالک مجازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور لذی القربیٰ الخ بیان مصرف کے لئے ہو تو اہل سنت کو سوائے اس کے کہ اس صورت میں خدا کی طرف حرف عائد ہوگا چنانچہ معلوم ہو جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ اس کی تسلیم میں کچھ دشواری نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مِلک جو اس صورت میں فقط برائے نام ہی ہوگی اگر بالفرض بطور وراثت وارثوں کی طرف منتقل بھی ہو جائے گی۔ تو استحقاق اصناف باقیہ تو کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثوں کی طرف منتقل ہو ہی نہیں سکتا جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اصل کا یا آمدنی کا خرچ کرنا ضروری تھا، بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح بدستور رہے گا۔

اور اگر بفرض محال منتقل بھی ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے اصناف اربعہ کے وارثوں کی طرف منتقل ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثوں سے کچھ تعلق نہیں۔ سو ابوبکر صدیق نے جو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا تو لِمَ اُس کی یہی ہے کہ ان کی طلب گاری سے یہی بات ٹپکتی تھی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا فدک کو جو بطور فیٔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبض و تصرف میں آیا تھا مثل اور املاک ہر قسم کے تصرف فیٔ قابل سمجھ کر فقط اپنی گذران کیلئے طلب کرتی تھیں بطور تولیّت نہیں مانگتی تھیں۔ ورنہ دعویٰ ہبہ اور دعوے میراث کے کیا معنی ؟ معہذا روایت مجاج السالکین جس کا ترجمہ تو مذکور ہو چکا اور عبارت بھی انشاء اللہ قریب ہی مذکور ہوگی اس دعوے کے لئے دلیل کامل ہے۔ اہل فہم اس روایت سے آپ سمجھ جائیں گے کہ ابوبکر صدیق کا نہ دینا فقط اسی وجہ سے تھا کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا فدک کو اپنے صرف کے لئے طلب فرماتی تھیں۔ ورنہ اگر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا بھی اس لئے طلب فرماتیں کہ مصرف مذکورہ میں صرف کریں تو ابوبکر صدیق یوں کیوں عذر کرتے کہ میں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مصرف میں صرف کرتے ہوئے دیکھا ہے۔
مگر چونکہ اہل حق بعد ظہور حق کے مان لیا کرتے ہیں جب حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی فہم مبارک میں حضرت ابو بکر صدیق کی بات آگئی اور صدیق اکبر کو اسم با مسمی صدیق صادق پایا، یہ گمان خود پہلے سے نہ تھا کہ ابو بکر صدیق آپ خورد برد کرلیں گے اس کام کے اپنے سر رکھنے میں غلجان دیکھا۔ تو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے ابو بکر صدیق کا عذر قبول فرمایا اور ان کا قول مسلم رکھا۔ اور فدک کی آمدنی کے صرف کا انتظام اور اہتمام ابو بکر صدیق ہی کے سر ڈالا اور راضی ہوگئیں۔ چنانچہ ناظران روایت مذکورہ پر مخفی نہ رہے گا۔ اس پر بھی شیعہ نہ مانیں تو اور کیا کہا جائے کہ ان نااہلوں کو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے اتباع سے غرض نہیں۔ صحابہ کی عداوت کے لئے اہل بیت کے نام کو آڑ کر رکھا ہے۔

آیت میں لام کے مختلف معنی مراد لینے پر مفاسد

الحاصل اگر بفرض محال فللہ سے تو یہ مراد ہو کہ مالک حقیقی خداوند کریم ہے اور فللرسول کا یہ مطلب کہ مالک مجازی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور لذی القربی الخ کے یہ معنی ہوں کہ ان مصارف میں صرف کیا جائے تو اہل سنت کو تو اس کی تسلیم میں کچھ دشواری نہیں مالک فدک بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور وراثت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی سہی لیکن ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ کی طرف سے خرچ کرنے کے داروغہ تھے۔ برضائے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا فدک کی آمدنی کو مصارف معلومہ میں صرف کرتے تھے۔ پر سنیوں کی اس طفل تسلی سے شیعوں کے کیا ہاتھ آئے گا۔ اُلٹا بیس طرح کی خرابیاں اور جوابدہی سر دھرنی پڑیگی۔
اول تو نعوذ باللہ یہ لازم آئے گا کہ خداوند کریم نے با ایں ہمہ عنایت اس تملیک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مقرب اور محبوب کے ساتھ وہ معاملہ کیا جیسے کہا کرتے ہیں "گھر بار سب تیرا ہے پر کوٹھی کُٹھلے کو ہاتھ نہ لگانا" سبحان اللہ جو بات مخلوق کے حق میں بھی معیوب ہو وہ شیعوں کو اس صورت

میں جناب باری تعالی کی نسبت تجویز کرنی پڑے گی۔ دوسرے یہ کہ قرآن شریف کے اعجاز کا شہرہ اور بوجہ فصاحت و بلاغت اور خوبی عبارت و مضامین جناب باری تعالے کا یوں دعوے کرنا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ یعنی ایسی کوئی ایک سورت ہی لے آؤ زیادہ نہیں تو اِنَّا اَعْطَیْنَا ہی کے برابر ہی۔ اس صورت میں محض بے جا اور بے موقع ہو جائے گا مضمون ایسا کچھ کہ مالک تو کر دیا پر اختیار ذرہ برابر نہ دیا۔ اور عبارت ایسی کچھ کہ معنی مقصود سے کچھ لگاؤ نہیں۔ اگر اس وجہ سے اس موقع میں یوں کہا جائے کہ "المعنی فی بطن الشاعر" تو بے موقع نہ ہو۔
بلکہ انصاف سے دیکھئے تو خلاف مقصود پر البتہ دلالۃ موجود ہے قرینہ عطف سے للرسول ولذی القربی سے ایک طرح کا استحقاق ثابت ہوتا ہے۔ ہاں اگر کوئی اور قرینہ اس سے اقوی اس کے معارض ہو جاتا جیسے للہ میں موجود ہے تو کچھ مضائقہ بھی نہ تھا۔ اس لئے سوا اس کے کہ بطور احوال میری زبان پر آگیا آج تک کسی نے اس کا یہ مطلب ہی نہ سمجھا۔ اور با ایں ہمہ قرآن قرآن مبین بھی رہا۔ تیسرے للہ کے لام کو اگر تملیک کے لئے اس لئے نہیں کہہ سکتے۔ کہ تملیک وہاں ہوا کرتی ہے جہاں پہلے سے ملک نہ ہو تو یہ مسلم لیکن لذی القربی الخ کے لام کے یہ معنی کیوں نہیں ؟ ذی القربی وغیرہ تو کچھ ہم پایہ خدا اور شریک موجودات نہیں جو مالک حقیقی اور مالک قدیمی ان کو کہا جائے ؟ اور تملیک بمعنی مذکور کے گنجائش نہ ہو۔
چوتھے یہ کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک مثل ملک جملہ بنی آدم ہے اور آپ اس قسم کی ملک کے قابل ہیں۔ تو قرینہ عطف یوں تقاضا کرتا ہے کہ جو بات للرسول کے لام سے ثابت ہو وہی لذی القربی کے لام سے ثابت ہو ورنہ ترجیح بلا مرجح ہے۔ اور اگر مثل ملک خداوندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک بھی عوام کی ملک سے ممتاز ہے اور ایک نوع جداگانہ ہے۔ تو ہم

یوں کہتے ہیں کہ جیسے باری تعالیٰ کی ملک میں وراثت جاری نہیں ہوسکتی۔ رسول
اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ملک میں بھی وراثت جاری نہیں ہوسکتی۔

آپ کی ملک میں وراثت جاری نہیں ہوسکتی کیونکہ آپ زندہ ہیں

اور یہ بات دو وجہ سے قرین قیاس بھی ہے۔ اول
تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام انبیاء بالیقین
قبر میں زندہ ہیں۔ تو اس صورت میں آپ کی ملک زایل ہونے ہی نہیں پائی جو وارثوں
کی ملک اس کے قائم مقام ہو۔ بلکہ جیسے ہم تم کہیں چلے جائیں یا چندے کسی گوشہ
میں بیٹھ رہیں۔ اور ہمارے لواحق وغیرہ ہماری اشیاء کو برتیں تو اس سے ہماری
ملک زائل نہیں ہوتی، اور برتنے والے وارث مالک نہیں ہوجاتے۔ ایسے
ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی گوشۂ قبر میں پنہاں ہوگئے ہیں۔ اور آپ
بدستور اپنی اشیاء، اموال کے مالک ہیں کوئی اور مالک نہیں ہوگیا۔ اور حدیث
لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَا صَدَقَۃٌ جو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔
اس حدیث کی لم بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ آپ اب تک بقید حیات ہیں۔ پر شیعہ
نہ سمجھیں تو کیا کیجئے؟

خدا کی مالکانہ شان آپ کو اتنی مشاہد تھی کہ اپنی ہر چیز کو عاریت یقین کرتے تھے

اور اگر شیعی یا کوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و
سلم کے زندہ ہونے کو نہ مانے تو دوسری وجہ
یہ ہے کہ انبیاء، خاصکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسبب کمال درجہ کی حقیقت شناسی
کے ہر دم و ہر لحظہ خداوند کریم مالک الملک کی ملکیت کو دیکھتے ہیں۔ اور اس کا مالک
ہونا ہر وقت ان کے پیش نظر ہے۔ اس لئے اپنی ملک کو ملک ہی نہیں سمجھتے۔
بلکہ جیسے کوئی کسی کے گھر دعوت کھانے جاتا ہے اور اس کے کھانے کو بمنزلہ اور
اثاث البیت کھانا کھلانے والے ہی کی ملک سمجھتا ہے۔ پر خاص اس کھانے کی
نسبت جو اُس کے سامنے رکھا جاتا ہے فقط کھا لینے کی اجازت سمجھتا ہے۔ نہ یہ
کہ اپنا سمجھ کر کسی کو دیدے یا بیچ ڈالے یا اپنے لواحق کے لئے لیجائے۔ بلکہ اپنے
لئے لیجانا بھی ممنوع جانتا ہے۔ نہیں تو عرف و شرع میں اس بات کو کوئی معیوب

نہ سمجھتا۔
ایسا ہی انبیاء بھی ان اشیاء کو جو ان کے قبضہ میں بطور ملک ظاہر کے آجاتی ہیں
اپنی ملک نہیں سمجھتے۔ بلکہ ملک مالک الملک سمجھ کر بمنزلہ مہمان یا دعوتی کہ جو کچھ
اُس سے کھایا گیا کھایا گیا باقی مالک خانہ کا ہے۔ جو کچھ اپنے کام آیا اپنے کام
میں لائے باقی کو خدا کی ملک سمجھ کر اس دار دنیا سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔
پھر جب ان کے نزدیک اُن کا ترکہ ان کی چیز ہی نہ ہوئی تو یہ قبض حین حیات
اور استعمال بمنزلہ قبض طعام دعوت اور استعمال مال مستعار ہوگا۔ اور ان کے
عندیہ میں وارثوں کو اُس میں سے کچھ حق نہ پہونچے گا۔ اسی واسطے رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہو۔ لانورث ما ترکناہ صدقۃ۔

ایک شبہ کا ازالہ

اور یہ بات کہ اگر انبیاء کا مقبوضہ ان کی ملک ہی نہیں تو اُن کی
بیع و شرا بھی چاہیئے کہ نافذ نہ ہوا کرے۔ کسی نادان ہی کے دل میں کھٹکے تو کھٹکے ؟ کیونکہ
جنسے محبت ہوتی ہے بسا اوقات اہل دنیا بھی اُن کو اس بات کی اجازت دیدیا کرتے
ہیں۔ کہ وقت ضرورت ہماری چیز کو بیچ لینا خداوند کریم تو درکنار بلکہ یاران بے تکلف
تو اجازت کے بھی محتاج نہیں ہوتے۔ دوستوں کی چیزیں اجازت ہی سمجھتے
ہیں لیکن اس اجازت کو موجب ملک کوئی نہیں سمجھتا۔ یہاں تک کہ اُس کے وارث
بھی اُس کے مستحق ہوجائیں۔ الحاصل انبیاء کی حقیقت شناسی اسی بات کو مقتضی ہے
کہ اپنے مقبوضہ کی نسبت اپنے آپ کو مالک نہ سمجھیں۔ ہاں اُس کو من جانب اللہ وقف
سمجھ کر اور ملک خداوند کریم جانکر حسب ضرورت اپنے کام میں لاتے رہیں۔
باقی رہے عوام اور سوائے انبیاء کے اور لوگ ہر چند کتنے ہی باکمال کیوں نہ ہوں
بمنزلہ عوام ہی کے ہیں سو ان کو انبیاء کے مقابلہ میں بمنزلہ اطفال اور مجانین کے بڑوں بوڑھوں
عقلمندوں کے مقابلہ میں سمجھنا چاہیے یعنی جیسے اطفال بے تمیز اور مجنونانِ الطفال
سیرت دعوت یا غیر کی کسی قسم کی چیز کو اگر ان کے پلے پڑ جائے۔ اپنی سمجھ کر اگر مالک بھی
اُن سے لینے لگے تو غل مچا دیتے ہیں۔ اور رونے دھونے لگتے ہیں۔ اور مالکان سیر چشم

چشم پوشی کرکے چپ ہو رہتے ہیں اور اُس کھانے کو انھیں کو لیجا لے دیتے ہیں۔ اور اُن اشیاء کو انھیں کے پاس چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ ایسے ہی عوام بھی اس متاع دنیا کو جو حقیقت میں ملک مالک الملک۔ مالک حقیقی کی ہے اُن کے پاس مستعار ہے۔ گو زبان سے خدا کی کہے جائیں پر دل سے اپنی ہی سمجھتے ہیں۔ اور اگر کسی ایک آدمی نے اُس کو دل سے بھی خدا ہی کی سمجھا۔ تو اول تو پورا پورا سمجھنا کہاں ؟ دوسرے کسی کو کیا معلوم ؟ دل کی بات سوا خدا کے کون جانتا ہے ؟ جو اُن کے مال میں وراثت جاری نہ کی جاوے۔ مثل نبوت اگر ان کے اندر بھی اس کی کوئی علامت ہوتی تو یوں بھی ہوتا۔ اس لئے خداوند اکرم الاکرمین نے براہ چشم پوشی اُن کے متروکہ کو انھیں کی ملک قرار دے کر بقدر مناسب اُن کے پس ماندوں کو تقسیم کر دیا۔

القصہ ان وجوہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ملکِ انبیاء برنگ ملکِ خدا قابلِ وراثت نہیں۔ اور اگر براہ تعصب ان وجوہ کو کوئی تعصب سمجھے۔ تو یہ احتمال تو کہیں نہیں جانے گا۔ کہ ملکِ انبیاء شاید قابل وراثت نہ ہو۔ یہ وجوہ غلط ہیں تو ہوا کریں شاید کوئی اور ہی وجہ ہو۔ مدعیان وراثت کو جب بھی مشکل ہی رہے گی۔ القصہ لِلرَّسُوْل سے ایسی ملک کو ثابت کرنا جو برائے نام ہو اہل سنت کو تو کچھ مضر نہیں۔ پر شیعی اتنا تو سمجھ لیں کہ کوئی اجنبی ایسی نا معقول باتوں پر کیا کہے گا ؟ القصہ اہلِ دانش و فہم کے نزدیک لام للرسول ولذی القربیٰ سے ملکیت اور استحقاق اصنافِ مندرجۂ آیت مثل لام للذکر مثل حظ الانثیین یا لام لکم رؤس اموالکم جو پہلا ملکیت اور دوسرا استحقاق پر دلالت کرتا ہے ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا۔

آیت میں لام بیان مصارف کے لئے ہے

ہاں اگر مثل لام انما الصدقات للفقراء و المساکین الخ بیان مصرف کے لئے کہا جائے تو البتہ قرین عقل اور شیعوں کے نزدیک بھی واجب التسلیم معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اول تو اس میں کچھ خرابی نہیں۔ بے غل و غش عقل اسے مسلم رکھتی ہے۔ اور بوجہ بے عقلی اگر عقل کی بات کے تسلیم کرنے میں شیعوں کو

کچھ عذر ہو تو آیۃ واعلموا انما غنمتم من شیء فان للہ خمسہ میں جو بعینہا آیۃ ما افاء اللہ کے مطابق ہے۔ اتفاقات سے شیعوں کے نزدیک بھی لام بیان مصرف ہی کے لئے ہے۔ چنانچہ ابو القاسم صاحب شرائع الاحکام نے جو ملقب بمحقق ہے اور سوا اُس کے اور علماء امامیہ نے اس بات کو بتصریح کہا ہے۔ بلکہ اس مذہب کے اماموں سے بھی بہ سند بیان کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو کوئی کسی چیز کا مصرف ہوتا ہے اگر مالکِ مال اُس کو نہ دے تو اہلِ مصرف اس کے دادخواہ نہیں ہو سکتے۔ بالجملہ اہلِ مصرف قبل عطا مالک نہیں ہوتے۔ اس لئے فقراء وغیرہ کو زکوٰۃ اور صدقات کا قبل از عطا کوئی مالک نہیں سمجھتا تو اس صورت میں اس آیت میں بھی لام ملکیت اور استحقاق پر دلالت نہ کرے گا۔ اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک وغیرہ آراضی فَۓ کا تقسیم کرنا ضروری نہ سمجھا۔ بلکہ آمدنی کو ہمیشہ تقسیم فرماتے رہے۔ اگر لام للرسول وغیرہ ملکیت اور استحقاق پر دلالت کرتے تو قرینہ لفظ افاء اللہ کا اس بات کو مقتضی تھا کہ اصل زمین کو بانٹ کر مستحقوں کو حوالہ فرماتے۔ کیونکہ اصل زمین مصداق ما افاء اللہ ہو سکتی ہے نہ کہ آمدنی چنانچہ ظاہر ہے۔

اہل شیعہ کا اعتراض کہ ما افاء اللہ کا مقتضی زمین کی تقسیم تھا اور آپ آمدنی تقسیم فرماتے رہے ؟

یہاں اگر شاید کسی عقل کے دشمن کو یہ شبہ حیران کرے کہ ہم نے مانا یہاں مصرف سے ملکیت اور استحقاق ثابت نہیں ہوتا تا وقتیکہ اہل مصرف کو کچھ عطا نہ کیا جائے۔ ان کی ملک میں نہیں آتا۔ لیکن لفظ ما افاء اللہ اس بات کو تقاضا کرتا ہے کہ اصنافِ مندرجۂ آیت مصرف اہل زمین ہوں۔ تو اس صورت میں لازم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصل زمین کو تقسیم فرماتے۔ آمدنی کا تقسیم کرنا بظاہر خلاف آیت ہے۔ سو اس خاکپائے علماء کی گذارش یہ ہے کہ اس قسم کے شبہ کا جواب اہلسنت تو انشاء اللہ بطور معقول دے نکلیں گے لیکن شیعی اتنا تو سمجھیں کہ یہ اعتراض اہلِ سنت پر نہیں بلکہ صاحب سنت سرور کائنات خلاصۂ موجودات علیہ وعلی آلہ افضل

الصلوات والتسلیمات پر ہے۔ سو اس صورت میں آپ نے مذہب کی بھی خبر نہیں ایسے شبہ کا جواب ہماری طرف سے تو وہی شعر مشہور بہت ہے۔ ؎

شادم کہ از رقیبان دامن کشاں گذشتی ؛ گو مشت خاک ما ہم برباد رفتہ خند

با ایں ہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فدک کو تقسیم کرکے ندینا ہمیں تو ایمان کے لئے کچھ اور افعال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم نہیں۔ ہم تو بے دلیل اس کو صحیح سمجھتے ہیں لیکن درصورتیکہ ابو بکر صدیق وغیر اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرفداری میں ہم کو اتنا بکھیڑا کرنا پڑا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرفداری اور حمایت کیونکر نہ کریں گے اگر شیعوں کو خلفاء کے بغض اور حسد کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اس بات کا طعن ہے۔ کہ آیت سے تو آمدنی کا مصارف مندرجۂ آیت میں صرف کرنا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر اہل مصرف کا دینا اس آیت سے نکلتا بھی ہے تو اصل زمین کا نکلتا ہے۔ پھر آپ نے اصل زمین ہی کیوں نہ تقسیم فرمائی؟ تاکہ سب نہیں تو کچھ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ پر آتا۔ اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا بہ نسبت فدک دعویٰ وراثت صحیح ہو جاتا۔ اور یہ طعن جو ابو بکر صدیق پر (بوجہ نہ دینے میراث کے) ہم کرتے تھے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا پر حسب مزعوم شیعہ پلٹ کر نہ آتا کیونکہ وہ معصوم تھیں۔ اور معصوم سے یہ بات کہ جو اپنے مورث کی چیز ہی نہ ہو اس میں دعویٰ وراثت کا کرے (اس اہتمام سے کہ شیعوں سے سب ہی نے سنا ہوگا) ہرگز تصور میں نہیں آسکتا۔

اور ایک شے اگر مالک اہلِ مصرف میں سے کسی ایک کو اس غرض سے عطا کرے کہ اس قدر اوروں کو دے کر باقی جو بچے اس کو اپنے آپ رکھ لے۔ تو اس کا دینا لینا تا وقتیکہ جس کو وکیلِ تقسیم بنایا ہے تقسیم نہ کرے، اُس قدر میں کہ جس قدر بعد تقسیم اس کے پاس باقی رہ جائے گا اس کے لئے موجبِ ملک نہیں ہو سکتا، اور وجہ اس کی ظاہر ہے۔ کیونکہ ہبہ اشیائے مشترکہ میں باتفاق فریقین بے قبض موجب مِلک نہیں ہو سکتا۔ اور قبض بے تقسیم متصور نہیں۔ تو اس صورت میں یوں

بھی نہیں کہہ سکتے کہ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قابض تو تھے ہی! اگر اور کوئی اصناف مندرجۂ آیت میں سے بایں وجہ مالک نہیں ہو سکتا کہ اہل مصرف قبل عطاء اور قبل قبض مالک نہیں ہوا کرتے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو سب ہی پر قابض تھے اپنا حصہ بھی اس میں آگیا۔

بہر حال کوئی صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مالک ہونے کی نہیں نکلتی جو دعوے وراثت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صحیح ہو۔ بالجملہ ان مقامات میں تصدق اور انفاق ہے اور موصوف بتصدّق اور انفاق (یعنی اموال) کا لحاظ شیعوں کے اطوار سے یوں ٹپکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تقسیم نہ کرنے میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دو وجہ سے حرف ہو۔ ایک تو یہ کہ بظاہر خلاف آیت کیا۔ دوسرے اس تقسیم نہ کرنے کی بدولت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی معصومیت بالکل ہی تھامنی مشکل پڑ گئی۔ اس لئے ہمیں بھی اپنا ما فی الضمیر ضرور عرض کرنا پڑا تاکہ بسبب طرف داریٔ جناب رسالت مآب سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم دامانِ رحمتِ خداوندی میں ہمیں بھی جگہ ملے۔ اور شیعی جوابِ دندان شکن سنکر اپنے کردار کو پہنچیں۔

اعتراض کا جواب کہ اموالِ فَے وقف ہیں نہ کہ ملکیت

جناب من شیعوں کا ایسے مقامات میں لڑنا (قطع نظر اس کے کہ اہل سنت پر کیا اعتراض کرتے ہیں اپنے مذہب پر کرتے ہیں) اس مثل مشہور کا مصداق ہو جاتا ہے ع سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

کیونکہ ما افاء اللہ الخ جملہ اسمیہ ہے، اور جملہ اسمیہ کلام بلغاء اور فصحاء میں موجب دوام و ثبوت ہوتا ہے۔ اور کوئی بشر بمقتضائے بشریت اس قاعدہ کی رعایت میں چوک جائے تو چوک جائے۔ خداوند علیم چوک نہیں سکتا۔ مگر اس صورت میں لازم ہے کہ اللہ اور للرسول اور لذی القربیٰ ہونے کی صفت ما افاء اللہ سے زائل اور منفک نہ ہو۔ اور بایں صفت موصوف ہونے سے اس کی ذات میں کچھ انکار نہ ہو۔ سو یہ بات جبھی بن پڑتی ہے کہ اموال فَے کو چنانچہ مرقوم ہو چکا وقف کہا جائے۔

کیونکر وقف کو دا نما للہ بھی کہہ سکتے ہیں اور اہل مصرف کے لئے بھی کہہ سکتے ہیں

فئے اور صدقات کا ایک لطیف فرق

باقی رہا جملہ انما الصدقات للفقراء الخ ہر چند وہ بھی جملہ اسمیہ ہی ہے لیکن اہل دانش و فہم پر مخفی نہ ہوگا کہ صدقہ ہونا کسی چیز کا خود ایک آنی بات ہے۔ یعنی کبھی آن واحد کے لئے اس صفت کو اپنے موصوف سے ارتباط پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر مثل حرکات کہ سریع الزوال ہوتی ہیں اپنے موصوف سے جدا ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اس صفت کے وجود کے یہی معنی ہیں کہ قدر بقدر اس کی کسی کو دیدیجئے۔ ورنہ قبل دینے کے صدقہ نہیں۔ و الا تمام احکام صدقات مثل ادا فرض اور حصول ثواب اور اطفا غضب رب وغیرہ بے دیئے اس پر مترتب ہوا کریں۔ اور جب دے چکے جب ہی وہ صفت صدقہ ہونے کی اس سے زائل ہو جاتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی محتاج فقیر مسکین مال زکوٰۃ کسی اہل نصاب سے لیکر اپنی طرف سے کسی غنی یا ہاشمی وغیرہ کو دینے لگے تو کچھ ممنوع نہیں۔ بالجملہ صدقہ ہونے کی صفت کا وقت فقط عطا اور قبض ہی ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ یہ ایک آن کی بات ہے سو اس آن تک اس کا للفقراء ہونا کہیں نہیں گیا۔ بعد میں اگر فقراء وغیرہ اس کو کسی کو ہبہ کردیں یا بیچ ڈالیں تو وہ صدقہ ہی نہیں۔ جو پھر بھی فقراء کا استحقاق باقی رہے۔

القصہ یہ قضیہ بھی دوام ہی پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس کے دائمہ ہونے سے ہمیں کیا انکار رہے۔ پر اتنا یاد رکھنا ضرور ہے کہ دوام کے یہ معنی ہیں کہ محمول وقت وجود موضوع حقیقی تک اس کے ساتھ مربوط رہے۔ مگر موضوع حقیقی کا پہچاننا ہر کسی کا کام نہیں۔ ان باتوں کے لئے حقائق شناس معانی سنج چاہئے جس کو خداوند علیم اس قدر بصیرت عنایت فرمائے کہ مناط حکم اور مدار ارتباط موضوع و محمول اور سیاق کلام کو دریافت کر سکے۔ اس کا یہ کام ہے۔ سو جملہ ما افاء اللہ میں موضوع حقیقی مصداق ما ہے اور اس سے مراد خود اراضی فئے ہیں۔ اور صفت افاءۃ فقط تعیین اور تفہیم اور رفع ابہام کے لئے ہے۔ اس لئے للہ وغیرہ ہونا جو مضمون خبر ہے اس کی ذات

کے ساتھ دائم رہے گا۔ اور موافق اصطلاح اہل منطق یہ قضیہ دائمہ ہوگا۔

اور جملہ انما الصدقات وغیرہ میں موضوع حقیقی صفت تصدق ہے ذات اموال نہیں۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کیونکہ یہ جملے اگرچہ خبریہ ہیں اہل فہم کے نزدیک انشائیہ ہیں مطمح نظر ان مقامات میں تصدق اور انفاق ہے۔ اور موصوف بتصدق اور انفاق (یعنی اموال کا لحاظ) فقط اس لئے ہے کہ یہ صفت بغیر اس موصوف کے متحقق نہیں ہو سکتی۔ سو اس جملہ میں دوام محمول تا دوام وصف تصدق چاہئے اور موافق اصطلاح اہل منطق اس کو عرفیہ عامہ سمجھئے اور قضیہ ما افاء اللہ اگرچہ انشائیہ ہے پر اس قضیہ میں صفت افاءۃ مطمح نظر نہیں۔ ورنہ جیسے جملہ انما الصدقات یا جملہ ما انفقتم کا ماحصل تصدقوا اور انفقوا ہے اس جملہ کا خلاصہ افیئوا ہوتا۔ اس تقریر کو سنکر اہل فہم کو تامل نہ رہے گا کہ فعل جناب سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوات و اکمل التحیات میں مطابق آیت ہے۔

معصوم سے خطا سرزد ہونا محال نہیں

باقی رہا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا معصوم ہو کر ایسی غلطی کرنا سو اول تو اہل سنت کے نزدیک سوائے انبیاء کسی کی معصومیت مسلم ہی نہیں۔ دوسرے کسی مقدمۂ خاص میں معصوم سے غلطی فہم ہونا اور غیر معصوم سے نہ ہونا کچھ محال نہیں چنانچہ مضامین متعلقہ آیت محمد رسول اللہ کی تفسیر میں اس کی تحقیق گذر چکی ہے۔ اور بیسیوں نظیریں اس کی کلام اللہ اور احادیث میں موجود ہیں منجملہ اس کے کھیتی کے قضیہ میں حضرت داؤد کا غلطی کھانا حالانکہ نبی ہو چکے تھے۔ اور حضرت سلیمان کا حق بات کا سمجھ جانا حالانکہ جب تک نہ نبی ہوئے تھے۔ نہ موافق اصطلاح شیعہ امام تھے اس دعوے کے لئے دلیل کافی ہے۔ مگر شیعوں کو کلام اللہ یاد نہ ہو یا معنی فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ کا فہم نہ ہو تو اہل سنت کا کیا قصور؟ اس جگہ سے ہر کوئی سمجھ گیا ہوگا کہ شیعوں کا اہل سنت پر یہ طعن کرنا کہ وہ ایسے اماموں کی تقلید اور اتباع کرتے ہیں۔ جو انہیں کے اقرار موافق غلطی کر سکتے ہیں۔ ایسا ہی ہے جیسا اندھا آفتاب کو بے نور بتلائے۔

اور جیسے اندھا آفتاب کو بے نور نہیں کہتا اپنی آنکھوں کو بے نور کہتا ہے شیعی بھی اہل سنت کا قصور نہیں بتلاتے اپنی عقل کے قصور کی گواہی دیتے ہیں۔

اموال فئے آپ کی ملک نہ تھے اس کی تیسری دلیل

اب تیسری دلیل بھی اس احتمال کے بطلان کی کہ اموال فئے مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھے۔ اور یہ مصارف معلومہ کا مقرر کرنا ایسا ہی ہے جیسا زکوٰۃ کے لئے فقراء و مساکین وغیرہ کا مصرف بنا دینا۔ پھر دلیل بھی ایسی کچھ۔ کہ احتمال مذکور تو باطل ہو ہی جائے یہ شبہ بھی مرتفع ہو جائے کہ ما افاء اللہ تو تقسیم اصل زمین کو مقتضی ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل کی جائے آمدنی کو کیوں تقسیم کیا۔؟ صورت اس کی یہ ہے کہ زمین باغ کی آمدنی بھی اثمار اور کھیتی کی پیداوار ہے۔ لیکن بسبب اس کے کہ پھل اور کھیتی اشجار اور زمین کے توابع اور لوازم میں سے ہیں۔ تو پھل کے توڑنے سے پہلے مجموعہ درخت اور پھل کو درخت۔ اور کھیتی کاٹنے سے اول کھیتی سمیت زمین کو زمین کہا کرتے ہیں اس وجہ سے آمدنی بھی ما افاء اللہ ہی میں داخل ہے لیکن جیسے کھیتی میں جو مجموعہ اناج اور بھس کا ہوتا ہے آدمی اور گائے بیل حسب لیاقت شریک ہیں۔ اناج آدمیوں کے لئے اور بھس گائے بیل کے لئے تو ایسے ہی اس شرکت خدا اور بندگان خدا میں بھی جو فللہ وللرسول ولذی القربیٰ الخ میں مذکور ہے خدائے تعالیٰ اور بندگان خدا کو حسب لیاقت و قابلیت شریک سمجھنا چاہیئے۔

مصارف مندرجہ آیت کی تعیین و استحقاق کی باریک حکمت

لیکن خداوند کریم خور و نوش سے غنی ہے اور بندے خور و نوش اور نان و نفقہ کے محتاج۔ یہاں تک کہ ان کے شریک کرنے کی وجہ یہی ان کی احتیاج ہوئی ہے۔ چنانچہ لفظ فقراء اور مساکین میں اہل فہم کے لئے اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ اسی لئے کہ فقیر اور مسکین تو وہی ہوتا ہے جس کے یہاں قُوت یعنی رزق نان نفقہ کی کوتاہی اور کمی ہو چنانچہ زبان دانان عربی اور واقفان اقوال علماء فقہ پر مخفی نہ ہوگا۔ بلکہ لفظ رسول بھی اگر غور سے دیکھئے تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احتیاج اور فقر پر دلالت کرتا ہے

اس لئے اس لفظ سے بے تامل ہر کوئی یوں سمجھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مایحتاج کے بہم پہنچانے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ کیونکہ جب آپ پیغام رسان خداوندی اور قاصد جناب باری ٹھیرے۔ تو تاوقتیکہ آپ اس مشغلہ میں مشغول رہیں اور کار دگر کی فرصت کہاں۔ بلکہ مثل قاصدان پیغام رسانان دنیاوی کہ تا وقتیکہ پیغام پہنچا کر اپنے گھر پر نہیں پہنچ لیتے۔ اپنے کاروبار نہیں سنبھال سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تا وقتیکہ پیغام خداوندی سے فارغ نہ ہولیں۔ اپنے کاروبار کی طرف متوجہ نہ ہو سکتے تھے۔ مگر جب فارغ ہوئے تو وطن اصلی کو تشریف لے گئے۔ اس وطن کے کاروبار ہی نہ رہے جو بطور خود کچھ کھانے پینے کا فکر کرتے۔

مصارف فئے کی ترتیب لفظی کی حکیمانہ تشریح

غرض بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے سروسامانی خود اس لفظ رسول ہی سے ظاہر ہے۔ اتنا فرق ہے کہ اور اصناف مندرجہ آیت کی بے سروسامانی کسی وجہ دنیاوی کے باعث۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے سروسامانی بسبب مشغولی کار خداوندی ہو۔ اسی لئے آپ کو مقدم رکھا۔ غرض ان الفاظ سے خود اہل فہم پر واضح ہے کہ خداوند کریم نے جو ان اصناف کو اموال فئے میں شریک کیا ہے۔ تو بوجہ احتیاج اصناف مذکورہ شریک کیا ہے تو اس صورت میں شرکت اور تقسیم حسب لیاقت یوں ہو سکتی ہے کہ مجموعہ اشجار و اثمار اور مجموعہ زمین اور پیداوار میں جو بہیئت مجموعی عرف میں اور دیکھنے میں ایک شئے واحد گنی جاتی ہے اور ایک نظر آتی ہے۔ اور مجموعہ کو ما افاء اللہ کہہ سکتے ہیں بلکیت جو لوازم غنی ہے خدا کے لئے رہے۔ اور پیداوار جو رفع احتیاج کے لئے ہے بندوں کے واسطے تجویز کی جائے۔

اب دیکھئے کہ اس تقریر سے وہ احتمال بھی باطل ہو گیا کہ مال فئے مملوک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہوا وہ مصرف بطور مصرف زکوٰۃ ہو۔ اور وہ شبہ بھی مرتفع ہو گیا کہ چاہیئے تھا اصل زمین کا تقسیم کرنا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تو تقسیم نہ کیا اور آمدنی کو تقسیم فرمایا۔

اموال فئے کے آنحضرتؐ کی ملک نہ ہونے کی چوتھی دلیل

اب چوتھی دلیل کے سننے کے لئے بھی تیار ہونا چاہیئے۔ تاکہ کثرت دلائل کے زور سے احتمال مذکور دل سے بالکل محو ہو جائے۔ جناب من خبر پر فاء کے داخل ہونے کے قرینہ سے اور نیز بشہادت وجدان صاف ظاہر ہے کہ مبتدا یعنی ما افاء اللہ متضمن معنی شرط ہے تو اس صورت میں للہ وغیرہ ہونے کا ترتب اور توقف افادۃ اور تسلیط پر ضروری ہے اور در صورتیکہ اراضی فئے کو مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیئے تو یہ ترتب اور توقف تو درکنار وجود خبر بھی اپنی ذات سے ضروری نہ ہوگا۔ گو بوجہ معصومیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان امور میں جن کے آپ مامور تھے قصور ممکن نہ ہو۔ ہاں اگر مصرف کہیئے تو پھر یہ ترتب اور توقف اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ توجیہات ذکر للہ سے جو مذکور ہو چکی ہیں آپ عیاں ہے۔

معہذا اگر مقصود شارع یہی ہوتا کہ اراضی فئے مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور للہ اور لذی القربی بایں غرض فرمایا ہے کہ خدا کے واسطے ذی القربی وغیرہ کو دینا چاہیئے تو لاجرم فللرسول وللہ ولذی القربی الخ فرماتے اس صورت میں گو یہ آیت مصداق "المعنی فی بطن الشاعر" تو رہتی لیکن بلا سے یہ ترتب اور توقف تو جو مدلول فاء ہے درست ہو جاتا۔ اور معنی گو کسی کی سمجھ میں نہ آتے فی حد ذاتہ تو صحیح ہو جاتے۔ فصاحت و بلاغت بلکہ باعتبار قواعد زبان دانی صحت عبارت بھی نہ سہی لیکن اتنی غلطی تو نہ ہوتی کہ عبارت برعکس معنی مقصود دلالت کرے۔

اموال فئے کے غیر مملوکہ ہونے کی پانچویں دلیل

پانچویں وجہ احتمال مذکور کے بطلان کی یہ ہے کہ ضمیر کیلا یکون دولۃ بجانب ما افاء اللہ راجع ہے اور کیلا یکون علۃ تعیین مصرف مذکور ہے سو اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ یہ مصرف اس اندیشہ کے لئے مقرر کیا گیا ہے کہ مبادا اراضی فئے تحت تصرف اغنیاء آجائیں۔ مگر اس اندیشہ سے جب ہی تک بچاؤ ہو سکتا ہے کہ اراضی فئے کو مد خرچ اصناف معلومہ کہا جائے ورنہ اگر مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا مملوک کس دیگر ہوں تو ایک نہ ایک روز

یہ خرابی بالضرور پیش آئے گی۔ اصناف مندرجہ آیت اگر خود اغنیا نہیں تو خداوند بے نیاز کی بھی عادت یہ ہے کہ دولت و فقر کو فقط ایک ہی خاندان میں دائم و قائم نہیں رہنے دیتا۔ بسا اوقات اولاد اغنیا فقیر اور پسماندگان فقراء امیر ہو جاتے ہیں سو بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پس از انتقال ذوی القربی وغیرہم اگر حسب مزعوم شیعہ اراضی فئے میں وراثت جاری ہوگی۔ تو بیشک اس سلسلہ میراث میں بہت سے اغنیا بھی نکلیں گے اور وہ خرابی جس کے بچاؤ کے لئے یہ مصرف مقرر کیا تھا بحال خود رہے گی۔

اور یوں کہنا کہ اغنیا سے مراد فقط حکام یا اغنیائے لشکر ہی ہیں محض تعصب ہے۔ لفظ عام سے بے قرینہ معنی خاص مراد لے لینا عوام کا بھی کام نہیں چہ جائیکہ علماء جو خواص امت ہیں۔ ہاں اگر قطع طمع اغنیاء لشکر افسران فوج کے لئے یہ آیت نازل ہوئی ہو۔ یا حکام جاہلیت اس قسم کی اراضی کو خاص اپنے لئے رکھتے ہوں اور اس قانون نامعقول کے موقوف کرنے کے لئے یہ مصرف مقرر فرمایا ہو۔ تو در صورت فرض و قوع امور مذکورہ بیش برین نیست کہ حکم عام کے لئے شان نزول خاص ہو۔ سو یہ بات کچھ اسی جگہ خاص نہیں بیسیوں آیات اور سینکڑوں احادیث کی شان نزول خاص اور حکم عام ہے۔ اور اس کا عموم بالعموم مسلم ہے۔ خاص کر کتب علم اصول میں بتصریح صحت و امکان خصوص شان اور عموم احکام مذکور ہے۔

اموال فئے کے غیر مملوکہ ہونے کی چھٹی دلیل

چھٹی وجہ احتمال مذکور کے بطلان کی یہ ہے کہ اراضی فئے کے لئے جن اشخاص اور اصناف کو مقرر فرمایا ہے تو ان کو انکے اوصاف سے تعبیر فرمایا ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بصفت رسول اس جگہ ذکر فرمایا اور یتامی اور مساکین اور ابن سبیل کو بوصف یتم اور مسکنت اور مسافرت یاد فرمایا۔ اور ان کے حسب و نسب وغیرہ تشخصات اور تعینات کو ذکر نہ کیا۔ اور پھر اس کے بعد للفقراء المهاجرين الخ اور والذين تبوؤ الدار الخ اور والذين جاءوا من بعدهم الخ کو جو لذی القربی والیتامی والمساکین وابن

السبیل سے بدل ہے ماقبل کا ضمیمہ کیا۔ اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان اوصاف کو اراضی فئے کے مصرف ہونے میں دخل اور اُن اراضی کا مصرف ہونا ان اوصاف پر موقوف ہے۔ اور چونکہ زمین باغ ملک مثل منافع اکل وشرب مثل روٹی پانی وغیرہ جن سے انتفاع ان کے ہلاک ہونے پر موقوف ہے۔ نہیں ہیں۔ بلکہ وقت انتفاع بدستور بحال قدیم قائم رہتے ہیں۔ تو دائماً الی یوم القیمۃ اراضی فئے سے انتفاع انھیں اشخاص کو جائز ہوگا جو موصوف باوصاف مذکورہ ہوں۔ ورنہ دوام وثبوت جو مدلول جملہ اسمیہ ہے باطل ہو جائے گا۔

مگر یہ بات جب ہی بن پڑتی ہے کہ اراضی کو بمعنی وقف کہا جائے اور مصارف مذکورہ میں اصل زمین کو تقسیم نہ کریں اور اصناف مندرجہ کو اس کا مالک نہ کردیں ورنہ بالفعل نہیں تو بعد انتقال مالکان اول یا بعد بیع وشراء کے غیر مصرف میں اس کا صرف ہونا لازم آئیگا۔ اور لحاظ اوصاف ہی کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محققین کے نزدیک اس زمانہ کے خمس اور فئے سے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے خمس اور فئے میں سے بھی سہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساقط ہوگیا۔ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصفِ رسالت مثل اوصاف مسکنت اور مسافرت وغیرہ کسی میں باقی نہیں رہا۔ باقی رہی زکوٰۃ اور صدقات واجبہ اُن کے مصرف ہونے کے لئے بھی تحقیق اوصافِ فقر و مسکنت وغیرہا جس کی طرف آیۃ انما الصدقات مشیر ہے ضروری ہے مگر چونکہ وصف تصدق کو بجز آنِ واحد قیام نہیں چنانچہ ابھی مرقوم ہوا ہے۔ تو وقتِ تصدق تحقق اور وجود اوصاف معلومہ ضروری ہوا کیونکہ فقراء وغیرہم کو آیت انما الصدقات میں فقط اُن اموال کا مصرف مقرر کیا ہے۔ جو موصوف بصدقہ ہوں۔ اس لئے بلفظ صدقات تعبیر فرمایا۔ اور اگر قطع نظر اس وصف کے فقرا وغیرہم کو نفس مال کا مصرف مقرر فرماتے تو مثل انما المخرج من الاموال بنیۃ الصدقۃ یا سوا اس کے اور کوئی ایسی عبارت جس سے مطلق مال کے لئے فقرا وغیرہم کا مصرف ہونا ثابت

ہونا بیان فرماتے۔ الحاصل آیۃ انما الصدقات میں اسناد کو دونوں طرف میں اوصاف ہی سے ارتباط ہے اور آیۃ ما افاء اللہ میں ایک طرف ذات اور دوسری طرف اوصاف ہیں۔ اس لئے زکوٰۃ میں دونوں اوصاف کو اور فئے میں فقط ایک جانب میں اوصاف کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

اموال فئے کے غیر مملوک ہونے کی ساتویں دلیل

ساتویں وجہ احتمال مذکور کے بطلان کی یہ ہے کہ مالک حقیقی تمام مخلوقات اور موجودات کا بالاتفاق اور بالبداہت مالک الملک خداوند کریم ہے۔ اور باوجود اس کے پھر ہمارا تمھارا مالک ہونا ایک معنی مجازی ہیں۔ جیسے کوئی شخص اپنے چند مکان چند آدمیوں کو مستعار یا کرایہ پر رہنے کو دے۔ اور وہ چند اشخاص اپنے اپنے رہنے کے مکان کو محاورۃً اپنا گھر کہدیا کرتے ہیں۔ چنانچہ سب جانتے ہیں۔ ایسے ہی ہیں بھی مالک حقیقی نے ہماری اشیاء مقبوضہ گو انتفاع کے لئے دے رکھی ہیں۔ اور ہم اُن کو اپنے محاورات میں اپنا کہنے لگے ہیں لیکن جیسے مکانات کا مستعیر یا کرایہ دار ہونا عاریۃً لینے اور کرایہ لینے پر منحصر اور موقوف ہے۔ فقط مالک مکان کی ملکیت کفایت نہیں کرتی۔ بلکہ اگر عقد کرایہ اور عاریت ظہور میں نہ آئے تو پھر مالک اصلی ہی کی طرف آرہے گی۔ ایسے ہی ہمارے مالک ہونے کے لئے بھی اسباب تملیک ظاہری مثل بیع وشراء ہبہ وصیت وغیرہا ضروری ہوئے۔ ورنہ تمام موجودات پھر خدا ہی کی طرف مملوک ہونے میں منسوب رہیں گے۔

مگر چونکہ اموال فئے مشار الیہا بلفظ ما افاء اللہ میں ان اسباب میں سے فقط غنیمت ہونے کا توہم ہوسکتا تھا اور اس کو جناب باری نے فما اوجفتم سے دفع کر دیا تو یہ اموال سوائے خداوند کریم مالک الملک کے اور کسی کی طرف بطور ملکیت منسوب نہیں ہوسکتے۔ پھر اس صورت میں للرسول ولذی القربیٰ کے معنے بجز بیانِ مصرف اور کچھ نہیں ہوسکتے۔ سو یہی ہمارا مطلب تھا بالجملہ ان سات وجوہ سے اراضی فئے کا مدخرج پنج اقسام معلومہ ہونا مثل مدلولاتِ حواس ہر کس و

تاکس پر واضح اور لائح ہوگیا۔ اور باوجود تمد و خروج ہونے کے وجہ طلب کرنے حضرت خیر النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا، کی اول تو یہ ہے کہ جناب سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا معصوم نہیں۔ اور معصوم بھی ہوں تو معصوم سے غلط فہمی محال نہیں۔ چنانچہ معلوم ہوچکا اور وجہ غلط فہمی کی یہاں ظاہر بھی ہے۔ کیونکہ جناب سیدۃ النساء فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے ہمیشہ اراضی فئے پر قبض و تصرف حضرت خلاصۂ موجودات سرور کائنات علیہ و علی آلہ افضل الصلوٰۃ واکمل التحیات والتسلیمات کا دیکھا تھا۔ اور اس بات کی تحقیق کہ یہ از قسم غنیمت ہے یا از جنس فئے ہے۔ زنان خانہ نشین اور وہ بھی ایسی زاہدہ کہ سامان دنیا وما فیہا سے کچھ غرض نہ ہو بہت دشوار ہے۔ خاص کر خیبر اور قریٰ خیبر کی نسبت کہ فدک بھی انھیں میں سے ہے۔

کیونکہ بعض قریٰ خیبر عنوۃً یعنی بعد جنگ و جدال اور بعضے قریٰ جیسے فدک صلحاً مفتوح ہوئے ہیں۔ اس لئے بہ نسبت خاص خیبر کے مابین علما اختلاف بھی ہے۔ کہ آیا خیبر عنوۃً فتح ہوا ہے یا صلحاً الحاصل اراضی فئے کا مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہونا اہل انصاف پر روشن ہوگیا۔ اگرچہ اہل فہم کو پہلے بھی اس میں تامل نہ تھا کیونکہ باوجود یقین مصارف معلومہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مملوک ہونے کی کوئی صورت بھی تھی تو یہی تھی۔ کہ اُن اوصاف کا مقرر فرمانا ایسا ہو جیسا کہ زکوٰۃ اموال مملوکہ اغنیاء کے لئے فقراء وغیرہم کا مقرر کرنا۔ سو یہ بات گو فی حد ذاتہ ممکن تھی لیکن قرینۂ عطف للرسول ولذی القربیٰ اس بات کو مقتضی تھا کہ جیسے ذوی القربیٰ وغیرہم بالاتفاق مالک اراضی فئے نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مالک نہیں۔

ذوی القربیٰ کو اگر فئے کا مالک مانیں تو دو خرابیاں موجود ہیں

اور اگر قطع نظر اتفاقِ امت کے ذوی القربیٰ وغیرہم کو مالک کہا جائے تو بہت سے بہت ہوگا تو اراضی فئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصناف باقیہ میں مشترک ہوں لیکن دو خرابیاں اور موجود ہیں۔ ایک تو شرکاء غیر محدود کا شریک ہونا۔ کیونکہ ذوی القربیٰ وغیرہم کا

کوئی حد و پایاں نہیں۔ ہر روز کمی و بیشی رہتی ہے۔ خاص کر والذین جاؤ امن بعدھم نے تو دائرہ اہل مصرف کو اتنا فراخ کردیا ہے کہ قیامت تک کے مومنین کو گھیر لیا ہے۔ دوسرے قبل عطا مال غنیمت۔ بلکہ دین بھی ملک میں نہیں آسکتا۔ اراضی فئے جو کسی طرح اس کے حصول میں اہل مصرف کی سعی و کوشش یا کسی کے فعل کو دخل نہیں۔ محض فضل خداوندی سے ہاتھ لگ گیا ہے۔ کیونکر قبل عطا اور قبل قبض کسی کا مملوک ہوسکے۔

الحاصل اہل عقل پر بادی النظر میں اس عبارت سے اراضی فئے کا غیر مملوک ہونا عیاں تھا اور اب سب پر واضح ہوگیا بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہوگیا کہ جیسے اس آیت سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ امکان ملکیت بھی ثابت نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا محال ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور اسی لئے مجکو بھی اتنی تطویل کی ضرورت پڑی۔ ورنہ عدم ثبوت ملکیت خود ظاہر تھا۔ البتہ بایں نظر کہ کم فہموں سے مقابلہ ہے۔ عدمِ ثبوت ملکیت میں گفتگو کرنی ضروری تھی۔

مَامَلَكَتْ يَمِيْنُكَ سے دعوائے وقف پر اشکال

مگر اتنی بات باقی رہی کہ لفظ ما افاء اللہ عام ہے اشیاء منقولہ و غیر منقولہ کو برابر شامل ہے پس اگر ما افاء اللہ بوجوہ مذکورہ وقف ہے تو لاجرم اسباب منقولہ بھی وقف ہوں گے۔ سو اس صورت میں دو خرابیاں لازم آئیں گی۔ اول تو یہ کہ حنفیوں کے نزدیک اشیاء منقولہ کا وقف ہونا ہی صحیح نہیں۔ دوسرے یہ کہ اموال فئے میں سے بہ نسبت اموال منقولہ کے وقف ہونا کسی سے منقول اور مروی نہیں۔ بلکہ اگر تعامل سلف و خلف پر نظر کیجئے تو عیاں ہے کہ منجملہ اموال فئے اسباب منقولہ میں تصرفات مالکانہ کرتے تھے۔ بیع و شرا وغیرہ آثار ملکیت جو وقف نہ ہونے پر دلیل کامل ہیں برابر بے تکرار اور انکار مروّج رہے ہیں۔ چنانچہ بنی النضیر کے ہتھیار وغیرہ اموال منقولہ جو ہاتھ آئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تقسیم فرما دیئے تھے۔ اور صراحۃً نہ کنایۃً یوں نہ فرمایا کہ یہ اشیاء وقف ہیں۔ ان میں تصرفات مالکانہ مت کیجو۔

اور یہ بھی نہ سہی کلام اللہ سے زیادہ تو کوئی حجت نہیں کلام اللہ میں خود موجود ہے ما ملکت یمینك مما افآء اللہ علیك مطلب یہ ہے کہ اے نبی ہم نے حلال کیں تیرے لئے وہ باندیاں جن کا تو مالک ہوا ہے اموال فئے میں سے" اس آیت سے صریح ثابت ہے کہ فئے کے غلام باندی مملوک ہو سکتے ہیں وقف نہ تھے۔ جب ایک چیز کا بھی اموال فئے میں سے مملوک ہونا ثابت ہوا تو فللہ وغیرہ الفاظِ آیۃ ما افاء اللہ اور الفاظ سیاق وسباق آیۃ مذکورہ کے اور جن کے وسیلہ سے وقف ہونا اراضیٔ فئے کا ثابت کیا گیا ہے۔ وہ معنی نہ ہوں گے جو وقف ہونے پر دلالت کریں۔ اور نہ کلیۃً قضیہ ما افاء اللہ اس بات کو مقتضی ہے کہ تمام افراد ما افاء اللہ کا ایک حکم ہو۔ خواہ اسباب منقولہ ہوں خواہ غیر منقولہ وقف ہوں تو دونوں ہوں۔ وقف نہ ہوں تب دونوں ہوں

اشکال مذکور کا جواب

اس لئے ہمیں بھی اس خلجان کو رفع کرنا ضرور پڑا۔ سو اہل انصاف کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ واقعی امام ابوحنیفہ کے نزدیک اشیاء منقولہ وقف نہیں ہو سکتی لیکن خداوند کریم وعلیم وحکیم کچھ امام ابوحنیفہ کا مقلد نہیں جو اس کے ذمہ اتباع رائے ابوحنیفہ ضروری ہو۔ اور اگر اتفاقات سے کوئی بات بظاہر خلافِ مذہب حنفی صادر ہو جائے تو اس کی جوابدہی اس کے ذمہ پر لازم ہو۔ بیش بریں نیست کہ امام ابوحنیفہ سے خطا ہوئی ہو۔ لیکن شیعی ہی یہ فرمائیں کہ اہل سنت امام ابوحنیفہ کو معصوم ہی کب سمجھتے ہیں جو یہ خرابی ان کے سر پڑے بلکہ اہل سنت کا یہ مقولہ ضرب المثل ہو گیا ہے المجتہد یخطی ویصیب یعنی مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور صحیح بھی کہتا ہے" ہاں اتنی بات مسلم کہ مرتبہ اجتہاد کو یہ لازم ہے کہ اکثر صحیح کہا کرے۔ سو اس بات میں ان سے غلطی ہو گئی ہو تو کیا حرج ہے؟ ان کے صاحبین وغیرہ کی رائے تو آخر یہی ہے کہ اشیاء منقولہ بھی وقف ہو سکتی ہیں۔ وہ بھی اہلسنت ہی کے پیشوا ہیں شیعوں کے نہیں اور اگر شیعی ان کو اپنا پیشوا بنالیں اور طوسی ورضی وشریف مرتضی والوالقاسم محقق وغیرہم کا اتباع چھوڑ دیں

تو زہے نصیب اُن کے۔ پھر کچھ تکرار نہیں بمعہذا یہ آیۃ کچھ معارض اور مناقض رائے ابوحنیفہ نہیں بلکہ موافق ہی ہو تو کچھ عجیب نہیں۔ اگر اس معما کی شرح مطلوب ہے تو کان دھر کر سنئے لیکن شرط یہ ہے کہ انصاف مدنظر ہو اور میری ہیچمدانی پر نظر نہ ہو ماسبق اس آیت کا ھو الذی اخرج الذین کفروا من دیارھم سے لیکر لیخزی الفاسقین تک اس بات پر دلالۃ کرتا ہے۔ کہ ما افاء اللہ سے مراد فقط مکانات سکنی اور اراضیٔ صحرائی ہیں تو اب اس صورت میں بجز اموال غیر منقولہ اراضی وباغات ما افاء اللہ سے مراد نہ ہوں گے۔ اور باعتبار خصوص ماسبق کے لفظ ما کا باوجود عموم ذاتی کے مخصوص ہو جانا ایسا شائع وذائع ہے۔ کہ ہر ادنیٰ واعلیٰ جانتے ہیں اطفال کافیہ خوان بھی سمجھتے ہیں کہ الاسم ما دل علی معنی میں ما سے مراد کلمہ ہے۔ اس لئے مولانا جامی شرح ملا میں کلمۂ ما کی شرح میں کلمہ ہی لکھتے ہیں۔ القصہ ما افاء اللہ سے علی العموم اموال منقولہ غیر منقولہ سب مراد نہیں فقط اموال غیر منقولہ مراد ہیں۔ چنانچہ جملہ کی لایکون دولۃ بھی اسی طرف فی الجملہ کھینچتا ہے۔ اس لئے کہ تداول در دولت کے تو یہ معنی ہیں کہ ایک شئ بحال خود باقی رہے۔ اور باایں ہمہ کسی کسی کے پاس منتقل ہوتی رہے۔ سو یہ بات بجز اموال غیر منقولہ اور کسی میں بطور کمال متصور نہیں۔ اقسام غذا اور اقسام لباس اور اقسام مرکب سب کے سب بسبب استعمال فنا ہو جاتے ہیں یا فنا ہونے لگتے ہیں۔ اگر چندے کوئی چیز قائم رہی تو کیا قائم رہی؟ یوں تو کچھ نہ کچھ سب اشیاء کو قیام ہے روٹی سالن بھی تھوڑی دیر تو ٹھیرے ہی رہتے ہیں مگر اس جگہ اتنے قیام سے کیا کام چلتا ہے یہاں تو بشہادت والذین جاؤا من بعدھم قیامت تک کا حساب کتاب ہے۔ بہرحال ما افاء اللہ میں اموال غیر منقولہ داخل ہی نہیں جو اعتراض معترض واقع ہو۔ اور ہمیں فکر جوابدہی ہو۔

وقف کا معنی کیا ہے اور وقف کے قابل کونسی چیزیں ہیں؟

ہاں اتنی بات البتہ قابلِ لحاظ ہے کہ ہم نے مانا اموال منقولہ ما افاء اللہ میں داخل ہی نہیں لیکن اموال منقولہ کا جو بطور فئے حاصل ہوتے ہیں کیا حکم ہے؟ مثل اموال غیر منقولہ وقف

بمعنی مذکور سمجھنا چاہیئے یا مثل غنیمت مملوک ہوسکتے ہیں ؟ سو اپنے فہم نارسا میں یوں آتا ہے کہ وہ قابل ملک وعطا ہیں۔ اگر اہل فہم بھی اسی جانب ہوں تو فبہا ورنہ ہمارا کیا نقصان ہے ؟ ہم اس کے وقف ہونے کو اگر ثابت ہوجائے تو اپنی کہی ہوئی بات یعنی وقف نہ ہونے سے بھی زیادہ خوش ہوکر تسلیم کریں۔ اگر وہ بھی وقف ہوجائے تو کچھ اعتراض ہی باقی نہ رہے۔ خیر اب اپنے خیالات کو عرض کرتا ہوں بگوش ہوش وچشم انصاف غور سے سنیئے اور ملاحظہ فرمایئے وقف ایسی چیز ہونی چاہیئے کہ بحال خود باقی رہے۔ اور پھر کام آسکے۔ چنانچہ وقف کے معنی بھی یہی ہیں کہ اصل محبوس اور موقوف رہے۔ اور منافع مصارف وقف میں صرف کئے جائیں۔

اشیائے منقولہ میں سے پھل اور غذا وقف کے قابل نہیں

معہذا فئے کے وقف بمعنے مذکور ہونے میں اس تغائر ذات اور منافع کی خواہمخواہ ضرورت ہے۔ کیونکہ للہ اور للرسول ولذی القربیٰ وغیرہم ہونا جب ہی صحیح ہوسکتا ہے کہ اصل اللہ تعالیٰ کے لئے رہے اور منافع اوروں کے لئے چنانچہ مذکور ہوچکا۔ سو یہ بات وہاں ہوسکتی ہے جہاں وہ چیز اور ہو اُس کے منافع اور۔ ورنہ خود منافع میں یہ قابلیت نہیں۔ سو اموال منقولہ میں سے اقسام غذا کا تو منجملہ منافع ہونا ظاہر ہی ہے۔ کیونکہ منافع کے معنی اس جگہ فقط اتنے ہی ہیں کہ استعمال کامل کے بعد پھر قابل استعمال باقی نہ رہے۔ بلکہ استعمال ہی میں فنا ہوجائے۔ سو اقسام غذا کا منافع ہونا تو ظاہر ہے ماسوا اس کے اور اسباب منقولہ مثل اقسام لباس و سواری وغیرہا اور ضروریات انسانی۔ کہ اگرچہ ایک وجہ سے مثل اشیاء غیر منقولہ خود اور ہیں اور ان کے منافع اور۔ کیونکہ گھوڑا اور چیز ہے۔ اور اس کی منفعت اور فائدہ یعنی سواری اور تخفیف مشقت سفر اور شے۔ علیٰ ہذا القیاس کپڑا اور شے ہے۔ اور اس کا فائدہ یعنی پہننا اور گرمی سردی کی تکلیف سے بچنا۔ اور زیب وزینت اور شے۔

لیکن غور کیجئے تو اس قدر فرق سے کوئی چیز اشیاء ضروریہ انسانی میں سے خالی

نہیں۔ اقسام غذا میں بھی یہ بات موجود ہے کہ روٹی مثلاً اور شئے ہے اور اس کے منافع یعنی کھانا اور مزہ آنا اور قوت کا پیدا ہونا اور شے۔ لیکن اس قدر فرق سے قابلیت وقفیت پیدا نہیں ہوتی۔ ورنہ جیسے زمین کا وقف ہونا مسلم الثبوت ہے اناج غلہ بھی وقف ہوا کرتے۔ حالانکہ اس کے وقف ہونے کے عقل کے نزدیک کوئی معنی نہیں۔ وقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اصل محبوس اور موقوف رہے۔ اور منافع مصرف میں صرف ہوں۔ اور یہاں اصل۔ منافع کے ساتھ ہی فنا ہوتی ہے۔ نقل مشہور ہے "جیسی اصل ویسی نقل" بایں ہمہ اگر غلہ بھی وقف ہونے کے قابل ہے تو اراضی وقف کا غلہ بلاشبہ وقف ہو۔ پھر نہ اہل مصرف کو اس کی بیع درست ہو نہ ہبہ۔ نہ اس میں میراث جاری نہ وصیت۔ حالانکہ جہان میں اس کا کوئی منکر ہی نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ غلہ کو من جمیع الوجوہ منافع ہی مقرر رکھا ہے۔ سو منافع وقف اہل مصرف کے حق میں صدقہ ہوتے ہیں۔ اور صدقہ جس کو کردیا جائے اس کا مملوک ہوجاتا ہے۔ تو اب اس کی بیع وشرا وغیرہ میں کچھ دشواری نہ ہوگی۔ اور کسی کے نزدیک غلہ وقف بھی ہوسکے تو ہوا کرے۔ یہاں تو کلام اراضی فئے کے غلہ میں ہے جن کو ہم نے وقف خداوند کریم کہا ہے۔ سو اراضی فئے کا غلہ باتفاق وقف نہیں ہوتا اسی واسطے مملوک اہل مصرف ہوجاتا ہے۔

سواریاں اور کپڑے بھی وقف کے قابل نہیں۔

بالجملہ پیداوار زمین اور علیٰ ہذا القیاس اثمار واشجار نفے کا وقف نہ ہونا تو ظاہر ہوگیا۔ باقی رہے انواع مراکب اور اقسام لباس وغیرہ ان میں بہ نسبت غذا کے کوئی فرق نکالے تو یہ نکالے۔ کہ غذا استعمال کے ساتھ ہی فنا ہوتی ہے اسی لئے وقف نہیں ہوسکتی۔ بخلاف سواری۔ لباس کے یہ چڑھنے پہننے وغیرہ سے فنا نہیں ہوتی۔ لیکن بعد غور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرق بعینہ ایسا ہے کہ روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کر کھالیجئے اور باقی کو چھوڑ دیجئے۔ سو حاصل اس کا یہ ہوا کہ بقدر استعمال فنا ہوگئی۔ سو کپڑے سواری وغیرہ میں بھی یہ بات موجود ہے کیونکہ گھوڑا وغیرہ جو جانور سواری میں رہتے ہیں۔ بہ نسبت ان جانوروں کے جو اُن کے

برابر کھائیں پر سواری میں نہ رہیں دُبلے اور کمزور ہو جاتے ہیں۔

اور اگر چندے بسبب امداد بدل ما یتحلل باقی بھی معلوم ہوں۔ تو اول تو بدل ما یتحلل ہی یوں کہیے۔ ہے کہ اصل باقی نہیں۔ اور اگر ایسے مواقع میں اسی کو بقائے اصل کہیے تو وہ بقا کہاں؟ جو بے کسی استعمال کے ہو۔ اور یہی دو چیزیں جانور کی (زور اور بدن) استعمال میں آتی ہیں جان استعمال میں نہیں آتی۔ چنانچہ ضعیفی میں جو قابل استعمال نہیں رہتا تو یہی دو باتیں گھٹ جاتی ہیں۔ علی ہذا القیاس کپڑا بھی استعمال سے پتلا پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ بیدار مغزوں پر مخفی نہ ہوگا اور اس کے تار کمزور ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں دو چیزوں پر مدار کار استعمال کا تھا۔ اسی واسطے رفتہ رفتہ بہت استعمال کے باعث قابل استعمال نہیں رہتا۔ سو یہاں بھی وہی حاصل نکلا کہ منافع بقدر استعمال فنا ہو گئے۔ غائت ما فی الباب کہیں نقصان ایک طرف سے ہوا کہیں چاروں طرف سے کہیں شکل بنی رہی کہیں بگڑ گئی لیکن استعمال ہونے کا مضمون دونوں جا برابر ہے۔ باقی شکل صورت کو لے کر کیا جائیے۔ اس کو استعمال میں کچھ دخل ہی نہیں عکس آئینہ میں شکل وصورت موجود ہے مگر چونکہ جسمیت اور زور و طاقت نہیں کوئی صورت استعمال کی نظر نہیں آتی۔

امام ابو حنیفہ کا اشیائے منقولہ کو ناقابل وقف کہنے کی وجہ

بالجملہ جن چیزوں سے منافع کا تعلق ہے وہ چیزیں بقدر استعمال فنا ہو جاتی ہیں۔ اور جو چیزیں بحال خود باقی ہیں اُن سے منافع کو کچھ تعلق نہیں۔ یہ بات اگر ہے تو زمین یا سوائے اس کے اور اشیائے غیر منقولہ ہی میں ہے۔ کہ استعمال میں منافع ہی فنا ہوں اور اصل باقی رہے استعمال کی وجہ سے اصل میں کچھ نقصان نہ آئے۔ اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ امام ابو حنیفہ نے اشیاء منقولہ کو قابل وقف ہی نہ سمجھا۔ اور صاحبین یا کسی اور نے اگر لحاظ بقائے صورت بعض اشیاء منقولہ اُن کو قابل وقف سمجھا تو ان کی صورت کو اصل منافع اور بقائے صورت کو بمنزلہ بقائے اصل منافع سمجھ کر اس کے وقف ہونے کے قائل ہو گئے ہیں لیکن بعد اس تحقیق کے اہل حق سے توقع یوں ہے کہ رائے امام ابو حنیفہ

ہی کو ترجیح دیں۔

صاحبین کا اشیائے منقولہ کو قابل وقف کہنے کے وجوہ

ہاں اس سے قطع نظر کیجیے تو مذہب صاحبین بظاہر حق معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بایں خیال کہ اول تو منافع مرکب و لباس وغیرہ اشیاء ضروریہ دنیاوی عرف میں مرکب اور لباس ہی کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اور وہ تا وقتیکہ صورت اور جان باقی ہے قوت اور بدن کی طرف منسوب نہیں ہوتے جو یوں کہیے کہ استعمال میں فنا ہوتے جاتے ہیں۔

دوسرے منافع مرکب و لباس وغیرہ منافع کلیہ ہیں۔ کہ اوقات مختلفہ میں اُن کے افراد ظہور میں آتے ہیں۔ اور جیسے ہر ہر فرد بشر انسان کامل ہے جزو انسان نہیں ایسے ہی منافع اشیاء مذکور بھی جو اوقات مختلفہ میں حاصل ہوتے ہیں منافع تامہ ہیں۔ اجزائے منافع نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ بعض افراد کے فنا ہو جانے سے نوع فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ جب تک ایک فرد بھی باقی ہے تو تمام نوع باقی ہے۔ تو اس صورت میں معلوم ہوا کہ بعض اوقات کے انقطاع سے اصل منافع فنا نہیں ہوتے پھر وقف کیوں نہ ہو سکے گا؟ کیونکہ بقائے منافع دلیل بقائے اصل ہے۔ بخلاف منافع اقسام غذا کے کہ وہ منافع جزئیہ ہیں۔ جو نفع کہ ایک روٹی سے حاصل ہوتا ہے۔ آدھی سے اس کا آدھا حاصل ہوتا ہے۔ پورا باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ظاہر ہے۔ ہاں اگر اصل باقی رہتی تو منافع بھی بوجہ کمال باقی رہتے۔ خیر اگر مذہب ابو حنیفہ حق ہے تو اموال منقولہ کا منجملہ اموال فئے وقف نہ ہونا تو درکنار قابل وقف نہ ہونا ظاہر ہو گیا۔

صاحبین کی رائے بھی مقصود کے موافق ہے

اور اگر رائے صاحبین صحیح ہے تب بھی مطلب ہاتھ سے نہیں گیا وجہ اس کی یہ ہے کہ تمام ضروریات بشری میں سے احتیاج غذا منجملہ ضروریات اصلیہ ہے۔ اور باقی اموال منقولہ تمامہا ضروریات فرعیہ میں داخل ہیں اگر غذا کی ضرورت نہ ہوتی تو نوکریوں کی تلاش کے لئے سواری کی ضرورت مثلاً نہ ہوتی تو معلوم ہوا کہ سواری کی ضرورت غذا کی ضرورت سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر سواری کی ضرورت سے مثلاً گھانس دانہ کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس

جہاں تک یہ سلسلہ ضرورتوں کا چلے گا۔ تو مابعد قبل کی فرع ہوگا اور حقیقت میں ضرورت اصلی ایک ضرورت غذا ہی نکلے گی۔ اور باقی اشیار کی احتیاج گو کہنے کو ان اشیار کی احتیاج ہے لیکن حقیقت میں غذا کی احتیاج ہے۔ تو اس صورت میں بایں خیال کہ وقف رفع ضرورت کے لئے ہوتا ہے۔ اور حقیقت میں ضرورت اگر ہے تو ضرورت غذا ہی ہے۔ تو مصرف وقف میں اس ضرورت کا ہونا ضروری ہوا۔ اور کسی اور وقف میں نہیں۔ تو وقف سے غرض تو رفع احتیاج غذا ہی مقصود ہے چنانچہ جناب باری تعالیٰ عز اسمہ نے بھی لفظ رسول اور مساکین اور فقراء اور ابن السبیل میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس لئے کہ فقیر اور مسکین کے معنوں میں رزق کی کمی اور کوتاہی معتبر ہے۔ بلکہ لفظ رسول یتامیٰ اور ابن السبیل بھی اسی طرف مشیر ہیں۔ چونکہ لفظ رسول تو اس بات کی طرف مشیر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بایں وجہ کہ رسول ہیں۔ یعنی خدا کے بھیجے ہوئے ہیں خدا کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اتنی فرصت ہی نہیں کہ حسب دلخواہ کمائیں۔ اور فراغت سے بیٹھ کر کھائیں۔ اور جب کمانے کی فرصت نہ ہونے کی یہ وجہ ہوئی کہ خدا کے کام میں لگے ہوئے ہیں تو لاجرم بمقتضائے قدرشناسی خداوندی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا نان و نفقہ بھی خدا ہی کے ذمہ ہونا چاہیئے۔ اس کی بہتر صورت اس سے کیا ہوگی کہ جو مال خاص خدا کا ہو اور بے منت غیر حاصل ہوا ہو۔ اس میں سے کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تجویز کیا جائے۔ یتیم اور ابن السبیل کا مورد رحم ہونا بھی تو باعتبار اکثر کے بسبب انقطاع اسباب رزق ہوجاتا ہے۔ اور نہ بھی لفظ فقراء میں تو بیشک قوت کے نہ ہونے پر دلالت ہے۔ سو وہ بوجہ ارتباط بدلیت سب کو شامل ہے۔ اور اسی لئے سب ہی میں فقر کا ملحوظ رکھنا ضروری ہوا۔ خواہ ذوی القربیٰ ہوں خواہ اقسام باقیہ۔ بالجملہ مصرف وقف میں احتیاج غذا کا ہونا ضروری ہوا۔

اشیائے منقولہ کا وقف فقراء و مساکین کو مفید ہی نہیں

سو اگر ان کو اموال منقولہ دیجائیں

تو دو طرح سے رفع احتیاج مذکور میں کام آسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بطور مذکور ان کو سلسلۂ اسباب تحصیل غذا میں داخل کیا جائے۔ مثلاً سواری پر چڑھ کر نوکری وغیرہ کے لئے سفر کیا جائے تاکہ کچھ کما کر غذا بہم پہنچائے۔ یا مثلاً ہنڈیا رکابی چمچہ کھانے پکانے کے لئے رکھا جاوے۔ تاکہ بایں وسیلہ کھانے پکائے۔ دوسرے یہ کہ اشیائے مذکورہ کو بیچکر کھا جائے لیکن اگر اتفاق سے پیٹ کو ایسی لگی ہو کہ جان پر بنی ہوئی ہو۔ تو اس صورت میں بیع کی اجازت نہ دینی جیسا وقف میں ہوتا ہے رفع احتیاج کے بدلے اور احتیاج کا پابند کر دینا۔ اور آسائش کے بدلے جو رفع احتیاج اس کے لئے ہوتی ہے الٹا تکلیف میں ڈالدینا ہے۔ کیونکہ اس سے زیادہ اور کیا تکلیف ہوگی کہ چیز پاس ہو اور پھر اس منتفع نہ ہو سکے۔ شعر

خرابی دل پروانہ زیں بتر چہ بود ؛ کہ شمع را بنمایند و سوختن ندہند

اور اس قسم کی احتیاج کا ہونا فقراء و مساکین کے تو مفہوم میں داخل ہے۔ پر یتامیٰ اور ابناء سبیل میں بھی کثیر الوقوع ہے۔ اور چونکہ سبب اس قسم کی احتیاج کا فقراء اور مساکین اور یتامیٰ اور ابناء سبیل کے حق میں بے سروسامانی معلوم ہوتی ہے تو پھر اس کا ارتفاع بجز اس کے متصور نہیں کہ اور کچھ عطا کیا جائے۔ تاکہ اگر غذا ہو تو خود اس سے ورنہ اُسے بیچ کر اپنا پیٹ پالیں۔ سو درصورتیکہ عطا میں اُن کو یہ اختیار ہی نہ ہو تو ان کی طرف سے بھاڑ میں پڑے۔ ہاں اگر اُن کے منافع مثل پیداوار زمین و اثمار و اشجار اقسام غذا میں سے ہوتے تو پھر اُس کا بیچنا تو درکنار متولی وقف کو ان کا دینا ہی کیا ضروری ہوتا۔ بہر حال اموال منقولہ کا وقف ہونا فقراء اور مساکین وغیرہم کو مفید نہیں۔ یہ دوسری وجہ ہے جس سے تدبر امام ابو حنیفہ موجہ معلوم ہوتا ہے۔

بعض اشیائے غیر منقولہ جو حاجت برآری نہیں کرتیں۔ مگر ان میں قابلیت ہے

باقی رہے چاہ یا مکانات سو ان کا وقف ہونا بھی بظاہر رافع احتیاج فقراء اور مساکین وغیرہم نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان میں اور اموال منقولہ میں دو فرق ہیں جن کے سبب ان کو اموال

منقولہ پر قیاس نہیں کیا جاتا۔ ایک تو اموال منقولہ معدنِ رزق ہی نہیں جو مخرج قوت ہو سکیں۔ بخلاف مکانات کے کہ ان کی زمین بہرحال قابل پیداوار ہے۔ اور چونکہ مدار وقفیت کا اسی قابلیت پر ہے پیداوار کا ہونا کچھ ضرور نہیں۔ ورنہ زمین وقف اگر مزروعہ ہو اور ایک سال یا چند سال کسی سبب سے افتادہ رہے تو اس کی وقفیت باطل ہو جایا کرے اس لئے مکانات وقف کی زمین بھی قابل وقف ہی رہے گی۔ حاصل یہ ہے کہ اگر غرض اصلی کسی شے کی کسی وجہ خارجی کے باعث مسدود و مفقود ہو جائے تو جو حکم اس غرض کی وجہ سے اُس پر متفرع اور مترتب ہوا تھا وہ حکم موقوف نہ ہو جائے گا ویرانوں کی مسجدوں میں گو بالفعل نماز نہیں پڑھی جاتی۔ پر چونکہ قابلیت نماز بدستور باقی ہے تو حکم وقفیت بھی باقی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ گو ضرورت غذا ضرورت اصلی ہے لیکن ضرورت مکان اور ضرورت آب بھی ضرورت اصلی ہے۔ کسی اور ضرورت کی ضرورت سے ان کی ضرورت نہیں چنانچہ ظاہر ہے۔ اور پھر یہ دونوں بھی مثل غذا زمین سے حاصل ہوتے ہیں تو زمین کے وقف کرنے میں ان تینوں ہی کا لحاظ چاہئے۔ ان تینوں میں سے کوئی شے سہی کچھ غذا ہی کی خصوصیت نہیں پر۔ چونکہ پانی اول تو اکثر بے دام و درم کے میسر آتا ہے۔ دوسرے بیشتر پیاس غذا کے کھانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس وجہ سے گویا پانی کی ضرورت غذا ہی کی ضرورت پر موقوف ہوئی۔ غایت ما فی الباب اور ضرورتیں منجملہ سلسلۂ اسباب غذا ہوں اور یہ داخل مسببات غذا تیسرے اکثر غذاؤں کا قیام اور قوام بھی پانی ہی سے ہے تو اس وجہ سے پانی بھی منجملہ اسباب غذا اور مثل اور ضرورات فرعیہ کے فرع غذا ٹھیرا۔

تو پانی کی ضرورت کے ارتفاع کی طرف تو ضرورت نہ ہوئی اس لئے نہ آیت ما افآء اللہ میں نہ اُس کے صلہ میں اس کی طرف کچھ اشارہ فرمایا۔ مگر ضرورت مکانات من کل الوجوہ ضرورت اصلی ہے۔ اور پھر بجز مال کثیر کے اس کے ارتفاع اور اندفاع کی کچھ صورت نہ تھی۔ اس لئے اس کے رفع دفع کی ضرورت پڑی۔

سمجھ میں جانتا ہوں لفظ اخرجوا من دیارھم میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے لیکن اموال منقولہ میں سے کسی میں یہ قابلیت نہیں کہ بالذات ان ضرورتوں کو رفع کر سکے۔ البتہ ان ضروریات ثلثہ کی تحصیل کے سامان ہیں خواہ بطور سببیت کے جیسے ہنڈیا رکابی وغیرہ سے پکانا کھانا۔ اور گھوڑے پر چڑھ کر نوکری کے لئے جانا یا بطور بدلیت کے یعنی اموال منقولہ کو بیچ کر روٹی مکان پانی بہم پہنچانا لیکن چونکہ ایسی ضرورت جس میں گھوڑے لباس وغیرہما کے بیچنے کی نوبت پہنچے۔ بہ نسبت اُس ضرورت کے کہ یہ اس کے حق میں منجملہ اسباب ہوں شدید ہے۔ اور پھر با ایں ہمہ اہل مصرف میں موجود۔ ورنہ مصرف ہی کیوں ہوتے تو اموال منقولہ میں اس کی رعایت کرنی ضرور پڑی یعنی مثل پیداوار زمین اموال منقولہ میں بھی بعد عطا کے اہل مصرف کو اختیار ملے۔ تاکہ بیچ کھوچ کر رفع ضرورت کریں۔ بالجملہ اموال منقولہ مثل پیداوار کہ وہ بھی منقولات میں سے ہے۔ ملک میں اہل مصرف کے کر دینے چاہئیں۔

مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ کے لفظی فوائد

اب سب کو معلوم ہو گیا کہ آیت ما ملکت یمینک مما افآء اللہ علیک کچھ ہمارے مضر نہیں۔ بلکہ الٹی موید ہے کیونکہ بظاہر مِن جو مِمَّا میں ہے تبعیضیہ ہے۔ سو اس صورت میں ما ملکت یمینک سے دو باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ ایک تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام اموال فئے کے مالک نہ تھے۔ دوسرے جس قدر کے مالک ہوئے وہ بمجرد مسلط ہو جانے کے مالک نہیں ہوئے تھے۔ ورنہ سبھی کے مالک ہوتے کیونکہ سبب ملکیت اس صورت میں تسلط ہی ہوگا سو وہ سبھی میں پایا جاتا ہے۔ تو اب لاجرم کسی اور سبب سے مالک ہوئے ہوں گے۔ اور بظاہر بجز اس کے کہ بعد تقسیم آپ کے قبضہ میں آگیا اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ لفظ يَمِينُكَ خود قبضہ پر دلالت کرتا ہے ورنہ اگر قبض کی ضرورت نہ ہوتی فقط مَلَكْتَ بصیغہ خطاب فرما دیتے لفظ یمینک کی کچھ حاجت نہ تھی۔

اموال فئے میں آنحضرت کے حصہ کی نوعیت

باقی کلام رہی اس میں کہ قبل قبض مالک تو نہ تھے۔ پر جیسے قرض خواہ مال مدیون میں اور غازئین مال غنیمت میں مستحق

ہوتے ہیں۔ اور بوجہ اس استحقاق کے مدعی بن سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مال فئے میں مستحق تھے، یا مثل فقراء و مساکین کہ ان کو مالِ اغنیاء مالکانِ زکوٰۃ میں اس قسم کا استحقاق نہیں ہوتا کہ مدعی ہوسکیں۔ بلکہ قابلِ اعطاء اور مصرف عطا ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی فقط منجملہ مصارف تھے۔ اس لئے اس کی تحقیق بقدر فہم نارسا گذارش ہے۔ جناب من استحقاق دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک استحقاق قوی۔ اور اس کو ہم استحقاق فعلی اور استحقاق شخصی اور استحقاق حقیقی بھی کہتے ہیں۔ دوسرا استحقاق ضعیف اور اس کو ہم استحقاق انفعالی اور استحقاق نوعی اور استحقاق مجازی بھی کہتے ہیں' اور وجہ تسمیہ بیان معنی سے انشاء اللہ ظاہر ہوجاوے گی۔ استحقاق قوی میں مستحق کی جانب کوئی امر وجودی ہونا چاہیے' جو منشاء استحقاق اور مبداء دعویٰ بن سکے۔ ورنہ مستحق حقیقت میں مستحق نہ ہوگا غیر مزاحم ہوگا۔

سو یہ بات دَین کی صورت میں تو ظاہر ہی ہے۔ غنیمت میں بھی مخفی نہیں کیونکہ جہاد امر وجودی ہے اور یہی لِمُ معلوم ہوتی ہے کہ مال غنیمت کی تحصیل کو بندوں کی طرف منسوب فرمایا، اور یوں فرمایا وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ ورنہ حقیقت میں سب چیزیں خدا ہی کی دی ہوئی ہیں۔ اور استحقاق ضعیف میں فقط مفلسی اور ناداری جو امر عدمی ہے کفایت کرتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ عدم مثبت وجود نہیں ہوسکتا۔ اس لئے حق جو امر وجودی ہے۔ ناداری سے جو امر عدمی ہے ثابت نہ ہوگا۔ اسی واسطے اگر کوئی کسی مفلس کو کچھ نہ دے تو بہ نسبت اُس مفلس کے ظالم نہ گنا جائے گا۔ اور نہ مفلس اس کی نالش و فریاد کرسکے گا۔ ہاں اگر حقوق واجبہ کسی مفلس کو بھی نہ دے تو عند اللہ گنہگار ہوگا۔ کیونکہ مفلس کا حق نہیں تو خدا کا تو ہے۔ بالجملہ ناداری اور مفلسی مثبت حق نہیں فقط موجب قابلیت ہے۔ اور یہ قابلیت تمام نوع مفلسین میں برابر ہے۔ تو جس کسی کو دے دے گا کام چل جائے گا اسی واسطے محققین کے نزدیک جملہ مصارف مندرجہ آیت انما الصدقات کا احاطہ اور استیعاب ضروری نہیں یعنی یہ لازم

نہیں کہ سب ہی اصناف کو دئے۔ کیونکہ یہاں مدار کار امر عدمی پر ہے جو ناداری ہے اور وہ سب میں برابر ہے اور یہ مابعد آیت مسلم ہے کہ سب اشخاص اصناف مذکورہ کا دینا لازم نہیں۔

مصارف کے مقرر کرنے کی وجہ اہلِ مصارف کی ناداری ہے

سو اگر بالفرض بوجہ مفلسی دینا ضروری ہوتا تو سب کو دینا ضروری ہوتا اور جب سب اشخاص کا دینا ضروری نہیں تو سب اصناف کا دینا بھی ضروری نہیں۔ اور اس ناداری کی وجہ سے ان مصارف کا مقرر کرنا اکثر اصناف میں تو ظاہر ہی ہے۔ پر عاملین اور مؤلفۃ القلوب میں ناداری کا ہونا ہی سرے سے ضروری نہیں۔ مدار استحقاق ہونا تو درکنار؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ عاملین کا دینا تو وہ فقراء مساکین وغیرہم ہی کا دینا ہے۔ کیونکہ یہ نہ ہوں تو صدقات کیونکر وصول ہوں؟ تو گویا یہ ان کے نوکر اور اجیر ہیں ان کا دینا فقراء مساکین ہی کے کام میں خرچ کرنا ہے۔ گویا انھیں کیا دیا فقراء مساکین وغیرہم ہی کو دیا، باقی رہے مؤلفۃ القلوب سو ان کا دینا بھی موجب تکثیر صدقات تھا کیونکہ زکوٰۃ خوشی خاطر سے تو کوئی کوئی دیتا ہے۔ البتہ عامل کو اگر سلطان وقت کی پشتی ہو تو وصول ہوسکتی ہے سو فتح مکہ سے پہلے پہلے بسبب قلت اہل اسلام کے مددگاروں کی حاجت تھی۔ اور وقت فتح مکہ گو بظاہر ایک وجہ سے جماعت کثیر ہوگئی تھی لیکن حقیقت کو دیکھئے تو قصہ بدستور تھا۔ کیونکہ مؤلفۃ القلوب بظاہر مسلمان تھے جبتک ایمان دل میں خوب نہ جما تھا۔ مگر چونکہ داد و دہش میں اثر ہے کہ دینے والے کی محبت لینے والے کے جی میں پیدا کردیتی ہے۔ تو اس تدبیر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جو بیخ ایمان ہے اُن کے دل میں جمائی گئی۔

اور چونکہ بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مسلمان بکثرت ہوگئے۔ اس واسطے اب مؤلفۃ القلوب کا سہم ہی ساقط ہوگیا۔ الحاصل مؤلفۃ القلوب کا دینا بھی ایک وجہ سے فقراء مساکین وغیرہم ہی کا دینا تھا۔ کیونکہ ان کا دینا اُن کے حق میں بمنزلہ تجارت تھا۔ اس واسطے جب اس تجارت میں کچھ نفع نہ رہا اس کو موقوف کردیا

معہذا اس زمانہ کے فقراء اور مساکین اسلام کے فقر و مسکنت کی وجہ بھی کفار کی مخالفت ہوئی تھی سو ان کو کچھ دے کر اپنا موافق دل کر لینا گویا فقراء اور مساکین ہی کو دینا ہے۔ کیونکہ داد و دہش سے فقراء کا فقر رفع ہو جاتا ہے۔ سو وہی بات یہاں بھی نکلی۔ ان وجوہ سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ اَلْمُؤَلَّفَۃ کا لام عہد کے لئے ہو۔ الغرض استحقاق ضعیف میں مصرف کی جانب فقط امر عدمی ہوتا ہے۔ اسی لئے ان کی طرف سے دعویٰ اور طلب گاری نہیں ہو سکتی۔ ہاں خدا کی طرف سے حکم جو امر وجودی ہے منشاء استحقاق ہوتا ہے۔ اس لئے خدا کی طرف سے مطالبہ اور مواخذہ رہتا ہے۔ اور زکوٰۃ کو حق خداوندی کہتے ہیں گو فقراء مساکین کی طرف بھی مجازاً منسوب کر دیں۔

جب یہ بات متحقق ہو چکی تو اب سنئے کہ اموال فئے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کسی ایسے امر وجودی کا ہونا تو جو منشاء استحقاق ہو سکے ظاہر البطلان ہے۔ قرض آپ کا کفار کی جانب نہ آتا تھا۔ وصیت کی کوئی صورت نہیں۔ ایک غنیمت ہونے کا احتمال تھا سو اس کو بھی جناب باری تعالیٰ نے مَّا اَوْجَفْتُمْ فرما کر رفع کر دیا تو اب بجز اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استحقاق از قسم استحقاق ضعیف ہو کوئی صورت بن نہیں پڑتی۔ اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ خداوند کریم نے مال فئے کی تحصیل کو بندوں کی طرف منسوب نہیں فرمایا بلکہ لفظ افاء اللہ میں اپنی ہی طرف نسبت کیا۔ اور اسی لئے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا سہم ساقط ہو جائے۔ چنانچہ مذہب اکثر اہل حق یہی ہے اور شیعہ جو سہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امام کے لئے تجویز کرتے ہیں تحکم محض ہے۔ آیت میں کوئی دلیل نہیں۔ سو جس صورت میں فقط افاء اللہ سے یعنی خداوند کریم کے اس مال کو کفار کے قبضہ سے نکال کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دینے سے ملکیت ثابت نہ ہوئی چنانچہ بدلالۃ ما ملکت یمینک مذکور ہو چکا اور پھر ادہر کوئی صورت استحقاق کی بھی نہیں۔ تو بجز اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منجملہ

مصارف مال فئے ہوں کیا کہیے۔

مِمَّا أَفَاءَ اللہ کے لغوی فوائد

بہرحال آیت ما ملکت یمینک مما افاء اللہ میں اگر افاءۃ فئے یعنی اصطلاحی سے مشتق ہو تو درصورتیکہ مِنْ مِمَّا میں تبعیضیہ ہو ہمارے مخالف نہیں۔ بلکہ اور موید ہے اور اگر بخلاف ظاہر مِنْ کو بیانیہ کہیے تو پھر ما مما میں موصولہ نہ ہوگا جو عموم پر دلالۃ کرے۔ اور تمام فئے مملوک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہو۔ بلکہ موصوفہ ہوگا۔ ورنہ لازم آئے کہ مال فئے ما ملکت میں منحصر ہو۔ اور سواء ما ملکت اور کچھ نہ ہو الغرض اگر مِنْ بیانیہ ہو تب بھی ہمارے مخالف نہیں۔ غایت مافی الباب ہمارے لئے دلیل بھی نہ ہو۔ یہ سارا جھگڑا تو اس صورت میں ہے کہ افاءۃ فئے بمعنی اصطلاحی سے مشتق ہو۔ اور درصورتیکہ افارۃ بمعنی اعادت اور رد کے ہو اور حاصل یہ ہو کہ خداوند کریم نے اپنے مال کو کفار سے ہٹا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ڈال دیا۔ تو پھر مستدل ملکیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس آیت میں کوئی دستاویز نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ معنی غنیمت اور فئے میں دونوں میں بن پڑتے ہیں۔

فئے کے معنی کی تعیین

اور حق دیکھئے تو یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ منشاء اور مبداء اس اصطلاح کا اگر ہے تو آیۃ سورۂ حشر اعنی ما افاء اللہ علی رسولہ ہے مگر سورۂ احزاب جس میں آیۃ ما ملکت یمینک مما افاء اللہ ہے۔ سورۂ حشر سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ چنانچہ اتقان میں ابن خریس کی روایت جو درباب ترتیب نزول سور تہائے قرآنی نقل کی ہے۔ اس میں یہ ترتیب مصرح مذکور ہے۔ معہذا سورۂ حشر میں بھی خود افارت بمعنی اصطلاحی نہیں بلکہ معنی لغوی مراد ہیں۔ کیونکہ شرط فئے بمعنی اصطلاحی کی یہ ہے کہ جنگ و جدال کی نوبت نہ آئے۔ سو یہ بات کہ بے قتل و قتال اور بے جنگ و جدال مال ہاتھ آ جائے۔ یہ تو فما اوجفتم سے ماخوذ ہے۔ اگر افارت کے مفہوم میں یہ بات داخل ہوتی تو فما اوجفتم کی کیا حاجت تھی۔ پر جب یہ لفظ کثیر الاستعمال ہوا ہو تو اختصار کے لئے سارے

جملہ بما افاء اللہ علی رسولہ منہم فما اوجفتم الخ کے معنی ایک لفظ فئے میں پھولے جیسے جہاد میں تمام جاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ کے معنی داخل کرلئے ہیں۔ الغرض جب آیۃ سورۂ حشر میں جو ماخذ اصطلاح مذکور ہے خود افاءۃ بمعنی لغوی ہو۔ تو جو آیت اس سے پہلے نازل ہوچکی اُس میں افار بمعنی اصطلاحی کیونکر ہوگا۔

اب بفضلہ تعالے جملہ مراتب متعلقہ آیت ما افاء اللہ سے فراغت پائی، اور ہر فہمیدہ غیر فہمیدہ کے نزدیک یہ بات متحقق ہوگئی۔ کہ فدک مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھا۔ نہ اس میں ہبہ کی قابلیت اور نہ اس میں میراث جاری ہوسکے۔ اور یہ بھی تیقن ہوگیا کہ روایت ہبہ فدک جو شیعوں کے نزدیک درباب غصب فدک دلیل کامل ہے محض افترا اور بہتان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تصور میں نہیں آسکتا کہ مال غیر مملوک کو دیدہ و دانستہ کسی کو بطور ہبہ حوالہ کردیں۔

آنحضرت سے فہم قرآن میں خطا نا ممکن تھی کیونکہ اصلاح کے لئے وحی جاری تھی

ہاں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ سمجھنے کا احتمال ہوتا تو یوں ممکن تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کلام اللہ اور کلام اللہ کے دقائق کو نہ سمجھیں تو پھر کون سمجھے؟ ہم جیسے ہیچمدان تو کلام اللہ کے اشارات سمجھ جائیں۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نہ سمجھیں؟ سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر شیعوں کے نزدیک یہ بات ہو تو ہو۔؟ یا یوں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسول نہ ہوتے کوئی امتی ہوتے تو یوں بھی کہہ سکتے۔ کہ اجتہاد تھا کچھ وحی تو تھی ہی نہیں جو غلطی نہ ہوسکے۔ یہاں تو یہ صورت کہ اگر اجتہاد بھی ہو تب بھی یہ امر ممکن نہیں کہ آپ غلطی کریں۔ اور پھر متنبہ نہ ہوئے ہوں۔

اس صورت میں اگر بالفرض والتقدیر بفرض محال نقل کفر کفر نباشد آپ کلام اللہ سے اس اشارہ کو کہ فدک جو منجملہ فئے ہے مملوک نہیں نہ سمجھے ہوتے؟ اور اس وجہ سے براہ غلطی ہبہ بھی کردیتے تب لازم تھا کہ وحی ربانی سے اصلاح اور تصحیح ہوجاتی

اور فدک کو مسترد فرماتے۔ سو اگر شیعہ اتنی گنجائش پاکر کہ سنیوں کے نزدیک ممکن ہے کہ نبی سے اجتہاد میں غلطی ہوجائے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام سے باوجود نبوت حکم میں غلطی ہوئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا باوجود نبی ہونے کے صحیح سمجھ جانا چنانچہ سورۂ انبیاء میں آیت داؤد وسلیمان اذ یحکمان فی الحرث الخ میں مذکور ہے اس بات پر شاہد بھی ہے۔ اپنے مذہب سے دست بردار ہوکر حضرت ابوبکر صدیق کی ضد میں یوں کہنے لگیں۔ کہ فدک کا مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہونا بشہادت کلام اللہ مسلم۔ لیکن ہمیں اس میں بھی شک نہیں کہ فدک کو ہبہ بھی ضرور ہی کیا۔ بہت ہو تو یہ ہو کہ بوجہ غلطی اجتہاد کلام اللہ کا یہ اشارہ نہ سمجھا ہو۔

آیۂ ما افاء اللہ، یوصیکم کی مخصص ہے

سو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ اتنی دور جانے اور اس قدر تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے اس سے سہل ترکیب میں بتائے دیتا ہوں جس میں مذہب کو بھی آنچ نہ آئے اور بات کی بات بنی رہے یعنی مناسب یوں ہے کہ یہ بات نعوذ باللہ خدا ہی کے ذمہ لگایئے اور اس بات میں بھی بدستور دیگر اغلاط خداوندی نعوذ باللہ منہا بدا کے قائل ہوجایئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس لوث سے بچا لیجئے کیونکہ یہ بزرگی تو اسلاف شیعہ نے خدا ہی کے لئے تجویز کررکھی ہے۔ اور باایں ہمہ کچھ حاصل بھی نہیں۔ سنیوں کے نزدیک اگر نبی کی نسبت غلط فہمی کا امکان ہے اور ان کے نزدیک کیا وہ بھی خدا ہی کی کہی کہیں ہیں تو وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ وحی سے اُس کی اصلاح ضروری ہے۔

بہرحال فدک کے ہبہ ہونے کی کوئی صورت نہیں جو روایت ہبہ کو مانیئے۔ اور اس وجہ سے حضرت فاطمہ زہرا رض کو مالک جانئے۔ غرض ہبہ کا باطل ہونا روشن ہوگیا اور کیونکر روشن نہ ہو ہبہ کے لئے ملکِ واہب مقدم ہے۔ سو یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہ نسبت اراضی فئے جس میں سے فدک بھی ہے مالک نہ ہونا ثابت ہوگیا۔ اور علی ہذہ القیاس فدک میں میراث کا جاری ہوسکنا نہ ہوسکنا

بھی بخوبی واضح ہوگیا۔ اور معلوم ہوگیا کہ اگر آیت یوصیکم اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور غیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برابر شامل ہے۔ اور خطاب عام ہے خاص امت ہی کو نہیں۔ تب بھی بہ نسبت ابو بکر صدیق کوئی حرف عائد نہیں ہو سکتا کیونکہ آیت ما افاء اللہ منجملہ متروکہ نبوی بہ نسبت فدک وغیرہ اموال فئے کے مخصص ہے۔ چنانچہ واضح ہوگیا۔

یوصیکم اللہ فدک کو شامل ہی نہیں

بلکہ غور سے دیکھئے تو تخصیص کے کہنے کی بھی کچھ حاجت نہیں تخصیص ہو تو یہ معنی ہوں کہ آیت یوصیکم اللہ سے بہ نسبت فدک بھی یہی حکم نکلتا تھا لیکن مثل استثنا ر آیت مذکور یا کسی مخصص نے فدک وغیرہ کا استثنا کر دیا ہے سو یہ بات یہاں کوسوں پاس کو نہیں پھٹکتی۔ کیونکہ آیت یوصیکم اللہ اگر متروکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شامل بھی ہو گی۔ تو اُس متروکہ کو شامل ہو گی جو مملوک نبوی بھی ہو۔ کیونکہ میراث تو اشیائے مملوک مورث میں جاری ہوتی ہے۔ فدک جب وقف ہوا تو مملوک ہی نہیں۔ تو عموم آیۃ یوصیکم اللہ میں داخل کیونکر ہو۔ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو البتہ درصورتِ تسلیم عموم خطاب اس کی ضرورت پڑتی۔ کہ حدیث مَا تَرَکْنَا ہٗ صَدَقَۃً کو مخصص کہئے لیکن بحمد اللہ اس کی ضرورت ہی نہ ہوئی۔

یُوْصِیْکُمُ اللہ کی جیسے بہت سی احادیث مخصص ہیں۔ ایسے ہی ما ترکناہ ہے

لیکن تاہم تکثیر سواد وجوہ رفع مخالفت آیت مذکورہ و حدیث مسطور کے لئے ماسوا اس تقریر کے جو دربارہ تخصیص گذر چکی ہے۔ اس قدر اور مرقوم ہے کہ آیت یُوْصِیْکُمُ اللہ میں کچھ بھی تخصیص نہیں ہوئی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری نہیں ہوتی بلکہ باتفاق فریقین اور بہت سی تخصیص ہوئی ہیں۔ چنانچہ کافر وارث نہیں ہوتا غلام وارث نہیں ہوتا۔ قاتل مورث وارث نہیں۔ بایں ہمہ ان تخصیصات پر کلام اللہ کا کوئی لفظ آیت مذکورہ سے متصل ہو یا منفصل دلالت نہیں کرتا۔ بجز اس کے نہیں کہہ سکتے کہ احادیث مخصص عموم ہوئی ہوں پھر اسی حدیث مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ نے کیا قصور کیا ہے کہ مخصص نہ ہو سکی۔ اگر یہ حدیث آیت مذکورہ کے بایں معنی مخالف کہتے ہو کہ مخصص ہے۔ تو جو حدیثیں اور تخصیصوں پر

دلالت کرتی ہیں بدرجۂ اولیٰ مخالف ہوں گی۔ کیونکہ نہ کوئی لفظ اس آیت میں اُن کے مؤید ہے جیسا کہ قرینہ غیبت یوصی جو خصوص خطاب کُمْ پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ مذکور ہوا مضمون حدیث مَا تَرَکْنَاہُ کے موید ہے۔ اور نہ کوئی اور ہی آیت اُن احادیث کے مساعد ملتی ہے۔ جیسا کہ آیت مَا اَفَاءَ اللہُ حدیث مذکور کے مساعد ہے۔

الحاصل اگر آیۃ ما افاء اللہ سے بھی قطع نظر کیجئے اور حدیث مذکور کو مبین خطاب اور مفسر مراد حدیث رکھئے تب بھی بیش۔ برین نیست کہ حدیث مذکور آیت مسطور کے مخصص ہوگی۔ مخالفت کجا؟ اور اگر تخصیص بھی مخالفت کہلاتی ہے تو ایسی مخالفت شیعہ سُنی سب کے نزدیک درست ہے۔ تکرار کی کیا بات ہے۔

بعض آیات اور روایات شیعہ میں کلّی تضاد

ہاں مخالفت اسے کہتے ہیں کہ میّت کے ماں باپ کے ہوتے اس کی اولاد کی اولاد کو میراث نہ دی جائے جیسے کہ شیعہ کہتے بھی ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ حالانکہ اولاد کی اولاد بلاشبہ اولاد ہی میں داخل ہے۔ اور خود جناب باری تعالیٰ ہی فرماتے ہیں یُوْصِیْکُمُ اللہُ فِیْ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ یعنی اولاد کو میراث دلانے کے باب میں خود جناب باری تعالیٰ وصیت فرماتے ہیں۔ پھر جب اولاد کی اولاد بھی اولاد ہی ہوئی تو ان کی وراثت آپ ثابت ہوگئی۔ اور اگر اولاد اولاد کی اولاد ہونے میں بھی حضرات شیعہ کو سند ہی کی ضرورت ہے۔ اور بے سند اور بے دلیل ایسے مضامین نہیں سمجھ سکتے۔ تو لیجئے سند بھی موجود ہے کلام اللہ میں اولاد کی اولاد ہی کو آیت مباہلہ یعنی نَدْعُ اَبْنَاءَنَا وَاَبْنَاءَکُمْ میں ابناء فرمایا اس لئے کہ باتفاق فریقین ابنا رنا سے حضرات حسنین وغیرہما مراد ہیں۔ حالانکہ وہ دونوں صاحبزادے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ تھے۔ بیٹی کے بیٹے تھے۔

دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو حضرت یعقوب کی اولاد کی اولاد تھی ان کو خداوند کریم بار بار بنی اسرائیل کہتا ہے۔ حالانکہ بنی اسرائیل کے معنی لعینہ اولاد یعقوب ہے۔ اس لئے کہ بنی اولاد اور اسرائیل سے مراد حضرت

یعقوب ہیں۔ اور سب جانتے ہیں کہ اُس زمانہ کے بنی اسرائیل حضرت یعقوب کے بیٹے تو تھے ہی نہیں اولاد کی اولاد تھے وہ بھی کئی پشتوں بعد۔ علیٰ ہٰذا القیاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے آدمیوں کو خداوند کریم اس آیت میں یَابَنِیْ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطَانُ اور نیز اور آیات میں بنی آدم فرماتا ہے حالانکہ حضرت کا ان میں سے کوئی بھی بیٹا نہ تھا۔ اگر تھے بھی تو کہیں اڑسنگ کے پڑسنگ جاکر اولاد کی اولاد ہوتے تھے۔

دوسرے مخالفت اسے کہتے ہیں کہ بیوی کو زمین اور زمین کی قیمت سے میراث نہیں دیتے اور علیٰ ہٰذا القیاس برادران اور ہمشیرگان مادری کو مقتول کی دیت میں سے میراث نہیں دیتے۔ اور دیں تو قاتل کو مقتول کے ترکہ اور دیت میں سے میراث دیں۔ بشرطیکہ خطاء سے یا شبہ خطا سے قتل کیا ہو۔ حالانکہ نصوص قرآنی زوجہ اور بہنوں اور بھائیوں کی سب کی توریث میں عام ہے۔ زمین کی اور اس کی قیمت اور دیت کی کچھ تخصیص نہیں۔ اور اسی طرح جملہ القاتل لا یرث بھی جس سے قاتل کا محروم ہونا ثابت ہوتا ہے عام ہے۔ عمد اور خطا کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔

باایں ہمہ اور بھی سب میت کے بڑے فرزند کو شمشیر اور مصحف اور انگوٹھی اور پوشاک (میت کی) بدون عوض دلاتے ہیں۔ اور اس باب میں شیعہ بعض اپنے ائمہ سے بھی روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے باپ کے ترکہ میں ان اشیاء میں سے اور وارثوں کو حصہ نہیں دیا۔ بلا عوض سب کا سب آپ ہی رکھا۔ اور پھر اس روایت کا راوی سوائے شیعہ اور کوئی نہیں۔ حالانکہ یہ روایت سراسر مخالف قرآن ہے اگر عذر عصمت ائمہ ہے اور یوں کہیے کہ امام معصوم ہوتا ہے اور معصوم سے ظلم و ستم اور خطا نہیں ہوتی جو کچھ انھوں نے کیا صحیح ہی کیا ہوگا۔ ہم نہ سمجھیں تو کیا ہوا؟ تو اول تو اہل سنت کسی کو سوا انبیاء معصوم ہی نہیں سمجھتے جو اُن کے سامنے یہ عذر چل سکے۔

قول قابل اتباع ہے اور فعل میں خصوصیت کے احتمال ہیں

اور مسلّمنا کہ فعل معصوم میں خطا نہیں ہو سکتی لیکن بالاتفاق قول معصوم اتباع اور اقتداء میں فعل معصوم سے مقدم ہے کیونکہ افعال میں تو یہ

بھی احتمال ہے کہ خاص اس کے لئے ہو آخر بیسیوں احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھے۔ منجملہ ان کے دربارہ نکاح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حق میں چار کی قید نہ ہونی معلوم ہی ہو چکی صوم وصال کا آپ کے لئے جائز ہونا اوروں کے لئے نہ ہونا سب کو معلوم۔ علیٰ ہٰذا القیاس اور بہت سے امور ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص تھے اور کچھ کچھ ان کا مذکور بھی ہو چکا اور قول میں یہ احتمال نہیں ہوتا اگر اس میں کسی وجہ سے کوئی تخصیص بھی ہوتی ہے تو کسی ایک آدھ ہی کی ہوتی ہے۔

بہرحال جب قول بعض ائمہ کہ وہ اگر بالفرض معصوم بھی ہیں تو کہیں اتنے ہیں؟ جتنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قابل اقتدار و اتباع ہیں۔ چنانچہ شیعوں کے نزدیک علی العموم یہ حکم جاری ہے۔ ہر کس و ناکس کو یہ مقام حاصل ہے کہ مصحف و انگشتری وغیرہ ترکہ پدری میں سے بدون عوض لے لے۔ تو قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ بدرجہ اولیٰ لائق اتباع ہوا۔ اور جب ان امور کو بھی لحاظ کیجیے کہ ائمہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر نہیں۔ اور ابو بکر صدیق نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سُنی اور آجکل کے شیعہ جو روایت مذکور پر عمل کرتے ہیں انھیں سننا تو کہاں نصیب اُن کی زیارت بھی میسر نہیں آئی۔

حدیث لا نورث مفسر و مبین آیت ہے اور روایت شیعہ مخالف

معہذا حدیث لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ ایک وجہ سے مبین خطاب بھی ہو سکتی ہے اس کا مخصص ہونا ایسا ظاہر نہیں کہ اس کے سوا احتمال ہی نہ ہو۔ بلکہ قرین عقل بعد غور کے مفسر و مبین ہونا ہی ہے بخلاف روایت شیعہ کے کہ وہ مخصص کیا مخالف ہے کیونکہ تخصیص کے لئے کوئی وجہ تو چاہئے یہاں بجز دھینگا دھینگی کے اور کچھ نہیں۔ بغرض ان امور کے لحاظ سے روایت شیعہ روایت ابو بکر صدیق کے پاسنگ بھی نہیں ہو سکتی۔ معہذا ہم پوچھتے ہیں کہ سند ائمہ دربارہ تخصیص کیا ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فعل و قول ہے تو ابو بکر صدیق نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قول سے تخصیص کی تھی کہ فدک دیا تو کچھ چنگیز خاں اور قانون انگریزی کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ ہاں ابو بکر صدیق کی جانب البتہ

اتنا قصور ہے کہ انھوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کوئی راوی بیچ میں نہ تھا۔

ائمہ نے روایت فدک اگر بلا علاقہ آنحضرت بیان کی ہے تو دو خرابیاں لازم آئیں

اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کچھ علاقہ نہیں تو دو خرابیاں لازم آئیں گی اول تو معصوم ہو کر کلام اللہ کے مخالف کیا معصوم کے تو معنی تو یہی ہیں کہ احکام خداوندی کے خلاف اس سے نہ ہو سکے دوسرے اس پر بھی اکتفا نہ کیا امت کے لئے بھی یہی حکم مخالف رہا اور یہ دونوں خرابیاں پہلی شق پر بھی برابر وارد ہیں۔ کیونکہ کلام اس صورت پر ہے کہ تخصیص کو مخالف کہیے۔ سو اس صورت میں مخالفت کہیں نہیں گئی۔ اس میں کوئی کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہوں یا کوئی اور کلام اللہ کے مخالف تو کسی کی بات کیوں نہ ہو قابل شنوائی نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اور تخصیصات مسطورہ کو جو بحوالہ مذہب شیعہ مرقوم ہوئی ہیں اور واقع میں تخصیصات نہیں مخالفات ہیں چنانچہ ظاہر ہے۔ ایک طرف دھریئے اور حدیث ابو بکر کو ایک طرف رکھیے اور لوجہ عقل اور نقل آیت یُوْصِیْکُمُ اللّٰہ سے اس کی چسپیدگی اور مخالفات قبیحہ کی منافرۃ کو ملحوظ کر کے دونوں کو تولئے۔ اور پھر تو لئے کہ کس طرف پلہ جھکتا ہے؟

الحاصل ہر ہر سخن سے شیعوں کی سخن فہمی اور ہر ہر قدم پر اُن بزرگواروں کی عقل و نقل سے مناسبت معلوم ہوتی جاتی ہے۔ پر ہر بات پر گرفت کرنے میں بھی تھکا جاتا ہوں۔ اور نیز شرم آتی ہے کہ ان بیحیاؤں کو الزام دے کر کہاں تک شرمایئے۔ اس لئے باقی امور کا جواب لکھنے سے جی رکتا ہے۔ اور یوں خیال آتا ہے کہ جب اس فرقہ کی خوش فہمی ہر ہر سطر پر معلوم ہو گئی تو اہلِ انصاف اسی سے سمجھ جائیں گے کہ اور بھی ایسے ہی گل کھلائے ہوں گے لیکن یقین سے اطمینان کا رتبہ زیادہ ہوتا ہے۔ گو اتنی تقریروں سے جو مرقوم ہو چکیں۔ مولوی عمار علی صاحب کے خط معلوم کے امور باقیہ کا غلط ہونا بھی متیقن اور متحقق ہو گیا لیکن شائقین کو یہ تردد ہو گا کہ دیکھئے اُن کے غلط ہونے کے کیا کیا وجوہ ہوں؟ اس لئے باوجود قلتِ فرصت اور کثرتِ ضروریات اور بھی

حرکت کرنی پڑی۔ اس لئے بقدر مناسب دربارہ مخالفت حدیث لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ اور آیت وَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ اور آیت وَوَرِثَ سُلَیْمَانُ دَاؤُدَ کے اپنے مافی الضمیر کو قلم کے نیچے کھینچتا ہوں۔

اول قابل لحاظ یہ بات ہے کہ جب آیت یُوْصِیْکُمُ اللّٰہ میں خطاب مخصوص امت کے لئے ہوا تو اس حدیث ہی کی اہل سنت کو کچھ ضرورت نہ رہی۔ اور کسی کے مال میں میراث جاری ہو کہ نہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مال میں تو وراثت جاری ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم میں داخل ہی نہیں۔ بایں ہمہ جب آیت ما افاء اللہ سے فدک کا غیر مملوک ہونا ثابت ہو گیا۔ تو جھگڑا ہی تمام ہو گیا۔ اب اگر کوئی کہیں سے خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ترکہ میں میراث کا جاری ہونا ثابت بھی کرے تب بھی فدک میں تو میراث جاری ہو ہی نہیں سکتی۔

حدیث معاشر الانبیا، اگر غلط بھی ہو تو بھی فدک ہاتھ نہیں آتا

القصہ اگر بوجہ مخالفت ظاہری جو حدیث مذکور اور آیات باقیہ میں ظاہر بینوں کو معلوم ہوتی ہے۔ حدیث مذکور اگر غلط بھی ہو جائے تب بھی کچھ حرج نہیں۔ اول تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باشارہ آیۃ یوصیکم اللہ ہی اس آیت سے مستثنیٰ ہیں۔ پھر اگر اور انبیاء کے ترکہ میں میراث جاری ہوئی بھی تو ہوا کرے۔ کلام تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں ہے غایت مافی الباب حدیث مذکور غلط ہو لیکن اِس کے غلط ہونے سے فدک نہیں مل سکتا ہاں آیت یوصیکم اللہ اگر غلط ہو جائے تو البتہ شیعوں کا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔

دوسرے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں بھی میراث جاری ہو؟ تب جس چیز میں تنازع ہے یعنی فدک میں بشہادت آیت ما افاء اللہ میراث جاری نہیں ہو سکتی۔ اب اگر مخالفت مابین حدیث و آیات کے ثابت بھی ہو گئی تو حدیث ہی غلط ہو جاوے۔ پر شیعوں کا مطلب تو ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں اگر آیت ما افاء اللہ پر شیعہ خط لا کھینچ کر ایمان پر خط کھینچ جائیں تو کیوں نہیں؟ بہرحال بغرض اثبات برارت

حضرت صدیق اکبر یعنی باین غرض کہ فدک کا نہ دینا موافق حکم نبوی تھا۔ ہمیں اس میں
اس کی ضرورت نہیں کہ حدیث مذکور اور آیات مذکورہ میں موافقت ثابت کریں۔ اور
مخالفت جو بظاہر نظر آتی ہے اس کو باطل کرکے حدیث مذکور ثابت کریں۔ اس باب
میں اشارہ یوصیکم اللہ اور دلالۃ ما افاء اللہ کافی ہے۔

فصل

وراثت انبیاء پر بحث۔ کہ وہ مالی ہے یا علمی؟ اور مالی مراد لینے پر خرابیاں

پر لغرض اثبات صدق صدیق اکبر اس باب میں بھی گفتگو کرنی ضروری ہوئی اس لئے نظر بر تقدم
وتاخر آیات اول درباب مخالفت حدیث اور آیت وَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ الخ میں
گفتگو چھیڑتا ہوں۔ پر شرط یہ ہے کہ بغور سنئے اگر وراثت سے اس آیت میں وراثت مالی
مراد ہے۔ اور اس وجہ سے حدیث کو اس آیت کے مخالف کہتے ہیں تو دو حال سے خالی
نہیں۔ آل یعقوب سے یا تو خود ذات بابرکات حضرت یعقوب علیہ السلام مجازاً مراد ہو
چنانچہ محاورات عرب میں اکثر پایا جاتا ہے کہ آل فلاں بولتے ہیں اور اس سے خود وہی شخص
مراد ہوتا ہے۔ یا حقیقی معنی مقصود ہوں۔ یعنی آل یعقوب سے اولاد یعقوب مراد ہو۔
سو اول صورت میں تو لازم آئے گا کہ تادم دعاء مذکور مال حضرت یعقوب جن کے انتقال
کو دو ہزار برس سے زیادہ ہوچکے تھے بجنسہ غیر منقسم رکھا ہوا ہو۔ اور آگے حضرت زکریا کو
یقین ہوا کہ میری وفات سے پہلے بھی تقسیم ہولیا تھا۔

یا بعد اس دعا کے قبل وفات حضرت زکریا کے تقسیم ہوجاتا تو پھر جملہ یَرِثُ مِنْ
مِنْ آلِ يَعْقُوبَ کے زیادہ کرانے کی کیا حاجت تھی؟ لفظ یَرِثُنِي بھی کافی تھا
کیونکہ اس صورت میں وہ مال حضرت زکریا کا ہوچکا۔ اب حضرت یعقوب کا نہ عرفاً
رہا نہ شرعاً۔ حضرت یحییٰ وارث ہوں تو ہر طرح سے حضرت زکریا ہی کے وارث کہلائیں
حضرت یعقوب کے وارث نہ کہلائیں گے۔ اس صورت میں لاجرم جملہ یَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ
غلط ہوجائے گا۔ اور پھر لغو جدا رہے گا کیونکہ حضرت زکریا کی نسبت تو وراثت پر دلالت
یَرِثُنِي میں موجود تھی یرث من آل یعقوب کی کیا ضرورت تھی؟

بہر حال اس صورت میں اس وجہ سے یوں کہنا پڑے گا کہ دو ہزار سال سے زیادہ
عرصہ گذرا اور باایں ہمہ حضرت یعقوب کا مال غیر منقسم ہی رہا۔ سو ایسی بات دیوانوں
کے سننے کی ہے۔ عاقلوں کے کانوں میں تو ایسی نامعقول باتوں کی سمائی نہیں۔ کون
کہہ دے گا کہ دو ہزار سال سے زیادہ ایک شخص خاص کا مال باوجود اس کثرت اولاد
کے کہ شاید کسی کی نہ ہوئی ہو غیر منقسم رکھا رہا ہو۔ اور اگر آل یعقوب سے معنی حقیقی مقصود
ہوں اور اولاد یعقوب مراد ہو۔ تو یہ معنی ہوں کہ حضرت یحییٰ تمام بنی اسرائیل کے وارث
ہوں۔ جو تعداد میں لکھو کھا سے متجاوز ہوں گے۔ اور پھر باایں ہمہ حضرت یحییٰ تمام احیاء
واموات سے ایسا رشتہ وقرابت رکھتے ہوں جو موجب وراثت ہوسکے۔
معہذا یہ بھی ضرور ہو کہ اس زمانہ کے بنی اسرائیل میں جو جو زندہ ہوں وہ لاجرم حضرت
یحییٰ کے سامنے مرہی جائیں۔ تاکہ وارث جو حضرت زکریا ہیں اور یَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ
اس پر دلالت کرتا ہے ظہور میں آئے۔ سو یہ بات پہلی بات سے بھی کچھ آگے بڑھی ہوئی
ہے بجز اس کے کہ ان عبارات کے ایسے معنی لے نے کو زبردستی اور بے ہودہ
کہئے اور کیا کہئے؟ عالم وعاقل کے تو تصور میں یہ بات نہیں آسکتی کہ ایسے امور وجود
میں آئیں۔ اور پھر کوئی نادان ہی ایسی نامعقول تمنائیں کرے۔ چہ جائیکہ حضرت زکریا
انبیاء کی تیز ذہنی اور سلامت عقل سب جانتے ہیں اور پھر باایں ہمہ کیا زیبا تھا کہ جناب
باری تعالیٰ ایسی چرپوز باتوں کو اپنے ایسے کلام پاک میں نقل فرماتا کہ جس کی بلاغت
ومتانت کا شہرہ آسمان سے زمین تک پہنچا۔

غایت ما فی الباب کوئی بات کو بنائے تو یوں بنائے کہ من کل واحد من
آل یعقوب اگر فرماتے تو یہ اعتراض ہوسکتا۔ اور فقط من آل یعقوب سے تو
سب بنی اسرائیل کے مال کی وراثت لازم نہیں آتی۔ مگر اہل انصاف سمجھتے ہیں کہ
اگر یہ معنی ہوں کہ بنی اسرائیل میں سے ہر فرد بشر کی وراثت مراد لینا ضروری نہیں۔
ایک دو کی وراثت بھی کافی ہے۔ تو اتنی بات تو یرثنی میں موجود تھی۔ اس قدر عبارت
بڑھانے سے کیا حاصل ہوا؟ معہذا ایسے مواقع میں بحکم محاورۃ تمام افراد ہی

مراد ہوتے ہیں۔

الغرض شیعوں کا اس آیت کو وراثت پانے پر محمول کر کے بوجہ مخالفت حدیث ماترکناہ صدقۃ حضرت ابوبکر صدیق اور پیروانِ حضرت صدیق پر طعن کرنا بعینہ ایسا قصہ ہے۔ جیسے نکٹے ناک والوں پر ہنسیں جس فرقہ کے علماء کی فہم و فراست اور خوش فہمی اس درجہ کو ہو تو جاہلوں کو تو کچھ نہ پوچھئے۔ ان کی عقل سے تو بیشک بھینس ہی بڑی ہوگی۔ معہذا حضرت زکریا نے مقام دعا میں دو لفظ فرمائے ہیں ایک تو وَلِيًّا دوسرے يَرِثُنِي اگر ولی سے فرزند مطلوب ہے تب یرثنی بیکار اور لغو گفتار ہے بیٹا آپ وارث ہوا کرتا ہے۔ ایسا کونسا فرزند ہوتا ہے جو قابلیت وراثت نہ رکھتا ہو۔ اور اگر يَرِثُ کی قید سے یہ غرض ہو کہ ایسے اوصاف اس میں پیدا نہ ہوں جو مانع وراثت ہوں، مثلاً کافر نہ ہو۔ یا میرا قاتل نہ ہو۔ کیونکہ کافر اور قاتل میت کے وارث نہیں ہوتے تب بھی اس کی کچھ حاجت نہ تھی اس لئے کہ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا آگے موجود ہے۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ ولی بھی دے تو ایسا دے جو تیری مرضی کے موافق ہو۔

باقی رہا یہ احتمال کہ يَرِثُنِي کی قید اس لئے بڑھائی کہ مبادا فرزند تو عطا ہو لیکن سامنے ہی مر جائے۔ تو یہ احتمال اسی کو روا ہے جو نعوذ باللہ خداوند علیم کو فہیم نہ سمجھے۔ اسی دعا میں یہ الفاظ موجود ہیں اِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَائِي جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ مجھے اپنے بعد کا اندیشہ ہے اُس اندیشہ کے سبب ولی طلب کرتا ہوں۔ سو اب اس دعا میں یہ بات صاف موجود ہے کہ ولی ملے تو ایسا ملے جو بعد تک زندہ رہے۔ معہذا لفظ ولی تو اُسے ہی کہیں گے جو ولی عہد اور خلیفہ ہو۔ اس مضمون کو حضرت زکریا کے بعد تک زندہ رہنا آپ لازم ہے۔

اور ان سب خرابیوں سے قطع نظر کیجئے۔ وراثت مالی کے نہ ہونے کی ایک یہی وجہ بہت ہے۔ کہ اس صورت میں حضرت زکریا کے منصب نبوت کو بٹا لگتا ہے۔ مال کا اتنا خیال کہ جیتے جی تو تھا ہی۔ مرنے کے بعد کا بھی ابھی سے بندوبست ہے۔ اور وہ بھی اس قدر کہ خدا سے بھی کچھ شرم نہیں۔ یہاں تک کہ خود جناب باری ہی سے یہ التجا ہے۔

کہ اس کے برتنے کے لئے فرزند عنایت کر۔ بڑے درجے کے دنیا داروں اور محبانِ دنیا کا کام ہے نہ کہ انبیاء کا۔ اور ان میں سے بھی حضرت زکریا کا جو آزادگی اور وارستگی میں مشہور تھے۔ استغفر اللہ شیعہ بھی کس قدر بیہودہ ہیں۔ کہ حضرت ابوبکر صدیق کے ساتھ انبیاء کو بھی نہیں چھوڑتے۔ انبیاء کی یہ لوگ کیا قدر جانیں؟ ان کی ہمت بلند کے سامنے تو تمام متاع دنیا مینگنی کے برابر ہے۔ پھر ان میں سے حضرت زکریا جیسے بے تعلق۔ وہ ایک قدر قلیل متاع دنیا کے لئے کیا اس قدر بندوبست کرتے؟ اور وہ بھی اتنا کچھ کہ خدا تک نوبت پہنچی۔ اور وہ بھی اس اہتمام سے کہ اول تمام مراتب اپنے استحقاق کے جس سے خواہمخواہ دعا قبول ہی کرنی پڑے۔ بیان کئے جائیں۔

کیونکہ بعد تمہید مطلب کے، تو یہ ہے انی خفت الموالی جس سے اپنی کمال بیقراری اور بے تابی اور ضرورت فرزند ثابت ہو جائے۔ تاکہ کچھ توقف نہ ہو۔ سبحان اللہ نبی نہ ہوئے دنیا دار ہوئے۔ اتنی دور کی تو انھیں بھی نہیں سوجھتی جن کی رگ و پے میں محبت دنیا رچی ہوئی ہے۔ اور شب و روز اسی دہیان گیان میں رہتے ہیں۔ علاوہ بریں اگر حضرت زکریا کو یہ اندیشہ تھا۔ کہ ان کے بنی اعمام ان کے مال کو اُن کے بعد بیجا اور بے موقع صرف نہ کریں۔ تو اول تو یہ اندیشہ ہی بیجا کیونکہ نقل مشہور ہے آپ ہوئے جگ پرلوں مرے کے بعد کوئی سیاہ کرے یا سفید مردہ کو کیا اندیشہ؟ بعد مردن کوئی مواخذہ کی صورت ہی نہیں۔ اور اس پر خدا سے عرض کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس اندیشہ کی تدبیر اور تدبیر بھی وہ عمدہ کہ درصورت قبولیت دعا وہ بات ہرگز نہیں۔ خود ان کے ہاتھ میں موجود تھی یعنی اپنے ہاتھ سے تمام اموال خدا کی راہ میں لٹا جاتے۔ جو اس خوف سے بھی نجات ہو جاتی اور ذریعہ مزید ترقی درجات آخرت بھی میسر آتا۔ فرزند اگر نیک بھی ہوا اور اس نے مال کو خدا کی راہ میں صرف بھی کیا تو مردہ کو کیا؟ وہ مال اب فرزند کا ہو گیا ثواب دینے دلانے کا اس کو اختیار ہوگا باقی رہی یہ بات کہ ایک دفعہ مال کے لٹا دینے میں یہ اندیشہ تھا کہ اگر بعد اتفاق حیات طویل باقی نکلی تو پھر اپنا گذارا مشکل ہے۔ سو اس کی یہ صورت ہے کہ اگر ایسی

ہی بے صبری اور اس بات کی پابندی تھی۔ اور باوجود نبوت توکل دشوار تھا تو انبیاء کو ان کی موت کی اطلاع ہو جاتی ہے۔ وقت اطلاع موت سب دے دلاجاتے اور وارثان بد وضع کے لئے کوڑی نہ چھوڑتے۔ القصہ نظر بر وجوہ مذکورہ وَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ سے وراثت مالی مراد نہیں ہو سکتی۔

وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ میں وراثت مالی مراد نہیں

علیٰ ہذا القیاس آیت وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ میں بھی بحکم قرآن عقلیہ ارادۂ وراثتِ مالی ممنوع ہے۔ مگر شاید شیعوں کو یہ عذر ہو کہ یہاں عقل ہی ندارد ہے۔ تو البتہ یہ عذر معقول۔ خیر اگر شیعہ انصاف کریں تو اس قدر اور معروض ہے کہ باتفاق مؤرخین اور اجماع اہل تواریخ حضرت داؤد کے انیس بیٹے تھے۔ ایک حضرت سلیمان اور اٹھارہ دوسرے۔ پس اگر وارث ہوتے تو سب ہی ہوتے۔ حالانکہ بطور خصوصیت جناب باری تعالیٰ کا یوں فرمانا کہ حضرت داؤد کے حضرت سلیمان وارث ہوئے اس بات کو مقتضی ہے۔ کہ حضرت داؤد کے وارث فقط حضرت سلیمان ہی تھے۔ اور بھائیوں کی شرکت نہ تھی۔ اور نیز یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ سب بیٹے باپ کے مال کے وارث ہوا کرتے ہیں۔ پھر اس بات کے بیان کرنے سے کیا حاصل نکلا۔ جو جناب باری تعالیٰ نے اس قصہ کو یاد فرمایا۔ ایسی لغو بیہودہ باتیں خداوند متین کے کلام میں نہیں ہو سکتیں۔

علاوہ بریں ایسی بات کے بیان کرنے میں جس میں تمام عالم نیک و بد شریک ہوں کیا بزرگی نکلی جو خداوند کریم نے حضرت سلیمان کے فضائل و مناقب میں اس کو درج فرمایا۔ اور مقام تعریف میں چنانچہ سیاق و سباق سے ظاہر ہے ذکر کیا۔ القصہ بوجوہ مذکورہ یہاں بھی وراثت مالی مراد نہیں ہو سکتی۔ جب بدلائل واضحہ اس سے اطمینان ہوا کہ ہر چہ بادا باد وراثت مالی تو مراد نہیں۔ تو یہ تردد ہوا کہ پھر اور کون سی وراثت مراد ہوگی؟ اس بات کے اطمینان کے لئے اول تو حضرات ائمہ کی طرف رجوع کیا ادھر سے یہ جواب ملا اِنَّ سُلَيْمَانُ وَرِثَ دَاوُدَ وَاِنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرِثَ سُلَيْمَانَ۔ یعنی بیشک حضرت سلیمان حضرت داؤد کے وارث ہوئے۔ اور حضرت

محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان کے وارث ہوئے۔

وراثت سے مراد علم دین (بروایت ائمہ شیعہ)

چنانچہ یہ روایت حضرت امام جعفر صادقؓ کے حوالہ سے امام المحدثین شیعہ حضرت کلینی نے اپنی کتاب میں نقل کی ہے۔ سنیوں کی کتابوں میں ایسی ویسی باتیں ہوتیں تو شیعوں کے لئے گنجائش انکار بھی تھی۔ بہر حال اس روایت سے عیاں ہے کہ آیت وورث سلیمان میں تو وراثت علمی و وراثت منصب نبوت مراد ہے۔ وراثت مالی مراد نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت سلیمان سے کیا قرابت تھی؟ کہ اس کے وسیلہ سے جو مال حضرت سلیمان کو حضرت داؤد کے ترکہ میں سے ملا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میراث میں ملتا بمعہذا مال ملا تو کب ملا؟ بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایسی میراث جو حضرت داؤد سے حضرت سلیمان کو پہنچی۔ اور حضرت سلیمان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی بجز میراث نبوت اور میراث علم کے اور کچھ نہیں۔

سیاق و سباق آیت سے بھی وراثت علمی ظاہر ہے

علاوہ ازیں خود کلام ربانی میں کلام سابق اور کلام لاحق دونوں اسی بات پر دلالت کرتے ہیں۔ کہ جملہ ورث سے میراث علمی مراد ہے میراث مالی مراد نہیں۔ چنانچہ حافظان عربی داں پر پوشیدہ نہیں۔ بااین ہمہ بندہ بھی ماقبل مابعد دونوں کو لکھ کر اطمینان کئے دیتا ہے۔ کلام سابق تو یہ ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ جس کے جملہ ورث سلیمان سے مل کر یہ معنی ہوئے۔ کہ بیشک دیا ہم نے داؤد اور سلیمان کو ایک علم۔ اور کہا ان دونوں نے شکر اس اللہ کا جس نے فضیلت دی ہم کو اپنے بہت بندوں ایمان والوں پر۔ اور وارث ہوئے سلیمان داؤد کے" اور کلام لاحق یہ ہے وَقَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ الخ اور مجموعہ کے مل کر یہ معنے ہوئے "کہ وارث ہوئے سلیمان داؤد کے۔ اور بولے وہ۔ لوگو ہم کو سکھائی ہے یعنی خدا نے گفتگو پرندوں کی فقط"

اب دیکھئے کہ جب جملہ ورث جملہ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا پر معطوف ہوا اور جملہ وَقَالَ وَرِثَ پر معطوف ہوا اور پھر ان دونوں تینوں معطوف اور معطوف علیہ کے ایک دوسرے

پر معطوف ہونے کو لحاظ کریں تو دلیل نہ ایک جملہ و ہاں جملہ ورث پر معطوف ہو تو اس ارتباط سے اب یہ بات نکلتی ہے کہ ورث میں وراثت علمی مراد ہے۔ ورنہ بے علاقہ دو جملوں میں عطف کے کیا معنے؟ جس نے مختصر معانی اور مطول کی بحث فصل و وصل کو دیکھا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ اگر وراثت سے وراثتِ علمی مراد نہ ہو بلکہ مالی ہو۔ تو پھر عطف کے جواز کی کوئی صورت نہیں۔ چہ جائیکہ موجب فصاحت و بلاغت ہو۔ اور ظاہر بھی تو ہے اس صورت میں ان دونوں تینوں جملوں میں عطف کا ہونا بعینہ ایسا ہے جیسا زاغ کے ساتھ طوطی کو ایک قفس میں بند کر دیجئے۔

اور جملہ ورث جو ما بین اپنے ماقبل اور مابعد کے داخل ہے اس کی یہ صورت ہو گی۔ جیسے کہا کرتے ہیں بیاہ میں بیچ کا لیکھا۔ ایسی غیر مربوط کلام دیوانوں کی ہوتی ہے۔ خداوند تعالیٰ شانہ کی شانِ رفیع سے یہ بات محال ہے۔ کہ ایسی ناموزوں گفتگو کرے۔ ہاں اگر ایسے مواقع میں محاورات عرب میں لفظ وراثت نہ بولا کرتے تو البتہ فی الجملہ جائے تأمل تھی۔ خیر شیعوں کو شاید خبر نہ ہو پر حافظان کلام ربانی کو معلوم ہے۔ کہ محاورات ساکنان عرب تو درکنار خود کلامِ ربانی میں جو ارباب فصاحت و بلاغت کے نزدیک عربی زبان میں کوئی کتاب یا کوئی عبارت اُس کے ہم سنگ تو کیا پاسنگ بھی نہیں ہو سکتی۔ بہت مواقع میں وراثت سے وراثت علمی مراد ہے یہاں تک کہ وراثت مالی کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا۔

کلام اللہ میں وراثت کو صرف علم کے لئے کثرت سے استعمال کیا ہے

ایک جا فرماتے ہیں ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتَابَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا جس کا یہ مطلب ہے کہ پھر ہم نے وارث کیا کتاب کا اپنے بندوں میں سے اُن لوگوں کو جن کو چھانٹ لیا۔ دوسری جا ارشاد ہے فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِھِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْکِتَابَ ط اس سے بھی وہی وراثت کتاب یعنی علم کتاب مراد ہے۔ مگر شاید خوش فہمان شیعہ کو یہاں یہ احتمال ہو کہ کتاب بھی تو مال ہے اور شاید وراثت مالی ہی یہاں بھی مراد ہو۔ تو گو اس احتمال کے دفع کے لئے کاغذ کے سیاہ کرنے میں اپنی ہنسی کا اندیشہ ہے۔ مگر

بلحاظ قدر فہم شیعہ ناچار کچھ اشارہ ضروری ہوا۔ [illegible]

اس لئے معروض ہے کہ اول آیت میں تو بعد عِبَادِنَا کے فَمِنْھُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ الخ ہے اور دوسری آیت میں بعد کتاب کے یَاْخُذُوْنَ عَرَضَ ھٰذَا الْاَدْنٰی ہے سو تفریع فَمِنْھُمْ سے تو یوں ظاہر ہے کہ عطاء کتاب کے بعد باعتبار عمل کے اُن کے تین حال ہو گئے۔ کوئی ظالم رہا۔ کوئی مقتصد کوئی سابق۔ سو عمل علم پر متفرع ہو سکے ہے نہ کہ اوراق اور جلد کتاب پر۔ اور یَاْخُذُوْنَ کا یہ مطلب ہے کہ ان کو کتاب کیا ملی دنیا ہی کمانے لگے یعنی رشوت لیکر امراء کی مرضی کے موافق مسئلے غلط بتانے لگے چنانچہ قرینہ اَلَمْ یُؤْخَذْ عَلَیْھِمْ مِّیْثَاقُ الْکِتَابِ اَنْ لَّا یَقُوْلُوْا عَلَی اللہِ اِلَّا الْحَقَّ ط اس بات پر شاہد ہے اور ظاہر ہے کہ رشوت لیکر غلط مسائل بتانے بے علم کے نہیں ہو سکتے۔ بہرحال اکثر مواقع میں لفظ وراثت سے وراثت علمی مراد ہے۔ سو اس استبعاد کی بھی گنجائش نہیں کہ میراث کو علم سے کیا علاقہ؟

کلام اللہ میں وراثت بمعنی قائم مقام

ہاں شاید کسی عربی خواں عمامہ بند شیعی کے جی میں یہ کھٹکے کہ وراثت علمی وراثت مجازی ہے اور وراثت مالی وراثت حقیقی۔ پس وراثت کے معنی حقیقی چھوڑ کر بے ضرورت معنی مجازی لینے درست نہیں البتہ اگر ضرورت ہوتی تو مضائقہ بھی نہ تھا۔ اس لئے کہ گذارش یہ ہے کہ معنی معروف وراثت کے معنی حقیقی ہونا اور علم میں مجازاً مستعمل ہونا ہی اول تو مسلّم نہیں۔ علم میں بھی مثل مالی وراثت! اپنے معنی حقیقی پر ہی رہتی ہے۔ الغرض وراثت کے معنی حقیقی دونوں کو عام ہے اور بظاہر اس کے معنی قائم مقام ہونے کے قریب قریب ہیں بلکہ اگر بمعنی جا دی اور مسلط ہو جانے کے کہئے تو اور بھی انسب اور اولیٰ ہے۔ چنانچہ ظاہر ہو جائے گا۔ پر بسبب کثرت استعمال کے عرف فقہا میں معنی معروف میں خاص ہو گیا ہے۔ ورنہ حقیقت وراثت کا اطلاق وراثت علم اور وراثت منصب دونوں پر ویسا ہی صحیح اور درست ہے جیسا کہ وراثت مالی پر۔

اور دلیل اس بات کی کہ معنی خاص یعنی وراثت مال میں یہ لفظ معروف ہو گیا ہے

اور اسی معنی قریب قریب قائم مقام ہونے یا حاوی اور مسلط ہو جانے کے ہیں۔ تمام ہے
کہ بطور معروف ہو یا بطور دیگر۔ یہ ہے کہ بعض ایسے موقع میں کلام اللہ میں یہ لفظ مستعمل ہوا
ہے کہ وہاں وراثت علمی ہو سکے۔ کیونکہ جو چیز میراث میں ملی ہے وہ مال ہے۔ اور نہ
میراث بطور معروف ہو سکے اس لئے کہ جن سے میراث پہنچی ان سے رشتہ داری تو کیا
قرابت دینی بھی نہ تھی۔ بلکہ یہ مسلمان تو وہ کافر جن سے میراث بطور معروف پہنچتی بھی نہ
پہنچے۔ ہاں اگر بمعنی قائم مقام ہونے اور نیابت منصب کے کہا جائے تو البتہ معنی بن جائیں
دیکھئے فرماتے ہیں وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ
الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بَارَکْنَا فِیْهَا جس کے معنی یہ ہیں۔ اور وارث
کیا ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور تھے مشرق اور مغرب میں اس زمین کا جس میں ہم نے
برکت رکھی فقط اب سنئے اس قصہ میں جن کو زمین دلائی وہ بنی اسرائیل تھے۔ اور
جن سے دلائی وہ فرعون اور قوم فرعون تھی۔ ان میں قرابت نسبی تو کیا رشتہ داری
اسلام و ایمان بھی نہ تھی۔ بلکہ یہ مسلمان تھے تو وہ کافر اگر بالفرض آپس میں ایسی
رشتہ داری بھی ہوتی تب ظاہر یہ ہے کہ اس شریعت میں بھی مسلمانوں کو کافروں
کی میراث نہ پہنچتی ہوگی۔ بجز اس کے کہ میراث سے مراد قائم مقام ہونا۔ اور وراثت
منصب مراد ہو۔ اور کوئی صورت نہیں۔ سو اس صورت میں نہ وراثت علمی ہے جو
معنی مجازی کہئے اور یوں کہئے کہ معنی حقیقی وراثت مالی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ
وراثت میں جو چیز ملی وہ زمین ہے جو اصل مال ہے اور نہ یوں کہے بنے ہے کہ وراثت
بمعنی معروف ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَالْعَاقِبَةُ
لِلْمُتَّقِیْنَ میں بھی جس کے یہ معنی ہیں کہ بیشک زمین اللہ کی ہے وارث کر دے ہے
جسے چاہے اپنے بندوں میں سے۔ اور آخر بھلا ڈرنے والوں ہی کا ہے" وہی
وراثت بمعنی قائم مقام ہونے کے ہے۔

وارث بمعنی حاوی و مسلط

الغرض ان مواقع میں تو وراثت ظاہر میں بمعنی قائم مقام

ہونے کے ہے۔ اور غور سے دیکھئے تو حاوی ہو جانا اور مسلط ہو جانا مراد ہے۔
کیونکہ آیت وَتِلْکَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ کَانَ تَقِیًّا میں
جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ وہ جنت ہے جو میراث دیں گے ہم اپنے بندوں میں سے اس کو
جو پرہیزگار ہوگا فقط۔ بجز حاوی اور مسلط ہو جانے کے اور معنی مراد نہیں ہو سکتے
کیونکہ یہاں قائم مقام ہونے کی بھی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ جنت پہلے کسی اور
کے قبضہ میں کب تھی۔ جو پرہیزگاروں کو ان کے قائم مقام کیا؟ اور جنت کو ان سے
چھین لیا۔

اور مجازاً میراث حضرت آدم علیہ السلام کہئے تو قطع نظر اس کے کہ جبتک حقیقی
معنی بن سکیں مجازی کیوں لیجئے؟ اس کا کیا جواب ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام تو
خود جنت میں موجود ہوں گے۔ سو باپ کے ہوتے اولاد کے وارث ہونے کے
کیا معنی؟ بہرحال ایسے معنی عام جو تمام مواقع میں برابر صحیح ہو جائیں یہی معنی معلوم
ہوتے ہیں کہ وراثت سے حاوی ہو جانا اور مسلط ہو جانا مراد ہو۔ اور جب ایک
معنی عام حقیقی بن سکیں جو سب مواقع میں صحیح ہو جائیں۔ تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ
اس کے قائل ہوں کہ بعض مواقع میں معنی حقیقی کہئے اور بعض مواقع میں معنی مجازی
کیونکہ جیسا بے ضرورت معنی حقیقی چھوڑ کر معنی مجازی مراد لینے درست نہیں۔ ایسا
ہی بے ضرورت اس کا قائل ہونا کب درست ہے کہ ایک جا معنی حقیقی لیں اور
ایک جا معنی مجازی؟

ہاں اگر معنی عام کے حقیقی ہونے کی کوئی صورت نہ ہو تو یوں بھی ہوتا۔ معہذا قانون
میراث لاریب قدیم سے قانون شریعت ہے۔ کیونکہ ہر نبی کی شریعت میں کچھ کچھ
اس کے قواعد ہیں۔ اگر یہ بات رسوم دنیا میں سے ہوتی تو یہ بات نہ ہوتی۔ لہذا
اس صورت میں میراث مالی معنی شرعی ہوئے اور وضع لغت اصطلاح شریعت
سے ہر قرن میں مقدم سمجھی جاتی ہے۔ خواہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہو
خواہ کسی اور نبی کا اور ظاہر ہے کہ اصطلاحات اقوام معنی حقیقی میں سے نہیں ہوتیں

بلکہ اقسام منقولات میں سے ہوتی ہیں۔ تو لاجرم معنی حقیقی اُدھر ہی ہوں گے۔ سو اگر وہی ہوں جو میں نے عرض کئے تو نبہا ورنہ جو کچھ ہوں وہی سہی۔ ہمارا تو اتنا مطلب ہے کہ وراثت بمعنی معروف معنی حقیقی نہیں بمعنی اصطلاحی ہے۔

اب سنئے کہ باوجود اصطلاح کے پھر اصطلاح بھی ایسی غالب نہیں کہ معنی حقیقی پر ترجیح ہو۔ کیونکہ کلام اللہ میں اکثر مواقع میں معنی اصطلاحی کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا بہت ہی کم ایسے مواقع ہیں کہ بظاہر وہاں معنی اصطلاحی کا احتمال ہو۔ اور تلاش کیجئے تو بجز ان آیتوں کے جو متمسک شیعہ ہیں اور کوئی آیت نہ نکلے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اُن آیتوں میں بھی احتمال ہی احتمال ہے۔ اور پھر احتمال بھی ایسا کہ غور سے دیکھئے تو وہ احتمال ہی محال ہے۔ چنانچہ بخوبی واضح ہو چکا۔ پھر کون سی ضرورت ہے کہ معنی حقیقی کو چھوڑ کر معنی منقول مراد لیجئے؟ ہاں اگر خدا تعالیٰ کی خود اصطلاح مقرر کی ہوئی ہوتی۔ اور مثل صوم وصلوٰۃ معنے اصلی مراد ہی نہ ہوا کرتے تو ایک بات بھی تھی۔ اس تقریر اخیر سے متحقق ہو گیا کہ وراثت علمی اور وراثت بمعنی معروف دونوں معنی مجازی ہیں یعنی معنی غیر حقیقی ہے۔

وراثت علمی اگر معنی مجازی ہی ہو تو مجاز متعارف ہے

اور سلمنا کہ وراثت بمعنی معروف وراثت حقیقی ہے اور وراثت علمی وراثتِ مجازی لیکن مجاز متعارف اور مجاز مشہور ہے خصوصاً استعمالات قرآن میں یہاں تک کہ حقیقت اور معنی حقیقی کی برابری کرتا ہے۔ چنانچہ دو آیتیں اس بات کی شاہد مذکور بھی ہو چکی ہیں ایک تو ثُمَّ اَوْرَثْنَا الکتاب الذین الخ دوسری فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں وراثت علمی پر بے تکلف دلالت کرتی ہیں۔ کچھ تامل اور توقف کی نوبت نہیں پیش آتی۔ اور یہی مجاز متعارف کے معنی ہیں کہ ایسا مجاز حقیقت سے کم نہیں ہوتا۔ جو یوں کہا جائے کہ بے ضرورت معنی مجازی مراد لینے درست نہیں۔ اور ان سب سے قطع نظر کیجئے تب بھی بات ہاتھ سے کہیں نہیں گئی۔ اس لئے کہ اس میں تو کسی کو کلام نہیں

باوجود قرائن کے معنی مجازی کے مراد لینے میں کچھ دشواری نہیں بلکہ وقت قرائن دالہ معنی حقیقی کا چھوڑ دینا اور معنی مجازی کا مراد لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ نہیں تو پھر معنی مجازی کے استعمال کی کوئی صورت نہ ہو۔

سو اول تو حدیث کلینی سے بڑھ کر اور کونسی دلیل معنی حقیقی کے چھوڑنے اور معنی مجازی کے مراد لینے کی ہوگی علاوہ بریں اور بھی قرائن عقلیہ اور نقلیہ مذکور ہوئے پھر اب بھی اگر معنی مجازی ضروری نہ ہوں تو پھر کب ہوں گے؟

کلینی کی ایک روایت جس میں وراثت علمی کی صراحت ہے

اور با ایں ہمہ اور ایک ایسی دلیل ہے جس سے وراثت مالی کا آیت وَرِثَ میں بلکہ آیت وَهَبْ لِیْ الخ میں بھی مراد نہ ہونا اور وراثت علمی کا دونوں آیتوں میں مراد ہونا بتصریح ثابت ہو جائے اور شیعوں کو بھی اس کے انکار میں مجال دم زدن نہ ہو۔ ہمارے پاس موجود ہے اعنی سوائے آیت مذکور کے۔ ایک دوسری روایت کلینی ہی کی جس کو شیعوں کو بھی برسر و چشم ہی رکھنا پڑے۔ اور درباب مطلب مذکور روایت سابق سے زیادہ کافی ووافی ہے۔ اپنے پیش نظر ہے بغرض دندان شکنی شیعہ اس روایت کو زیب اوراق کرتا ہوں۔

روی مُحَمَّدُ بْنُ يَعْقُوْبَ الرَّازِيُّ فِي الْكَافِيْ عَنْ اَبِيْ عَبْدِ اللّٰهِ جَعْفَرِ ابْنِ مُحَمَّدٍ الصَّادِقِ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنَّهُ قَالَ اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَآءِ وَذٰلِكَ اَنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوْرِثُوْا وَفِيْ نُسْخَةٍ لَمْ يَرِثُوْا دِرْهَمًا وَّلَا دِيْنَارًا وَاِنَّمَا اَوْرَثُوا الْاَحَادِيْثَ مِنْ اَحَادِيْثِهِمْ فَمَنْ اَخَذَ بِشَيْءٍ مِّنْهَا فَقَدْ اَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ۔

مطلب یہ ہے کہ محمد بن یعقوب رازی اعنی علامہ کلینی کافی میں ابو البختری کے واسطے سے امام جعفر صادق سے روایت کرتے ہیں۔ کہ انھوں نے فرمایا کہ بیشک علما انبیاء کے وارث ہیں اور یہ اس سبب سے کہ انبیاء نے میراث میں نہیں چھوڑا اور ایک نسخہ میں یوں ہے کہ میراث میں نہیں پایا کوئی درہم اور نہ کوئی دینار انھوں نے

جو میراث میں چھوڑا ہے تو چند باتیں ہی اپنی باتوں میں سے چھوڑ گئے ہیں۔ پس
جس نے کچھ باتوں میں سے لیا تو اس نے بڑا ہی کامل حصہ لیا فقط۔
اس روایت سے بتصریح معلوم ہوگیا کہ انبیا کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا ان کے
علم کے البتہ علماء وارث ہوتے ہیں۔ سو بعینہٖ یہی مطلب اس حدیث کا ہے جو اہل سنت
حضرت ابوبکر صدیق سے روایت کرتے ہیں۔ اگر اس روایت کو مولوی عمار علی صاحب
اور دیگر علماء شیعہ جھوٹا بتلاتے ہیں تو یہ روایت بدرجہ اولیٰ جھوٹی ہے مگر بایں لحاظ
کہ وہ روایت صدیق ہے تو یہ روایت صادق ہے۔ اور جھوٹوں کو سچوں کی بات
کب پسند آتی ہے؟ اس روایت کو بھی جھوٹا بتلانے لگیں تو کیا عجب؟ بہت ہوگا
تو یہ ہوگا کہ حضرت امام جعفر صادق سے بھی برگشتہ ہو جائیں اور کلینی کو بھی تبرا کر کے
اُن کے کردار کو پہنچائیں۔ لیکن اس بات میں ان کو جب مشکل ہو کہ دین سے غرض ہو
اگر دین سے غرض ہوتی تو صدیق اکبر ہی سے کیوں بگاڑتے؟ بہر حال وہ تسلیم کریں
یا نہ کریں حضرت امام ہمام امام جعفر صادق کا قول ہمارے نزدیک صادق ہے۔ اور
ان کی بات ہمارے سر آنکھوں پر۔

الحاصل بشہادت کلمہ اِنَّمَا جو باقرار شیعہ بھی مفید حصر ہے۔ چنانچہ آیت
اِنَّمَا ولیکم اللہ سے بزعم خود اسی بھروسے لڑتے ہیں یہ بات ثابت ہوگئی کہ انبیاء
نے سوائے علم اور احادیث کے کوئی چیز میراث میں نہیں چھوڑی۔ تو اس صورت میں
لاجرم دونوں آیتوں میں میراث علمی ہی مراد ہوگی۔ باقی اس بات کا شیعوں کو
اختیار ہے کہ اسے معنی حقیقی کہہ کے تعبیر کریں یا معنے مجازی اس کا نام رکھیں۔ اگر معنی
حقیقی کہیں تو فبہا ورنہ مجاز کہیں اور مجاز بھی مجاز متعارف۔ تب بھی انھیں مرحبا۔ اور
اگر ہماری ضد میں مجاز غیر مشہور و غیر متعارف کے قائل ہوں تب بھی کچھ اندیشہ نہیں
چشم ما روشن دل ما شاد۔ اس لئے کہ باوجود اس قدر ہجوم قرائن صارفہ کے جو در باب
مراد نہ ہونے وراثت مالی کے مذکور ہوئے۔ اور باوصف اس قدر کثرت وجوہ ارادہ
وراثت علمی کے جو مسطور ہوئیں۔ اگر وراثت علمی مراد ہو تو گو وہ وراثت مجازی ہی سہی

تب بھی علیٰ حق و صواب ہے۔
بلکہ اگر بالعکس ہو تو خطا فاحش اور غلط ہے اور قواعد دلالۃ کی رو سے غیر جائز
بہر حال آیت وَوَرِثَ میں جیسے بقرائن و دلائل سابقہ وراثت مالی کا مراد نہ ہونا
ثابت اور متحقق ہوگیا تھا۔ ویسے ہی اب بوجوہ و دلائل مذکورہ یہ بھی متحقق ہوگیا
کہ وراثت علمی مراد ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جیسے قرائن و دلائل مسطورہ بالا سے تیقن
ہوگیا تھا کہ آیت وَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ
میں وراثت مالی مراد نہیں۔ اب بشہادت روایت ثانی کلینی یہ لو ثابت ہوا ہے۔
اس کے ساتھ یہ بھی ثابت ہوگیا کہ وراثت علمی مراد ہے چنانچہ ظاہر ہے۔ اور بعد
ادائے شہادت اس روایت کے اس کی حاجت نہ رہی کہ کچھ قرائن اس بات کے بہم پہنچا کر
کئے جاویں کہ یہ آیت وهب لی میں بھی بدستور آیت وَوَرِثَ وراثت علمی ہی مراد ہے
کیونکہ روایت مذکور سے بڑھ کر شیعوں کے حق میں اور کونسی دلیل دندان شکن ہوگی
اس روایت کے ذکر کرنے میں شیعوں کی وہی مثل ہوگئی جیسے کہا کرتے ہیں۔ انھیں
کی جوتی انھیں کا سر۔

سورۂ مریم میں حضرت زکریا صرف خلیفۂ نیک چاہتے تھے

مگر بنظر مزید تحقیق و خوشنودی اہل سنت و پشیمانی شیعہ
کچھ قدرے قلیل اور بھی چھیڑ چھاڑ سہی۔ اس لئے عرض ہے
اگر لفظ ولی اور جملہ وَإِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِن وَرَائِي وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا
کو جو آیت فَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ الخ سے متصل ہی پہلے واقع ہے بنظر غور دیکھا
جائے تو عیاں ہو جائے کہ مقصود حضرت زکریا علیہ و علیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام
فقط طلب گاری جانشین اور خواستگاری خلیفۂ نیک آئین تھی۔ اس دعا کے وقت
جس کا اس سورۂ مریم میں قصہ مذکور ہے۔ تمنائے عطائے فرزند نہ تھی گو کسی اور وقت
میں یہ بھی دعا مانگی ہو۔ اس لئے کہ لفظ وَلِی باتفاق اہل لغت بمعنی فرزند ہرگز
نہیں آتا۔ البتہ بمعنی ولیعہد اور جانشین آتا ہے۔ اور اس پر لفظ مَوَالِيَ مِن وَرَائِي
کا قرینہ خود اسی پر دلالت کرتا ہے۔ کہ گو لفظ وَلِی مثل لفظ مولیٰ بمعنی متعدد

آتا ہو۔ لیکن یہاں یہی معنی مراد نہیں۔ کیونکہ موالی کے ساتھ لفظ من ورائی جو لگا ہوا ہے۔ وہ بے اس کے کہ موالی سے معنی مذکورہ ہی مراد ہوں صحیح نہیں ہوسکتا۔ اطمینان کے لئے ترجمہ مرقوم ہے۔

اعنی اپنے بنی اعمام اور اقرباء سے اندیشہ ہے یعنی یہ ڈر ہے کہ وہ لوگ منصب خلافت نبوت کے لائق نہیں، اگر وہ لوگ میرے جانشین ہوئے تو اُن سے حمایت احکام خداوندی تو معلوم۔ الٹی تبدیل اور تحریف کا کھٹکا ہے۔ اور اپنی اولاد ہونے کی توقع نہیں۔ جو یہی امید ہو کہ شاید کوئی فرزند لائق فائق پیدا ہو جائے۔ کیونکہ میری عورت بانجھ ہے۔ اس لئے یہ عرض ہے کہ مجھے ایک ایسا جانشین عنایت فرما جو میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوب کا بھی وارث ہو۔ اور اس کو اپنی مرضی کے موافق کر دے فقط"

ظاہر ہے کہ سیاق میں موالی کے معنی بجز قائمان مقام اور خلفاء کے اور کچھ نہیں ہو سکتے تو لاجرم ولی بھی جو اُسی مادہ سے مشتق ہے بمعنی ولیعہد اور جانشین ہی گا۔ اور اگر بفرض محال ولی بمعنی فرزند بھی ہو تو موالی بھی بمعنی فرزندان ہی ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت زکریا کے اول تو کوئی فرزند تھا ہی نہیں۔ دوسرے اگر تھا بھی تو پھر تمنائے فرزند کس لئے تھی۔ وراثت کے قابل سب ہی فرزند ہوتے ہیں نیک ہوں یا بد۔ باقی رہا مضمون پسندیدہ الٰہی ہونے کا۔ اگر بالفرض بفرض محال کوئی فرزند بد اطوار ہی تھا؟ اور اسی لئے دوسرے فرزند نیک کی طلبگاری تھی۔ تو اُسی کے حق میں یہ دعا کیوں نہ فرمائی؟ اور موالی کے لئے جو دعا نہ فرمائی تو یہ وجہ ہے کہ تمام برادری بلکہ تمام کنبہ کے ساتھ آدمی کو ایسی محبت نہیں ہوتی جو اُن کے لئے خوا مخواہ دعا ایسے تہ دل سے نکلے۔ یہ معاملہ اگر ہوتا ہے تو اپنی ہی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے۔ کہ اگر اُس کو بد اطوار دیکھے تو خوا مخواہ جی تڑپ جائے۔ اور اصلاح کی دعا بے اختیار دل سے نکلے لیکن شیعوں کو بھی اتنا تو یقیناً معلوم ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی استدعا کے وقت تک کوئی فرزند نہ تھا نیک نہ بد تو معلوم ہوا کہ موالی سے وہی لوگ مراد ہیں کہ بظاہر اُن کے جانشین ہونے کا دھیان تھا کیونکہ یہ جملہ بظاہر غیر ہی کی طلب گاری کی علت ہے جس کے معنی بظاہر یہ ہیں کہ میرے تو فرزند ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کوئی جانشین ہی سہی۔ اور جب جانشین کوئی غیر ہو تو پھر وراثت مندرجہ آیت بجز وراثت علمی اور وراثت منصبی کے صحیح نہ ہوگی۔

اور یہ بھی نہ سہی جب ولی بمعنی جانشین ہوا تو وراثت سے وراثت علمی ہی مراد ہوگی وہ اپنا ہو یا بیگانہ۔ اور یہ دعا کچھ مستبعد نہیں کیونکہ جیسے محبان دنیا اور اہل دنیا فرزند اور خلف رشید کے طلب گار رہتے ہیں۔ ایسے ہی ارباب علم و فضل اور مرشدان صاحب کمال کو خلیفہ راشد اور جانشین کامل کی تمنا ہوا کرتی ہے۔ بلکہ ایسے لوگوں سے تمنائے فرزند البتہ مستبعد ہے۔ اور یہ جو بعضے اور مواقع میں حضرت زکریا سے دعا میں۔ بجائے ولی لفظ ذُرِّيَّة جو باتفاق بمعنی اولاد ہے کلام اللہ میں منقول ہے تو اس سے یہ لازم نہیں کہ سورۂ مریم میں بھی اس دعا سے اولاد ہی مطلوب ہو۔ اس لئے کہ مکرر سہ کرر دعا کا اتفاق ہوا ہو۔ سورۂ مریم میں جس دعا کا ذکر ہے اس دعا کے وقت تک بسبب اس کے اولاد کی طرف سے مایوس تھے۔ جانشین ہی کی تمنا ہو۔ مگر کچھ تو اس سبب سے کہ مایوس کو اسی چیز کی تمنا ہوتی ہے جس کی طرف سے مایوس ہو۔ نہیں تو مایوس ہی کیوں ہو۔ خداوند کریم ارحم الراحمین قاضی الحاجات مجیب الدعوات نے بوجہ خاطر داری حضرت زکریا ساری تمنا پوری کر دی۔ کچھ اس وجہ سے مدنظر رحمت و قدرت خداوندی عطائے فرزند ہوا ہو۔ کہ اس دعا کے بعد قبل قبولیت جب حضرت مریم کو دیکھا ہو کہ بے موسم میوے خداوند کریم اُن کو پہنچاتا ہے۔ تو ان کو بھی امید ہوئی ہو کہ مجھے بھی بے موسم فرزند عنایت ہو جائے۔ تو ایسے ارحم الراحمین قدیر کی رحمت اور قدرت سے کیا بعید ہے؟ اس لئے اس وقت خاص فرزند ہی کی دعا کی ہو۔ اور خداوند مجیب الدعوات نے قبول فرمائی ہو۔ بہر حال مکرر دعاؤں کا اتفاق ہوا ہو۔ اول (بسبب نہ ہونے سامان تولد کے) فقط جانشین ہی کی دعا کی ہو۔ بعد میں یوں سمجھ کر کہ سامان کی خلا

کو ضرورت نہیں اس بات کی دعا کی ہو کہ جانشین بھی ملے تو فرزند ہی ملے۔
لیکن جس آیت میں کلام ہے اُس آیت میں ہم تسلیم نہیں کرتے کہ دعا رفرزند ہی اس میں مقصود ہے۔ اور با ایں ہمہ جس جگہ لفظ ذریت ہے وہاں بھی اگر اولاد معنوی یعنی خلیفہ راشد اور مرید کامل اور شاگرد رشید مراد ہو تو کیا قباحت ہے؟ آخر شاگردوں اور مریدوں کو فرزند بول ہی دیا کرتے ہیں۔ اور فرزند ناخلف کو کہا کرتے ہیں کہ یہ ہمارا بیٹا نہیں۔ بلکہ خود خداوند کریم نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو بوجہ ناخلفی یوں کہا کہ یہ تمھارا بیٹا نہیں۔ اور وجہ ایسی بیان فرمائی یعنی بداطوار ہونا جس سے یوں معلوم ہو جائے کہ جو نیک اطوار ہیں سو وہ سب بمنزلہ برادر اور فرزند ہیں۔ بلکہ سورۂ ہود میں جو حضرت نوح کا قصہ مذکور ہے تو اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سب متبعان نوح علیہ السلام کو اہل نوح فرمایا۔ جس سے ایک دفعہ تو یوں سمجھ میں آئی کہ حضرت نوح کے کنبہ کے لوگ مراد ہیں۔ اس لئے کہ حضرت نوح کو یہ حکم ہوا تھا کہ جب طوفان کی آمد ہو تو تم کشتی میں سب قسم کے جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا چڑھا لیجو۔ اور اپنے اہل کو چڑھا لیجو۔
اب ظاہر ہے کہ جانوروں کے اور اہل وعیال کے چڑھانے کو تو فرمایا۔ اور سوا ان کے اور مسلمانوں کے چڑھانے کو نہ فرمایا۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ خداوند کریم سے منجملۂ محالات ہے کہ جانوروں کے بچاؤ کی تدبیر تو کی جائے اور مسلمانوں کے بچاؤ کا سامان نہ کیا جائے۔ اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سب مسلمانوں کو اہل و عیال نوح علیہ السلام ہی میں شمار کر لیا ہے۔ القصہ جب متبع اور مرید داخل اہل وعیال ہوئے اور فرزند ناخلف اہل وعیال سے خارج ہوئے۔ تو ہو سکے ہے کہ ذریت سے مرید اور متبع ہی مراد ہو۔ چنانچہ عربیت کے محاورات میں اپنے زمرہ کے لوگوں کو آل اور ذریت کہہ دیا کرتے ہیں۔ مگر انصاف یوں ہی ہے کہ سورۂ آل عمران میں جو دعا زکریا علیہ السلام میں لفظ ذُرِّيَّة واقع ہے۔ تو وہاں اولاد ہی مراد ہے۔ پر اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سورہ مریم میں بھی لفظ ولی سے اولاد ہی

مراد ہو۔ ہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سوائے ایک بار کے اس باب میں حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا ہی نہیں کی۔ تو البتہ ٹھکانے کی بات ہے۔
پر مغائرۃ الفاظ یعنے یہاں اور الفاظ کا ہونا اور وہاں اور۔ اس بات پر شاہد ہے کہ چند بار دعا کا اتفاق ہوا۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ ولی کو فرزند پر محمول کیجے۔ البتہ اگر بجز فرزند کے مراد لینے کے معنی صحیح نہ ہو سکیں تو ایک بات بھی ہے لیکن یہاں تو معاملہ بالعکس ہے۔ فرزند کے مراد لینے میں صحتِ معنی زائل ہو جائے تو عجب نہیں۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا کہ جملہ کَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا اسی طرف مشیر ہے، اور اگر یوں کہیے کہ اس سیاق سے حضرت زکریا علیہ السلام کی یہ غرض تھی کہ وجہ دعا معلوم ہو جائے اور اس بات کی بازپرس کا اندیشہ نہ رہے کہ اولاد جب فتنہ ہے۔ اس جلالت قدر پر کیا مناسب تھا کہ ایسی تمنائے نازیبا کو زبان پر لائیے دوئم جملہ کانت امراتی عاقرا مثل جملہ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا جو اپنے بڑھاپے پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اپنا عجز اور بے سروسامانی ثابت ہو جائے۔ تاکہ باعث جوشِ رحمت اور موجب حرکت قدرت ہو۔ نہ یہ کہ بوجہ بے سروسامانی قطع امید مقصود ہے۔ تو قطع نظر اس کے کہ ہم نے جو معنی بیان کئے ان معنی سے عمدہ نہیں تو کم تو کسی طرح نہیں۔ اور ہم کو لا نسلم کہنے کی اس سبب سے پھر بھی گنجائش ہے۔ اس سے تو بات ہاری ہی نہیں کہ ولی بمعنی فرزند تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اگرچہ اس کا مصداق فرزند ہی کیوں نہ ہو۔
غرض بہر حال یہ لفظ بمعنی ولیعہد اور جانشین ہے۔ اور جب بمعنی ولیعہد اور جانشین ہوا تو وراثت سے وہی وراثت مقصود ہوگی جو ولیعہد اور جانشین کو سزاوار ہے۔ تاکہ لفظ ولی کے اختیار کرنے کا بھی فائدہ معلوم ہو۔ اور وہ ظاہر ہے کہ یہی وراثت منصب و وراثتِ علم ہے۔ نہ وراثت مالی بطور معروف۔ جیسے بدلائل و قرائن مرقوم بالا آیت فھب لی الخ میں وراثت مالی کا مراد نہ ہونا معلوم ہو چکا تھا۔ اب بشہادت روایت کلینی و قرائن مذکورہ یہی متحقق ہو گیا کہ وراثت

علی اوز وراثت منصب ہی مقصود ہے۔ اور وہ خلجان جو دربارۂ تخالف ہردو آیت مشار الیہا و حدیث ما ترکنا ہ صدقۃ تقاضا ہر بیان حدیث و کلام اللہ کے دل میں کھٹکتا تھا بیخ و بنیاد سے اُکھڑ گیا۔ اور بہر نہج اطمینان کامل ہوگیا کہ حدیث مذکور کسی آیت کے مخالف ہی نہیں۔ جو اس وجہ سے اُس کو غلط کہا جائے۔ اور دشمنان صدیق اکبر کی بات بنے۔ گو درصورت غلط ہونے حدیث مذکور کے بھی شیعوں کا اہل سنت پر کچھ دباؤ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ بحوالہ اشارہ آیۃ یوصیکم اللہ اور ہدایت آیۃ ما افاء اللہ مرقوم ہوچکا۔ بلکہ الٹے شیعوں کو اپنے دن نظر آئے کہ اس حدیث کے مصدق ان کی حدیثیں بھی نکلیں۔

حدیث لا نورث حضرت صدیق کے لئے متواتر سے بھی بڑھ کر تھی۔

اور نیز اب اس کی کسی طرح حاجت نہیں کہ جیسے اس حدیث کا مخالف نہ ہونا ثابت ہوگیا۔ ویسے ہی (قطع نظر مخالف ہونے کے) فی حد ذاتہ اس کا صحیح ہونا بھی صحیح ہوجائے۔ مگر بنظر اثبات و اظہار صدقِ صدیق اکبر کچھ اس بات میں بھی رقم طرازی ضروری ہے اس لئے اول تو یہ معروض ہے کہ اس جگہ یہ عذر ہی بیجا ہے کہ اس حدیث کا راوی ایک ہی شخص ہے۔ کیونکہ یہ بات تو وہاں دیکھی جاتی ہے کہ جہاں خود نہ سُنا ہو۔ اور درصورتیکہ کوئی شخص اپنے کانوں سے کوئی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن لے۔ تو اس کے لئے وہ ایک اپنا سننا لاکھوں کی خبر دینے سے زیادہ ہوگا کیونکہ راویوں کی کثرت کی جو روایات میں ضرورت ہوتی ہے تو اس لئے ہوتی ہے کہ جھوٹ ہونے کا وہم جاتا رہے۔ اور جب اپنے کانوں سے سُن لیا تو پھر جھوٹ کا احتمال ہی نہیں رہتا۔ جو اس کے رفع دفع کی ضرورت ہو۔

بلکہ لاکھوں کے بیان سے گو یقین حاصل ہوجائے۔ پر ایسی تسلی اور اس قدر اطمینان نہیں ہوتا جس قدر دیکھنے سے ہوتا ہے۔ کلکتہ، دلی، لندن، مکہ مدینہ کے ہونے میں گو ہمیں اس وجہ سے شبہ نہیں۔ کہ ہزاروں لاکھوں بیان کرتے ہیں لیکن دیکھنے میں جو بات ہے وہ سننے میں نہیں۔ اس لئے مثل مشہور ہے کہ

ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ

جب دیکھنے کی چیزوں میں یہ حال ہے کہ اوروں کا کہا اگرچہ لکھوکھا کیوں نہ ہوں۔ اپنے دیکھنے کے برابر نہیں تو سننے کی باتوں میں بھی یہی سمجھنا چاہئے کہ اوروں کی خبر اور روایت اگرچہ لکھوکھا کیوں نہ ہوں۔ اپنے کان کے سننے کے برابر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اظہر من الشمس ہے۔ پھر جب حضرت ابوبکر صدیق اپنے کان سے ایک حکم سن چکے ہوں۔ تو ان پر یہ اعتراض کرنا کہ جس روایت پر انھوں نے عمل کیا بجز ان کے اس کا اور کوئی راوی نہیں۔ علماء شیعہ کی کمال سلامتِ عقل اور خوبیٔ فہم پر دلالت کرتا ہے۔ اتنی بات تو ہر ادنیٰ اعلیٰ جانتا ہے کہ حدیث نبوی اُس شخص کے حق میں جس نے بلا واسطہ اپنے آپ سُنی ہو یقین بلکہ عین الیقین ہے۔ اُس کو اس حدیث پر عمل کرنا واجب ہے کسی دوسرے سے سُنے یا نہ سُنے۔

روایت کے درجات ان کے لئے ہیں جنھیں آنحضرت سے سماع و رویت حاصل نہیں

اس لئے اجماع اصولیین شیعہ و سُنی اس بات پر ہے کہ خبر کا متواتر اور غیر متواتر اور واحد اور مشہور وغیرہ ہونا بہ نسبت اُنھیں لوگوں کے ہے جنھوں نے نبی کو نہ دیکھا نہ اپنے آپ اُن کی بات سُنی بلکہ اوروں کے واسطے سے اُن کی باتیں سنیں۔ نہ کہ اُن کے حق میں جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بچشم خود دیکھا اور بگوش خود اُن کے کلام سُنے۔ ایسے لوگوں کے حق میں جنھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اپنے کانوں سُن لی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات حدیث متواتر سے بڑھ کر ہے۔ سو ابوبکر صدیق نے اپنے سننے کے موافق آپ عمل کیا تھا۔ کسی دوسرے کی گردن پر تو چھری نہیں رکھی۔ غرض یہ اعتراض تو بہرحال بے جا۔ ہاں بے اعتقادی کی وجہ سے اُن کی بات کا اعتبار نہ کرو تو یہ دوسری بات ہے۔ اُس کو اس اعتراض سے کیا علاقہ۔

روایت لا نورث کے راوی دس بارہ صحابی ہیں

مہذا الحکم کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ۔ ہم بھی اُسی راہ چلتے ہیں جس راہ شیعہ چلیں۔ اگر راویوں کی کثرت ہی سے حدیث صحیح ہوتی ہے۔ اپنے سننے سے نہیں ہوتی۔ تو سنئے جیسے روایات کے غلط ہونے

کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ اُس کے راوی کذاب و مفتری ہوں۔ دوسرے یہ
کہ اس کے معنی مخالف عقل یا معارض نقل صحیح ہوں۔ ایسے ہی صحت روایات کی بھی
دو ہی صورتیں سمجھنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے راوی صادق ثقہ دیندار ہوں دوسرے
یہ کہ قرآن یا احادیث صحیحہ اس کے معنوں کی موئید ہوں۔ اور عقل اس کے مدلول کے
مساعد ہو۔ علیٰ ہذا القیاس جیسے راویوں کی قلت اور روایات صحیحہ کی مخالفت سے
بقدر مخالفت اعتبار کی بھی قلت ہوتی ہے۔ چنانچہ سب جانتے ہیں ایسے ہی
کثرت رواۃ و ناقلان اخبار اور موافقت اخبار و روایات صحیحہ سے بقدر موافقت
اعتبار کو بھی ترقی اور زیادتی ہوتی ہے۔ اس لئے دونوں قسم کے وجوہ صحت اور
دونوں قسم کے وجوہ اعتبار کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

راویوں کی کثرت کا تو یہ حال ہے کہ ایک ابوبکر صدیق ہی اس کے راوی نہیں۔
کوئی دس بارہ راوی ہیں۔ اور وہ بھی ایسے ایسے کہ اُن کے ثانی آسمان و زمین نے
بھی کمتر دیکھے سنے ہوں گے۔ اور یہ جو علماء شیعہ فرماتے ہیں اور مولوی عمار علی صاحب
بھی اُسے ہی گاتے ہیں۔ کہ ابوبکر صدیق نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو فدک
سے فقط ایسی روایت کو سُنا کر جواب بتلایا۔ کہ اس کا راوی ایک آدمی کے سوا
یعنی اپنے آپ کے اور کوئی نہ تھا۔ دروغ محض اور سراسر بہتان ہے۔ اس لئے
کہ اہل سنت کی کتابوں میں یہ حدیث بروایت زبیر بن العوام و حذیفۃ بن الیمان
و ابو درداء و ابوہریرہ و عباس و علی و عثمان و عبدالرحمٰن بن عوف۔ و سعد بن ابی
وقاص و عائشہ ام المؤمنین و عمر بن الخطاب و ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم اجمعین
صحیح و ثابت ہوئی ہے۔

اہل شیعہ کے نزدیک حضرات علی اور حذیفہ کا اعتبار لازمی ہے

اگر حضرت عائشہ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور حضرت
عثمان کا اس باب میں شیعوں کو اعتبار نہ تھا۔ تو حضرت
علی اور حضرت حذیفہ وغیرہم نے کیا تقصیر کی ہے؟ جو ان کا بھی اعتبار جاتا رہا اگر شیعوں
کے نزدیک اس سے زیادہ اور کیا خطا ہوگی کہ حق کہہ گذرے۔ اور وہ بھی ایسے مقدمہ

میں کہ جس میں کہنے سے مدعیان محبت شیعہ سراپا عداوت کی بات بھکی پڑی ہے۔ مگر بنظر
خیر خواہی شیعہ باتباع آیت کلا نمد ہؤلاء علماء شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے
کہ سنیوں کی بدشگنی کے لئے اپنی ناک اپنے ہاتھ سے کیوں کاٹتے ہو۔ یہ بھی خبر ہے کہ
معصوم کے قول کے نہ ماننے سے شیعہ بھی شیعہ نہیں رہتا بزعم خود کافر ہو جاتا ہے۔
درصورتیکہ حضرت علی کا اس روایت میں نام آگیا پھر تو جی چاہے یا نہ چاہے
ماننا ہی چاہئے۔

علیٰ ہذا القیاس حضرت حذیفہ کی بات سمجھئے۔ کیونکہ اگر وہ معصوم نہ تھے تو در
باب روایت معصوم ہی تھے۔ اس لئے کہ ملا عبداللہ شہیدی نے اظہار الحق میں
انھیں حضرت حذیفہ کے حق میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیان فرمائی
ہے۔ مَاحَدَّثَكُمْ بِهٖ حُذَيْفَةُ فَصَدِّقُوْهُ یعنی جو کچھ حذیفہ تم سے کہا کرے اُسے
سچ ہی سمجھو اور سچ ہی کہو۔

بخاری شریف میں حدیث لا نورث بروایت حضرت امیر

اور اگر کسی کو یہ تأمل ہو کہ اور ہوں تو ہوں حضرت علی
اس کے راوی نہ ہوں گے۔ تو اپنی تصدیق کے لئے
اصح الکتب اہل سنت سے وہ حدیث ناظرین کے پیش نظر کرتا ہوں جس سے بالخصوص
حضرت علی کا بہ نسبت اس حدیث کے راوی ہونا ثابت ہو جائے۔

اخرج البخاری عن مالک بن اوس بن الحدثان النصری اِنَّ عُمَرَ بْنَ
الْخَطَّابِ قَالَ بِمَحْضَرٍ مِنَ الصَّحَابَةِ فِيْهِمْ عَلِيٌّ وَالْعَبَّاسُ وَعُثْمَانُ
وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ وَزُبَيْرُ بْنُ الْعَوَّامِ وسعد بن ابی وقاص
اُنْشِدُكُمْ بِاللّٰهِ الَّذِيْ بِاِذْنِهٖ تَقُوْمُ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ اَتَعْلَمُوْنَ
اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَاهُ
صَدَقَةٌ قَالُوا اللّٰهُمَّ نَعَمْ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلٰى عَلِيٍّ وَالْعَبَّاسِ فَقَالَ
اُنْشِدُكُمَا بِاللّٰهِ هَلْ تَعْلَمَانِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ قَالَ ذٰلِكَ قَالَا اللّٰهُمَّ نَعَمْ۔

حاصل یہ ہے کہ امام بخاری نے مالک بن اوس بن الحدثان النصری کے واسطے سے روایت کیا ہے کہ تحقیق حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے مجمع میں جس حضرت علی اور حضرت عباس اور حضرت عثمان اور عبد الرحمن بن عوف اور حضرت زبیر بن العوام اور حضرت سعد بن ابی وقاص بھی تھے یوں فرمایا کہ میں تمھیں اس خدا کی قسم دیتا ہوں۔ اور اس خدا کو یاد دلا کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے آسمان و زمین قائم ہیں۔ کیا تم اس بات کو جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔ اُن سب نے کہا ہم خدا کے رو برو کہتے ہیں، کہ ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے۔ پھر حضرت عمر حضرت علی اور حضرت عباس کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ کہا کہ میں تم دونوں کو خدا کی قسم دیتا ہوں اور خدا کو یاد دلا کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی ہے ؟ اُن دونوں صاحبوں نے فرمایا کہ ہم خدا کے رو برو کہتے ہیں کہ ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے فقط۔

القصہ اس روایت سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت علی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ اور وہ بھی یوں نہیں بقسم روایت کیا ہے۔ سو اگر اس روایت کی تسلیم میں یہ عذر تھا کہ اس حدیث کے ایک ہی راوی ہیں خود ابو بکر صدیق۔ اور جس حدیث کا کل ایک ہی راوی ہو اور پھر کلام اللہ کی بھی مخالف ہو تو اس پر عمل کرنا ہرگز درست نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ابو بکر صدیق نے کلام اللہ کو چھوڑ کر ایک اپنی ہی روایت پر عمل کیا۔ تو قطع نظر اس کے کہ جہاں علماء شیعہ مخالفت سمجھتے ہیں وہاں مخالفت نہیں موافقت ہے۔ فقط اپنی سمجھ کا قصور ہے۔ چنانچہ ظاہر ہو چکا اور پھر قطع نظر اس سے کہ یہ ایک کی روایت اور زیادہ کی روایت کا فرق وہاں ہے۔ جہاں اس روایت کو مروی عنہ سے اپنے کانوں سے نہ سنا ہو۔ اور جس صورت میں کہ اپنے کانوں سن لیا ہو۔ تو گو یہ سننے والا ایک ہی ہو پر لاکھوں کے بیان سے

زیادہ ہے۔

بفضلہ تعالیٰ یہ عذر بھی مرتفع ہو گیا کیونکہ اس روایت کے اس قدر راوی ہیں کہ کمتر روایات کے اس قدر راوی ہوں گے اور پھر ان میں بھی اکثر وہ لوگ جو بقسم بھا گئے ہیں اور پھر ان میں سے بھی ایک حضرت علی تو ایسے ہیں کہ اُن اکیلوں کی روایت لاکھوں کے برابر ہے خصوصاً شیعوں کے نزدیک۔ کہ اُن کے نزدیک اُن کی روایت کا غلط ہونا محال ہے۔ چہ جائیکہ موکد بالقسم ہو۔

بہرحال شیعوں کے طور پر تو اس روایت کی صحت اور اس روایت کا اعتبار کلام اللہ کی صحت اور اعتبار سے کم نہیں۔ پھر ابو بکر صدیق سے کب ہو سکے ہے کہ ایسی روایت پر عمل نہ کریں ؟ اور اس کا اعتبار نہ کریں۔ اور اہل سنت کے طور پر خود ظاہر ہی ہے کہ اس کے سب راوی بڑے بڑے جلیل القدر صحابی ہیں۔ ایک کا کہنا بھی ہزاروں کے کہنے کے برابر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ روایت بھی اس درجہ کی صحیح اور معتبر ہے کہ قطعیت میں کلام اللہ کی برابری کرتی ہے۔

کیونکہ یہ جماعت کی جماعت جس کا مذکور ہوا قطع نظر اس کے کہ ایک جماعت کثیر ہے۔ ان میں ایک ایک ایسا ہے کہ اس کا کہا مفید یقین اور خبر متواتر کی برابری کرتا ہے۔ چہ جائیکہ جس کے مجموعہ کو لحاظ کیجیے۔ القصہ بوجہ کثرتِ رواۃ صدق و دیانت راویان تو صحت و اعتبار حدیث ما ترکناہ صدقۃ کا یہ حال ہے۔ کہ اول تو اس روایت کے اس قدر راوی ہیں۔ کہ کمتر روایات کے اس قدر راوی ہوں گے اور پھر وہ بھی ایسے ایسے جلیل القدر صحابی۔ اور اگر بوجہ موافقت آیات و احادیث دیکھیے۔ تو آیات کا تو یہ حال ہے کہ خود آیت یوصیکم اللہ ہی جس کی مخالفت کے بھروسے علمائے شیعہ بہت کودتے تھے۔ اس کے موافق ہے مخالف نہیں۔ چنانچہ اس طرح سے مرقوم ہو چکا کہ ناظرین کو ان شاء اللہ شبہ نہ رہے گا۔

اور اگر کسی کو اس پر بھی مخالفت معلوم ہو گی تو ایسے عقل کے اندھوں سے یہ ڈر ہے کہ جن احادیث سے

احادیث و آیات میں کوئی مخالفت نہیں بے عقلی سے کہیں وہم ہو جاتا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زکوٰۃ اور صدقات کا حرام ہونا ثابت ہوتا ہے اُن عاد کو بدرجہ اولیٰ آیت انما الصدقات للفقراء والمساکین کے مخالف سمجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بات کا طعن کرنے لگیں کہ نعوذ باللہ خلاف کلام اللہ عمل کیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فقر و فاقہ مشہور و معروف ہے۔ اور تنہا یہ دعا کرنا کہ الٰہی مجکو جیتے جی اور مرتے دم تک مسکین ہی رکھ۔ اور قیامت کو زمرۂ مساکین ہی میں اٹھائیو۔ سب کو معلوم ہے۔ اور جب آپ فقیر و مسکین بلکہ فخر الفقراء و المساکین ہوئے تو آپ کو زکوٰۃ و صدقات کا لینا بدرجۂ اولیٰ درست ہوا۔ اول یہ بھی ظاہر ہے کہ آیت انما الصدقات میں کوئی اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تخصیص کا نہیں پایا جاتا۔ بخلاف آیت یوصیکم اللہ کے کہ اس میں خطاب کا امت کے ساتھ مخصوص ہونا جو لقرینہ غیبت صیغہ یوصی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے مخصوص ہونے پر شاہد کامل ہے۔

اور جب باتفاق فریقین وہ احادیث جو زکوٰۃ و صدقات کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ آیت انما الصدقات کی مخالف نہ ہوئیں۔ بلکہ موافق ہوئیں تو حدیث ما ترکناہ صدقۃ بدرجۂ اولیٰ موافق ہوگی۔ کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم میراث سے مخصوص ہونا سیاق سورۃ یعنی شروع سورت سے تو معلوم ہوتا ہی تھا چنانچہ مرقوم ہو چکا ہے۔ خود آیت یوصیکم اللہ سے بھی مفہوم و معلوم ہوتا ہے۔ بخلاف آیت انما الصدقات کے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اُس کے حکم سے مخصوص ہونا اگر معلوم ہو تو بتکلف ومنهم مَن يَلمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ سے جو اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ سے بفاصلہ چند آیت مقدم ہے معلوم ہو کیونکہ ماحصل اس کا یہ ہے۔ "کہ بعض منافقین میں سے وہ لوگ ہیں کہ اے پیغمبر تجھ پر زکوٰۃ بانٹنے میں طعن کرتے ہیں۔ اگر انھیں بھی مل جائے تو راضی ہو جائیں اور نہ ملے تو غصہ میں بھر جائیں"۔ سو اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کا منصب تقسیم زکوٰۃ تھا۔ پھر جو انما الصدقات فرمایا تو معلوم ہوا کہ یہ حق فقراء و مساکین کا ہے۔ منافقین کے باپ کا اس میں اجارہ نہیں۔

القصہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب تقسیم اور فقراء اور مساکین کے مصرف ہونے اور منافقین کے مستحق نہ ہونے کو لحاظ کیا جائے تو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم سے خارج ہیں اور یہ ایسی بات ہے کہ کوئی شخص کسی مسکین کو کچھ دے کر یوں کہے کہ اس کو مساکین پر تقسیم کر دینا اغنیا کو نہ دینا تو گو وہ مسکین بھی جس کو وکیل تقسیم کیا ہے مسکین ہے لیکن بحکم شہادت فہم عرف وہ شخص اس حکم سے خارج ہے اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آیت واعلموا انما غنمتم من شئ میں اور آیت ما افاء اللہ میں فللرسول شمول کہنے کی ضرورت ہوئی۔ القصہ آیت اِنَّمَا الصدقات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص ہونا فقط ایک آیت ومنهم من يلمزك فی الصدقات سے جو جملہ منفصل اور قرینہ خارجی ہے بدقت اور بتکلف سمجھ میں آتا ہے۔ اور آیت یوصیکم اللہ سے آپ کا مخصوص ہونا بے تکلف قرینہ داخلی خارجی دونوں سے سمجھ میں آتا ہے۔

تو اگر وہ احادیث جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زکوٰۃ کا حرام ہونا ثابت ہوتا ہے آیت انما الصدقات کے مخالف نہیں موافق ہیں۔ تو حدیث ما ترکناہ صدقۃ آیت یوصیکم اللہ سے زیادہ تر موافق ہوگی۔ علی ہذا القیاس آیت وورث سلیمان داؤد اور آیت فہب لی من لدنک سے بھی حدیث لا نورث ماترکناہ صدقۃ مخالف نہیں موافق ہے۔ کیونکہ ان آیات میں میراث علمی و میراث منصبی مراد ہے، میراث مالی مراد نہیں۔ چنانچہ بدلائل واضحہ واضح ہو گیا اور حدیث ماترکناہ صدقۃ میں میراث مالی مراد ہے میراث علمی مراد نہیں۔ باقی رہی احادیث سے موافقت سو اس کا حال یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک تو یہ حدیث ماترکناہ صدقۃ اس درجہ کو صحیح ہے کہ اس کی صحت کے دریافت کرنے کے لئے کسی اور حدیث صحیح کی موافقت کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اور حدیثوں کے صحت کی میزان اور معیار

اس کو کہئے تو زیبا ہے۔ بااین ہمہ یہی حدیث کئی طریقوں سے یعنی سندوں سے
مروی ہے۔ اور وہ سب کی سب صحیح ہیں۔ اور یہی معنی ہیں احادیث
صحیحہ کے موافق ہونے کے۔

کیونکہ حدیث کی صحت باعتبار سند صحت کے ہوتی ہے اور حدیث کا تعدد باعتبار
تعدد سند کے ہوتا ہے۔ اگر متن یعنی ایک عبارت کئی سندوں سے مروی ہو تو اس
حدیث کو پھر ایک حدیث نہیں کہتے ہیں۔ اُس کی تعداد بمقدار تعداد اسانید ہوگی۔
اور جب وہ ایک حدیث نہ ہوئی بلکہ متعدد ہوئیں تو بایں وجہ کہ متن ایک ہے ایک
دوسرے کے موافق ہوگی۔ اور چونکہ حدیث ما ترکناہ صدقۃ کا یہی حال ہے بلکہ
بعض بعض الفاظ متن میں بھی فرق ہے گو معنی باہم موافق ہی ہوں۔ تو بیشک ان کو
ایسی چند حدیثیں کہیں گے کہ ایک دوسرے کے موافق ہیں۔ اور پھر جب سب سندیں
صحیح ہوئیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث احادیث صحیحہ اہل سنت کے موافق ہے۔

روایاتِ شیعہ سے لا نورث کی تائید

مگر اس سے کام نہیں چلتا کیونکہ اس کی صحت میں اگر
شک ہو تو شیعوں کو ہو۔ اس لئے لازم یوں ہے کہ احادیث صحیحہ اور روایات معتبرہ
شیعہ اس کی صحت پر شاہد لائیے۔ لہذا معروض خدمت علمائے شیعہ بلکہ عوام و
خواص امامیہ بہ عرض ہے۔ کہ فرقہ امامیہ اثنا عشریہ کے نزدیک کتاب کافی کلینی سے
بڑھ کر کتب احادیث میں کوئی کتاب معتبر نہیں۔ سو وہ علامہ کلینی ہی کی روایت تھی جو
بروایت ابو البختری امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا یہ قول منقول ہوا ہے۔

اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ وَذَالِکَ اِنَّ الْاَنْبِیَاءَ لَمْ یُوْرِثُوْا وَفِیْ نُسْخَۃٍ
لَمْ یَرِثُوْا دِرْھَمًا وَلَا دِیْنَارًا وَاِنَّمَا اَوْرَثُوْا اَحَادِیْثَ مِنْ اَحَادِیْثِھِمْ
فَمَنْ اَخَذَ بِشَیْءٍ مِنْھَا فَقَدْ اَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ۔

اور چونکہ ترجمہ اس کا مرقوم ہو چکا ہے تو مکرر ترجمہ کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ پر اتنا
لکھنا ضروری ہے۔ کہ اس روایت میں بنسبت روایت صدیق کے کوئی بات کم نہیں
بلکہ اتنی بات زیادہ ہے کہ اس روایت میں حضرت امام ہمام امام جعفر صادق رضؓ نے

بنظر بدگمانی شیعہ اس کی وجہ بھی بیان فرما دی ہے کہ انبیا کے علم کے تو وارث ہوتے ہیں
اور ان کے مال کا کوئی وارث نہیں۔

سو در صورتیکہ نسخہ لَمْ یَرِثُوْا صحیح ہو تب تو مطلب ظاہر ہے کیونکہ حاصل یہ ہوگا
کہ انبیا کے جو فقط علما ہی وارث ہیں کوئی ان کے اموال متروکہ کا وارث نہیں ہوتا۔ تو وجہ یہ ہے
کہ انہوں نے بھی تو کسی سے کچھ درہم و دینار میراث میں نہیں لیا اور اگر نسخہ لَمْ یُوْرِثُوْا
صحیح ہو تو مطلب یہ ہوگا۔ کہ علما کے وارث الانبیاء ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انبیا نے درم و
دینا کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ جو اس میں میراث جاری ہو۔ انہوں نے فقط احادیث میراث میں
چھوڑی ہیں۔ باقی رہا فدک وغیرہ سو فدک تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ملک میں
ہی نہ تھا جو یوں کہئے کہ فدک چھوڑ کر آپ اس جہان سے تشریف لے گئے چنانچہ بشہادت
آیت ما افاء اللہ بخوبی روشن ہو چکا ہے۔

وصال کے وقت کوئی چیز آپ کی ملکیت نہ تھی

اور سوا اُس کے اور اشیاء مثل لباس مرکب
مکان کے، سو مکان آپ کے پاس فقط حجرہائے ازواج مطہرات تھے۔ سو بگواہی کلام اللہ
یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ مملوک ازواج ہو چکے تھے۔ اس لئے کہ خداوند کریم یوں ارشاد
فرماتا ہے وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ یعنی اے پیغمبر کی بی بیو اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔ اور یوں
نہیں فرمایا وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِ النَّبِیِّ یعنی نبی کے گھروں میں ٹھہری رہو، تو معلوم ہوا کہ وہ حجرے
ازواج کے ہو چکے تھے۔ بوجہ ہبہ مملوک ازواج ہوئے ہوں یا اور کسی وجہ سے، اور یہ احتمال
کہ سکونت کے گھر کو تمام عالم رہنے والوں کا گھر کہا کرتے ہیں۔ اگرچہ مالک اس کا کوئی اور ہو۔
ادھر کرایہ کے مکان کو سبھی اپنا کہا کرتے ہیں قطع نظر اسکے کہ یہ مجاز ہو، اور بے ضرورت
مجازی معنے مراد لینے کی اجازت نہیں۔ اور پھر اس سے قطع نظر کیجئے کہ خدا کو کیا ضرورت
ہوئی۔ کہ فی بیوت النبی نہ فرمایا؟ اور یہ فرمایا جو شیعوں کے لئے اور موجب دشواری ہے
امام کی بات غلط ہو جائے گی۔ ہم کو تو ان معنی کی اپنے طور پر ضرورت نہیں کیونکہ تا حین حیات
مملوک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تھے۔ تو بحکم حدیث لانورث الخ وہ صدقہ
ہوگئے پھر ازواج کے تصرف میں ایسے تھے جیسے املاک فدک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا

کے صرف میں آتی تھی۔ ہم کو تو ان معنے کے کہنے میں فقط تصدیق حدیث حضرت امام جعفر صادق مدنظر ہے۔

سو اگر آیت وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ کے وہ معنے نہیں جو ہم نے عرض کئے تو شیعوں ہی کو دشواری ہے۔ ہمیں کیا غرض؟ مکانات بھی وقت وفات آپ کے نہ تھے۔ ہاں البتہ لباس اور مرکب کے باب میں کھٹکا باقی رہا مگر قوت ایمان کی بات تو یوں ہے کہ حضرت امام کے اس حصر کو کہ انبیاء نے بجز احادیث کے میراث میں کچھ چھوڑا ہی نہیں، صحیح سمجھ کر ہرگز متامل نہ ہوجیئے اور یوں سمجھئے کہ گو بظاہر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اشیاء مذکورہ کو دنیا میں چھوڑا لیکن شاید کسی کو اپنے جیتے جی دے گئے ہوں۔ اور پھر جو ان کے پاس موجود تھیں تو بوجہ عاریت ہوں۔

القصہ اپنی سمجھ میں نہ آنے کے باعث حضرت امام کی بات کی تکذیب نہ کیجئے، ہاں اپنی سمجھ اور عقل کی تغلیط کیجئے۔ لیکن اطمینان قلب مومنین کے لئے یہ اشارہ مرقوم ہے کہ لَمْ یورثوا کے یہ معنے نہیں کہ آپ دنیا میں کچھ چھوڑ ہی کر نہیں گئے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ میراث میں نہیں چھوڑ گئے۔ سو اس صورت میں بجز اس کے نہیں بن پڑتی کہ یہ روایت جس کے راوی حضرت ابوبکر صدیق ہیں، یعنی حدیث لَانُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ صحیح ہو، اور حضرت امام نے بوجہ واقفیت اس وصیت کو حصر کر کے یہ فرما دیا ہو، کہ انبیاء نے بجز احادیث کے میراث میں کچھ نہیں چھوڑا۔ بہرحال روایت حضرت امام ہمام امام جعفر صادق روایت حضرت صدیق اکبر سے اس بات میں کہ انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا کچھ کم نہیں، بلکہ بہر ہیچ زیادہ ہے۔ اول تو آپ نے بطور حصر یوں فرما دیا کہ انبیاء نے بجز احادیث میراث کے لئے کچھ چھوڑا ہی نہیں،

صادق اور صدیق کی روایت کا فرق

حدیث ابوبکر صدیق میں یہ بات نہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے۔ کہ حضرت امام کے حصر سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اول تو یہ کہ یا تو انبیاء علیہم السلام نے کچھ چھوڑا ہی نہیں یا چھوڑا ہے تو وہ میراث کے قابل نہیں۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے میراث میں احادیث کو چھوڑا ہے۔ اور حضرت ابوبکر صدیق کی روایت سے فقط اتنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ

اموال متروکہ انبیاء قابل میراث نہیں۔ معہذا حضرت ابوبکر صدیق کی حدیث میں اس دعوے کے ساتھ کہ متروکہ انبیاء قابل میراث نہیں کوئی دلیل نہیں۔ اور حضرت امام نے اس کی دلیل بھی فرما دی ہے اور اپنے دعوی کو موجہ کر دیا۔ سو سنیوں کی طرف سے تو آپ کو اطمینان ہی تھا۔ اس وجہ کا طرہ جو ساتھ لگایا، تو اسی وجہ سے لگایا ہوگا۔ کہ حضرات شیعہ کی طرف سے آپ کی خاطر جمع نہ تھی، ان کے نفاق سے عیاں تھا کہ میری بات سیدھی انگلیوں حضرت شیعہ ماننے والے معلوم نہیں ہوتے اس لئے اپنے دعوے کو موجہ کر کے بیان فرمایا تھا۔

لیکن آفرین ہے شیعوں کو کہ حضرت امام کی بات کے نہ ماننے سے گو ایمان ہی خاک میں رل گیا، مگر کیا امکان جو اپنوں سے باز آجائیں، اپنی وہی مرغی کی ایک ٹانگ گائے جاتے ہیں۔ خیر خداوند کریم ہی ان کو سمجھے کہ نہ پیر کے نہ فقیر کے، نہ اصحاب کے نہ اماموں کے۔۔۔ بالجملہ جائے شرم ہے کہ جن کی آڑ میں یہ اصحاب کرام پر طعن کرتے تھے۔ وہ خود ہم صفیر اصحاب ہیں۔ یہ وہی مثل ہے کہ مدعی سست اور گواہ چست۔ وائے برحال شیعہ کہ اصحاب کو برا کہہ کے تو نور ایمان ہی کھویا تھا، پر ائمہ کی بات نہ ماننے سے ایمان ہی کھو دیا۔ کیونکہ بزعم شیعہ منکر قول ائمہ کا کافر ہے۔ خصوصاً جب کہ ایسی معتبر کتابوں کے واسطے سے معلوم ہو جائے، جن کا نام کافی کلینی، القصہ حدیث ما ترکناہ بشہادت حدیث کلینی مذکور جو صحیح ہے اصح ہے۔

کلینی کی دوسری مؤید حدیث

معہذا ایک اور حدیث کلینی ہی اس کے مؤید ہے چنانچہ وہ بھی مرقوم ہو چکی، لیکن بنظر احتیاط اسے بھی مکرر لکھے دیتا ہوں۔ رَوَی الْکُلَیْنِیُّ عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ اِنَّ سُلَیْمَانَ وَرِثَ دَاوُدَ وَاِنَّ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَرِثَ سُلَیْمَانَ۔ ترجمہ اس کا مرقوم ہو چکا، اس لئے یہاں اسی قدر مرقوم ہونا مناسب ہے۔ کہ اس سے اتنی بات معلوم ہوئی ہے کہ انبیاء کی میراث، میراث علم ہے، باقی رہا دلائل عقلیہ اور قرائن عقلیہ سے حدیث مذکور کا صحیح ہونا سو اس کا بیان بھی اوپر ہو چکا ہے، مگر بطور یاد دہانی فقط اشارتاً یہ بات مرقوم ہے۔ کہ اول تو انبیاء اپنی قبور میں زندہ موجود ہیں اور زندہ کے مال میں میراث جاری نہیں ہوتی، ہاں اگر وہ اشیاء ان کے کام آمد نہ رہیں اور اس لئے

وہ ان اشیا کو کسی موقع میں صرف کرنے کو کہیں۔ تو ان کے خدام کو لازم ہے کہ ان اشیا کو اسی طرح صرف کردیں۔ سو درصورتیکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو باتفاق حیات النبی ہیں گوشہ قبر میں زندہ موجود ہوں۔

اور پھر دلائل بھی اس پر شاہد ہوں۔ چنانچہ اوراق سابقہ میں مذکور ہوئے۔ تو میراث تو آپ کے متروکہ میں جاری نہ ہوگی۔ لیکن آپ کے خلیفہ کے ذمہ جو بمنزلہ کارکن نبوی ہے کیونکہ خلیفہ اُسے ہی کہتے ہیں، یہ بات لازم ہوگی کہ درباب اموال نبوی جویائے اشارات نبوی رہے سو چونکہ اشارہ نبوی حضرت ابوبکر صدیق کو جو خلیفہ راشد تھے اس باب میں بایں طور معلوم ہوا کہ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ ہے تو انکے ذمہ اُس کی تعمیل لازم پڑی، اور کوئی ناقدر شناس باوجود دلائل مسطورہ سابقہ حیات نبوی کو نہ مانے تو ان کے لئے دوسری ہدایت عقلی موجود ہے، اگر ہدایت پر آنا ان کو منظور ہو، وہ یہ ہے کہ انبیاء خدا کے سامنے اپنے آپ کو مالک ہی نہیں سمجھتے۔ پھر وہ کیونکر نہ کہیں کہ ہمارے متروکہ میں میراث جاری نہیں ہوتی۔ کیوں کہ وہ ہماری ملک ہی نہیں خدا کی ملک ہے۔ ہمارے پاس فقط مستعار تھا۔ جب ہم ہی نہ رہے تو عاریت کہاں رہی؟ اب لازم یوں ہے کہ جیسے یہ خدا کا مال ہے۔ خدا ہی کی راہ میں صرف ہونا چاہیئے۔

مگر چونکہ یہ بات سابق میں مشروحًا بیان ہو چکی ہے تو یہاں اس قدر بھی بہت ہے علاوہ ازیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا فدک نہ دینا یا بوجہ ظلم وعناد ہو یا بوجہ حقانیت، مگر چونکہ حضرت صدیق اکبر نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی اس میں سے کچھ نہیں دیا، اور علے ہذا القیاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں اپنی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا کو بھی نہیں دیا۔ حالانکہ موافق قانون میراث یہ دونوں بیبیاں بھی وارث تھیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ازواج مطہرات میں سے تھیں، بلکہ ان سب میں معزز اور ممتاز۔ تو معلوم ہوا کہ یہ نہ دینا محض باتباع امر حضرت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم تھا۔ بوجہ عناد و ظلم و فساد نہ تھا، ورنہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی پر ظلم کرتے تو کرتے اپنی بیٹیوں پر نہ کرتے۔

مالک الدنیا اور زاہد غاصب نہیں ہو سکتا

معہذا جو لوگ غضب کرنے والے ہوتے ہیں وہ لوگ بندہ ہوا و ہوس ہوتے ہیں تارک الدنیا اور زاہد نہیں ہوتے۔ جو لوگوں کے اموال چھین تو لیں پر بوجہ زہد و تقوٰے و ترک دنیا اپنی خواہشات نفسانی کو مار کر بیٹھ رہیں، اور اسے ہاتھ نہ لگائیں، پھر جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فدک کو نہ چھیڑا، اور اسے ہاتھ نہ لگایا، نہ اپنے خرچ میں لائے، نہ اولاد کو نہ اہل و عیال کو دیا۔ تو کیا وجہ پیش آئی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فدک کا نہ دینا فقط اسی وجہ سے تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کے باب میں ایک حکم ناطق سن چکے تھے۔ اور ان سب کو جانے دیجئے۔ ابوبکر صدیق کی نسبت تو شاید شیعان فریب باز بحکم المرء یقیس علی نفسہ فریب کا بھی احتمال کریں۔؟

ترکہ نبوی میں تمام اہلبیت کا عمل

حضرات ائمہ اور اہل بیت کی طرف تو یہ گمان نہ ہوگا سو ان کا حال سنیئے کہ حضرت امیر المومنین علیؓ سے لے کر آخر تک سب اس بات میں شریک ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ترکہ جب ان کے ہاتھوں پڑا تو حضرت عباس اور ان کی اولاد کو اس میں دخل نہ دیا، ان سب کو نکال باہر کیا۔ اور ازواج مطہرات کا بھی حصہ نہ دیا۔ حالانکہ نصف ترکہ کے یہ دونوں فریق مالک ہوتے تھے۔ پس اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری ہوتی تھی۔ تو بزرگان اہلبیت کیوں ابوبکر صدیق کی راہ ہو لیے؟ ابوبکر صدیق اگر مرتکب ظلم شنیع اور جور قبیح ہوئے تھے تو چنداں مستبعد نہ تھا۔ لیکن ان بزرگواروں کو جو شیعوں کے نزدیک معصوم اور اہلسنت کے نزدیک محفوظ ہیں کیا بلا پیش آئی کہ سب کے سب ایسے ظلم عظیم کے روادار ہوئے۔

اس لئے کہ باجماع اہل سیر و تواریخ و باتفاق علماء حدیث ثابت اور محقق ہے کہ متروکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خیبر اور فدک وغیرہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حضرت علیؓ اور حضرت عباس کے قبضہ میں تھا۔ لیکن حضرت علی نے انجام کار حضرت عباس کا قبضہ اٹھا دیا، فقط انہیں کا قبضہ رہا، پھر حضرت علی مرتضٰے کے بعد حضرت امام حسنؓ کے قبضہ میں رہا، ان کے بعد حضرت امام حسینؓ کے قبضہ میں رہا، بعد ازاں حضرت امام زین العابدین اور حضرت حسن بن حسن کے تحت تصرف رہا۔ دونوں اسے لیتے دیتے رہے

ان کے بعد حضرت زید بن حسن برادر حسن بن حسن کا اس پر تصرف ہو گیا، اس کے بعد مروان کے پنجوں میں پڑ گیا۔ پھر برابر مروانیوں کے قبضہ میں رہا یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی بادشاہت کی نوبت آئی، چونکہ وہ خلیفہ عادل اور بادشاہ انصاف پرور تھے، انہوں نے کہا جو چیز رسول اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا کو مانگنے پر بھی نہ دی ہو۔ میرا اس میں کیوں کر حق ہو سکے۔ اس لئے انھوں[1] نے پھر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی کو اس کا متولی کر دیا۔

پس ائمہ معصومین اور بزرگان اہلبیت کے عمل درآمد سے عیاں ہو گیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری نہیں ہوتی، بلکہ وہ وقف ہوتا ہے۔ اسلئے اولاد ائمہ معصومین - - - - - - نے ان لوگوں کو دخل نہ دیا۔ جو بقانون میراث وارث تھے، اور بالیقین متحقق ہو گیا کہ حدیث صدیق اکبر یعنے لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ بلا غبار صحیح و درست ہے، اور حضرت ابوبکر صدیق کا حضرت فاطمہ کو متروکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نہ دینا اس لئے ہے جیسا کہ ائمہ اہلبیت نے ازواج مطہرات اور عم بزرگوار اور بنی عم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیا، بلکہ حضرت صدیق اکبر کی جانب دلائل حق پرستی زیادہ تر ہیں۔ کیونکہ ائمہ اہلبیت کی نسبت ازواج مطہرات اور بنی عم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نہ دینے میں ظاہر بینان کم فہم کو مثل خوارج یہ بھی شبہ ہو سکتا ہے کہ نفع کی چیز دیکھ کر نہ دیا۔ کیونکہ فدک وغیرہ گو وقف تھا لیکن خرچ اہلبیت مقدم تھا۔ معہذا طعن و تشنیع کا بظاہر چنداں اندیشہ نہ تھا۔ کیونکہ یہ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کے وارثوں کے کچھ غیر نہ تھے ایسی جگہ چیز کے پھنس جانے اور خرچ ہو جانے کو یونہی کہا کرتے ہیں کہ گھی کہاں گیا کھچڑی میں۔

لیکن ابوبکر صدیق کی جانب نفع کا تو یہ حال ہے کہ قاعدہ کی رو سے ایک حبہ کی توقع نہ تھی کیونکہ نہ وارث ہو سکتے تھے منجملہ مصارف مندرجہ آیۃ ما افاء اللہ تھے کیونکہ آپ کچھ مسکین فقیر نہ تھے اور پھر ظاہر میں بھی باتفاق فریقین ایک حبہ تک کا تغلب اس میں نہیں

---

[1] یعنی ابوبکر صدیق

کیا۔ آئندہ سوائے مردمان فہیدہ اور عاقلان سنجیدہ کے کسی سے کلمہ خیر کی توقع نہ تھی، بلکہ الٹا عقل کے دشمنوں سے یہ اندیشہ تھا کہ یوں کہیں گے۔ دیکھو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ہوتے ہی یہ آنکھیں بدل لیں کہ حضرت فاطمہ کا بھی لحاظ نہ کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ کا ترکہ دبا بیٹھے۔ چنانچہ بلا کم و کاست یہی ظہور میں آیا غرض کہ کسی طرح کی منفعت کی امید تھی، اگر تھی تو تمام عمر کی سوختگی کی امید تھی۔

القصہ گو حضرت صدیق اکبر نے بھی وارثان نبوی کو متروکہ نبوی بوجہ تعمیل ایمائے نبوی نہیں دیا۔ اور ائمہ اہلبیت نے بھی بوجہ مذکور متروکہ نبوی وارثان نبوی کو نہیں دیا۔ لیکن ابوبکر صدیق کا نہ دینا ایک مجاہدہ عظیم تھا۔ اور ائمہ اہلبیت کا نہ دینا فقط نہ دینا ہی تھا۔ خصوصاً جب کہ نیازمندی و اخلاص و محبت صدیق اکبر اور حقوق اہلبیت خصوصاً حضرت فاطمہ زہرا کو لحاظ کیجئے۔ اور پھر اس پر حضرت فاطمہ کے ایک دفعہ بمقتضائے بشریت ناخوش ہو جانے کو دیکھئے تو رمز شناسان طریقہ پر واضح ہو جائے گا کہ ایسے وقت میں پابند حکم نبوی رہنا ایسے ہی کامل الایمان مستقیم العقل سراپا اتباع نبوی کا کام ہے جیسے ابوبکر صدیق رض، لیکن شیعوں کی عقل کی آنکھ پھوٹ گئی ہے حق و باطل کی تمیز کیونکر کریں گے مگر اس میں ابوبکر صدیق کا کیا قصور؟ ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ÷ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

جیسے اندھے کو اندھیرا تو اندھیرا نور بھی اندھیرا ہی نظر آتا ہے، ایسے ہی شیعوں کو بسبب عداوت کے اندھے ہو جانے کے باعث خوبیاں بھی برائیاں ہی نظر آتی ہیں۔ ؎

چشم بداندیش کہ برکندہ باد ÷ عیب نماید ہنرش در نظر

الحاصل بقرائن عقلیہ واضح و لائح ہو گیا کہ حضرت صدیق اکبر کا نہ دینا فقط بوجہ اتباع امر نبوی تھا، اور یہ حدیث یعنی لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ صحیح بلا غبار ہے۔ سوائے اتباع نبوی اور پیروئی حدیث مذکور کسی قسم کا احتمال ان کی جانب نہیں ہو سکتا اور سابقاً بجہت کثرت رواۃ اور صدق و دیانت جملہ راویان و ہجوم قرائن نقلیہ اس حدیث کا اعتبار اور اس کی صحت معلوم ہو چکی تھی۔ تو اب کسی کو دربارہ صحت حدیث مذکور کسی وجہ سے مجال

دم زدن باقی نہ رہی۔ اگر کسی کو کچھ حوصلہ ہو تو بسم اللہ، اور یہ بھی متحقق ہو گیا کہ مولوی عمار علی صاحب کا درباب صحتِ حدیث مذکور یوں رقم فرمانا کہ۔

"اول تو یہ روایت خلاف قرآن ہے۔ دوسرے یہ کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے وارثوں میں سے نہ بیٹی سے نہ اپنی بیبیوں سے کسی سے نہ کہا کہ میرا مال صدقہ ہے تم کو نہیں پہونچتا تم دعوے نہ کرنا۔ اور جو خدا کا حکم ان کے واسطے تھا اس کو ان سے چھپا رکھا۔ اور ایک اجنبی شخص سے کہ اس کو کسی طرح کا دخل پیغمبر خدا کی وراثت میں نہ تھا اس کے کان میں کہدیا۔ اور کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ کہا۔"

ایک سخن ابلہ فریب یا گفتگوئے ابلہانہ ہے۔ کیونکہ جسے وہ خلاف [illegible] کہتے ہیں وہ حقیقت میں موافق قرآن ہے۔ چنانچہ مفصل معلوم ہو چکا [illegible] ہو تو کسی کا کیا قصور ہے؟

مصرع۔ سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

اور جہاں وہ یوں کہتے ہیں کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ [illegible] بارہ سے تو روایت موجود ہے، منجملہ رواۃ حضرت علی اور حضرت [illegible] اور حضرت عائشہ بھی ہیں، اور خدا جانے اور کتنوں نے سنا ہوگا؟ کہ ان کو روایت کا اتفاق [illegible] مولوی صاحب کو خبر نہ ہو تو یہ ہمارا ذمہ نہیں کہ انہیں خبر کیوں نہ ہوئی [illegible] پڑے ہیں۔ یا دیدہ و دانستہ فریب کرتے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے وارثوں میں سے کسی سے نہ کہا، اگر بسبب بے خبری کے [illegible] تو قابل تنبیہ ہے کہ کسی چیز کی اگر کسی کو خبر نہ ہو تو اس سے یہ لازم نہیں [illegible] میں نہ ہوا کرے۔ مولوی صاحب کو موجودات اور واقعات [illegible] سے خصوصاً موجودات عالم غیب اور واقعات قرون گذشتہ کی [illegible] وجہ سے کہ وہ معلوم [illegible] واقع نہیں [illegible]

[illegible] لا وجود الا ما شاهدت بھی نہیں اور [illegible] نقش و قرطاس ہوا ہے تو اس کا جواب دکان سے فروشان پہ ملے گا۔ ہاں اگر حضرت عباس اور حضرت عائشہ

وارث نہ ہوتے تو یوں بھی کہنا جائز تھا کہ اپنے وارثوں میں سے کسی سے نہ کہا، اور حضرت علی ہر چند وارث نہ تھے۔ لیکن اول تو وارثوں سے زیادہ مقرب تھے دوسرے وہ حضرت فاطمہ کے جو وارث تھیں وارث تھے یعنی ان کے خبرگیران اور ان کی طرف سے لینے دینے والے ہی تھے۔ سو بہ نسبت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے سنانے کے ان کا سنا دینا اور ان کا کہنا زیادہ تر مفید تھا، علاوہ بریں اس قسم کے مضمون جو موت کی خبر دیں اقربا کے حق میں موجب رنج ہوتے ہیں خصوصاً بیٹی کہ اس کو بہ نسبت فرزندوں اور اکثر اور اقربا کے والدین کے ساتھ زیادہ محبت ہوتی ہے، تو اگر جناب سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم موافق رائے ناقص مولوی عمار علی صاحب حضرت فاطمہ زہرا رضہ سے یہ مضمون فرماتے، کہ تمہارے لئے حکم خداوندی یوں ہے کہ میری وفات کے بعد میرے ترکہ میں سے کچھ نہ لینا، تو کچھ فائدہ تو ہرگز نہ تھا۔

اس لئے کہ جو کچھ ان کے کہنے سے کام چلتا۔ اس سے زیادہ حضرت علی کے کہنے سے کام چلتا نظر آتا تھا، اور ان سے کہہ ہی چکے تھے۔ مگر چونکہ یہ مضمون متضمن خبر وحشت اثر وفات سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم تھا تو مفت موجب آزردگی خاطر مبارک حضرت زہرا رضہ ہوتا۔ سو ایسا کونسا حضرت زہرا رضہ کا آزردہ کرنا ثواب تھا یا جناب سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ زہرا کے دشمن تھے کہ بے وجہ اور بے سبب ان کو سب سے پہلے رنج وغم میں ڈال دیتے، آپ خود جانتے تھے کہ اگر بالفرض والتقدیر میری وفات کے بعد، حضرت زہرا رضی اطلاع حضرت علی رضہ ابوبکر صدیق سے، جو آپ کے نزدیک بالیقین خلیفہ ہونے والے تھے، طالب میراث ہوں گی اول تو ابوبکر صدیق رضہ دین میں ایسے سست نہیں کہ کسی کے پاس لحاظ سے حق بات زبان پر نہ لائیں، اور پھر حضرت زہرا رضہ ایسی ناحق پرست نہیں کہ باوجود زبان صدیق صادق سے حدیث نبوی سن لینے کے ہٹ دھرمی کریں اور طلب میراث سے باز نہ آئیں

اور اگر بمقتضائے بشری (جیسے حضرت موسےٰؑ حضرت ہارونؑ پر بے خطا بوجہ غلط فہمی معترض ہوئے تھے۔ اور ان کو قصوروار سمجھا تھا) مقدمہ میراث میں حضرت زہرا رضہ کو

(۱۵۵)

حضرت صدیق اکبر پر کچھ اعتراض ہوگا؟ اور ان کا یہ عذر کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ لَا نُوْرِثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ بوجہ غلط فہمی جو مرتبہ بشریت کو لازم ہے، اور انبیاء بھی اس سے چھوٹے ہوئے نہیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہوگا۔ تو حضرت علی موجود ہیں وہ اس حدیث کو سنا دینگے، القصہ مولوی صاحب کا یہ گانا، کہ کسی سے اپنے وارثوں میں سے نہ کہا، سراسر دروغ و بہتان ہے۔

آنحضرت نے سیدہ کو یہ حدیث نہ بتائی کیونکہ وہ بزعم شیعہ علم غیب جانتی تھیں،

اور یہ جو اپنے نزدیک اس نہ کہنے کو خدا کے حکم کا چھپانا سمجھتے ہیں۔۔۔ اس کو بجز اس کے کہ دیوانوں کی بکواس کہیئے اور کیا کہیئے؟ اول تو حضرت فاطمہ زہرا رضی سے بظاہر چھپانے کی کوئی صورت ہی نہیں، اس لئے کہ وہ ائمہ اہلبیت سے کسی بات میں کم نہیں، جب ائمہ کو علم ماکان و علم مایکون ہو تو حضرت فاطمہ رض کو بدرجۂ اولےٰ ہوگا۔ کیونکہ ان کا رتبہ اکثر ائمہ سے زیادہ ہے۔ کم نہیں۔ بلکہ یوں کہیئے تو زیبا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہنے کی حاجت ہی نہ دیکھی، کہیئے تو اس سے جیسے بے کہے معلوم نہ ہوسکے اور اگر ماکان و مایکون میں سے احکام کو مستثنےٰ رکھیئے یا حضرت فاطمہ زہرا کو دربارۂ علم ائمہ سے کم کہیئے۔ تو اسے چھپانا نہیں کہتے، کہ ایک گروہ میں سے دو چار کو بتلادیا اور باقیوں کو نہ بتلایا، سب جانتے ہیں کہ جب بات دو چار کے کانوں میں پڑتی ہے۔ پھر چھپی نہیں رہتی۔ نقل مشہور ہے۔

ع۔ نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

خاص کر علم دین کی باتیں کیونکہ درباب درس و تدریس و تبلیغ علم و احکام جو کچھ فضائل اور تاکیدیں منقول ہیں۔ سب کو معلوم ہیں۔ پھر کیا امکان جو ایسی بات چھپی رہے؟ آخر جو احکام خداوندی نازل ہوتے تھے۔ سرور کائنات علیہ افضل الصلوات وعلی آلہ کون سے خانہ بخانہ ہر ہر فرد بشر کے کان میں کہتے پھرتے تھے؟ یہی ہوتا تھا کہ ایک دو سے آپ نے کہا۔ انہوں نے اوروں سے، اسی طرح آگے پیچھے سب کو خبر ہو جاتی تھی اور اب تک یونہی بتدریج اتیوں کو خبر ہوتی جاتی ہے۔

ہاں اگر آپ سب کو کہدیتے کہ دیکھو خبردار اور کسی کو اطلاع نہو، تو البتہ یوں کہہ سکتے کہ حکم خداوندی چھپا رکھا۔ علاوہ بریں عقل کی جو بات تھی، وہ آپ کر گذرے، یعنی حضرت صدیق اکبر سے جو کارکن خلافت تھے یہ بات واشگاف فرمادی' اور ظاہر ہے کہ دینا لینا دونوں ہی کا کام ہے، دینے والے کا بھی اور لینے والے کا بھی۔ اگر ان میں سے ایک بھی اپنے کام سے ہٹ بیٹھے۔ تو دوسرے سے کیا ہوسکتا ہے۔ دینے والا اگر دے نہیں تو لینے والا کیوں کرلے۔ اور لینے والا اگر لے نہیں تو دینے والا کس طرح دے۔ پھر لینے دینے والوں میں سے اگر ایک کو بھی رد کردے تو جس چیز کا بدستور رکھنا منظور ہو وہ بدستور رہے گی، سو فقط ابوبکر صدیق کے دینے سے رد کردینے میں مطلب حاصل تھا اس لئے حضرت فاطمہ سے کہنے کی کچھ ضرورت نہ ہوئی۔

صرف صدیق سے حدیث بیان کرنے کی حکمتیں

باقی رہی یہ بات کہ مطلب یوں بھی حاصل ہوسکتا تھا کہ حضرت فاطمہ زہرہ رض کو یہ حدیث سنا دیتے' اور حضرت صدیق اکبر سے یہ بات نہ فرماتے۔ بلکہ حصول مقصود اس صورت میں بوجہ احسن ہوتا۔ کیونکہ اتنا جھگڑا ہی (جو ہوا) نہ ہوتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی حصول مقصود کی ایک یہ بھی صورت تھی لیکن اس صورت میں جو اب ظہور میں آئی۔ چند مصلحتیں ایسی ساتھ لگی ہوئی تھیں، کہ در صورت مرقومہ ہرگز نہ تھیں۔

پہلی حکمت

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اول تو ایسی وصیتوں کے صدیق اکبر سے فرمانے میں صحت خلافت صدیق اکبر کی طرف اشارہ مدنظر تھا تاکہ حاضرین محفل سمجھ جائیں کہ یہ وصیتیں جو صدیق اکبر کو کی جاتی ہیں، تو انہیں اپنا جانشین کرنا اپنے مدنظر ہے۔ کسی مصلحت سے تصریح نہیں فرماتے تو کیا ہوا، اور یہ کچھ نیا ہی اشارہ نہیں ایسے ایسے بلکہ اس سے بڑھ کر اور بہت سے اشارے حضرت صدیق اکبر کی خلافت کی طرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام بلکہ خود کلام ربانی میں پائے جاتے ہیں۔

اور اس سے مولوی عمار علی صاحب کے اس سخن نامعقول کا بھی جواب نکل آیا، کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک اجنبی شخص سے کہ اسے کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی وراثت میں کچھ دخل نہ تھا یہ فرمایا کہ لا نورث ما ترکنا صدقۃ ۔ اور
حاصل جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ میرے بعد سر رشتہ
اختیار صدیق اکبر کے ہاتھ میں ہوگا اس لئے جو امور ضروریۂ خلافت قابل وصیت ہیں ۔ وہ
انہیں سے کہنے چاہئیں تاکہ اس کے موافق کاربند ہو کر انداز خلافت کو ہم رنگ نبوت کردیں
دوسرے ایسی صورت میں فقط لینے والے کو منع کرنے میں یہ بھی اندیشہ ہے کہ مبادا الطمع
نفسانی حکم خداوندی کو چھپالے، گو بوجہ محفوظیت یا معصومیت حضرت زہراؓ سے اس
موقع خاص میں یہ ڈر نہ ہو ۔ مگر قواعد کلیہ شرعیہ میں خاص خاص امور کا اعتبار نہیں ہوتا
اسی واسطے اگر کسی قضیہ میں کوئی ولی کامل کہ اس کی ولایت اور صدق و دیانت
پر تمام عالم متفق ہو، تن تنہا ثبوتِ دعوائے مدعی کی گواہی دے، تو گو یہ یقین کامل ہے
کہ یہ شخص جھوٹ نہیں بولتا ۔ ہرگز قبول نہ ہوگی ۔

اور اگر ایسے دو آدمی کہ بظاہر پیرایۂ عدالت رکھتے ہوں گو قاضی کے نزدیک
بھی وہ دونوں مل کر صدق میں اس ایک کے برابر نہ ہوں، بلا تامل مقبول ہوگی، وجہ اس
کی یہی ہے کہ قواعد کلیہ شرعیہ کو بایں وجہ کہ جو ان قواعد کے لحاظ سے مقصود ہے ۔
کسی خاص موقع میں ان کے لحاظ نہ کرنے میں وہ مقصود بوجہ احسن اور بدرجہ اتم
حاصل ہوتا ہے نہیں چھوڑ سکتے ۔ الحاصل گو حضرت فاطمہ کو حدیث مذکور کے سنا دینے
میں برعم شیعہ مقصود اصلی بہ نسبت اس کے زیادہ تر اچھی طرح سے حاصل ہو جاتا کہ
صدیق اکبر سے فقط کہدیا لیکن قاعدہ کلیہ یہی ہے کہ ایسے موقع میں دینے والے کو روکا جائے
نہ لینے والے کو ۔ اور بایں ہمہ کہنا ہی غلط ہے ۔ کہ اگر حضرت فاطمہ کو یہ حدیث سنا دیتے
تو جھگڑا نہ ہوتا ۔ اور مقصود بوجہ احسن حاصل ہو جاتا ۔ کیونکہ اول تو جھگڑے کا ہونا ہی
مسلم نہیں ۔ چنانچہ انشاء اللہ معلوم ہو جائے گا، یہ فقط شیعوں کی شرارت ہے ۔ کہ
افسانہائے بے اصل کو کوچہ و بازار میں گاتے پھرتے ہیں ۔ حاشا و کلا جو یوں ہوا ہو ۔

دوسری حکمت | دوسرے اگر کسی قسم کی نا ہمواری انہیں شکر رنجی دو چار روز کے لئے
ہو بھی گئی ۔ تو اسے جھگڑا نہیں کہتے ۔ ایسے ایسے امور میں ہو ہی جاتی ہے ۔ حضرت موسیٰ

اور حضرت ہارون کا قصہ کس کس نے نہیں سنا، معہذا جو رنج کہ قریب ہی مبدل بصلح
ہو جائے ۔ اس کے ہونے کا کچھ اعتبار نہیں ۔ اس کو عرف میں کَاَنْ لَّمْ یَکُنْ سمجھتے
ہیں، ایسے رنجوں کا اگر کھٹکا بھی ہوتا ہے ۔ تو پیش بندی نہیں کیا کرتے ۔ سو باایں لحاظ
گو نہ صدیق اکبر ایسے ناقدر شناس ہیں کہ حضرت زہرا کے سامنے عذر معذرت نہ کریں گے،
نہ حضرت زہرا ایسی کج طبع ہیں کہ ہرگز سیدھی ہی نہ ہوں گی ۔ اس کا پیغمبر خدا صلے اللہ
علیہ وسلم نے کچھ لحاظ نہ کیا ہو، مگر الحمد للہ کہ اسی طرح ظہور میں آیا ۔ چنانچہ روایت
مجاج السالکین جو انشاء اللہ قریب ہی مذکور ہوتی ہے ۔ اس بات پر شاہد ہے
کہ حضرت صدیق اکبر نے عذر کئے ۔ اور حضرت زہرا نے قبول فرمائے، اور بدل و جان
ان سے پھر بمنزلہ شیر و شکر مل گئیں ۔

تیسری حکمت | تیسرے یوں کہنا کہ حضرت فاطمہ سے کہدیتے تو جھگڑا نہ ہوتا ۔ جب زیبا ہے
کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عالم الغیب بھی ہوتے ۔ بیسیوں آیات اس بات کی گواہ
ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام موجودات میں سے کسی کو علم غیب نہیں،
قُلْ لَّوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۔ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ
فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ اول آیت سے بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کا عالم الغیب نہ ہونا، اور دوسری سے بالعموم ملائکہ اور انبیاء اور جن و بشر کا
عالم الغیب نہ ہونا ثابت ہے ۔ جسے شک ہو ترجمہ کے کلام اللہ بہت موجود نہیں، نویں
سیپارہ کے نصف و ثلث کے مابین اور بیسویں سیپارہ کے اول رکوع میں آیت
مذکورہ کو تلاش کر کے اپنی تسلی کرے ۔

اور ظاہر ہے کہ اس طرح کے امور کا دھیان گمان بھی بسا اوقات نہیں آیا کرتا
جو یوں کہئے کہ عقل سے معلوم کر کے پیش بندی کرنی تھی ۔ ہاں جو نسی مصلحتیں بیان کیں
اور انشاء اللہ تعالے کروں گا ۔ وہ البتہ لحاظ عقلی کے قابل ہیں ۔ چنانچہ عاقل سمجھتے ہیں
اور جو لا یعقل نہ سمجھیں تو کیا کیجئے ۔

چوتھی حکمت | چوتھی مصلحت یہ ہے کہ جب یوں سمجھ کر کہ جتنا دونوں کے کہنے سے کام چلتا ہے

اتنا ہی ایک کے بھی؟ ایک ہی کے سنا دینے کی تجویز ٹھیری تو پھر مناسب یوں ہے کہ ابوبکر صدیق ہی کو رد کیے۔ کیونکہ فعل عطا انہیں سے ظہور میں آتا۔ باقی حضرت فاطمہؓ لینے والی تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ دنیا لینے کی فرع ہے اور دینا اصل ہے اور اصل کے اکھاڑ دینے میں جو کچھ قلع و قمع فساد ہوتا ہے۔ وہ فرع اور شاخ کے قطع کرنے میں نہیں ہوتا

الحاصل حسن فساد کی پیش بندی کے لئے اس حدیث کا سنا دینا مدنظر تھا اور صدیق اکبر کے کہنے میں تو اس کی بیخ و بنیاد کا اکھاڑ دینا تھا۔ اور حضرت فاطمہؓ کے کہہ دینے میں گویا شاخ کو قطع کر دیا، یا یوں کہیئے کہ پھل نہ لگا۔ سوائے اس کے اگر حسب گفتار سراپا نا معقول شیعہ کوئی اور فساد بیچ میں اتفاق سے کھڑا ہوتا نظر آئے تو اس کی مدافعت کے لئے اس کی مدافعت کو نہیں چھوڑا جاتا یعنی اس بات کا لحاظ مقدم ہے کہ مملوکہ نبوی دست برد وارثان نہ ہو جائے۔ اس بین ملاسے کسی قسم کا تنازع ہی کیوں نہ پیش آجائے۔

بہرحال قطع نظر اس کے کہ حضرت فاطمہ زہرا کے کہنے میں سر دست آزار خاطر مبارک حضرت زہرا نظر آتا تھا۔ اور مطلب ان کے نہ کہنے میں بھی حاصل ہو سکتا تھا۔ اقتضا اصلی بھی یہی تھا کہ حضرت فاطمہ سے نہ کہیئے۔ اور حضرت صدیق اکبر ہی کے گوش گذار کر دیجئے۔ کیونکہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو پھر سر رشتہ اختیار انہیں کے ہاتھ ہوگا۔ جب وہ متروکہ نبوی وارثوں کو نہ دیں گے۔ تو حضرت فاطمہ یا اور کسی وارث کے پاس آپ نہ جائے گا۔ جو وہ اس کو اپنا مملوک سمجھ کر تصرف ناجائز کر بیٹھیں، اور اس وجہ سے ان کو اطلاع کرنے کی ضرورت ہوتی۔

باقی رہی فقط طلب گاری تو اس میں تا وقتیکہ اس بات کی اطلاع نہ ہو کہ ہمارا حق نہیں کچھ گناہ نہیں جو اس پیش بندی کی ضرورت ہو، معہذا حضرت عباس اور حضرت عائشہ سے کہہ دینا کفایت کرتا تھا۔ اس لئے کہ اگر میراث تقسیم ہوتی تو یہ دونوں صاحب بھی کچھ کم نصف کے مالک ہوتے۔ سو اگر میراث تقسیم ہوتی تو سب ہی کو برابر تقسیم ہوتی پس لاجرم ان کو بھی اطلاع ہوتی۔ سو اگر حضرت فاطمہ کو پہلے سے معلوم نہ ہوتا۔ اور نہ

ابوبکر صدیق کو خبر ہوتی، تب بھی ان دونوں کا سننا کافی تھا۔ وقت ضرورت بیشک حال معلوم ہو جاتا۔ اور ان سب کو جانے دو، نہ ابوبکر صدیق کا ذکر کرو اور نہ حضرت عائشہ اور حضرت عباس کے معلوم ہونے کا کچھ خیال کرو، فقط حضرت علی سے فرما دینا ایسا ہی تھا۔ جیسا حضرت فاطمہ سے فرما دیا۔ کیونکہ ان کی طرف سے کارکن اور خبرگیران جب تک وہی تھے۔ دونوں صاحبزادے جب تک صغیر السن ہی تھے۔

پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اول تو میراث کا لینا کچھ کلھیا میں گڑ پھوڑنا نہیں ہے۔ جو چپ چپاتے ہو جائے۔ پھر وہ بھی اس قدر مخفی کہ حضرت فاطمہؓ کے میراث لینے کی حضرت علی کو بھی خبر نہ ہو۔ بلکہ صدیق اکبر سے اگر بالفرض کچھ لیا بھی جائے گا۔ تو گو مطالبہ کرنے والی حضرت فاطمہ زہراؓ ہوں گی۔ پر لینے والے اور قبضہ کرنے والے حضرت علی ہی ہوں گے ادھر حضرت عائشہ اور حضرت عباس بھی بہ نسبت حضرت فاطمہ کے کوئی غیر نہ تھے۔ ایک بجائے والدہ دوسرا بجائے دادا، اور ظاہر ہے کہ ایسی قرابتوں میں بیشتر اتفاق ملاقات رہتا ہے اور اس سبب سے ایک دوسرے کو اس کے نفع و نقصان کی اگر کچھ اطلاع ہوتی ہے تو اطلاع کر دیتا ہے خصوصًا امر دینی کے نفع و نقصان کی باتیں۔ اور وہ بھی ایسے لوگوں سے جو دنیا کو طلاق دیئے بیٹھے ہوں۔ ایسے مواقع میں تو اگر بمقتضائے بشری کوئی رنج بھی فی مابین واقع ہو جاتا ہے۔ تب بھی اس کے نفع و نقصان کی اطلاع کر دیا کرتے ہیں۔

کیونکہ ایسے مواقع اگر کچھ رنج بھی ہو جاتا ہے تو بوجہ محبت ہوتا ہے بوجہ عناد و بغض نہیں ہوتا۔ جو دوسرے کے نقصان کا روادار ہو۔ چونکہ رنج کے دو طرح کے ہونے کی تحقیق آیت محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء کے ذیل میں گذر چکی۔ اس لئے فقط اسی پر اکتفا کر کے معروض کرتا ہوں۔ کہ حضرت عائشہ اور حضرت عباس کے سنا دینے میں بھی یہ نظر آتا تھا۔ کہ لاجرم ان کے وسیلہ سے فاطمہ اور نیز اور وارثوں کو یعنی ازواج باقیہ کو اطلاع ہو جائے گی۔ شروع میں نہیں تو وقتِ طلب یا وقتِ قبض و تصرف تو ضرور یہ بات معلوم ہو جائے گی۔ کیونکہ ایسی باتیں کچھ راز کی تو ہیں ہی نہیں۔ جو کسی کو اطلاع نہ ہو

الحاصل اسے چھپانا نہیں کہتے کہ دس بارہ بلکہ شاید زیادہ کے سامنے ایک بات فرمادیں اور وہ بات بھی اس قسم کی کہ اس کی تعمیل اگر ہو سکے۔ تو جب تک طشت از بام افتادہ کا قصہ نہ ہو تب تک نہ ہو سکے۔ منجملہ اسرار کے نہیں جو چھپائی جائے۔ خاص کر حضرت علی اور حضرت عباس اور حضرت عائشہ سے، کہ دو تو ان میں سے وارث ہیں اور ایک وارث کے وارث یعنی ان کے خبر گیران پھر یوں کہنا کہ حکم خدا کو جو بہ نسبت وارثانِ نبوی تھا پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے وارثوں سے چھپا رکھا۔ جھک مارنا ہے کہ نہیں۔

حسب روایت شیعہ خدا کا حکم چھپانے کی ایک مثال

ہاں چھپا رکھنا اسے کہتے ہیں، کہ حضرت امام زین العابدین نے حسب روایاتِ کاذبہ شیعہ فرزند ارجمندِ خویش حضرت زید شہید سے حکم امامت امام محمد باقر کا چھپا رکھا، اور پھر حیف تر یہ ہے کہ حکم بھی ایسا کہ جیسا اس کے نہ ماننے سے کفر عائد ہوتا ہے ویسا ہی اس کے نہ جاننے سے آدمی کافر رہتا ہے۔ چنانچہ بدستاویز حدیث مَنْ لَمْ یَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِہٖ فَقَدْ مَاتَ مِیْتَۃً جَاہِلِیَّۃً شیعوں کا یہی عقیدہ ہے۔ اس لئے کہ اس کے معنے شیعوں کے طور پر یہی ہو سکتے ہیں کہ جو امام وقت کو (دوازدہ ائمہ میں سے) نہ جانے، یعنی اس کی امامت کی اسے خبر نہ ہو، تو وہ جاہلیت کا سا مرنا مرے گا یعنی جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پہلے پہلے اکثر جزیرۂ عرب کے لوگ بسبب جہالت کے عقائد باطلہ اس جہان سے لے گئے اور اس سبب سے جہنم رسید ہوئے۔ ایسے ہی امامت امام وقت سے جو جاہل رہے گا۔ وہ بھی اسی شمار قطار میں داخل ہوگا، الحاصل حضرت امام زین العابدین نے حضرت زید شہید سے ایسا مسئلہ جو رکن دین و ایمان تھا چھپا رکھا تھا، سو چھپانا اسے کہتے ہیں نہ کہ اس کو کہ ہر ہر وارث کے کان میں لَا نُوْرَثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ کہا اور اگر سند مطلوب ہے تو لیجئے کلینی کی روایت موجود ہے۔ کسی ایسے ویسے رند بازاری کی نہیں۔

رَوَی الْکُلَیْنِیْ عَنْ اِبَانَ قَالَ اَخْبَرَنِی الْاَحْوَلُ اَنَّ زَیْدَ بْنَ عَلِیٍّ بَعَثَ اِلَیْہِ وَھُوَ مُخْتَفٍ قَالَ فَاَتَیْتُہٗ فَقَالَ یَا اَبَا جَعْفَرٍ مَا تَقُوْلُ اِنْ طَرَقَکَ طَارِقٌ مِنَّا اَتَخْرُجُ مَعَہٗ قَالَ فَقُلْتُ لَہٗ اِنْ کَانَ اَبَاکَ

اَوْ اَخَاکَ خَرَجْتُ مَعَہٗ فَقَالَ لِیْ اُرِیْدُ اَنْ اَخْرُجَ فَاُجَاہِدَ ھٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ فَاخْرُجْ مَعِیْ فَقُلْتُ لَا اَفْعَلُ جُعِلْتُ فِدَاکَ فَقَالَ اَتَرْغَبُ بِنَفْسِکَ عَنْ نَفْسِیْ فَقُلْتُ اِنَّمَا ھِیَ نَفْسٌ وَاحِدَۃٌ فَاِنْ کَانَ لِلّٰہِ فِی الْاَرْضِ حُجَّۃٌ فَالْمُتَخَلِّفُ عَنْکَ وَالْخَارِجُ مَعَکَ سَوَاءٌ فَقَالَ یَا اَبَا جَعْفَرٍ کُنْتُ اَجْلِسُ مَعَ اَبِیْ فِی الْخِوَانِ فَیُلْقِمُنِی الْبَضْعَۃَ السَّمِیْنَۃَ وَیُبَرِّدُ لِیَ اللُّقْمَۃَ حَتّٰی تَبْرُدَ شَفْقَۃً عَلَیَّ وَلَمْ یُشْفِقْ عَلَیَّ مِنْ حَرِّ النَّارِ اِذْ اَخْبَرَکَ وَلَمْ یُخْبِرْنِیْ قَالَ فَقُلْتُ خَافَ عَلَیْکَ اَنْ لَا تَقْبَلَ فَتَدْخُلَ النَّارَ وَاَخْبَرَنِیْ فَاِنْ قَبِلْتُ نَجَوْتُ وَاِنْ لَمْ اَقْبَلْ لَمْ یُبَالِ اَنْ اَدْخُلَ النَّارَ

حاصلِ روایت یہ ہے کہ علامہ کلینی ابان سے یوں روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ احول نے مجھ سے یوں نقل کیا کہ حضرت زید بن امام زین العابدین نے جس وقت کہ وہ مخفی تھے، کسی کو میرے پاس بلانے کو بھیجا، تو انہوں نے کہا، اے ابوجعفر (یہ لقب ہے احول کا) تیری اس میں کیا رائے ہے؟ اگر ہماری طرف سے اچانک کوئی بلانے والا تیرے پاس آئے (یعنی ہم اپنی مدد کے لئے تجھے بلوائیں) تو اس کے ساتھ ہمارے بلوانے سے ہو بھی لے گا کہ نہیں۔ احول نے کہا میں نے حضرت سے یوں عرض کیا کہ بلوانے والے تمہارے باپ یا تمہارے بھائی (یعنی امام محمد باقر) ہوتے تو مضائقہ نہ تھا۔ میں بھی ساتھ ہو لیتا، انہوں نے پھر فرمایا میرا ارادہ یوں ہے کہ میں نکلوں، اور اُن لوگوں سے یعنی مروانیوں سے جہاد کروں، سو تو بھی میرے ساتھ چل۔ میں نے عرض کی کہ میں آپ کے قربان جاؤں۔ مجھ سے ہرگز یہ کام نہ ہوگا۔ انہوں نے فرمایا کیا تو اپنے آپ کو ہم سے علحدہ ہو کر بچاتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں اور تم تو ایک ہی ہیں، پر درصورتیکہ روئے زمین پر کوئی خدا کی طرف سے حجت یعنی امام موجود ہو تو تمہارے ساتھ سے رہ جانے والا اور تمہارے ساتھ جانے والا دونوں برابر ہیں۔ یعنی امام کے ہوتے ہوئے تمہارے ساتھ جہاد میں جانے کا کچھ فائدہ نہیں، انہوں نے کہا اے ابوجعفر میں اپنے باپ کے ساتھ خوان پر بیٹھا کرتا تھا وہ مجھے چھانٹ چھانٹ کے گوشت کی موٹی موٹی بوٹیاں دیتے تھے اور میرے لئے لقمے ٹھنڈے کرتے تھے یہاں تک کہ خوب ٹھنڈا کھانے کے قابل ہو جائے،

یہ سب قصہ محبت کے سبب سے تھا۔ سو بڑے تعجب اور کمال حیف کی بات ہے کہ یہاں کی آگ کا تو شفقت کرنے میں لحاظ کیا۔ اور دوزخ کی آگ سے بچانے میں انہیں مجھ پر کچھ محبت نہ آئی جو مجھے امام محمد باقر کی امامت کی خبر کر دی اور مجھے بالکل خبر نہ کی، احول کہتا ہے۔ میں نے کہا تم سے یہ خوف ہوا کہ مبادا تم نہ مانو، اور اس سبب سے دوزخ میں جاؤ، اور مجھے یوں سمجھ کے خبر کر دی کہ اگر میں نے قبول کیا تو فبہا۔ نجات پائی نہیں تو ان کی بلا سے دوزخ میں جاؤں گا تو میں جاؤں گا۔ انتہی۔"

ہر چند اس روایت سے بہت سے مضمون مفید مطلب اہلسنت برآمد ہوتے ہیں لیکن اول تو اس مقام میں ان سب کا ذکر کرنا بے موقع ہے۔ دوسرے فرصت اتنی کہاں اس لئے فقط اتنی گذارش ہے کہ اس روایت سے بتصریح معلوم ہوا، کہ حضرت امام زین العابدین نے دیدہ و دانستہ اپنے فرزند ارجمند زید شہید سے امامت حضرت امام محمد باقر کو چھپا لیا حالانکہ اس کا جاننا منجملہ ارکان ایمان تھا۔ چنانچہ اس روایت سے بھی ظاہر ہے، اب اہل انصاف سے یہ عرض ہے، کہ فدک کو جو منجملہ متاع دنیوی تھا امامتِ امام وقت کے برابر رکھئے، جس کا جاننا منجملہ ارکان ایمان ہے۔ اور پھر حضرت امام زین العابدین کے دیدہ و دانستہ چھپا لینے کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دس بارہ آدمیوں کے سامنے بغرض تبلیغ کہہ دینے کے مقابل کیجئے۔ اور پھر اس کا لحاظ کیجئے کہ با ایں ہمہ حضرت امام زین العابدین نے جو حضرت امام محمد باقرؓ کی امامت کی حضرت زید شہید کو اطلاع نہ کی۔ تو اس میں کیا نقصان نکلا؟

اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت فاطمہ زہرا سے یا کسی اور وارث سے حدیث لا نُورث ما ترکنا صدقۃ نہ کہا۔ اور بزعم شیعہ فقط صدیق اکبرؓ ہی سے کہا تو کیا ضرر پیش آیا؟ ظاہر ہے کہ بہ نسبت امامتِ امام محمد باقر حضرت امام زین العابدین کے لب کشا نہ ہونے میں انجام یہ نکلا کہ نعوذ باللہ نقل کفر کفر نباشد حضرت زید شہید بوجہ جہل رکن ایمان یعنی امامتِ امام وقت چنانچہ روایت مسطور سے ظاہر ہے، مستوجب دوام عذاب اور داخل زمرۂ کفار ہوئے۔ اگر بذاتِ خود امام زین العابدین فرزند ارجمند

سے یہ بات فرما دیتے، تو امید قوی تھی کہ حضرت زید تسلیم ہی کر لیتے۔ اشتباہ در فرع احول وزوغ کو جو فی الحال رہزن ایمان ہوا، اس صورت میں بیچ میں سے اٹھ جاتا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فقط ابو بکر صدیق ہی سے حدیث مذکور کو کہا تو کچھ خرابی نہ نکلی۔ کیونکہ جو کچھ مقصود تھا، وہ حاصل ہی ہو گیا۔ ترکہ نبوی صدقہ ہی رہا۔ بہر حال، اس میں میراث جاری نہ ہونے پائی۔ بلکہ اگر بالفرض والتقدیر سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوات واکمل التحیات اس حدیث کو بوجہ فراموشی مثلاً کسی سے نہ فرماتے، نہ صدیق اکبرؓ سے، نہ کسی اور سے، تب بھی بیش بریں نیست کہ نادانستگی میں وارثان نبوی ترکۂ نبوی کو جو فی الحقیقت وقف تھا خود برد فرماتے سو ہم علماء شیعہ ہی سے استفتا کرتے ہیں کہ اگر کوئی نادانستگی میں مال وقف کو اپنا مال سمجھ کر کھا لے تو اس کے ذمہ کیا گناہ؟ بہر حال حضرت امام زین العابدین کے حکم خداوندی کے چھپا لینے سے جو کچھ نقصان نکلا، اس کو ایک طرف رکھئے۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس نہ کہنے سے جو مطلب کے حصول میں کچھ خرج نہ ہوا اور درصورت اخفائے کلی جو کسی طرح کا وارثوں کا نقصان دینی یا دنیوی نہ تھا، اس کو دوسری طرف دھرئیے، القصہ ادھر کے تمام لوازم کو ادھر کے تمام لوازم سے تو لئے، اور پھر بولئے کہ کس طرف پلہ جھکتا ہے؟ اور اخفاء حکم کس طرف ہے۔ اور کس طرف نہیں؟

بہر حال ہر کس و ناکس پر ان تقریروں سے واضح ہو گیا کہ کسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اخفاء حکم نہیں ہوا، اور بزعم شیعہ قطعاً اور یقیناً حضرت امام زین العابدین نے اخفا حکم خداوندی کیا لیکن آفرین ہے مولوی عمار علی صاحب کی فہم و فراست پر، کہ اسے تو اخفا سمجھتے ہیں اور اسے نہیں سمجھتے، بار خدایا انہیں کس نے کہا تھا کہ تم بھی دین مذہب کی باتوں میں دخل دیجو۔ اتنی عقل و فہم پر اہلسنت سے الجھتے ہیں۔ کوئی مولوی صاحب سے پوچھے۔ آپ نے کیوں اہلسنت سے دست و گریباں ہونے کا ارادہ کیا؟ شعر

الجھنے کو ملا ہیں آپ تو کچھ خیر ہے صاحب ٭ لگایا ہاتھ کس نے آپکی زلفِ پریشاں کو

علماء اہلسنت تو درکنار عوام اہلسنت بھی بمنزلہ دلاوران عالی نظر میدان مناظرہ میں ایسی سمجھ والوں کو بمنزلہ زنان بے ہتھیار سمجھ کر کچھ معترض نہیں ہوا کرتے ہیں۔ ہاں درصورتیکہ گریبان گیر ہی ہوجائیں۔ تب بضرورت وناچاری ان کے ہاتھ پاؤں کی خبر لیتے ہیں۔

اس لئے اس ہیچمدان نے بھی جو کچھ کیا سو کیا۔ بہرحال معاف کیجیئے گا۔ لیکن سچ تو یوں ہے آپ کو بری تو لگے گی۔ جیسی آپ کی باتیں ہیں۔ ایسے سخنہائے بے معنی سے تو گوز شتر بے مہار ہی بہتر ہے، وہ اگر اتفاق سے ناک تک پہنچ بھی جائے تو بیش برین نیست ناک ہی جلے گی۔ دل تو کسی عاقل کا نہ جلے گا۔ پر آپ کے حرف بے معنی اور سخن نامعقول ہیں طرفہ ستم یہ ہیں کہ بحکم مصرع۔ جواب جاہلاں باشد خموشی حقیقت میں قابل جواب تو ہوتے نہیں جو جواب دیا جائے۔ البتہ خاموش ہو کر جی جلانا پڑتا ہے پر اس ہیچمدان نے جب جانا کہ جاہلوں کے جواب میں عالم البتہ نہیں بولا کرتے، مجھے اس ہیچمدانی پر کیا ہوا جو خاموش ہو کر بیٹھ رہوں، معہذا اس پر آنہی ؎

دو چیز تیرۂ عقل است دم فروبستن ؞ بوقت گفتن وگفتن بوقت خاموشی

اس لئے اس قدر اوراق کو سیاہ کیا۔ اور آگے اور کرنے پڑے

سو منصفان بے روئی وریا اور بھی سنیں، کہ بعدازیں مولوی عمار علی صاحب کچھ ایسا رقم فرماتے ہیں جس سے حضرت فاطمہ زہرا کا مکرر صدیق اکبر کے پاس جا کر میراث کا طلب کرنا، اور ان کا فدک کو حضرت فاطمہؓ کے نام لکھدینا اور پھر اتفاق سے حضرت عمر کا آجانا، اور ان کا اس کاغذ کو پھاڑ ڈالنا نکلتا ہے۔ سو اس کا جواب بحکم مثل مشہور ع ؎۔ دروغ راجزا باشد دروغے ؞ موافق نقل ہندی "گوہ کی دار دسوت" یوں چاہیے تھا کہ حضرت فاطمہؓ ایک بار بھی میراث کی طلب کے لئے صدیق اکبر تک نہیں گئیں، چہ جائیکہ دوبارہ مطالبہ کی نوبت آئی ہو، اور حضرت صدیق اکبر نے ان کے ان کے نام جاگیر کا کاغذ لکھدیا ہو۔ اور حضرت عمر نے اسے پھاڑ ڈالا ہو، وہ شروع سے لب کشا ہی نہیں ہوئی تھیں، مگر چونکہ جھوٹ پھر جھوٹ ہے۔ ابتداً ہو یا دروغ کی

جزا ہیں، معہذا خداوند کریم جھوٹوں کو سینکڑوں طرح سے رسوا فرماتا ہے۔ چنانچہ ابھی انشاء اللہ تعالےٰ معلوم ہوا جاتا ہے، پر سچ ہی بولنا مناسب اور انسب نظر آیا۔ اس لئے گذارش یہ ہے یاد رہے کہ یہ محض دروغ بے فروغ ہے۔ طومار بندیوں سے سچوں کو جھوٹا نہیں کیا کرتے اہلسنت کا قول محکم ایسی پوچ باتوں سے خلل پذیر نہیں ہوسکتا۔

باقی یہ حوالہ دینا کہ سبط بن جوزی نے اس روایت کو اپنی سیرت میں تحریر کیا، اور واقدی محدث اہلسنت نے، اور برہان الدین حلبی شافعی نے اپنی سیر میں لکھا ہے، محض ایک سخن ابلہ فریب ہے۔ سادہ لوحانِ اہلسنت کے گمراہ کرنے کے لئے (بحکم اتباع پیشوایان خویش) مولوی صاحب بھی یہ چال چلتے ہیں۔ چونکہ در باب تنقیح روایات مفید مطلب شیعہ ایک بحث طویل مرقوم ہوچکی ہے اور اس کے مکرر بیان کرنے میں بجز دردسرِ تازہ کچھ سود نہیں۔ اس لئے مکلفِ ناظرین ہوں کہ چند اوراق پلٹ کر اس باب میں اپنی تسلی کرلیں۔

سیدہؓ کے سمجھانے پر فدک صدیقؓ نے واپس کردیا تھا

پر اتنا اشارہ یہاں بھی کئے دیتا ہوں۔ کہ اول بڑی دلیل اس بات کی کہ حضرت فاطمہ مکرر گئیں اور حضرت صدیق اکبر نے فدک کا جاگیرنامہ ان کے نام لکھدیا، اور حضرت عمر نے پھاڑ ڈالا سراسر دروغ اور بہتان بے اصل ہے۔ چنانچہ شیخ ابن مطہر حلی منہج الکرامت میں یوں رقم فرماتے ہیں لَمَّا وَعَظَتْ فَاطِمَةُ اَبَا بَكْرٍ فِي فَدَكٍ كَتَبَ لَهَا كِتَابًا وَرَدَّهَا عَلَيْهَا یعنی حضرت فاطمہ نے جب ابوبکر کو فدک کے مقدمہ میں وعظ و پند کیا، تو ابوبکر نے حضرت فاطمہ کے نام اسے لکھدیا اور فدک کو ان کے حوالہ کردیا۔ انتہی۔" اور ظاہر ہے کہ شیخ مطہر دشمنی صدیق اکبر میں مولوی صاحب کے بھی افسر ہیں، اور یار غار کی عداوت میں ان سے بھی اول ہیں، مولوی صاحب نے بھی اگر یہ باتیں سیکھی ہیں تو انہیں بزرگوں کے بہکانے سے سیکھی ہیں۔ اگر کچھ بھی اس کی اصل ہوتی۔ وہ سیر کی من کرتے۔ اور سوئی کا بھالا بنا دیتے۔

آخر اتنا بھی تو اسی غرض سے لکھا ہے کہ صدیق اکبر (بوجہ دغابازی) فدک کو

دبانا چاہتے تھے۔ پر وعظ و پند کے باعث آخر کار ہاتھ سے چھوڑا، اگر اپنی بات میں سچے ہوتے۔ اور حدیث لانورث ما ترکنا صَدَقَۃً مع صحیح ہوتی غلط نہ ہوتی۔ تو وعظ سے متاثر ہونے کے کیا معنے تھے؟ الٹا وہی حضرت فاطمہ کو نصیحت کرتے۔ سو اگر بچھاڑ ڈالنے کا قصہ کچھ بھی اصل رکھتا تو وہ کیا کیا زبان درازیاں نہ کرتے۔ بلکہ شیخ ابن مطہر علی نے تو اہل سنت کے لئے بہت تخفیف تصدیع کردی۔ یہاں تک کہ اہل انصاف کے نزدیک تو شیعوں کو لازم یوں ہے کہ مثل حُر بن یزید ریاحی صدیق اکبر کے بھی بدل و جان معتقد ہو جائیں، کیونکہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ۔ خیر الحمد للہ کہ شیعوں کی ہی روایات سے دروغ مولوی عمار علی صاحب ثابت ہو گیا وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ۔

بہرحال جو باتیں مولوی صاحب نے تراشی ہیں۔ مولوی صاحب کے بڑوں کو بھی نہ سوجھی تھیں۔ یہ تازہ الہام اب مولوی صاحب کو ہوا ہے، معہذا واقدی محدثین کے نزدیک منجملہ وضاعین ہے یعنی اس زمرہ میں معدود ہے۔ جو جھوٹی حدیثیں بنا کر بیان کیا کرتے ہیں، اور ابن جوزی کا حوالہ اس بات میں ہماری سر آنکھوں پر، کیونکہ انہوں نے دھوکہ بازوں کے فریب سے بچانے کے لئے امت محمدی کے لئے ایک کتاب خاص اسی فن میں تصنیف کی ہے۔ کہ فلانی فلانی حدیث موضوع ہے۔ تاکہ کوئی دھوکہ نہ کھائے سو ان کی اس کتاب سے نقل کرنے میں اہلسنت کی بات کا اور پختہ کرنا ہے اور اگر بالفرض ایسے استدلال بھی مفید مطلب ہوا کریں اور اس پر نظر نہ ہو کہ خود مصنف کتاب اس بات کی نسبت جو اس کے حوالہ سے بیان کی جاتی ہے کیا کہتا ہے؟ تو کل کو ملحدان بے دین کی اس بات کا شیعہ کیا جواب دیں گے؟ کہ کلام اللہ میں اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ موجود ہے، یعنی خدا محتاج ہے، تو معلوم ہوا کہ خدا محتاج ہے۔

اور اگر یوں کہئے کہ خدا نے یہود کے اس قول کو بطور رد و تکذیب درج کلام اللہ کیا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے، تو یہی جواب سبط بن جوزی کی اس روایت کے درج کرنے کا معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اس دغابازی کا کیا ٹھکانا ہے کہ عوام اہلسنت کے سامنے

یا تو ان کتابوں کا نام لیتے ہیں جو غیر مقبول اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ یا بوجہ شرارت و چالاکی ایسی کتابوں کا حوالہ دے جاتے ہیں، کہ گو وہ کتابیں معتبر ہیں۔ پر اس روایت کو جس کا حوالہ دیتے ہیں، اس کتاب میں بنظر دفع شرِ دغابازان لکھ کر موضوع لکھدیا ہے، یہ فرقہ عوام کو دھوکہ دینے کے لئے انہیں روایات کو پیش نظر کر دیتے ہیں۔ اور اکثر موقع میں اس سے بڑھ کر یہ کرتے ہیں۔ کہ ایک بات اپنے جی سے تراش کر کسی کتاب غیر مشہور کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اول تو یہ کتابیں کہاں؟ پھر اتنی دردسری کس کو ضرورت؟ بہرحال مولوی صاحب کا یہ ارشاد کہ حضرت فاطمہ مکرر حضرت صدیق اکبر کے پاس طلب میراث کے لئے گئیں، شاید بایں غرض ہو کہ مکرر سکرر جانے میں اور غلط صحیح غل شور مچانے میں کچھ تو ہاتھ پلے پڑ جائے گا۔ پھر مولوی صاحب کی ایک اور بیہودہ گفتار سنئے۔ مولوی صاحب کچھ ایسا رقم فرماتے ہیں۔

”کہ حضرت علی وغیرہ صحابہ ابوبکر کو اس بات میں سچا جانتے تھے۔ کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا ترکہ سب صدقہ ہے۔ تو پھر علی رضی اللہ عنہ اور عباس رضی اللہ عنہ نے خلیفہ ثانی کی خلافت میں عمر رضی اللہ عنہ سے جا کر کیوں دعوے کیا؟ چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ نے علیؓ اور عباس رضہ کو کہا کہ تم دونوں ابوبکر کو کاذب اور خائن اور غادر اور آثم جانتے تھے اور مجھے بھی تم دونوں کاذب اور خائن اور غادر اور آثم جانتے ہو اور میں وہ ہی کروں گا۔ جو کہ ابوبکر کرتا تھا، یہ روایت صحیح مسلم میں لکھی ہوئی ہے۔ اور مسند احمد بن حنبل میں لکھا ہے۔ کہ عثمانؓ کی خلافت میں عثمان رضہ سے بھی دعوے کیا تھا پس اگر ابوبکر ان کے نزدیک سچا ہوتا تو ان کے زمانہ میں دعوے ہرگز نہ کرتے معلوم ہوا کہ ابوبکر اس روایت میں بالکل جھوٹا تھا۔ ازراہِ عداوت روایت بنا کر فاطمہ کا حق غصب کیا، اور عمر خود علی اور عباس سے اقرار کرتا ہے کہ تم ابوبکر کو کاذب اور خائن جانتے تھے۔ اور مجھے بھی تم کاذب اور خائن جانتے ہو، پس جس وقت کہ علی نے ان کو کاذب اور خائن جانا تو بیشک ہم بھی کاذب اور خائن ان کو جانیں گے۔ یہی مطلب غصب تھا۔“

یہاں تک مولوی صاحب کی خرافات لایعنی تھی، اس میں کوئی ایک دو لفظ کا فرق ہوگا، پر معنی میں تفاوت نہیں، اب ہماری بھی سنئے کہ اس عبارت سے مولوی صاحب کے دو مطلب ہیں، ایک تو یہ کہ اگر حضرت علی اور حضرت عباس وغیرہم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سچا جانئے، تو حضرت عمر کی خلافت میں حضرت عمر سے دعویٰ نہ کرتے، اور علیٰ ہذا القیاس حضرت عثمان کے زمانہ میں دعوےٰ نہ کرتے، دوسرا یہ ہے۔ کہ جب باقرار حضرت عمر حضرت علی اور حضرت عباس کا ابوبکر صدیق کو کاذب آثم، غادر، خائن جاننا صحیح ہوا تو ہم بھی باتباع مرتضوی ابوبکر کو کاذب آثم غادر خائن سمجھیں گے

مسلم شریف کے حوالہ کی حقیقت

سو اول اعتراض کا تو جواب یہ ہے کہ یہ مولوی صاحب کی ایک نئی دغابازی ہے۔ عوام کے بہکانے کے لئے ایسی ابلہ فریبیاں کرتے ہیں پر حقیقت میں اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔ جو لوگ اصل روایات صحیح مسلم کو دیکھیں گے، وہ جان جائیں گے۔ کہ قصہ دگرگوں ہے۔ یعنے حضرت عمر کے زمانہ میں جس محفل میں یہ نوبت آئی ہے کہ حضرت عمر نے یوں کہا کہ تم ابوبکر صدیق کو کاذب آثم خائن سمجھتے تھے، اس محفل میں بسبب تولیت تکرار تھا، نہ بہ نسبت وراثت۔ چنانچہ اس حدیث سے بھی جس کا مضمون کچھ کچھ مولوی صاحب نے درج رقیمہ کیا۔ اور بروایت مالک بن اوس مروی ہے۔ اور نیز صحیح مسلم ہی کی اور حدیثوں سے یہ بات عیاں ہے لیکن مولوی صاحب نے یا تو بوجہ بلادت وغباوت نہ سمجھا ہو، اور یا باتباع پیشوایان قدیم دوسروں کے مطلب کی بات ہضم کر کے جس قدر دھوکا دے سکیں مذیب قرطاس کیا ہے۔

ہر چند جی یوں چاہتا تھا کہ احادیث مشار الیہا کو تمامہا لکھیئے، لیکن احادیث مشار الیہا کے تمامہا لکھنے میں قصہ بہت دور پہنچتا ہے۔ خصوصًا حدیث مالک بن اوس مذکور کہ وہ ایک بہت ہی طویل وعریض ہے اور یہاں ہمہ اکثر مواقع شرح طلب، اور ادھر فرصت قلیل، اس میں سب میں سے مختصر سا قصہ استنباط کر کے اور دو چار جملے بجنسہا لکھ کر متردوں کا اطمینان کئے دیتا ہوں، حدیث عائشہ سے جو اس حدیث سے کچھ آگے

صحیح مسلم میں موجود ہے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے اپنی خلافت میں منجملہ ترکہ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم فقط اس زمین کا جو مدینہ کے رقبہ میں اور قرب وجوار میں تھی حضرت علی اور حضرت عباس کو متولی کر دیا تھا خیبر اور فدک کو اپنی تولیت میں رکھا تھا۔ اس حدیث سے جس کا مولوی صاحب نے ذکر فرمایا، یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے خدا کا واسطہ دیکر حضرت علی اور حضرت عباس سے یہ عہد لے لیا تھا۔ کہ اس میں وہی کام کیجو۔ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔

مگر حدیث عائشہ مذکور سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی نے حضرت عباس کا قبضہ اٹھا دیا، چنانچہ حدیث مذکور کے یہ الفاظ اس پر شاہد ہیں۔

فَاَمَّا صَدَقَتُہٗ بِالْمَدِیْنَۃِ فَدَ فَعَہَا عُمَرُ اِلٰی عَلِیٍّ وَعَبَّاسٍ فَغَلَبَہٗ عَلَیْہَا عَلِیٌّ

جس کا یہ حاصل ہے کہ مدینہ میں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا صدقہ تھا۔ اس کو حضرت عمرؓ نے حضرت علی اور حضرت عباس کے حوالے کر دیا، سو حضرت علی نے اس کو آباد کیا اور اپنا قبضہ کر لیا۔

یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو اب سنیئے کہ جب حضرت علی اس تمام زمین پر جو دونوں کی تفویض اور سپردگی میں تھی۔ قابض ہو گئے تو آپس میں دونوں صاحبوں میں جھگڑا پڑا اس کے رفع داد کے لئے یہ صورت پیش آئی، کہ یہ دونوں صاحب خود حضرت عمرؓ کے پاس گئے، اور حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت زبیر بن العوام اور سعد بن ابی وقاص کو بھی کچھ پہلے ان کے پاس بھیجا۔ تاکہ وہ بھی کچھ سہارا لگائیں اور خلیفہ سے کہہ سنکر کچھ صلح کرا دیں، اسی آنے کو مولوی صاحب دعویٰ میراث کے لئے آنا سمجھتے ہیں، اس لئے کہ حضرت عمر کا حضرت علی اور حضرت عباس کو یوں کہنا کہ تم ابوبکر کو کاذب وغیرہ سمجھتے تھے، اسی دفعہ میں پیش آیا ہے۔ چنانچہ ناظران حدیث مذکور پر پوشیدہ نہ رہے گا۔

الحاصل جب حضرت عمر کے پاس یہ چھیوں صاحب تشریف لائے۔ اور یہ مذکور ہوا۔ تو اول تو حضرت عمر نے ان چھیوں صاحبوں کو قسم دیکر یہ پوچھا، کہ تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے کہ نحن نورث ما ترکناہ

صدقہ اور ان سب صاحبوں نے اقرار کیا کہ بیشک فرمایا ہے، بعد ازاں بہت سی گفتگو کے بعد یہ فرمایا۔

ثُمَّ جِئْتَنِي أَنْتَ وَهٰذَا وَأَنْتُمَا جَمِيعٌ وَأَمْرُكُمَا وَاحِدٌ فَقُلْتُمَا ادْفَعْهَا إِلَيْنَا فَقُلْتُ إِنْ شِئْتُمْ دَفَعْتُهَا إِلَيْكُمْ عَلَى أَنَّ عَلَيْكُمَا عَهْدَ اللّٰهِ أَنْ تَعْمَلَا فِيهَا بِالَّذِي كَانَ يَعْمَلُ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخَذْتُمَاهَا بِذٰلِكَ قَالَ أَكَذٰلِكَ؟ قَالَا نَعَمْ قَالَ ثُمَّ جِئْتُمَانِي لِأَقْضِيَ بَيْنَكُمَا وَلَا وَاللّٰهِ لَا أَقْضِي بَيْنَكُمَا بِغَيْرِ ذٰلِكَ حَتّٰى تَقُومَ السَّاعَةُ فَإِنْ عَجَزْتُمَا عَنْهَا فَرُدَّاهَا إِلَيَّ۔

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت علی اور حضرت عباس کی طرف متوجہ ہو کر یہ فرمایا کہ پھر تم اور یہ دونوں میرے پاس آئے اور تم دونوں باہم متفق تھے، اور تم دونوں کی بات ایک تھی، سو تم دونوں نے مجھ سے کہا کہ یہ ترکہ ہمارے حوالہ کر دو، میں نے کہا کہیں منظور ہو تو اس شرط پر دیتا ہوں کہ خدا سے عہد کر لو۔ کہ اس میں وہی کیجو۔ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ سو تم دونوں نے ترکہ مذکور کو اس شرط پر لیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے کہا یوں ہی بات ہے؟ ان دونوں صاحبوں نے کہا اسی طرح ہے۔ بعد ازاں حضرت عمر نے ان دونوں سے کہا۔ اب پھر تم دونوں میرے پاس آئے ہو کہ میں تمہارا فیصلہ کر دوں۔ یعنی زمین کو بانٹ کر تم دونوں کو جدا جدا متولی کر دوں یوں نہیں اللہ کی قسم اس کے سوا قیامت تک میں کچھ اور حکم نہ دوں گا۔ اگر تم سے تولیت کا سرانجام نہ ہو سکے تو لاؤ مجھے ہٹا دو۔"

یہاں تک حاصل مطلب تھا۔ اب غور فرمایئے کہ مولوی صاحب کے فہم کا قصور ہے یا کسی اور کا؟ اگر مشترح سننا منظور ہے تو سنئے۔ کہ اگر حضرت علی اور حضرت عباس حضرت عمرؓ سے طالب میراث ہوئے تھے۔ اور حضرت عمر نے ان کی طلب کے موافق ترکہ نبوی کو ان کے حوالہ کر دیا تو اس کی کیا وجہ ہوئی کہ باوجود معصوم ہونے کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حضرت علیؓ نے حضرت عباس کا بھی حصہ دبا لیا۔ شیعوں کو یہ اعتقاد ہو گا کہ حضرت علی نعوذ باللہ

نقل کفر کفر نباشد" ایسے دغاباز ہیں کہ اپنا دیکھیں تھے نہ پرایا۔ جو مل گیا سو ہضم کر لیا یا شاید معصوم ہونے کے شیعوں کے نزدیک یہی معنی ہوں کہ کتنا ہی ظلم و ستم کر بیٹھیں انکو سب مباح اور معاف ہے۔

امام کا حضرت عباس کو بے دخل کر دینا عدم وراثت پر کھلی دلیل ہو

انصاف سے دیکھئے، تو معتقدان مرتضوی کے لئے یہ حضرت علی کا قبضہ حضرت عباس سے اٹھا دینا اس بات کے لیئے گواہ عادل ہے، کہ اس ترکہ میں کسی کو میراث نہیں پہنچتی تھی، اور وہ ترکہ وقف تھا۔ سو درصورت وقف ہونے کے اگر متولی ہوں اور ایک دوسرے کا قبضہ اٹھا دیا، تو اس پر کچھ ظلم نہیں۔ بلکہ بسا اوقات قرین مصلحت یہی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ زمین و باغ جب تک کسی ایک طور پر نہیں ہوتے۔ تب تک تردد کامل نہیں ہو سکتا یعنی ایسی صورت میں اکثر زمین افتادہ پڑی رہتی ہے۔ سو افتادہ پڑے رہنے میں بجز اس کے اور کیا خوبی ہے کہ مساکین وغیرہ اہل مصرف کا حق مارا گیا۔ بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت علی کی رائے اور حضرت عباس کی رائے درباب تردد کچھ مخالف ہوئی ہو۔ حضرت علی نے دیکھا کہ اول تو حضرت عباس کی رائے پر رہیے تو نقصان اہل مصرف ہو۔

مثلاً جس مزارع کو حضرت عباس دینا چاہتے ہوں۔ وہ بہ نسبت اس مزارع کے جسے حضرت علی دینا چاہتے ہوں کم محصول اپنے ذمہ رکھتا ہو، یا نادہندہ دغاباز ہو، دوم اس تخالف رائے میں بند و بست معلوم، اس لئے بطور خود اس ترکہ کو برخلاف رائے حضرت عباس کسی کے حوالہ کر دیا ہو، اور یہ بات حضرت عباس کو گراں گذری ہو۔ اس لئے حضرت عمر سے اس بات کے خواستگار ہوئے ہوں کہ آدھوں آدھ بانٹ کر دونوں کو جدا جدا زمین کا متولی کر دیں۔ معہذا جو عبارت عربی میں مرقوم ہوئی ہے وہ خود اسی بات پر شاہد ہے کہ یہ جھگڑا فقط تولیت کا تھا، اس لئے کہ اول حضرت عمرؓ کا اس بات پر عہد لے کر دینا کہ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے وہی کیجو، خود اسی کی دلیل ہے کہ حضرت علی اور حضرت عباس کو متولی کر کے دیا تھا۔ ورنہ اس شرط کے کیا معنے؟ اگر میراث میں دیا تھا تو میراث تو وارثوں کی ملک ہوتی ہے، اور مالک کو اپنی چیز کا اختیار

ہوتا ہے، ورنہ ہر شخص سے بہ نسبت اراضیٔ مملوکہ کے یہی عہد لیا جایا کرتا۔

دوئم پھر حضرت عمر کا یوں فرمانا کہ قیامت تک اس کے خلاف حکم نہ دوں گا۔ خود اسی بات کو ثابت کرتا ہے کہ حضرت عمر نے ترکۂ نبوی بطور تولیت حضرت علی اور حضرت عباس کے حوالہ کر رکھا تھا۔ بطور میراث نہ دیا تھا۔ ورنہ مقصود حضرت عباس اور حضرت علی فقط تقسیم کر دینا تھا۔ سو اس میں حضرت عمر کا کیا نقصان تھا کہ ایک شئے مشترکہ کو فی مابین دو مالکوں کے تقسیم کر دیں؟ اگر بخل کرتے، تو دینے ہی میں کرتے۔ جب دے چکے پھر تقسیم میں کیا مشکل تھی۔ ہاں درصورت تولیت یہ اندیشہ تھا کہ ایک بیٹی اور ایک چچا کا میراث میں آدھوں آدھ کا ساجھا ہوتا ہے، سو اگر حضرت علی جو حضرت فاطمہ کی طرف سے وکیل تھے اور حضرت عباس کہ آدھوں آدھ بانٹ کر جدا جدا متولی کر دیجئے تو مبادا رفتہ رفتہ اگلے قرنوں میں اس تقسیم کو دیکھ کر دیکھنے برتنے والے یوں سمجھ جائیں کہ نصف حضرت فاطمہ کی اولاد کا مملوک ہے اور نصف حضرت عباس کی اولاد کا مملوک ہے۔

حضرت علی و عباس نے بقسم حدیثِ صدیقؓ کی تصدیق کی۔

علاوہ بریں حضرت علی اور حضرت عباس کا قسم کھا کر اس بات کا اقرار کرنا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بیشک یوں ارشاد فرمایا ہے کہ لَا نُوْرِثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ اور پھر میراث کا طلب کرنا شیعوں ہی کی سمجھ میں آئے تو آئے۔ اور ان سب پر طرہ یہ ہے کہ مولوی صاحب پہلے یوں رقم فرما چکے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر نے (بہ نسبت) فدک کے معافی کا کاغذ لکھ دیا تھا حضرت عمر نے پھاڑ ڈالا، پر جب حضرت عمر ابوبکر کی خلافت میں یوں ہوں تو اپنی خلافت میں تو بدرجہ اولےٰ حاوی ہونے چاہئیں، پھر حضرت علی اور حضرت عباس نادان تھے؟ نعوذ باللہ کہ باوجود اس قصہ کے معلوم ہونے کے مفت خفیف اور رسوا بننے کے لئے ایسی لغو حرکت اور نامعقول بات کرتے؟ اس سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر بالفرض بفرض محال یہ بات وقوع میں آئی بھی ہے؟ تو اول بار ہی حضرت علی اور حضرت عباس کا حضرت عمر کے پاس آنا جب کہ حضرت عمر نے ترکۂ نبوی انکے حوالہ کیا تھا محض طلبگاری تولیت کے لئے ہو۔ طلب گاریٔ میراث کے لئے نہ ہو۔

کیونکہ جب یہ بات آنکھوں دیکھ چکے ہوں۔ کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا جو جگر گوشۂ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ایک شخص نے لحاظ نہ کیا، دوسروں کا لکھا لکھایا کاغذ پھاڑ ڈالا ہو۔ وہ ہمارا کیا لحاظ کریں گے؟ اور وہ بھی اپنی حکومت میں، ہم تو دوسرے ہی درجہ میں ہیں، خیر یہ بات تو غلط ہے کہ ابوبکر صدیق نے کاغذ لکھ دیا ہو اور حضرت عمر نے پھاڑ ڈالا، پر اتنی بات صحیح ہے کہ اول بار کا حضرت علی اور حضرت عباس کا آنا بھی محض طلب گاری تولیت کے لئے تھا۔ چنانچہ لفظ ادفعها الینا سے یہ بات خود ظاہر ہے، جو لوگ مذاق سخن شناسی رکھتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں، باقی رہی یہ بات کہ طلب تولیت میں ان دونوں صاحبوں کو کیا فائدہ تھا۔ جو خلجان اپنے سر دھرنا تجویز کیا تو اس کا جواب یہ ہے۔ واللہ اعلم بحقیقت الحال کہ وقف نبوی میں منجملہ مصارف حق اقربائے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مقدم ہے۔ اس سے بچے تو اور کہیں صرف کیا جائے، خاص کرنے میں تو اشارہ خداوندی بھی موجود ہے۔ چنانچہ اس لئے ذی القربےٰ کو اوروں سے مقدم ذکر فرمایا، اور حدیثوں سے بھی اس قسم کے مضمون نکلتے ہیں۔

مگر خلیفہ کو اول تو تمام خلافت کا انتظام درپیش ہے۔ فقط اوقاف ہی کا انتظام ان کے ذمہ نہیں جو بہمتن اس کی طرف متوجہ ہو کر تردد کامل کرائیں، معہذا جن کو کچھ اوقاف سے توقع ہو جس قدر ان کے جی کو لگی ہوئی ہوگی۔ وہ دوسرے کے دل کو کاہے کو لگی ہوئی ہوگی؟ اس لئے حضرت علی اور حضرت عباس خواستگار تولیت ہوئے ہوں، اور حضرت عمر نے بھی بلحاظ وجوہِ مذکورہ اور نیز یوں سمجھ کر کہ جو حال بنی ہاشم کہ فلانا محتاج ہے فلانا نہیں، فلانے کو اس قدر حاجت ہے فلانے کو اسقدر، حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو معلوم ہوگا۔ وہ مجھے کاہے کو معلوم ہوگا۔ اور یہ اندیشہ باقی ہی نہیں رہا کہ کوئی اس دینے کو میراث کا دینا سمجھے، کیونکہ لَا نُوْرِثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ کا گھر گھر غل پڑ گیا، یہ بات قبول فرمائی ہو، اور با ایں ہمہ بنظر احتیاط تقسیم نہ فرمایا تاکہ مبادا رفتہ رفتہ بہت زمانوں کے بعد کوئی جاہل یوں نہ سمجھ جائے کہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت عباس کو مالک سمجھا تھا جب تقسیم کر دیا۔

مگر حضرت ابوبکر صدیق نے بطور تولیت بھی کسی کو دینا گوارا نہ کیا۔ کیونکہ حضرت فاطمہ کی طلب میراث کا تازہ قصہ تھا، اس قصہ سے سب کے کان پُر تھے۔ اس وقت اگر بطور تولیت ہی دیتے۔ ہر کوئی اس دینے کو بطور میراث ہی سمجھتا۔ لا نورث ما ترکناہ صدقہ اگر سنا بھی ہوتا تب کسے دھیان آتا۔؟

خائن و غادر مبالغۃً استعمال ہوئے۔ جیساکہ محاورہ ہے

اور یہی وجہ فی الجملہ موجب گرانی خاطر حضرت علی اور حضرت عباس معلوم ہوتی ہے، جس کو حضرت عمر غصہ کے باعث بایں الفاظ تعبیر فرماتے ہیں کہ تم ابوبکر کو کاذب آثم غادر خائن سمجھتے تھے۔ کیونکہ تمام جہان کا دستور ہے اور نیز کلام اللہ اور احادیث سے بھی یہ بات نکلتی ہے کہ اگر کسی سے کسی موقع میں معاملہ قلبی کے برخلاف کوئی بات ظہور میں آتی ہے، تو بطور مبالغہ اس کے ساتھ معاملہ قلبی کی بھی نفی کر دیا کرتے ہیں۔ مثلاً فی مابین اقربا و احباب اگر کسی سے کسی قسم کی بے اعتنائی اور بے پرواہی کسی وجہ خارجی کے باعث ظاہر ہوتی ہے، تو مبالغۃً کہدیا کرتے ہیں کہ یہ ہمارے قریب یا دوست کیوں ہوئے تھے یا یہ ہم کو اپنا قریب اور دوست ہی نہیں سمجھتے۔

سو قرابت اور رشتہ داری نسبی کا حال تو ظاہر ہے کہ وہ تو کسی طرح زائل ہو ہی نہیں سکتے۔ چہ جائیکہ بے اعتنائی اور بے پرواہی سے، اور دوستی کا حال بھی تو ظاہر ہے کیونکہ بے اعتنائی اور بے پروائی کی جو احباب کو شکایت ہوتی ہے۔ تو بوجہ ثبوت محبت اور بقائے الفت ہوتی ہے۔ ورنہ اجنبیوں سے کون شکایت کرتا ہے، علی ہذا القیاس حضرت علی اور حضرت عباس کی جانب سے جو فی الجملہ کشیدگی اور گرانی خاطر حضرت صدیق اکبر سے جس کا ابھی بیان تھا ظہور میں آئی۔ تو یہ گرانی خاطر اور یہ کشیدگی جو بظاہر فی الجملہ اطمینان قلبی اور اعتبار دلی کے مخالف تھی۔ جو ان دونوں کو بہ نسبت صدیق اکبر کے حاصل تھی۔ کیونکہ اس سے نظر عوام میں بے اعتباری کی بو آتی تھی۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے اس اعتبار کو جو ان کے دل میں مرکوز تھا نفی کر کے مبالغۃً ان کی طرف بے اعتباری کو منسوب کیا اور دلیل اس بات کی کہ یہ کلمہ مبالغۃً فرمایا تھا بیان حقیقت مد نظر نہ تھا،

خود ظاہر ہے کیونکہ حدیث لا نورث ما ترکناہ صدقۃ کے خود مقر تھے۔ نہیں تو یوں ہی کہتے۔ کہ ان کے نزدیک صدیق اکبر نے متروکہ نبوی زبردستی سے دبا رکھا تھا۔ اور ان کے عقیدہ کے موافق وہ غادر خائن کاذب آثم تھے۔

حضرت عمر کا غصہ مبالغہ کی دلیل ہے

معہذا حضرت عمر کا قرینہ غضب خود اس کے ارادہ کے لئے مصحح ہے۔ لیکن آفرین ہے مولوی عمار علی صاحب کے فہم پر اور جن سے انہوں نے ایسی تعلیم پائی ان کے فہم پر۔ کہ ایسی بات کو جو تمام عالم میں مروج ہو۔ اس زمانہ میں بھی کہ پیشوا شیعہ ہو گذرے نہیں سمجھتے کوئی ان کا مداح بہت سے بہت توجیہ کرے۔ تو یہ کہے کہ مولوی صاحب سمجھتے تو ہیں لیکن ابلیس لعین کی روح کو خوش کرنے کے لئے دیدہ دانستہ فریب سے تحریف معانی کرتے ہیں یہ سبب نہیں کہ حضرت عمر کا یہ کہنا تو انہیں یاد رہا کہ تم حضرت صدیق اکبر کو کاذب آثم غادر خائن سمجھتے تھے۔ اور یہ یاد نہ رہا کہ انہوں نے اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهٗ لَصَادِقٌ بَارٌّ رَاشِدٌ تَابِعُ الْحَقِّ یعنی اللہ خوب جانتا ہے کہ ابوبکر صدیق بیشک سچے نیک اطوار ہدایت پر حق کے تابع تھے۔ الحاصل مولوی صاحب کی کم فہمی یا فریب بازی ہے۔ جو ایسی بیہودہ باتیں فرماتے ہیں کہ کہیں کا سر کہیں کا پاؤں، ورنہ بمعنی مذکور عرف میں ایسے کلاموں کا مروج ہونا وہ لوگ بھی جانتے ہیں جنکو عقل نہیں، چہ جائیکہ اہل عقل۔

مبالغہ کلام اللہ میں۔ بطور محاورہ

اور اگر اس پر بھی اس قسم کے محاورات کی تصحیح کے لئے کلام ربانی ہی کی سند مطلوب ہو تو اپنی پڑی گو ہم اس سے بھی درگذر نہیں کرتے اس لئے یہ آیت حَتّٰى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا جو سورہ یوسف کے رکوع آخر میں موجود ہے۔ گوش گذار ہے، اس کے بظاہر یہ معنی ہیں یہاں تک کہ جب رسولوں کو ناامیدی ہونے لگی، اور وہ یوں خیال کرنے لگے، کہ ان سے جو کچھ امداد کے باب میں خدا کی طرف سے وعدہ وعید تھے۔ سب جھوٹے تھے، ہماری مدد ان کے لئے آپہنچی فقط، مگر سب اہل اسلام جانتے ہیں کہ انبیاء کی شان سے بہت بعید ہے کہ خدا سے ناامید ہوں۔ اور کیوں کر ناامید ہوں۔ اس صورت میں اس رکوع سے پہلے

رکوع میں یہ جملہ بھی موجود ہے اِنَّہٗ لَا یَیْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکَافِرُوْن جس کا یہ مطلب ہے،، بیشک نا امید نہیں اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں،، پھر کسی مسلمان کے خیال میں آسکتا ہے کہ رسول اور نا امید ہو جائیں، سو اگر حضرت عمر کی صدق روایات کے بھروسے باتباع مرتضوی صدیق اکبر کو مولوی صاحب کاذب خائن وغیرہ سمجھتے ہیں، تو خداوند کریم تو حضرت عمر سے زیادہ ہی سچے ہیں۔ خدا کے فرمانے کی تصدیق کر کے رسولوں کو خدا کی امداد سے نا امید سمجھ کر حسب ایماء آیت اِنَّہٗ لَا یَیْئَسُ الخ نعوذ باللہ کافر سمجھنے لگیں۔

علیٰ ہذا القیاس رسولوں کی نسبت جو اسی آیت میں مذکور ہے کہ دعائے خداوندی میں ان کو خیال دروغ ہوا تو اس میں بھی لازم ہے کہ مولوی صاحب رسولوں کی اتباع میں کمر ہمت باندھیں۔ سو اوّل تو اکثر محاورات کلام اللہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ خیال باطل جو کسی وجہ سے جی میں جم جایا کرتا ہے۔ اور اس کا یقین ہو جاتا ہے۔ اس کو ظن کہا کرتے ہیں چنانچہ سورہ جاثیہ میں کفار کے اس عقیدہ کی نسبت کہ مرنے کے بعد پھر کوئی اٹھایا نہ جائے گا۔ اور لوگوں کا مارنے والا زمانہ ہے، یوں ارشاد ہے کہ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْن یعنی وہ یونہی اٹکلوں کی باتیں کرتے ہیں۔ الغرض کفار کو اپنے اس عقیدہ میں شک تھا مگر چونکہ ایک خیال غلط تھا جناب باری نے اس کو بلفظ ظن تعبیر فرمایا، ایسے ہی اس مضمون میں سورہ انشقت میں اِنَّہٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ فرمایا۔ سو اس محاورہ کے موافق اگر ظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ قَدْ کُذِبُوْا کے معنے لیجئے، تب تو مولوی صاحب کو لازم ہے کہ نعوذ باللہ بزعم خود باتباع پیغمبران برگزیدہ خداوند کریم کے وعدوں کو بالیقین جھوٹا سمجھیں۔ اور اگر موافق مشہور ظن کے معنے گمان غالب یا شک سمجھتے، تب مناسب یوں ہے، کہ رسولوں کو تو یوں سمجھیں کہ ان کو خدا کے کہے کا یقین نہ تھا۔ اور اس وجہ سے نعوذ باللہ انہیں کافر سمجھیں۔ اور اپنے آپ ان کا اتباع کر کے دین و ایمان کو برباد کریں۔

اور اگر یوں تاویل کیجئے کہ رسولوں کو جو ظن دروغ تھا بہ نسبت خداوند

صادق القول نہ تھا۔ بلکہ نصرت کے دیر ہونے سے یوں سمجھے کہ اگر وعدہ ہائے نصرت وعدہ ہائے خداوندی ہوتے، تو لاجرم ان وعدوں کا ظہور ہو لیتا اتنی دیر نہ لگتی، ہو نہ ہو یہ وساوس شیطانی تھے وعدہ ہائے خداوندی نہ تھے، تو اس صورت میں اول تو ہمیں کچھ نقصان نہیں، جو کچھ بہ نسبت یاس مرقوم ہو چکا وہی کافی ہے، دوسرے ہم کہتے ہیں کہ اس صورت میں یہ لازم آئے گا کہ انبیاء کو وحی پر اطمینان نہ ہو، نعوذ باللہ، سو یہ تو ہم جانتے ہیں۔ شیعہ بھی تسلیم نہ کریں، کیونکہ جب انہیں ہی یقین نہیں تو پھر کس کو ہوگا؟ پھر چاہیئے کہ ایمان ایک معنی بے مصداق ہو جائے، کیونکہ ایمان کو یقین لازم ہے، پھر اگر اپنے اطمینان کے لئے معنی اس طرح کریں گے کہ ان کو بمقتضائے بشریت بے اختیار یہ خطرات دل میں گذرتے تھے۔ اس کو خداوند کریم نے بلفظ ظن (خواہ وہ اپنے معنے میں ہو یا بمعنے یقین) مبالغتًہ تعبیر کر دیا ہے۔ تو یہ وہی بات ہے جو ہم نے پہلے بیان کی ہے۔ سو حضرت عمر کی بات کو بھی ایسا ہی سمجھئے

مگر ہاں اگر یوں کہیئے۔ کہ نعوذ باللہ خدا کی طرف تو بوجہ بداء کذب کا احتمال ہو سکتا ہے۔ حضرت عمر کی طرف یہ احتمال نہیں، تو البتہ ہمکو مشکل ہے مگر اس کے لئے بداء کے ابطال کی تقریر کی طرف مراجعت ضروری ہے۔ بہرحال انبیا کی نسبت خداوند کریم کا یہ فرمانا کہ وہ مایوس ہو گئے، یا ان کو خدا کی نسبت یا وحی کی نسبت احتمال دروغ ہوا، بجز اس کے صحیح نہیں ہو سکتا، کہ موقع تعریض و عتاب میں مبالغتًہ فرما دیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو عبرت رہے، اور آپ ایسے خیالات میں نہ پڑ جائیں یا کسی اور وجہ سے مبالغتًہ فرما دیا ہے، سو ایسے ہی حضرت عمر کے قول مذکور کو بھی سمجھئے۔ بہرحال یہ آیت ہمارے مطلب کے لئے ثبوت کامل ہے۔ اور اسی قسم کی اور بہت سی نظیریں اہل فہم کلام اللہ سے نکال سکتے ہیں، کہ اگر معنے ظاہری مراد لیجئے۔ اور قرائن صارفہ کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ تو دین ایمان کی خیر نہیں، سو اگر مولوی صاحب کو کچھ ایمان کا درد ہے تو پھر خواہ مخواہ معنی ظاہری پر جو بے لحاظ قرائن خارجیہ کے متبادر الی الفہم ہیں کچھ لحاظ نہ کریں، بلکہ معنی مقصود ربانی پر نظر رکھیں۔

یعنی آیت حتّٰی اذا استیئس الرسل کے یہ معنی لیں کہ انبیاء کے تہ دل میں تو یقین ہی تھا۔ کہ وعدہائے الٰہی صادق ہیں۔ ایک نہ ایک روز بیشک امداد الٰہی آنے والی ہے غرض دل سے کوئی صورت انقطاع امید اور ظن دروغ کی نہ تھی پر جیسے بمقتضائے بشریت ہمارے تمہارے دل ہیں خداوند اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت خیالات فاسد اوپر کے دل ہیں آجاتے ہیں۔ اور اس سے اعتقاد قلبی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ ایسے ہی انبیاء کے دل ہیں بھی بمقتضائے بشریت بہ نسبت وعدہائے الٰہی خیالات فاسد بے اختیار گذرجاتے تھے۔ اور خدا نخواستہ اطمینان قلبی میں کچھ فتور نہ تھا، جو یوں کہیے، کہ وہ واقعی ناامید ہو گئے تھے۔ اور یقین ہو گیا تھا کہ وعدہائے الٰہی محض دروغ تھے یا ان کے صدق کا یقین نہ رہا تھا مگر چونکہ اس قسم کے خیالات کی وجہ سے دگو تہ دل میں نہ ہوں اور بے اختیار ہی آتے ہوں، ظاہر نظر میں یوں ہی کہتے ہیں کہ دل میں اعتقاد ہی نہیں یہ بات بعد تامل ہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ فقط اوپر کے خیالات ہیں،

تو خداوند کریم نے بھی برعایت ظاہر بطور مبالغہ متعارف ان خیالات کو بلفظ ظن اور بے قراری اور بیتابی بشری کو جس کے لوازم میں سے یہ خیالات ہیں بلفظ یاس تعبیر فرمایا، لیکن اسی طرح اگر حضرت علی اور حضرت عباس کی نسبت حضرت عمر کے اس فرمانے کو کہ تم صدیق اکبر کو اور مجھکو کاذب خائن وغیرہ سمجھتے ہو، حضرت علی اور حضرت عباس کی کشیدگی اور شکایت دلی پر (جو بمقتضائے بشریت برخلاف اعتقاد اور محبت قلبی کے جو تہ دل میں جمی ہوئی تھی، اوپر کے دل میں گذرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی) محمول کریں، تو اس سے زیادہ اور تو کچھ گناہ نہ ہوگا۔ کہ کلام اللہ کی ایک روش اختیار کی، اور یہ بات تو حضرت علی اور حضرت عباس نے منہ سے نکالی بھی نہ تھی، احتمال ہے کہ حضرت عمر ہی غلط سمجھ گئے ہوں، کہ دونوں صاحب کچھ اس قسم کا خیال نہ دل میں یا اوپر کے دل میں رکھتے ہیں۔

حضرت عباسؓ نے وہی الفاظ حضرت علیؓ کے لئے کہے جو حضرت عمرؓ نے ان کی نسبت کہے	ہم تو اس کے یہی معنی سمجھتے ہیں۔ جو حضرت عباس نے حضرت علی کو بالمواجہہ مجمع عام میں اسی جلسہ

میں بعینہٖ یہی الفاظ کہے ہیں، چنانچہ اسی حدیث میں جس کے حوالہ سے مولوی صاحب حضرت عمر کا حضرت علی اور حضرت عباس کو یوں کہنا کہ تم صدیق اکبر کو کاذب اور خائن وغیرہ سمجھتے ہو ثابت کرتے ہیں موجود ہے، مگر اس کو کاہے کو نقل کرتے، یہ تو صدیق اکبر ہی سے ضد ہے، بہر حال سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ حق بات یہی ہے۔ جو میں نے عرض کی، ورنہ حاشا وکلا جو حضرت علی اور حضرت عباس کے دل میں ذرہ برابر صدیق کیطرف سے بدگمانی ہو۔ مگر افسوس یہ ہے کہ مولوی صاحب اپنی تیرہ درونی کے باعث حضرت عمر بھی اگر لحاظ ظاہر یوں فرمادیں۔ کہ حضرت علی کے دل میں صدیق اکبر کی طرف سے کچھ فرق ہے تو بے تحقیق اعتبار کرلیں۔ اور حضرت خود اپنی زبان مبارک سے قسمیں کھا کھا کر ایسے کمالات جو لگ بھگ مرتبہ نبوت کے ہیں۔ صدیق اکبر کی تعریف میں بیان فرمائیں۔ اور علیٰ ہذا القیاس اور ائمہ نے چنانچہ سابقاً بحوالہ کتب معتبرہ شیعہ مفصلاً مرقوم ہو چکا ہے۔

لیکن اس پر بھی کیا امکان جو مولوی صاحب کے اور سوا ان کے اور شیعوں کے دل میں کا کفر ٹوٹے۔ سبحان اللہ کیا سمجھ ہے۔ صدیق اکبر کی ہجو کریں، تو حضرت عمر بھی معتبر ہو جائیں، اور تعریف ہو تو پھر حضرت علی بھی کہے جائیں، کوئی نہیں سنتا، کسی نے سچ کہا کُلُّ شَیْئٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ، ہم تو نہیں کہہ سکتے۔ پر شیعوں کے طور پر مولوی صاحب کی وہی مثل ہے کہ حضرت موسے کے سینکڑوں معجزوں پر بھی بنی اسرائیل سیدھے نہ ہوئے اور سامری کے ایک طلسم پر دین ایمان کھو بیٹھے۔ اس تقریر کے بعد مولوی صاحب کو اپنے اس حیرلوز اعتراض کی قلعی کھل گئی ہو گی۔ اور اگر بایں ہمہ بوجہ بلادت نہ سمجھیں۔ اور یہ دلنشین رہے کہ حضرت عمر نے جو کہا وہ واقعی تھا، نہ اس میں کچھ غلطی ہے نہ اس کے سوائے ظاہری معنوں کے اور کوئی معنے۔

تو میری عرض یہ ہے کہ بیش بریں نیست حضرت علی اور حضرت عباس کے دل میں بھی بات ایک دفعہ کو جم گئی ہو، کہ صدیق اکبر نے خیانت کی اور جھوٹ بولدیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لَا نُوْرَثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ فرمایا ہے،

لیکن مولوی صاحب فرمائیں تو سہی کہ یہی بات ہے ان کے کیا ہاتھ لگا؟ حضرت موسےٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے دست و گریبان ہونے کا قصہ مشہور و معروف ہے، اس کا سبب بجز اس کے اور بھی کچھ تھا کہ حضرت موسیٰ بایں وجہ کہ ان کی یہ خلقی بات تھی، کہ خلاف شریعت اور مخالف حکم الٰہی دیکھا نہیں۔ اور ان کے تن بدن میں آگ لگی نہیں، ذرہ برابر اگر کہیں خدا کی نافرمانی نظر پڑ جاتی تھی تو پھر تھامے نہیں تھمتے تھے، طور سے لوٹ کر جب بچھڑے کی پوجا پاٹ دیکھی۔ تو ایک دفعہ ہی یوں سمجھ گئے کہ بنی اسرائیل نے کیا تو کیا حضرت ہارون بھی ان کے شریک حال ہو گئے یا انہوں نے بنی اسرائیل کو نہ روکا۔ جو یہ فساد پھیل گیا۔ بہر حال ان کو شریک حال سمجھا یا یوں سمجھا۔ کہ انہوں نے کسی کو روکا نہیں، لیکن اس سمجھنے میں اول تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کچھ شک نہیں رہا تھا۔ نہیں تو نوبت یہاں تک نہ آتی کہ ان کے سر کے بال اور داڑھی پکڑ کر اپنی طرف کو کھینچتے۔ فقط شک اور تردد میں اتنی پیش قدمی تو کم عقل بھی نہیں کرتے چہ جائیکہ حضرت موسےٰ جن کا کمال عقل بالیقین معلوم ہے۔

حضرت علی اور حضرت عباس خطاءً بدگمان ہوئے

دوسرے یہ بھی سب جانتے ہیں کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کی غلط فہمی تھی۔ جو یوں سمجھے حضرت ہارون علیہ السلام اول تو نبی معصوم تھے ایسے امور میں شریک ہونا یا منع نہ کرنا، ان سے منجملہ محالات ہے دوسرے اگر معصوم نہ ہوتے، تب واقع میں ان سے کچھ خطا نہ ہوئی تھی، بے تحقیق فقط ظاہر حال کی وجہ سے یہ سمجھ کر کہ حضرت ہارون سے درباب نہی عن المنکر تقصیر ہوئی یا خود ان کے شریک حال ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے آپے سے باہر نکل گئے۔ ورنہ حضرت ہارون بہر طور بے خطا تھے، شریک حال ہونا تو کجا؟ منع اور زجر و توبیخ میں انہوں نے اپنی طرف سے کوتاہی نہیں کی تھی، تقدیر سے بات راست نہ آئی۔

اب دیکھئے کہ جب ایک معصوم دوسرے معصوم سے اتنے بدظن ہو جاتے ہوں کہ نوبت مشت مشت کی پہنچی۔ تو حضرت علی اگر فی الجملہ کچھ حضرت ابو بکر کی طرف سے بدگمان ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟ اور اہل سنت کو اس کی تسلیم میں کیا

دشواری ہے۔ نہ ابو بکر صدیق ان کے نزدیک معصوم! جو ان کے کذب و خیانت کے منسوب ہونے میں کسی رکن ایمان کا تھامنا مشکل پڑ جائے، نہ حضرت علی ان کے اعتقاد میں معصوم، کہ ان کی طرف غلط فہمی کی نسبت کرتے کچھ جی ڈرے اور پھر باینہم ہنوز یہ بھی متحقق نہیں کہ بالیقین حضرت علی کے جی میں صدیق اکبر کی طرف سے کچھ گمان فاسد ہو، فقط حضرت عمر نے اپنے عندیہ کے موافق وہ بھی مبالغۃً ایک بات کہدی ہے، ورنہ حضرت علی کا بہ نسبت حدیث لا نورث ما ترکناہ صدقۃ اقرار کرنا۔ اور پھر حد سے بڑھ کر صدیق اکبر کی تعریفیں کرنا چنانچہ سابقاً مرقوم ہو چکا ہی، خود اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ دل مرتضوی لبریز حسن اعتقاد صدیق اکبر تھا

اس پر بھی اگر مولوی صاحب (بزعم خود) باتباع حضرت شیر خدا علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہ، صدیق اکبر کو کاذب و خائن و غادر و آثم سمجھتے ہیں، تو بہ نسبت حضرت ہارون علیہ السلام تو دو قدم آگے بڑھ کر ان کے عصیان اور شراکت شرک کا چھاتی ٹھوک کر اقرار کریں گے، کیونکہ اول تو حضرت موسےٰ علیہ السلام معصوم اور بزعم شیعہ معصوم غلط فہمی سے بھی معصوم، ورنہ اہل سنت پر یہ طعن کیوں ہو تاکہ ان کے امام ابو حنیفہ وغیرہ غلطی کھا سکتے ہیں، دوسرے حضرت موسےٰ کا بہ نسبت حضرت ہارون علیہما السلام بالیقین خطاوار سمجھنا بالیقین معلوم ہے۔ تو اس صورت میں کوئی صورت مولوی صاحب کو اس عقیدہ میں کمی کرنے کی نہیں۔

امام کی اتباع میں شیعہ اگر صدیق کو برا کہیں تو حضرت عباس کے اتباع میں امام کو بھی کہیں

ادھر حضرت عباس حضرت علی کے بھی بزرگ ہیں دین کے نہیں۔ نسب ہی کے سہی۔ تھوڑا بہت کچھ ان کا بھی اتباع چاہیئے بہت نہیں۔ تھوڑا ہی سہی۔ معہٰذا حضرت عباس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی، چنانچہ بحوالہ قاضی نور اللہ شوستری مرقوم ہو لیا ہے تو ان کی بات باون تولہ پاؤ رتی کی نہیں، تو کچھ تو اعتبار رکھتی ہوگی خصوص جس سند سے مولوی صاحب کو صدیق اکبر کی نسبت حضرت علی کا کاذب سمجھنا کچھ معلوم ہوا ہے اسی روایت میں حضرت عباس کا حضرت علی مرتضیٰ کو بعینہٖ اسی طرح برا کہنا، اس سے بھی پہلے مذکور ہی

بلکہ جناب حضرت عمر نے بھی انہیں کی بات سے کہا ہو کہ آپ [illegible]
ایک دوسرے کو کاذب وغیرہ سمجھتے ہیں اسی قیاس پر انہوں نے کہدیا کہ تم صدیق اکبر
کو ایسا سمجھتے ہو۔ سو بحکم محبوبیت پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم اور بزرگی حضرت علی حضرت
عباس کا بھی اقتدا چاہیئے۔ اگر عذر بے اعتقادی ہے تو بہت نہیں تھوڑا ہی سہی، وہ
کیا دین و کیا آئین ہے؟ جس مذہب کے ایسے دلائل ہیں وہ خود مذہب کیا ہوگا۔!

ع :- قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اب ایک بات شرح طلب باقی رہی، مگر اس کے بیان میں متردد ہوں
بایں خیال کہ وہ بات شاید کسی کے خیال میں آجائے تو یہ اندیشہ ہے کہ مبادا کسی متردد
کو تردد پیدا ہو۔ یا کسی متعصب کو جائے انگشت نہادن ملے، اور جب یہ بھی خیال آتا ہے
کہ کبھی یوں بھی ہو جاتا ہے کہ روٹی نہ کھائیے۔ تو بھوکے مریئے، اور کھائیے تو ہیضہ میں جان
سے گذریے، ڈرتا ہوں کہ شاید کم فہم نہ سمجھیں۔ اور بیٹھے بھلائے گمراہ ہوں۔ میں اگر نہ
لکھوں تو شاید خبر بھی نہ ہو۔ لیکن بایں خیال کہ روٹی کو خداوند کریم نے نفع ہی کے لئے بنایا ہے
نقصان ہو جائے تو اتفاقی ہے۔ اس لئے ہیضہ کے اندیشہ سے کوئی کھانا نہیں چھوڑ دیتا
میرا کلام تو کیا چیز رہی۔ خود کلام ربانی میں کلام ربانی کی نسبت یوں فرماتے ہیں۔
يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا۔ گمراہ کرنا اول ہے ہدایت اس کے بعد پھر
جب خداوند کریم نے اپنی بات کو کسی سے نہ چھپایا ہو۔ میں اپنے جی کی بات
کیوں چھپا دُں۔

جیسے کلام ربانی اصل ہدایت کے لئے ہے، یوں کوئی اپنی کج فہمی سے بے راہ ہو
تو ہو، ایسے ہی وہ باتیں جو کلام اللہ و حدیث سے مستنبط ہوتی ہیں۔ اصل میں وہ ہدایت
ہی کے لئے ہیں۔ یوں کوئی بات کے مغز کو نہ سمجھے اور بہک جائے تو اپنا سر کھائے
بہر حال لکھنا ہی مناسب سمجھ کر لکھتا ہوں۔

ترکہ نبوی کے میراث ہونے پر استدلال اور اس کے جوابات

حدیث مالک بن اوس مذکور میں جس کے بعض مضامین
مولوی صاحب نے رقیمہ کریمہ میں درج فرمائے ہیں، اور

اس کو روایت صحیح مسلم کہا ہے، یوں مرقوم ہے کہ حضرت عمر نے حضرت علی اور حضرت
عباس کو اسی جلسہ میں جس میں یہ دونوں صاحب جھگڑتے ہوئے آئے تھے۔ بغرض
الزام یوں بھی فرمایا تھا۔

فَلَمَّا تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَنَا وَلِيُّ رَسُوْلِ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ فَجِئْتُمَا تَطْلُبُ مِيْرَاثَكَ مِنِ ابْنِ اَخِيْكَ وَيَطْلُبُ هٰذَا مِيْرَاثَ
امْرَأَتِهٖ مِنْ اَبِيْهَا فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
لَا نُوْرِثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ۔ اس کے بعد یہ ہے فَرَأَيْتُمَاهُ كَاذِبًا
اٰثِمًا غَادِرًا خَائِنًا

حاصل مطلب یہ ہے کہ ،، بعد وفات رسول اللہ صلے اللہ وسلم جب حضرت صدیق اکبر
خلیفہ ہوئے اور انہوں نے کہا کہ اب میں حضور ساری باتوں کا ولی اور مولی تو تم دونوں
آئے تم تو اپنے بھتیجے کی میراث مانگتے تھے، اور یہ اپنی بیوی کی طرف سے ان کے باپ کی میراث
مانگتے تھے، اس پر صدیق اکبر نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد
فرمایا ہے لَا نُوْرِثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةً سو تم نے انہیں کاذب آثم غادر خائن سمجھا،،

اس سے دو باتیں اہل سنت کے قول کے خلاف معلوم ہوئیں ایک تو یہ
کہ حدیث لا نورث ما ترکناہ صدقۃ گو اہلسنت یوں کہتے ہیں کہ اس کے راوی
حضرت علی اور حضرت عباس بھی ہیں، اور اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں خبر
بھی نہ تھی۔ ورنہ اہلسنت کے اعتقاد کے موافق حضرت علی تو حضرت علی ہیں حضرت
عباس کی طرف بھی گمان نہیں ہو سکتا کہ باوجودیکہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
سے سن لیا ہو کہ لا نورث ما ترکناہ صدقۃ پھر طلبگار میراث ہوں، دوسرے یہ بات
ہے کہ لفظ میراثک اور لفظ میراث امرأتہ اور نیز صدیق اکبر کا یہ جواب دینا کہ رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا کہ لا نورث ما ترکناہ صدقۃ صاف اس بات پر دلالت
کرتا ہے کہ وہ دونوں طالب میراث ہوئے پھر جب دونوں صاحبوں۔ کو حدیث مذکور کی
خبر ہی نہ ہوئی۔ تو اب یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا صدیق اکبر کو کاذب وغیرہ سمجھنا

اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے ان کی میراث نہ دی۔

چنانچہ حضرت عمر نے بھی اس نہ دینے ہی کی تفریع میں یہ بیان فرمایا ہے۔
فرایتماہ کاذبًا الخ سو اس صورت میں یہ توجیہ ہی غلط ہو گئی کہ حضرت علی کو صدیق اکبر سے بایں وجہ کچھ کشیدگی تھی کہ وہ ان کی تولیت تک کے روادار نہ ہوئے۔ اور اس کشیدگی ہی کی وجہ سے حضرت عمر نے کہا کہ تم صدیق اکبر کو کاذب سمجھتے تھے اور بایں ہمہ جب میراث کے نہ دینے کی وجہ سے ان دونوں صاحبوں نے صدیق اکبر کو کاذب خائن وغیرہ سمجھا، تو اب بجز اس کے سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ دل سے کاذب وغیرہ سمجھا ہو کیونکہ کسی کی میراث کا نہ دینے والا بالیقین خائن ہے۔ البتہ اگر اس حدیث میں یوں مذکور ہوتا۔ کہ ان دونوں صاحبوں نے صدیق اکبر سے بھی تولیت ہی مانگی، جیسا کہ حضرت عمر سے مانگی تھی پر صدیق اکبر نے تولیت سے بوجہ مذکورہ یا بوجہ دیگر انکار کیا۔ تو یوں بھی کہنے کی گنجائش تھی، کہ تولیت کے نہ دینے میں کچھ ستم نہیں، تولیت کسی کا حق نہیں، خلیفہ کو اختیار ہے، جسے چاہے اپنی سمجھ کے موافق متولی کرے۔

جواب اول | اب ان دونوں اعتراضوں کا جواب بگوش ہوش سنئے۔ اول تو اگر ہم فرض کریں کہ حضرت علی اور حضرت عباس نے تولیت ہی صدیق اکبر سے طلب کی تھی تب ان الفاظ سے کچھ اس کے مخالف انشاء اللہ تعالے نہ نکلے گا۔ اور یہی الفاظ جو حدیث میں مذکور ہیں طلب تولیت پر محمول ہو جائیں گے، گو ظاہر میں طلب میراث ہی پر دلالت کریں وجہ اس کی یہ ہے کہ سابق میں معنی میراث کی تحقیق میں گذر چکا ہے کہ میراث کے معنے حقیقی بھی قائم مقام ہونا ہے۔ پر اصطلاح فقہا میں میراث بمعنے مشہور میں مخصوص ہو گیا ہے۔

دوسرا جواب | اور اگر معنے حقیقی نہیں تب اس میں تو کلام ہی نہیں کہ مجاز متعارف ہے چنانچہ محاورات قرآنی میں بہت مواقع میں اسی معنی میں مستعمل ہے۔
اِنَّ الۡاَرۡضَ لِلّٰهِ يُوۡرِثُهَا مَنۡ يَّشَآءُ - وَاَوۡرَثۡنَا الۡقَوۡمَ الَّذِيۡنَ كَانُوۡا

يُسۡتَضۡعَفُوۡنَ مَشَارِقَ الۡاَرۡضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِىۡ بٰرَكۡنَا فِيۡهَا - نَحۡنُ نَرِثُ الۡاَرۡضَ وَمَنۡ عَلَيۡهَا

اور سوا ان کے اور بھی آیات میں یہی معنی مراد ہیں، اول دو آیتوں کا ترجمہ تو گذر ہی چکا ہے۔ اور تیسری آیت کا حاصل یہ ہے کہ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے ہم زمین کے وارث ہوں گے اور جو زمین پر رہنے والے ہیں ان کے بھی،، اور ظاہر ہے کہ بمعنے مشہور خداوند کریم کسی کا وارث نہیں، الحاصل ان آیات میں میراث سے میراث بمعنی قائم مقام ہونے کے مراد ہے۔ سو تولیت میں بھی یہی ہوتا ہے کہ متولی وقف کرنے والے کا قائم مقام ہوتا ہے، اس صورت میں میراثک من ابن اخیک اور میراث امرأتہ من ابیھا کے یا تو یہ معنے ہوں گے کہ تم تو اے عباس اپنے بھتیجے یعنی سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوٰت کے قائم مقام ہونے کے اور ان کے ترکہ کے متولی ہونے کے طلبگار تھے اور یہ یعنی حضرت علی اس ترکہ میں اپنے خسر یعنی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام ہونے کے خواستگار تھے۔

اس تقریر پر تو کلمہ من جو من ابن اخیک اور من ابیھا میں ہے صلہ میراث ہو گا۔ اور مجموعہ صلہ اور موصول کا حاصل قائم مقام ہونا نکلے گا۔ اور یا یوں کہیئے۔ کہ قائم مقام ہونا فقط لفظ میراث کا مدلول ہے اور لفظ میراث کا صلہ اگر ہے تو محذوف ہے اور کلمہ من مذکور سببیہ ہے۔ اور حاصل مطلب یہ ہو کہ تم تو بھتیجے کی وجہ سے تولیت کے قائم مقام ہونے کے طالب ہوئے اور حضرت علی خسر کے طلبگار ہوئے یہ دو توجیہیں تو بایں نظر ہیں کہ میراث کے یہ معنے نہیں جواب معروف ہیں۔

تیسرا جواب | اور اگر بپاس خاطر شیعہ میراث کو باعتبار معنی حقیقی معنی معروف ہی میں منحصر رکھیں اور پھر اس کو کسی دوسرے معنے کی طرف منقول بھی نہ کہیں، یا اس جگہ بجز معنے معروف عوام کے اور معنے مستبعد معلوم ہوں۔ تب بھی یہ کلام معنی مذکور پر دلالت کرنے میں کمی نہ کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ بطور تشبیہ حضرت عمر نے طلبگاری تولیت کو بوجہ استحقاق قرابت میراث فرما دیا ہو اور بوجہ قرابت استحقاق جتا کر تولیت کے طلب کرنے کو

طلب میراث سے جسقدر مشابہت ہے، ظاہر ہے اور یہ توجیہ جب ہی بن پڑتی ہے
جبکہ مادہ میراث کو معنی معروف میں منحصر نہ رکھئے، بلکہ بدستور معنی معروف و غیر معروف
میں عام سمجھئے۔ چنانچہ ظاہر ہے باقی اس صورت میں اگر کوئی طالب قرینہ صارفہ ہے
جو ارادہ معنی حقیقی سے روکے، تو اس سے زیادہ اور کیا قرینہ ہوگا۔ کہ دو چار سطر ہی
پہلے حضرت علی اور حضرت عباس کا اقرار گذرا ہے کہ واقعی رسول اللہ صلے اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا ہے لانورث ماترکناہ صدقۃ

لیکن یہ بات قابل بیان باقی رہی، کہ ہم نے مانا یہ تینوں توجیہیں صحیح،
اور حضرت علی اور حضرت عباس تولیت ہی کے طلبگار ہوئے تھے طالب میراث نہ ہوئے
تھے۔ لیکن صدیق اکبر کے اس جواب کو کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
لانورث ماترکناہ صدقۃ طلب تولیت سے کیا علاقہ؟ کیونکہ بالیقین اس حدیث
میں میراث سے معنی معروف مراد ہیں، اس صورت میں اس سوال و جواب کا وہی حال
ہوگا جیسا مشہور ہے "سوال از آسمان جواب از ریسمان" یا جیسے مثل مشہور ہے
"زمین کی کہیں تو آسمان کی سنیں"، اس لئے ہمیں اور بھی تکلیف اٹھانی پڑی۔ خیر

ع: برسر فرزند آدم ہرچہ آید بگذرد

اس تحریر کے مشغلہ کی کلفت بھی انشاء اللہ ایک روز رفع ہونے
والی ہے۔ سو بچشم انصاف اور بگوش ہوش دیکھئے اور سنئے کہ یہ جواب سوال مذکور
کے کس طرح مطابق آتا ہے۔

جناب من جواب دو طرح کے ہوتے ہیں ایک مطابقی، دوسرا التزامی، مطابقی
کے معنے تو یہ سمجھئے کہ اس کلام کے معنے مطابقی عین جواب ہو۔ اور جواب
التزامی کے ہماری اصطلاح میں یہ معنے ہیں کہ اس کے معنے مطابقی کو اقرار یا انکار لازم
ہو۔ اس جواب کو درصورتیکہ حضرت علی اور حضرت عباس کی طرف سے طلب میراث
بمعنے معروف ظہور میں آئی بمنزلہ جواب مطابقی سمجھنا چاہیئے۔ گو حقیقت میں التزامی
ہے۔ کیونکہ ان الفاظ میں سے کسی کے معنے مطابقی یہ نہیں کہ میں دوں گا یا نہ دوں گا مگر
چونکہ اس جواب سے انکار ایسا ہی ظاہر ہے، جیسے یوں کہدیتے ہیں کہ میں نہیں دیتا
اس لئے اس جواب کو بمنزلہ جواب مطابقی سمجھئے۔ اور درصورتیکہ حضرت علی اور حضرت
عباس طالب تولیت ہوئے ہوں تو تب اس جواب کو جواب التزامی سمجھئے۔ اس لئے
کہ اس صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ تمہارے متولی کرنے میں یہ اندیشہ
ہے۔ مبادا حضرت فاطمہ کے طلب میراث کے قرینے سے خلائق کے یہ ذہن نشین نہ ہو جائے
کہ انہیں جو دیا ہے تو بطور میراث دیا ہے

اور پھر رفتہ رفتہ یہ بات منقول ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ تمہارے ہمارے
بعد اس میں تصرفات مالکانہ ہونے لگیں۔ اور آگے جو پیدا ہونے والے ہیں اس کو
میراث سمجھ کر بانٹ بونٹ برابر کریں، حالانکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا ہے
لانورث ماترکناہ صدقۃ ہرچند بعد اس تقریر کے اس ایک جواب کے دو مختلف
سوالوں پر مطابق آنے میں کسی بلید ہی کو تامل ہے تو رہے مگر بنظر احتیاط و مزید توضیح
ایک مثال مرقوم ہے، اگر کوئی بادشاہ کسی امیر کی جاگیر اس کے انتقال کے بعد ضبط
کرکے کسی افسر کو یوں حکم دے کہ تم بطور خود لوگوں کو نوکر چاکر رکھ کر اس کا انتظام کرادو
تو اگر اس امیر کی اولاد جس کی جاگیر ضبط ہوتی ہے کسی وجہ سے یوں سمجھتے ہوں کہ یہ
جاگیر دوام کے لئے تھی۔ اور اس افسر کے اچانک نظم و نسق کو دیکھ کر اس سے یوں
کہیں۔ کہ یہ جائداد تو ہماری ہے تم اسے کیوں دباتے ہو، لازم یوں ہے کہ اسے ہمارے
حوالہ کردو، تو اس کا یہ جواب کہ بادشاہ نے اس جاگیر کو ضبط کرلیا ہے تمہیں نہیں مل
سکتی، جیسا صحیح ہے، ویسا ہی اس صورت میں بھی صحیح ہے۔ کہ اس امیر کی اولاد اپنی
جاگیر کے ضبط ہونے سے مطلع ہوں، پر بضرورت طلب معیشت اس افسر سے اس بات
کے ملتجی ہوں کہ تم آخر کسی نہ کسی کو اس کے انتظام کے لئے نوکر رکھوگے اگر ہمارے ہی ہاتھوں
اس کا انتظام کراؤ تو ہم اس کا استحقاق بھی رکھتے ہیں۔ ہم اسی متوفی
کی اولاد ہیں۔

مگر اس صورت میں اور اس صورت میں اتنا فرق ہوگا کہ پہلی صورت

ہیں تو جواب مذکور کافی ووافی ہے۔ اور دوسری صورت میں بعض مذکورات جواب الزاماً سمجھے جاتے ہیں، اور حاصل جواب یہ ہے کہ یہ جائداد ضبط ہوچکی ہے اگر ہم کو نوکر بھی رکھا جائے، تب یہ اندیشہ ہے کہ کوئی غماز بادشاہ کے کان میں کچھ جا جڑے اور بادشاہ کے دل میں یہ خیال بیٹھ جائے۔ کہ افسر نے امیرزادوں سے کچھ سازش کر کے جائداد کو بدستور رہنے دیا ہے، پھر نہ تمہاری خیر نہ میری خیر۔

حضرت علیؓ وعباسؓ نے بھول سے مطالبہ کیا۔ اور بھولنا عیب نہیں۔

دوسرا جواب، حضرات شیعہ اپنے حسب دلخواہ لیں یعنی یہ ہی سہی کہ حضرت علی اور حضرت عباس طالب میراث ہی ہوئے تھے لیکن باوجود اس بات کے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سن چکے تھے کہ لا نورث ما ترکنا صدقۃ، پھر اس طلب کی وجہ یہ ہوئی ہو کہ آدمی تھے، بھول گئے، جب حضرت ابوبکر صدیق نے کہا تب یاد آیا، سو اس بھول جانے میں حضرت علی کی شان میں کچھ فرق نہیں آتا بڑے بڑے رسول بھولے چوکے ہیں۔

حضرت آدم کی بھول

حضرت آدم کی شان میں خداوند کریم فرماتے ہیں۔ وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَى آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ یعنے ہم نے حضرت آدم کو پہلے سے تقید تاکید سب کچھ کر دی تھی، پھر بھی بھول گئے، جب حضرت آدم پیغمبر ذیشان ہو کر خود خدائی تقید وتاکید کو بھول جائیں، تو حضرت علی تو امام ہی تھے، وہ بھی پھر حضرت آدم ہی کی اولاد ہیں، وہ بحکم اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِأَبِيهِ ان کے نسیان کے وارث۔ وہ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک عام بات کو بھول جائیں جس میں کسی قسم کی تاکید [illegible] نہ علی العموم نہ بالخصوص حضرت [illegible] تو [illegible] کیا قباحت [illegible]

حضرت موسے کی بھول

[illegible] حضرت [illegible] علیہ السلام [illegible] حضرت خضر [illegible] حضرت موسے [illegible] کو حضرت خضر علیہ السلام سے بغرض تعلیم علم [illegible] حضرت خضر کو [illegible] سمجھ لیں کہنا کہ تم [illegible] نہ میں گی تم خود [illegible]

پھر ان سب کے بعد حضرت خضر علیہ السلام کا حضرت موسے سے عہد لینا کہ اگر میری ہمراہی مدنظر ہے تو جب تک میں نہ بتاؤں تم کسی بات کو نہ پوچھیو، یہ سارا قصہ سورۂ کہف میں سولھویں سیپارہ کے شروع سے کچھ پہلے مذکور ہے، اس اعتقاد پر کہ خدا کے بھیجے ہوئے گئے۔ اور اس اہتمام پر کہ سفر دور دراز قطع کیا۔ اور پھر کیا کیا انکار اور اقرار ہوئے، حضرت خضر کی جلالت قدر اور ان کی باتوں کا معقول ہونا یک لخت دل سے نکل گیا، اور اس پر اپنا عہد بھی بھول گئے

چنانچہ حضرت خضر کو مع حضرت موسے علیہ السلام جب ایک گھاٹ کے ملاحوں نے بوجہ اعتقاد بے لئے دیئے سوار کر لیا اور انہوں نے بیچ میں جا کر اس کشتی کا تختہ توڑ ڈالا۔ تو حضرت موسے علیہ السلام سے نہ رہا گیا۔ اور یہ کہہ اٹھے۔ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا یعنی اے خضر کیا تم نے اس کشتی کو اس لئے توڑ دیا کہ بیٹھنے والوں کو ڈبو دو، تم نے بھی عجیب کام کیا کہ کشتی والوں کے احسان کے بدلے یہ نقصان کیا۔ اس کے جواب میں جب حضرت خضر نے یوں فرمایا أَلَمْ أَقُلْ إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا یعنی میں نے تم سے کہا تھا۔ کہ تم سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا تو حضرت موسے علیہ السلام نے یہ عذر کیا لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ یعنی میں بھول گیا تھا تم مواخذہ نہ کرو"

الحاصل اس اہتمام اور اس تقید پر اتنی جلدی حضرت موسے بھول گئے ہوں تو پھر حضرت علی کا اتنی دیر کے بعد بھول جانا کچھ بات ہی نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام رسول ولو العزم، اور حضرت علی نہ رسول نہ نبی نہ اولو العزم۔۔۔ نہ غیر اولوالعزم، باینہمہ نوں اہتمام اور پیش بندی نہ تھی۔ فقط اتفاقاً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک بات چلتی چال سن لی سو وہ بھی اس طور پر کہ علی العموم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی۔ کچھ حضرت علی کے سنانے کی اس میں تخصیص نہ تھی اور حضرت موسے علیہ السلام کو بالخصوص یہ بات پیش آئی کہ خدا کے بھیجے ہوئے گئے۔ اور آگے جو کچھ گذرا سو گذرا،

سید الخلق کی بھول

اور اگر نا انصافان شیعہ حضرت موسے اور حضرت آدم علیہما السلام

کے نسیان پر نہ فرمائیں تو خود سرور کائنات علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات کو جناب باری تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں وَاذْكُرْ رَبَّكَ إِذَا نَسِيتَ یعنی یاد کر اپنے رب کو جب بھول جایا کرے، اس سے صاف امکانِ نسیان بہ نسبت پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم ثابت ہے، بلکہ شانِ نزول اس کا یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کفار سے ایک بات کا وعدہ کیا کہ کل بتاؤں گا، اتفاق سے انشاء اللہ کہنا بھول گئے، اس پر خدا کی طرف سے یہ نصیحت ہوئی۔

معتمد کتب صحاح شیعہ مثل کافی کلینی اور تہذیب ابو جعفر طوسی میں اسانید صحیحہ سے مروی ہے کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو نماز میں سہو ہوا، اور چار رکعت کی بجائے فقط دو ہی ادا کیں، پھر جب سرور مرسلین صلے اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کو امور دینی میں سہو ہوتا ہو تو حضرت علی تو امتی ہی ہیں، الحاصل ظاہر الامکان یہ بات ہے کہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو باوجود حدیث مذکور کے اپنے کانوں سے سن لینے کے سہو واقع ہوا ہو، اور وقت پر یاد نہ رہا ہو، اور وجہ بھی ظاہر ہے کیونکہ میراث کا قصہ تو ایسا عام ہے کہ سارا جہان اس میں شریک، حسب عادت بنی نوع اگر طلب کر بیٹھے ہوں، تو کیا بعید ہے۔

لیکن جب صدیق اکبرؓ نے یاد دلایا، تب یاد آ گیا اسی واسطے حضرت عمرؓ نے جب دونوں کو متولی کر دیا۔ تو حضرت علی نے حضرت عباس کا قبضہ اٹھا دیا، ورنہ متروکہ نبوی میں حق میراث سمجھتے، تو گو حضرت عمرؓ نے متولی کر کے دیا تھا، حضرت عباس کے قبضہ کو اپنے قبضہ سے مقدم سمجھتے۔ اس لئے کہ وہ حقیقۃً وارث تھے اور حضرت علی خود وارث نہ تھے حضرت فاطمہ کی طرف سے وکیل تھے، پھر اپنی خلافت میں سب حقداروں کو ان کا حق پہونچاتے، ازواج مطہرات کو ازواج مطہرات کا حصہ بانٹ دیتے حضرت عباس کی اولاد کو ان کا حصہ الگ کر دیتے، چونکہ اپنی خلافت میں بھی بدستور سابق رہنے دیا، اور تقسیم نہ کیا، اور کسی کا حصہ نہ دیا۔ چنانچہ بحوالہ اجماع فریقین مرقوم ہو چکا ہے، تو پھر بجز اس کے اور کوئی صورت نہیں کہ حضرت صدیق اکبر کے یاد دلانے سے بات یاد

آ گئی۔ اور اس لئے حضرت عمر کے سامنے اقرار کیا۔

صدیقؓ سے عمرؓ و ابن عمرؓ کی بدگمانی کی وجہ بشریت ہے

باقی رہی یہ بات کہ اس صورت میں پھر صدیق اکبر کی طرف سے بدگمانی کی کوئی صورت نہیں، جو حضرت عمر نے یوں فرمایا کہ تم ابوبکر کو کاذب آثم وغیرہ سمجھتے تھے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ بمقتضائے بشریت چنانچہ مرقوم ہوا۔ اوپر کے دل میں گاہ بیگاہ یہ خیال گذرا ہو کہ ہر چند یہ حدیث صحیح ہے لیکن پھر استحقاق تولیت ہمیں ہی تھا۔ بایں ہمہ جو صدیق اکبر نے قبضہ رکھا ہے تو ہو نہ ہو کچھ دال میں کالا ہے۔ اور یہ خیال پیرایۂ حال سے یا کسی قال سے حضرت عمر کو مترشح ہوا ہو۔ اس لئے انہوں نے بطور تنبیہ و شکایت ان کے منہ پر کہہ دیا، اور اس لئے انہوں نے بنظر انصاف سکوت فرما دیا، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

اس تقریر کے بعد امید یوں ہے، کہ جن کو خداوند کریم نے عقل سلیم عطا فرمائی ہے اگر کسی نابکار کی صحبت سے بے راہ بھی ہیں تو راہ پر آ جائیں، اور جو نہ آئیں تو اپنا سر کھائیں۔ مَنْ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ اب الحمد للہ کہ جمیع امور متعلقہ حدیث صحیح مسلم کے بیان سے فراغت پائی، لازم یوں ہے کہ بقیہ خرافات خط مولوی صاحب کا بھی جواب دندان شکن جو مولوی عمار علی صاحب اور نیز دیگر پیشوایان شیعہ کے دانت کیا توڑے منہ ہی سی دیئے انشاء اللہ بیان کر کے صفحہ قرطاس اور قلم و دوات کو ہاتھ سے دھر دیجئے۔ اس لئے التماس یوں ہے۔ کہ آگے مولوی عمار علی صاحب یوں رقم فرماتے ہیں

"اور صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ جس وقت ابوبکر نے فدک کے دینے سے انکار کیا۔ فاطمہ زہرا اس پر غضبناک ہوئی اور تمام عمر پھر کبھی اس سے کلام نہ کیا۔ اور صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ فاطمہ نے وقت مرنے کے وصیت کی، کہ ابوبکر اور عمر میرے جنازہ پر نہ آنے پائیں انتہی"

یہ خط کی آخری عبارت ہے۔ اور یہاں مولوی صاحب کی ترکی تمام ہو لی مگر اہل فہم پر پوشیدہ نہ رہے گا کہ بعد ثبوت مضامین مسطورہ بالاخصوصاً اشارہ آیت یوصیکم اللہ (در بارہ مستثنیٰ ہونے سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم میراث سے) اور صراحتِ آیت مَا أَفَاءَ اللّٰهُ (در بارہ وقف ہونے فدک وغیرہ اموال فئے کے)

صدیق اکبر پر دربارہ نہ دینے فدک کے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا، ہاں الٹا بطور حضرات شیعہ خوارج و نواصب کو گنجائش لب کشائی ہے کہ حضرت فاطمہ باوجود معصوم ہونے کے۔ چنانچہ عقیدہ شیعہ یہی ہے، فدک وغیرہ اموال وقف میں سے کس لئے طلب گار میراث ہوئیں؟ اور پھر وہ بھی اسقدر کہ صدیق اکبر نے ایک حق بات کہدی تو الٹا غصہ کے مارے ملنا جلنا میل ملاقات سب ترک کر دی، مگر چونکہ سانچ کو آنچ نہیں، سچی بات ہر طرح درست رہتی ہے، اہلسنت کو اس مقدمہ میں کچھ دشواری نہیں، جیسے وہ صدیق اکبر کو اس مقدمہ میں بے قصور سمجھتے ہیں حضرت فاطمہ زہرا جگر گوشۂ سید الوریٰ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی کسی طرح مورد اعتراض نہیں سمجھتے۔ اور باایں ہمہ کوئی قاعدہ ان کے دین و مذہب کا منقوض نہیں ہوتا، اول تو عیاں را چہ بیان۔

قرآن فہمی میں آنحضرت کے تمام اُمتی محتاج ہیں دوسرے بات کچھ دور نہیں، کان درست کیجیے، اور سنئے۔ حضرت فاطمہ زہرا ہر چند سیدۃ النساء بلکہ ان کے خاکپا سرمہ اکابر اولیاء، ان کے غلامان غلام مورد افضال کبریا، ان کی محبت جو محبت کے طور پر ہو باعث نجات اتقیا۔ ان کا اعتقاد جو اعتقاد کی طرح پر ہو باعث ترقی درجات اعلیٰ۔ لیکن پھر بھی اُمتی تھیں نبی نہ تھیں، فہم قرآن مجید میں کچھ نہ کچھ حاجت تفسیر نبوی رکھتی تھیں۔ کیونکہ فقط زبان دانی اور قوت فہم دقائق معانی سے اس جگہ کام نہیں چلتا بلفصیل اجمال کلام ربانی۔ اور شرح اشکال آیات فرقانی، بجز مورد وحی آسمانی اعنی سرور دوجہاں پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وعلیٰ آلہ و ازواجہ و اہل بیتہ و اصحابہ وسلم کے متصور نہیں، چنانچہ خود خداوند کریم فرماتا ہے اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ط یعنے بھیجا ہم نے تم میں رسول تمہیں میں سے جو پڑھتا ہے تم پر ہماری آیات، اور ستھرا کرتا ہے تم کو، اور تعلیم کرتا ہے تم کو قرآن اور حق بات فقط۔

اب غور فرمائیے کہ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ کہ جس کے یہ معنی ہیں کہ پڑھتا ہے تم پر ہماری آیتیں، تعلیم الفاظ قرآنی پر دلالت کرتا ہے اور یُزَکِّیْکُمْ جس کے یہ معنی ہیں کہ ستھرا کرتا ہے

اور پاک صاف کرتا ہے، تزکیہ باطن کی طرف مشیر ہے، بعد میں جو یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ فرمایا۔ تو قطع نظر اس کے کہ تعلیم عرف عرب میں معانی ہی سے متعلق ہے بعد یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ کے یہ فرمانا اس بات پر دلیل کامل ہے کہ یہ تعلیم معانی کی تعلیم ہے، پھر جب یُعَلِّمُکُمْ میں خطاب تمام امت کی جانب ہو، خاص کر مسلمانان ملک عرب کی طرف جو صحبت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں مشرف باسلام ہو چکے تھے چنانچہ لفظ منکم سے عیاں ہے، تو معلوم ہوا کہ اور سب علم معانی قرآن میں محتاج سرور دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اور نیز یہ بھی متحقق ہو گیا کہ تعلیم معانی قرآنی کی قابلیت بھی ہر کسی میں نہیں جب تک تزکیہ تام نہ ہو، تب تک تعلیم معانی قرآنی بے موقع ہے۔ اسی واسطے یعلمکم کے بعد یزکیکم فرمایا اور شواہد اس دلیل کے قرآن میں بہت ہیں حافظان علم پر مخفی نہ رہے گا۔ منجملہ ان کے ایک جگہ شان قرآن میں وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ فرماتے ہیں یعنی اتاری ہم نے تجھ پر کتاب۔ جس میں ہر چیز کی تفصیل اور بیان ہے

وَمَا اُوْتِیْتُمْ سے سرور دو عالم مستثنےٰ ہیں اور ایک جگہ علاوہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے اوروں کو فرماتے ہیں وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا یعنے نہیں دیئے گئے تم علم سے مگر تھوڑا۔ اور پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے مستثنےٰ ہونے کی وجہ ظاہر ہے۔ کیونکہ [illegible] جب کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم [illegible] کے پہنچانے والے ہیں، داخل زمرہ مخاطبین نہیں، [illegible] ان کے ذوالفقار کو خدا کے برابر سمجھتے ہیں [illegible] سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ القصہ [illegible] کے بہت سے مضامین ملیں گے جن سے [illegible] حقیقت کے ان کے موید ہونے میں [illegible] اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا الخ پر کچھ بندہ [illegible] نے عرض [illegible] کیا جا سکتا۔

حضرت فاطمہ بھی فہم قرآن میں آنحضرت کی محتاج تھیں

خیر بہرحال حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا درباب فہم معانی قرآنی رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو محتاج ہونا کلام اللہ سے ثابت ہو نہ ہو، پر اہل سنت کے نزدیک تو یہ بات لاریب مسلم ہے، اور اس کے مخالف کسی دلیل عقلی یا نقلی سے آج تک کوئی بات ان کو ثبوت کے ساتھ نہیں پہونچی اور کیونکر پہونچے ؟ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا دربارہ فہم قرآن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا محتاج ہونا اظہر من الشمس ہے، محتاج دلیل نہیں، اس کے خلاف کا غلط ہونا بھی ہم کسی کے نزدیک روشن، پھر اگر کسی آیت کے فہم میں بسبب اس کے کہ اس کی تفسیر زبان گوہر ریز آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے نہ سنی ہو فی الجملہ غلطی ہو جائے اور اسکے کسی اشارہ مخفی کو نہ سمجھیں تو اہل انصاف فرمائیں کہ اسمیں کیا محال ہے؟

علی ہذا القیاس اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بلکہ آج کل کوئی شخص اہل فہم میں سے اس اشارہ مخفی کو، جو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے رہ گیا ہو، بہ تنبیہ (نسبت وتفسیر نبوی) سمجھ جائے تو کیا قباحت ہے ؟ نہ اس بات سے کچھ کسر شان حضرت زہرا رضی اللہ عنہا لازم آتی ہے۔ اور نہ اس وجہ سے دوسروں کو ان پر فوقیت ہو سکتی ہے۔

اگر کسی ایک بات کے جاننے سے کسی کو فضیلت ہو تو حضرت خضر حضرت موسے سے افضل ہوتے

اگر ایک بات کے سمجھ لینے سے سمجھنے والوں کو نہ سمجھنے والوں پر فوقیت ہوا کرتی، تو حضرت خضر کو حضرت موسے علیہ السلام پر فوقیت ہوتی۔ کیونکہ کشتی کے توڑنے اور لڑکے کے قتل کرنے کی وجہ باوجودیکہ یہ سب حضرت خضر نے بامر خداوندی کیا تھا حضرت موسے علیہ السلام نہ سمجھے، اور حضرت خضر ان سب کے وجوہ جانتے تھے، چنانچہ واقفان کلام ربانی جانتے ہیں حالانکہ مذہب صحیح یہی ہے کہ حضرت خضر نبی نہ تھے اور اگر تھے بھی تو باجماع امت حضرت موسے علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے افضل ہیں۔

ادھر حضرت داؤد علیہ السلام کا کھیتی کے مقدمہ میں غلطی کھانا، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا حکم خداوندی کا سمجھ جانا معروف ومشہور ہے، اور قرآن میں مذکور، حالانکہ

جس وقت یہ قصہ پیش آیا۔ اس وقت حضرت داؤد پیغمبر وقت تھے، اور پیغمبر بھی کیسے اولوالعزم، اور حضرت سلیمان جب تک نہ نبی ہوئے تھے اور نہ امام تھے۔ اور باینہمہ صغیر السن، کیونکہ وقت وفات حضرت داؤد علیہ السلام حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمر کل بارہ برس کی تھی جب یہ قصہ پیش آیا۔ جب تو اور بھی چھوٹی عمر ہوگی۔ پھر جب حضرت داؤد علیہ السلام (حالانکہ نبی وقت اور رسول اولوالعزم تھے) ایک مسئلہ میں غلطی کریں اور ایک لڑکا نو عمر بات صحیح کہدے،

تو اسی طرح حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اگر ایک اشارہ بے تعلیم نہ سمجھیں وہ بھی آیت یوصیکم اللہ کا اشارہ، جو منجملہ آیات قرآن مجید ہے، جس کا فہم کامل بجز تفہیم وتعلیم سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم ممکن نہیں، چنانچہ معلوم ہو چکا، اور حضرت صدیق اکبر بلکہ آج کل کے پڑھنے لکھنے والے جو کسی طرح حضرت فاطمہ بلکہ ان کے خاکپا اور ان کے سگ در کے برابر نہیں ہو سکتے، بوجہ تعلیم نبوی سمجھ جائیں تو کچھ حرج نہیں، علی ہذا القیاس ممکن ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو اول فدک کا فئے ہونا نہ معلوم ہو کیونکہ ایسے قصے اکثر مجاہدین اور غانمین کو معلوم ہوتے ہیں، اور با ایں ہمہ آیت ما افاء اللہ سے بھی اراضی فئے کا غیر مملوک ہونا بتامل ہی نکلتا ہے، چنانچہ ناظرین وجوہ مسطورہ بالا پر جو دربارہ تحقیق غیر مملوک ہونے اراضی فئے لکھے گئے ہیں، پوشیدہ نہ رہیگا۔

اور اس نہ سمجھنے اور اس بے علمی کے باعث بعد وفات سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوات واکمل التحیات حضرت صدیق اکبر سے طالب میراث ہوئیں۔ کیونکہ جب تک اشارہ وجوہ اراضی فئے یوصی اور اشارات مذکورہ پر اور علی ہذا القیاس وجوہ غیر مملوک ہونے اراضی فئے پر جو آیت ما افاء اللہ کے پس وپیش سے مستنبط ہیں نظر نہ ہو تب تک ظاہر آیت یوصیکم اسی طرف ہے کہ پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم بھی حکم میراث میں شریک امت ہیں۔

سیدہ نے سماع حدیث کے بعد ندامت کے سبب بات چیت بند کی

مگر جب صدیق اکبر نے حدیث پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم سنادی ہو تب اس طلب گاری سے ایک گونہ ندامت اور رنج حاصل

ہوا ہو، کیونکہ انبیاء اور مرسلین اور صدیقین اور کاملین کو لازم ہے، کہ اگر کوئی بے اعتدالی ان سے ظہور میں آئے تو بعد اطلاع اس پر ندامت ہوا کرے، چنانچہ حضرت آدم کا گیہوں کھا لینے پر نادم ہونا، اور علیٰ ہذا القیاس حضرت نوح علیہ السلام کا دعائے نجاتِ فرزند سے نادم اور پشیمان ہونا، اور حضرت موسےٰ علیہ السلام کا قتل قبطی سے شرمندہ ہونا، خود قرآن میں موجود ہے۔

اور اس ندامت کے باعث حضرت صدیق اکبر سے ربط و ضبط میں فرق آ گیا ہو، اور ملنا جلنا بدستور سابق نہ رہا ہو۔ نہ یہ کہ ملنے پر بھی کلام و سلام کی نوبت نہ آتی ہو، کیونکہ اس طرح کی متارکت تین دن سے زیادہ حرام ہے۔ چہ جائیکہ تمام عمر؟ وہ بھی ایسے مسلمانوں میں، بہر حال ترک کلام میں جو بعض روایات میں ہے، اہلسنت کے نزدیک حضرت فاطمہ کی طرف کچھ حرف نہیں۔

سماعِ حدیث کے بعد سیدہ کو کلام کی حاجت ہی نہ رہی۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کلام نہ کرنے سے یہ مراد ہے کہ جب حدیث لانورث سن لی، تو پھر فدک کے مقدمہ میں کچھ چون و چرا نہیں کی، اور صدیق اکبر کے چھوڑ دینے سے یہ مراد ہے کہ چپکے ہو کر اپنے گھر میں بیٹھ رہیں۔ اور حدیث مذکورہ سن لینے کے بعد پھر ان کا پیچھا نہیں لیا، اور کیونکر لیں؟ اگر ایسا ہو تو حضرت فاطمہ رض اور دنیاداروں میں کیا فرق رہا، مگر حضرت صدیق اکبر بتقاضائے محبت و اعتقاد و نیاز مندی و انقیاد اس نہ ملنے کو غصہ پر محمول کر کے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے در دولت پر حاضر ہوئے ہوں، اور علیٰ ہذا القیاس اور لوگ بھی اسے غصہ ہی سمجھتے ہوں، اور اس لئے صدیق اکبر رض نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو سفارش کے لئے اندر بھیجا ہو، اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے تسکین صدیق اکبر کے لئے اظہار رضا اور خوشی کر دیا ہو۔

وَجَدَتْ کے لفظ کی تشریح

باقی کسی کے دل میں یہ خلجان رہے کہ روایات میں بتصریح مذکور ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صدیق اکبر سے غصہ ہو گئیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو روایات صحیحہ مثل روایات مسلم و بخاری میں فَوَجَدَتْ فَاطِمَةُ واقع ہے

اور وَجَدَتْ جیسا بمعنے غَضِبَتْ ہے جو غصہ پر دلالت کرتا ہے ویسا ہی بمعنے حَزِنَتْ بھی ہے جو حزن و غم پر دلالت کرے۔ چنانچہ قاموس وغیرہ کتب لغت نایاب نہیں، جسے تامل ہو دیکھ لے۔ پھر کونسی ضرورت ہے کہ وَجَدَتْ بمعنے غَضِبَتْ ہی لیجئے۔ اور خواہی نخواہی حضرت فاطمہ رض کا غصہ ثابت کیجئے

وَجَدَتْ کے صلہ پر بحث

اور اگر کوئی وہمی یوں تکرار کرے کہ ہم نے مانا وَجَدَتْ دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اگر کلمہ علی ہوتا ہے تو غصہ ہی کے معنی ہوتے ہیں، ہاں اگر اس کے صلہ میں حرف با واقع ہو تو پھر معنے حزن کی گنجائش ہے مگر اس مقام میں بعد وَجَدَتْ صحیح مسلم میں فقط علی ابی بکر ہی واقع ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وجدت بمعنی غَضِبَتْ ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے عندیہ کے موافق دوسرے کے کلام کے معنے سمجھتا ہے، اسی واسطے روایت بالمعنے، اول تو ہر کسی کی مقبول نہیں، اور مقبول بھی ہو تو ہم پایۂ روایت باللفظ نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ حقیقت الامر کچھ اور ہو، اور راوی کچھ اور سمجھ گیا ہو۔

آخر حضرت موسےٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا، اور اپنے معاملات میں اگر آدمی تامل کرے تو اکثر ایسے قصے پیش آتے ہیں۔ سو ممکن ہے کہ کہنے والے نے فقط وَجَدَتْ فاطمہ کہا ہو۔ اور سننے والے نے بایں خیال کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی کبیدگی کو جو درحقیقت بوجہ ندامت تھی، بوجہ غضب سمجھ رہا تھا، وَجَدَتْ کو بمعنے غَضِبَتْ محمول کر کے روایت کے وقت روایت بالمعنی کی ہو۔ اور اپنی سمجھ کے موافق لفظ علی ابی بکر بھی زیادہ کر دیا ہو بہر حال جب تک احتمالات صحیحہ پیدا ہو سکیں تب تک اہل عقل کو لازم یہی ہے کہ اہل کمال کی طرف سے بدگمان نہ ہوا کریں۔

اہل کمال کے کلام کا وہ محمل تلاش کیا جائے۔ جس سے حسن ظن قائم رہے۔

جناب باری تعالےٰ نے جو حضرت موسےٰ اور حضرت خضر علیہ السلام کا سورہ کہف میں بیان کیا ہے جس میں حضرت خضر کا ان ملاحوں کی کشتی کا توڑنا جنہوں نے ان کے ساتھ احسان کیا تھا۔ اور

نے لئے دینے اُن کو پار اتار دیا، اور بے گناہ صغیر السن لڑکے کو قتل کر دینا۔ اور حضرت موسےٰ علیہ السلام کا ان دونوں پر اعتراض کرنا مذکور ہے۔ اس کے بیان کرنے میں ایک یہی حکمت ہے کہ مردمان کوتاہ بین کو اگر بزرگان دین کا کوئی امر خلافِ عقل یا نقل نظر آئے تو اپنی نظر کا قصور سمجھیں اور ان کی نسبت گمان فاسد نہ کریں۔

علیٰ ہٰذا القیاس پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے ظُنُّوا الْمُؤْمِنِیْنَ خَیْرًا فرمایا ہے تو اس سے بھی غرض یہی ہے کہ اگر تمہاری نظر میں کسی مومن کامل کا کوئی کام خلاف شرع نظر آئے، تو گو ظاہر میں روک ٹوک کرو۔ تاکہ اگر واقع میں برا ہو تو اس کا انسداد ہو جائے پر دل سے بدگمان نہ ہو، اپنی طرف سے نیک ہی گمان کرتے رہو، نہ یہ کہ اچھے کاموں کو اچھا سمجھو کیونکہ اچھے کاموں کو ہر کوئی خود بخود اچھا سمجھتا ہے۔ حکم کی کیا حاجت تھی؟ اس تقریر سے اگر کسی کے جی میں یہ روگ بھی ہو گا، کہ ان احتمالات سے کیا کام چلتا ہے۔ ظاہر میں جو کچھ سمجھ میں آوے۔ ہم تو جانیں وہی بات ٹھیک ہو گی، تو ان شاء اللہ مرتفع ہو جائے گا، بہر حال گو یہ احتمال بہت سے نظر آتے ہیں مگر عقل سلیم ہو تو پایہ تحقیق سے کم نہیں۔ کیونکہ مناسب حال حضرت فاطمہ اور حضرت صدیق اکبر یہی ہے۔ مع ہذا منصب دعوائے منکران صدیق اکبر کی طرف ہے اور ظاہر ہے کہ دلیل مدعی جب ہی مفید مطلوب ہوتی ہے کہ کوئی احتمال خلاف مطلوب نہ بن سکے، ورنہ مدعا علیہ کی فقط ایک لانسلم میں شیخ چلی کا گھر بنا بنایا ڈھ جائے گا۔ سو اگر دشمنان صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو یہ منظور ہو کہ لفظ وجدت اور قصہ مندرجہ روایات سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا غصہ ہونا ثابت کریں، تو اول ان احتمالات کو باطل کریں۔ جب اس طریق سے اپنی عاقبت خراب کرنے کا ارادہ کریں۔

سیدہ صدیق سے بوجہ غلطی آزردہ ہوئیں

اور ہم نے مانا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اس مقدمہ میں حضرت صدیق اکبر سے آزردہ خاطر ہوئیں لیکن اس سے حضرت صدیق اکبر کا قصوروار ہونا کہاں سے ثابت ہوا۔ نہایت یہی تھا ثابت ہو تو یہ ہو، کہ حضرت فاطمہ زہرا بوجہ غلطی صدیق اکبر کو قصوروار سمجھ کر ان پر غضبناک ہوئی ہوں سو ایسا بسا

اوقات انبیاء و مرسلین کو بھی باہم پیش آتا ہے۔ حالانکہ وہ بالیقین معصوم ہیں، چہ جائیکہ صدیق؟ حضرت ہارون علیہ السلام کا بچھڑے کو پوجنے کے مقدمہ میں بے قصور ہونا کلام اللہ سے ثابت ہے۔ اور پھر باایں ہمہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کا ان پر غصہ ہونا، یہاں تک کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی اور سر کے بال کھینچنے تک کی نوبت آئی خود کلام اللہ ہی میں موجود ہے، سو جیسا حضرت ہارون تو یوں بے قصور کہ وہ بے قصور تھے ہی، اور حضرت موسےٰ علیہ السلام کو یوں کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں، کہ وہ اپنے عندیہ میں بے جا غصہ نہیں ہوئے تھے۔

حضرت موسےٰ غلطی سے حضرت ہارون پر ناراض ہوئے

بلکہ باایں نظر کہ ان کا بڑے بھائی پر غصہ ہونے کا کوئی منصب نہ تھا اگر خدا واسطے کی بات نہ ہوتی تو حضرت ہارون ان کا خون بھی کر دیتے تو دم نہ مارتے۔ چہ جائیکہ یوں دست و گریباں ہونے کی نوبت آئی پر مسلمان کو یقین ہے کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کو اس غیظ و غضب میں اجر عظیم ملے، اب لازم یوں ہے کہ اسی طرح حضرت فاطمہ سیدۃ النساء، اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہما کی باہم رنجش اور چقلش کو سمجھئے، اور دونوں کو اس مقدمہ میں بے قصور اور دونوں کو ماجور سمجھئے، اور ہم نے اسی دن کے لئے اس کی تحقیق آیت محمد رسول اللہ الخ کے ذیل میں بخوبی کی ہے، اگر کسی کو زیادہ تر تسکین مدنظر ہو تو پلٹ کر دیکھ لے۔

بالفرض اگر صدیق ہی کی غلطی تھی تو توبہ کر لی (کتب شیعہ)

اور اس سے بھی درگذر کیجئے، ہم کہتے ہیں شیعہ ہی سچ فرماتے ہیں صدیق اکبر ہی قصوروار تھے۔ لیکن جب انہوں نے توبہ کر لی، تو پھر کیا گناہ باقی رہ گیا؟ جو شیعوں کی زبان نہیں تھمتی مشہور ہے اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ ہاں توبہ کرنے کا ثبوت اگر مدنظر ہو تو یہ بات معقول۔ لیکن ہم سند بھی ایسی رکھتے ہیں، جسے شیعہ سلمنا سلمنا کہتے کہتے تھک جائیں۔ اور برسر و چشم رکھتے رکھتے مر جائیں۔ شیخ ابن مطہر حلی نہج الکرامت میں یوں ارشاد فرماتے ہیں لَمَّا وَعَظَتْ فَاطِمَۃُ اَبَابَکْرٍ فِیْ فِدَکٍ کَتَبَ لَہَا کِتَابًا وَرَدَّہَا عَلَیْہَا یعنی جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے صدیق اکبر کو فدک کے مقدمہ میں وعظ و پند کیا تو انہوں

چنانچہ حضرت مولوی صاحب نے بھی اس بات کو نامزا کہی میرزا دیر ملی ہیں کہ
اپنا نامہ سیاہ کیا ہے محض بیجا اور بے موقع ہے، دوسرا فائدہ یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر
نے فدک کی آمدنی میں سے ایک حبہ تک نہیں چھوا۔ بلکہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ
عنہا کے خرچ سے جو کچھ بچا، فقرا وغیرہم کو دے دلا دیا۔

سو معلوم ہوا کہ فدک کے نہ دینے میں کوئی غرض دنیاوی نہ تھی، ہیں تو رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں بیشک کچھ سن لیا تھا، جو باوجود اس بے غرضی اور
بے طمعی کے حضرت فاطمہ زہرا رض کو نہ دیا۔ ان دونوں فائدوں سے نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت ام ایمن
اور حضرت علی کی گواہی کا قصہ شیعوں کا ڈھکوسلا بنایا ہوا ہے۔ کیونکہ گواہوں کا مطالبہ
تو جب ہی ہوتا ہے۔ کہ مدعی کی طرف دروغ کا احتمال ہو۔ ہاں اگر اپنے آپ خورد برد کرنا
مدنظر ہوتا تو یوں بھی کہنے کی گنجائش تھی کہ یہ فقط ٹال ٹلاؤ تھی، مگر بدگمانوں کو اب بھی
شاید یہ گمان ہو کہ اول نہ دینا ہی مدنظر ہوگا۔ اور اس وقت گواہ بھی طلب کئے ہوں
انجام کار رضائے تعالے یا اندیشہ ملامت خلق سے حضرت زہرا رض کے پاس آکر اپنی بات کے
بنانے کے لئے یہ حیلہ برپا کیا ہو۔ سو اس کا جواب اول تو یہی ہے کہ

ع :۔ بدگمان وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

دوسرے ہم نے تسلیم کیا یونہی تھا لیکن غصب فدک اگر برا تھا تو حضرت زہرا
رضی اللہ عنہا کی ناخوشی کی وجہ سے برا تھا جب وہ راضی ہو گئیں تو شیعوں کو رنج کیوں
ہے ؟ مگر اس صورت میں بوجہ مخالفت حضرت زہرا کچھ انھیں پر وبال پڑے تو پڑے،
حضرت صدیق کو تو خدا نے بچا ہی لیا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ فدک تا حین حیات سرور
کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوات و اکمل التحیات ہی کے قبضہ و تصرف میں رہا حضرت
فاطمہ زہرا رض قابض اور دخیل ہوئی تھیں، ورنہ صدیق اکبر کی اس بات کے جواب
میں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یوں دیکھا ہے کہ تمہیں تمہارا خرچ اور مصلوں
کی محصلی دیکر فقرا وغیرہم کو بانٹ دیا کرتے تھے، یوں نہ فرماتیں کہ اچھا یوں ہی کیا کرو، بلکہ
اپنا قبضہ جتاتیں، جہاں سو، وہاں سوائے ر

جب ہبہ کا دعوے کیا، حالانکہ یہ ایک مخفی بات ہے ہر کوئی اسے نہیں جان سکتا
تو قبضہ تو کھلی بات ہے، اس کے دعوے میں کیا دشواری ہے۔ ہبہ کے دو تین ہی گواہ
تھے، اس کے تو ہزاروں نکل آتے۔ جو تھا یہ کہ صدیق اکبر تہ دل سے یہی چاہتے تھے
کہ فدک سیدۃ النساء ہی کے پاس چلا جائے۔ اور ان کی خاطر مبارک پر کسی طرح میل
نہ آئے۔ ورنہ ان کو ان کے ناخوش ہونے میں کیا دشواری تھی ؟ اور ان کے خوش کرنے
کی کیا ضرورت ہوتی ؟ اور یہ پہلے آیت محمد رسول اللہ کے ذیل میں ثابت ہو چکا ہے۔ کہ
طالب رضا بجز محب اور کوئی نہیں ہوتا، اور اگر کوئی یوں خیال کرے کہ یہ سارا تملق
اور ظاہرداری فقط دفع بدنامی کے لئے تھا۔ تو اول تو لفظ کبر ذالك علیہ فاراد
استرضاءھا، جس کے یہ معنے ہوئے کہ حضرت فاطمہ کا ناخوش ہو جانا انہیں بھاری
پڑا، اور ان کے راضی کرنے کا ارادہ کیا۔ خود اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ واقعی ابوبکر
کو یہ بات بہت شاق تھی، اور اسی واسطے ان کے راضی کرنے کی فکر میں تھے۔

دوسرے اگر بدنامی کا اندیشہ تھا تو مخالفین سے تھا موافقین تو بہرحال
ان کی طرف سے مطمئن ہی ہیں۔ کیونکہ جانتے ہیں۔ کہ اول تو فدک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
کا مملوک نہ تھا۔ پھر ترکہ نبوی میں میراث نہیں چلتی۔ مگر مخالفین نے اب کونسی کمی کی ؟
جو راضی کرکے ان کی زبان بند کرنا چاہتے تھے۔ سو اس سے بہتر تو یہی تھا کہ جب اپنے
آپ لینا مدنظر نہیں تو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالے کر دیتے، اس عقل و
دانائی پر کہ موافق مخالف ہندو، مسلمان یہود و نصاریٰ سب قائل ہیں۔ ایسی حرکت
ان سے تصور میں نہیں آتی شیعوں جیسے کم عقل ہوں تو مضائقہ بھی نہ تھا بلکہ نقل
سلیم اس روایت کو دیکھ کر صدیق اکبر کے صدق و دیانت پر شاہد ہے۔ اور بالیقین ان
کو اس مقدمہ میں بری الذمہ سمجھ کر ان کی طرف سے معتقد رہے۔ کہ درصورت صحت روایت
ہبہ فدک بلکہ بہرصورت جو صدیق اکبر نے فدک دینے میں آمادگی کی۔ حالانکہ حضرت سیدۃ
النساء کا یہ منصب نہ تھا کہ کسی طرف ان کا گوشہ خاطر مائل ہو۔ اور پھر اس کے موافق
نہ ہو۔ تو یہ وجہ نہیں ہوئی کہ صدیق اکبر کو ان کی رضا کی کچھ پرواہی نہ تھی۔ ورنہ اس کے

کیا چاہتے تھے۔ کہ دنیادار صاحب اختیار ہو کر حضرت فاطمہ کی ناخوشی سے کچھ دریغ نہ کرتے ہو؟ یا ان کا رنجیدہ ہو جانا۔ ان پر شاق ہو؟ بلکہ تہ دل سے ان کی رضا کے خواہاں تھے۔ پھر باایں ہمہ جو فدک نہ دیا۔ حالانکہ اپنے لئے بھی نہ رکھا تو بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ کسی حکم خداوندی کی پابندی اور تابعداری پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی ناچاری تھی اور مصلحتہائے دینی و دنیوی کی رعایت تھی۔

سو پابندی خداوندی کا تو یہ حال ہے کہ آیت یوصیکم اللہ اور آیت ما افاء اللہ خود اسی بات پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ معلوم ہو چکا اور اطاعت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی یہی ہے کہ خدا کی اطاعت کی جائے۔ سو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لانورث ماترکناہ صدقۃ فرمایا ہوا اور زیادہ اس کی تصدیق کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مصدق اور اس کے موافق روایتیں شیعوں کی معتبر کتابوں سے نقل بھی ہوئی ہیں۔ اور مصلحتوں کی یہ صورت ہے کہ اول تو احکام خدا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سراپا حکمت اور مصلحت ہی ہوتے ہیں۔ ماسوا اس کے اگر صدیق اکبر بپاس خاطر حضرت زہرا رضؓ فدک ان کے حوالہ کر دیتے۔ اور درصورت صحت روایات ہبہ فدک اس بات کی رعایت نہ کرتے کہ ہنوز دعویٰ ہے۔ کوئی دستاویز کامل نہیں، کیونکہ حضرت علی اور حضرت ام ایمن بلکہ ان کے ساتھ حسنین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بھی گواہی موافق قانون خداوندی قابل اعتبار نہیں۔

تو اول تو عام وخاص کے دل میں یہ بات تہ نشین ہو جاتی کہ خلیفہ سب مستغیثوں کو برابر نہیں سمجھتے۔ رو داروں کو بے ثبوت بھی کامیاب کر دیتا ہے۔ اور سوا ان کے اوروں سے قرار واقعی حجتیں طلب کرتا ہے۔ اور واقعی یہ بات شیوۂ انصاف سے بہت بعید ہے۔ معہذا باعث تنفر خلائق اور درہمی امور خلافت جو موجب انتظامی دین ہے۔ ہو جاتا۔ اور پھر یہ آگ ہرگز بجھائے نہ بجھتی، اور اگر بالفرض استحکام خلافت میں کچھ فرق نہ تھا۔ تو یہ وبال کس کی گردن پر رہتا، کہ قیامت تک حکام اسلام یہی شیوہ

برتتے۔ اور ان کے لئے یہ حجت اور دستاویز ہو جاتی، کہ خلیفہ راشد نے جب ایسا کیا۔ تو ہم بھی ایسا کریں گے، رو داروں کو منہ مانگے موتی دیں گے غیروں کی نہ سنیں گے۔

دوسرے اس صورت میں لازم آتا کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس حدیث کے مصداق ہو جائیں اَلْعَائِدُ فِیْ صَدَقَتِہٖ کَالْکَلْبِ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِہٖ یعنی کسی چیز کو کسی کو للہ دے کر پھر اس سے لوٹانے والا ایسا ہے۔ جیسا کتا قے کر کے پھر چاٹ لیوے،، اور وجہ اس کی یہ ہے، کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہوں لانورث ما ترکناہ صدقۃ تو جو جو چیزیں وقت وفات آپ کے ملک میں تھی۔ سب صدقہ ہو گئی، اور یہ بات باتفاق فریقین ثابت ہے۔ کہ ہبہ بے قبض موجب ملک نہیں ہوتا اور اب اس حدیث سے یہ ثابت ہوا۔ کہ تا دم وفات فدک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں رہا، تو اگر ہبہ بھی کیا۔ تب بھی قبضہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا نہ ہونے پایا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ وسلم ہی کا ہمیشہ قبضہ رہا، تو یہ ہبہ باتفاق فریقین موجب ملک سیدۃ النساء نہ ہوا بلکہ ہمیشہ دم وفات تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ملک میں رہا۔ تو بیشک یہ بھی صدقہ ہو گیا۔

سو درصورتیکہ دعوائے ہبہ کے قبول نہ ہونے کے بعد بزعم شیعہ دعوے میراث کیا ہو۔ تو جیسے ہبہ کی صورت میں صدیق لبغرض پاس خاطر سیدۃ النساء بوجہ مذکور نہ دے سکے۔ میراث کی صورت میں اس وجہ سے نہ دے سکے، کیونکہ وارث کی ملک نائب ملک مورث ہوتی ہے۔ جب یہ متحقق ہو تو وہ پہلے متحقق ہو۔ سو یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ جو چیز بقول لانورث ما ترکناہ صدقۃ حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صدقہ ہو چکی ہے۔ اور ملک سے نکل گئی تھی، پھر ملک نبوی میں آئے، ورنہ جو چیز خارج از ملک مورث ہو۔ اس میں میراث کا جاری ہونا محال ہی، سو ایسی حرکت لغو صدیق اکبر سے کب ہو سکتی تھی؟ جس سے ایسا حرف بیجا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف عائد ہو۔ معہذا لانورث، اور صدقۃ ہونا جب صحیح ہو

کہ قابل ملک وارث نہ رہے۔ پھر بھی اگر ملک وارث اس میں جاری ہو تو اجتماع نقیضین لازم لائے۔

علاوہ بریں لانورث ماترکناہ صدقۃ سے یوں ثابت ہوتا ہے کہ رضائے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم یہ ہے کہ وارثوں کو نہ دیا جائے۔ اور رضا حضرت زہرا اس طرف تھی۔ کہ ان کو دیا جائے، ناچار ہو کر صدیق اکبر نے رضائے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کو مقدم سمجھ کر اوّل تو ان کے فرمانے کے موافق عمل کیا اور پھر باینہمہ جس طرح سے بن پڑا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو بھی راضی کیا۔ چنانچہ اس حدیث میں مصرح ہے۔ سو یہ کمال انقیاد اور اطاعت صدیق اکبر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ باایں ہمہ رضائے سیدۃ النساء کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور نہ رضائے نبوی کو۔ درصورتیکہ موافق رضائے نبوی کرنا ان کی ناخوشی کا باعث ہوا ہو، تو عقلاً اور نقلاً ان کے ذمہ حضرت فاطمہ کا راضی کرنا لازم نہ تھا چنانچہ ظاہر ہے۔

تیسری مصلحت دنیوی اس میں یہ تھی۔ کہ اگر آپ حضرت فاطمہ زہراؓ کو کچھ بھی حوالہ کرتے، تو پھر حضرت عباس اور ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہم اجمعین جدا جدا ہر کوئی اپنی جاگیر کے گاؤں مانگتا۔ سو اول تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمانا لغو ہی جاتا۔ کیونکہ متروکہ نبوی اس قدر نہ تھا، جو اس بات کو وفا کرتے، کہ ہر کسی کو اس قدر دیجیئے۔ دوسرے پھر خلافت ہی کیا ہوئی کہ جو بیت المال کو اس طرح لٹا دیا، اور مستحق غیر مستحق کو نہ دیکھا، پانچواں فائدہ حدیث مجاج السالکین سے یہ ثابت ہوا۔ کہ گو حضرت فاطمہ زہراؓ ایک بار ناخوش ہو گئی تھیں، پر حضرت صدیق اکبر نے عذر معقول کیئے۔ اور اسی سبب حضرت فاطمہ زہرا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے راضی ہو گئیں اور خاتمہ بالخیر ہوا۔ اور اسی فائدہ کی غرض سے آج تک اس حدیث کو رکھ چھوڑا تھا۔ اظہر ہے کہ جب رنج مبدل بخوشی ہو جائے۔ تو پھر اس رنج کا زبان پر لانا اہل فہم کے نزدیک نازیبا ہے۔ خیر الحمد للہ کہ امامیوں ہی کی روایت سے حضرت سیدۃ النساء کا صدیق اکبر سے راضی ہو جانا ثابت ہو گیا۔ اور پھر روایت بھی کیسی؟ معتبر کتابوں کی۔ اور وہ

بھی ایک کتاب کی روایت نہیں۔ بلکہ سوائے مجاج السالکین کے اور کتابوں میں بھی مروی ہے۔

روایات اہل سنت میں سیدہ کی خوشنودی کا بیان موجود ہے

باقی رہیں روایات اہلسنت، سو مدارج النبوۃ اور کتاب الوفا بیہقی اور شرح مشکوۃ میں یہ بات موجود ہے۔ کہ حضرت فاطمہ زہراؓ کا ناخوش ہو جانا جو بظاہر کبیدگی ظاہر سے معلوم ہوتا تھا، ابوبکر صدیق پر شاق ہوا۔ حضرت فاطمہ کے در دولت پر حاضر ہوئے۔ اور حضرت علی سے سفارش کرائی، یہاں تک کہ حضرت زہرا ان سے خوشنود ہو گئیں۔ بلکہ شیخ عبدالحق نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے، کہ اس قضیہ کے بعد صدیق اکبر حضرت زہراؓ کے گھر گئے اور دھوپ میں دروازہ پر کھڑے رہے اور عذر معذرت کی۔ اور حضرت زہراؓ ان سے خوش ہو گئیں۔ اور ریاض النضرۃ میں یہ قصہ بتفصیل مذکور ہے اور فصل الخطاب میں میں بروایت بیہقی شعبی سے یہ قصہ مروی ہے۔

اور ابن سعان نے کتاب الموافقت میں اوزاعی سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ حضرت صدیق اکبر گرمی کے دن حضرت فاطمہ زہراؓ کے در دولت پر حاضر ہوئے، اور یہ عرض کی کہ میں یہاں سے کبھی نہ ٹلوں گا۔ جب تک کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی مجھ سے راضی نہ ہو جائیں۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ اندر تشریف لے گئے، اور حضرت فاطمہ زہرا کو قسم دی کہ تم راضی ہی ہو جاؤ۔ سو وہ راضی ہو گئیں۔ علیٰ ہذا القیاس شیعوں میں سے زیدیوں کی روایتیں بھی بعینہٖ اہل سنت کی روایات کے مطابق اور موافق ہیں۔

ان روایات کے ملاحظہ سے اہل انصاف کو تامل نہ رہے گا کہ صدیق اکبر کے دل میں عداوت خاندان نبوی ذرہ برابر نہ تھی۔ بلکہ ان کی محبت اور اعتقاد اور انکی تعظیم و تکریم میں ایسے فنا تھے کہ باوجود عروج خلافت اور شوکت سلطنت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے سامنے اپنے آپ کو مثل غلامان غلام اور کمترین خدام سمجھتے تھے۔ سو یہ بات بجز اس کے متصور نہیں کہ مرتبہ کمال صدق و صفا کو پہنچے ہوئے تھے، ورنہ اگر دنیا داری کی

ہوتی۔ تو ایسے امور ان سے ہرگز ظہور میں نہ آتے۔ ان کی بلا کو غرض پڑی تھی۔ کہ اس شان وشوکت پر اتنی منتیں سماجتیں کرتے؟ بلکہ خود سیدۃ النساء کا ان سے روٹھ جانا اس بات پر دلیل کامل ہے۔ کہ حضرت سیدۃ النساء کو صدیق اکبر پر کمال ہی بھروسہ تھا، ورنہ کس کے تصور میں آسکتا ہے کہ کوئی فقیر بادشاہان جبار کے سامنے ایسی باتیں کرے اور وہ بادشاہ ان کو ایسی ایسی منتوں سے منائے۔

جنازہ میں شرکت سے روکنے کا افسانہ اور بالبداہت اس سے یہ واضح ہوگیا کہ اگر بالفرض والتقدیر حضرت فاطمہ زہرا نے مرتے دم اس بات کی وصیت بھی کی ہو کہ میرے جنازہ پر ابوبکر صدیق نہ آنے پائیں تو بسبب کمال حیا اور پردہ داری کو یہ وصیت کی ہوگی۔ اور ابوبکر صدیق کو روکنے کی تخصیص اس وجہ سے ہو کہ ان کو حضرت زہرا ایسا سمجھتی تھیں کہ بہ خواہ مخواہ حاضر ہوں گے، کیونکہ ان کو جس قدر تعظیم وتکریم اہل بیت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پیش نہاد خاطر ہے اوروں کو نہیں مع ہذا ابوبکر ایک بارگی رنجش سے شرمائے ہوئے ہیں۔ اس کے تدارک کے لئے وہ کوئی موقع ایسا نہ چھوڑیں گے۔ جو اس میں غیر حاضری باعث اشتباہ اور موجب بدگمانی اہلبیت ہو، علاوہ بریں وہ خلیفہ وقت تھے۔ امامت نماز اور امامت جنازہ دونوں انہیں سے متعلق تھیں، اس لئے بالخصوص ان کا نام لے کر منع کیا ہو۔ غرض اگر تخصیص کہیں سے ثابت ہو بھی جائے تو اس کے یہ وجوہ ہیں

سیدہ کی وصیت میں عام ممانعت تھی تخصیص نہ تھی ورنہ علی العموم مردان نامحرم کے حاضر ہونے کی آپ روادار نہ تھیں، اس لئے یہ وصیت کی کہ مجھ کو شب کو دفن کر دینا۔ اور دلیل اس بات کی کہ بوجہ حیاء وپردہ داری علی العموم ممانعت تھی رصدیق اکبر ہی کی کچھ تخصیص نہ تھی) یہ ہے کہ بروایت صحیحہ یہ بات مروی ہے کہ حضرت سیدۃ النساء نے اپنے مرض موت میں فرمایا، کہ مجھے شرم آتی ہے۔ کہ بعد موت بے پردہ مردوں کے سامنے مجھکو لائیں۔ اور اس زمانہ کی عادت یہ تھی کہ عورتوں کو مثل مردوں کے بے پردہ یعنی بے گہوارہ دفنانے کو لے جایا کرتے تھے، اس پر اسماء بنت عمیس نے عرض کیا۔ کہ میں نے حبشہ میں دیکھا ہے کہ خرما کی شاخوں سے کجاوہ کی صورت کی نعش بناتے ہیں، حضرت زہرا نے ارشاد فرمایا کہ میرے سامنے بنا کر دکھلا

حضرت اسماء نے بنا کر دکھلایا۔ تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا بہت خوش ہوئیں اور تبسم کیا اور ہرگز بعد وفات سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم ان کو کبھی کسی نے تبسم کرتے نہ دیکھا تھا۔

اس وجہ سے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے حضرت اسماء کو وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد تو ہی مجھے غسل دیجو، اور حضرت علی رضؓ تیرے ساتھ رہیں کسی دوسرے کو نہ آنے دیجو، اب غور کیجئے کہ غسل کے وقت صدیق اکبر رضؓ کے آنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی، بلکہ کسی مرد کے آنے کی کوئی سبیل ہی نہیں۔ اس وقت جو اوروں کے آنے سے ممانعت ہوئی۔ تو یہ مطلب ہوا کہ عورتوں کو بھی نہ آنے دیجو۔ سو جسے عورتوں سے اس قدر شرم ہو، کہ بعد مردن ننگے بدن ان کے سامنے ہونے سے شرمائے۔ وہ مردوں کے جنازہ پر آنے سے کیونکر نہ شرمائے۔ سو اس لئے حضرت علی نے ان کو رات ہی کو دفن کر دیا۔ اور کسی کو اطلاع نہ کی۔

القصہ بوجہ تستر وبباعث حیا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اس بات کی روادار نہ ہوئیں کہ میرے جنازہ پر کوئی مرد حاضر ہو، ورنہ حضرت ابوبکر کی کوئی تخصیص نہ تھی، اور ہرگز کسی روایت میں اہل سنت کی روایات میں سے یہ بات نہیں، کہ بالخصوص حضرت صدیق اکبر کے نام سے ممانعت ہوئی ہو۔ علی العموم ممانعت ہوئی تھی۔ یہ شیعوں کی شرارت ہے۔ کہ ممانعت ان کے نام لگا دی۔ اور پھر دلاوری یہ کہ عوام اہلسنت کے سامنے ان کی کتابوں کا حوالہ بتا دیتے ہیں، اس پر مولوی عمار علی صاحب نے تو یہ طوفان جوڑے، کہ شرم کی آنکھیں پھوڑ کر صحیح مسلم کا نام لے دیا۔ کہ اس میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے وقت وفات یہ وصیت کی تھی۔ کہ ابوبکر اور عمر میرے جنازہ پر نہ آئیں۔ خدا جانے یہ بے حیائی کہاں سے اڑائی ہے، یا ایجاد فقیر ہے۔ کہ اصلاً ومطلقاً جھوٹ بولنے سے شرم نہیں آتی۔ صحیح مسلم کوئی نایاب کتاب نہیں۔ ہزاروں نسخے اس کے موجود ہیں حذف کرنے کی گنجائش نہیں۔ اگر یہ روایت ہو تو کوئی کہیں سے نکالدے۔ فقط اس میں اتنی بات ہے۔

دو کہ جب حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی۔ تو حضرت علی نے ان کو شب ہی کو دفن کر دیا۔ اور صدیق اکبر کو اطلاع نہ کی۔ اور نماز پڑھی ان پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے۔

چنانچہ تسکین خاطر ناظرین کے لئے عبارت روایت صحیح مسلم منقول ہے۔ اس کا ترجمہ بلاکم وکاست یہی ہے۔ جو میں نے عرض کیا، وہ عبارت یہ ہے۔

فَلَمَّا تُوُفِّيَتْ دَفَنَهَا زَوْجُهَا عَلِيُّ ابْنُ اَبِيْ طَالِبٍ لَيْلًا وَلَمْ يُؤْذِنْ بِهَا اَبَابَكْرٍ وَصَلّٰى عَلَيْهَا عَلِيٌّ

اور اس عبارت سے آگے نہ پیچھے کہیں وصیت کا ذکر نہیں، خدا جانے مولوی صاحب نے اس عبارت میں سے یہ معنے کہ حضرت زہرا نے صدیق اکبر اور حضرت عمر کے نہ آنے دینے کی وصیت کی تھی کون سی لغت اور کونسی زبان اور کون سے محاورہ کے موافق نکال لئے ہیں۔ سبحان اللہ علماء شیعہ کی یہ امانت و دیانت اور صدق گفتار ہے کہ دیدہ و دانستہ ایسے جھوٹ بولتے ہیں، غرض صحیح مسلم میں تو فقط اتنی بات ہے کہ حضرت علی نے حضرت سیدۃ النسا، کو شب کو دفن کر دیا، اور صدیق اکبر کو اطلاع نہ کی، اور اپنے آپ نماز جنازہ پڑھی۔ اور یوں بھی ایک قول ہے۔ کہ حضرت عباس نے چند اہل بیت کے ساتھ نماز پڑھ کے رات ہی کو دفن کر دیا، مگر بہر حال صحیح مسلم میں وصیت کا ذکر معلوم نہیں ہوتا۔

اور اگر بالفرض کسی روایت میں اس باب میں کوئی وصیت بھی ہو تو اس بات کی وصیت ہو گی کہ مردوں میں سے میرے جنازہ پر کوئی نہ آئے، چنانچہ بعض روایات میں آیا ہے کہ دوسرے دن جو حضرت صدیق اور حضرت عمر اور سوا ان کے اور اصحاب رضی اللہ عنہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر تعزیت کے لئے حاضر ہوئے تو شکایت کی کہ ہمیں آپ نے خبر نہ کی، ہمیں بھی شرف نماز اور شرف حضور میسر آجاتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی تھی کہ جب میں دنیا سے اٹھوں تو مجھے رات ہی کو دفن کر دینا تاکہ میرے جنازہ پر کسی نامحرم کی نگاہ نہ پڑے۔ سو میں نے ان کی وصیت کے موافق عمل کیا ہے۔ غرض اس روایت سے اور یہی روایت مشہور ہے۔

علی العموم نامحرموں کے آنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ حضرت صدیق اکبر یا حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی تخصیص کا اشارہ بھی نہیں۔

مگر شیعوں کی بدگمانی کا یہ حال ہے۔ کہ اہل بیت کی تمام حرکات سکنات گو مطابق میٹھیں یا نہ بیٹھیں، صدیق اکبر کی عداوت پر محمول کرتے ہیں اور عقل و نقل کا کچھ لحاظ نہیں کرتے، ان کی وہی مثل ہے۔ جیسے مشہور ہے سنا ہوگا۔

شعر[1]

سگے راچوں کلوخے بر سر آید ——— ز شادی بر جہد کیں استخوان است

وگر نعشی دو کس بر دوش دارند ——— لئیم الطبع پندارد کہ خوان است

القصہ ابوبکر صدیق کی ممانعت کی یا حضرت عمر کی ممانعت کی، کہیں تخصیص و تصریح نہیں۔

| سیدہ کا جنازہ صدیق ہی نے پڑھایا |

بلکہ فصل الخطاب کی روایت سے تو یوں ثابت ہوتا ہے کہ دگرگوں ہے۔ اس لئے کہ اس میں یوں مذکور ہے کہ ابوبکر صدیق اور حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رض عشا کی نماز کے وقت حاضر ہوئے، اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی رحلت مغرب عشا کے بیچ منگل کے دن رمضان شریف کی تیسری تاریخ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے واقعہ سے چھ مہینہ بعد ہوئی تھی اور آپ کی عمر شریف اٹھائیس برس کی تھی، ابوبکر صدیق رض بموجب فرمان حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیش امام ہوئے، چار تکبیروں کے ساتھ نماز پڑھائی، اس روایت سے تو قدر شناسا علی رضی اللہ عنہ کو بھی متحقق ہوتا ہے کہ حضرت سیدۃ النساء نے ہرگز صدیق اکبر کے نہ آنے دینے وصیت نہ کی تھی۔ کیونکہ جب حضرت امام حسین یہ عزم رکھتے ہوں کہ سعید بن العاص کو (حالانکہ وہ کچھ مودب نہ تھا) امام نہ ہونے دیں، تو حضرت علی تو حضرت علی ہیں۔

ادھر صدیق اکبر کا یہ ادب کہ تھوڑے ہی دنوں پہلے کیا کیا تاک رگڑ چکے تھے

[1] کتے کے سر پر جب پتھر آکر لگتا ہے ——— تو اس کو ہڈی سمجھ کر خوشی سے اچھلتا ہے

اور اگر دو شخصوں کو نعش اٹھائے ہوئے جاتے دیکھے ——— تو یہ بد طینت اسکو دستر خوان سمجھتا ہے

سو اگر حضرت فاطمہ وصیت کرتیں تو اول تو صدیق اکبر کو دھکے دلوا دیتے، ورنہ نماز
کا تو کیا ذکر؟ کیونکہ اپنی شجاعت اور صدیق اکبر کے ادب کے باعث کوئی وجہ تقیہ کی بھی
نہ تھی۔ القصہ صدیق اکبر کی ممانعت کی کوئی روایت نہیں، ہاں ایسی روائتیں ہیں جن
سے عموم ممانعت ثابت ہے، اور اگر بالفرض تخصیص کر کے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا نام
بھی ہو تو حضرت ابوبکر کے منع کی وجوہ تو مذکور ہولیں، باقی رہے حضرت عمر سو اول وجہ
میں تو وہ صدیق اکبر کے شریک ہی ہیں۔ اور علی ہذا القیاس دوسری وجہ میں بھی۔ کیونکہ
یہ صدیق اکبر کے سامنے بمنزلہ وزیر مشیر تھے۔ سو صدیق اکبر کے سب کام انہیں کے مشورہ
سے ہوتے تھے، سو اگر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو (بوجہ نہ دینے فدک کے) کچھ صدیق
اکبر سے رنج تھا، اور اس سبب سے وہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے شرمائے ہوئے ہیں، تو حضرت عمر
سے پہلے تھا، اور یہ ان سے پہلے شرمائے ہوئے تھے۔

باقی رہی تیسری وجہ اس میں بھی حضرت عمر صدیق اکبر کے ایک وجہ سے شریک
ہیں، کیونکہ حضرت عمر اور حضرت صدیق اکبر بمنزلہ لازم وملزوم ہیں۔ یہ ممکن نہ تھا کہ صدیق
اکبر بلائے جائیں، اور حضرت عمر کو خبر نہ ہو۔ سو اگر بالفرض والتقدیر کسی روایت میں (اہلسنت
کی) ممانعت تخصیص نام ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی نکل آئے۔ تو ان کے وجوہ یہ ہیں جو میں
نے عرض کئے۔ عداوت اور بغض صدیق اکبرؓ یا حضرت عمر نہ تھا۔ اور دلیل عقلی اس بات
کی (کہ حضرت صدیق اکبر کا حضرت زہرہ رضی اللہ عنہا کے جنازہ پر نہ بلانا۔ بوجہ حیا و سیدۃ النساء
اور باعث پردہ داری حضرت زہرا رضی اللہ عنہا تھا، نہ بوجہ کدورت اور ناخوشی)
یہ ہے کہ اگر بوجہ کدورت اور ناخوشی ہوتا تو اس وجہ سے ہوتا کہ مبادا صدیق اکبرؓ ان کے
جنازہ کی نماز نہ پڑھائیں۔ کیونکہ وہ خلیفہ تھے۔ امامت نماز پنجگانہ اور امامت نماز
جنازہ انہی سے متعلق تھا۔ سو یہ بات کسی وجہ سے درست نہیں ہوسکتی۔

اس لئے کہ باجماع مورخین طرفین شیعہ سنی جب حضرت امام حسن
رضی اللہ عنہ کا جنازہ باہر لائے۔ امام حسینؓ نے سعید بن العاص کو جو امیر معاویہ کی طرف
سے مدینہ کا امیر تھا۔ نماز پڑھانے کے لئے اشارہ کیا۔ اور یہ فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلے اللہ

علیہ وسلم کی سنت یوں نہ ہوتی، کہ امام جنازہ امیر ہوا کرے۔ تو تجھے ہرگز آگے نہ بڑھاتا
سو معلوم ہوا کہ حضرت سیدۃ النساء نے حضرت ابوبکر کی نماز پڑھانے کے اندیشہ سے
یہ وصیت نہ فرمائی تھی۔ ورنہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کس طرح حضرت زہرا
رضی اللہ عنہا کے خلاف کرتے، اور ظاہر ہے کہ سعید بن العاص ہزاروں مرتبہ ابوبکر رضی اللہ
عنہ سے کمتر تھے۔ خاص کر لیاقت نماز میں۔

کیونکہ کوئی چھ ہی مہینہ گذرے تھے۔ جو سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت
ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امام نماز تمام مہاجرین وانصار کا کیا تھا۔ اور اس باب میں کمال ہی تاکید
فرمائی تھی۔ پھر کیونکر احتمال ہو کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اس تھوڑی سی مدت میں یہ
تمام واقعات بھول گئی ہوں، الحاصل دلائل نقلیہ و عقلیہ دونوں اس بات پر شاہد
ہیں کہ شیعوں کا یہ وہم کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صدیق اکبر کو جنازہ پر آنے دینے
کی روادار نہ تھیں، عقل کے نہ ہونے کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ اور ان وجوہ کو بھی جانے
دو، ہمیں فقط روایت مجاج السالکین جو ابھی مرقوم ہوئی ہے کافی ہے۔ کیونکہ حضرت
فاطمہ زہرا سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا اگر صدیق اکبرؓ کے (بالخصوص) جنازہ پر آنے کی روادار
نہ ہوتیں، تو بوجہ رنج روادار نہ ہوتیں۔ سو اس روایت سے یہ بات عیاں ہے کہ حضرت
زہرا رضی اللہ عنہا کے دل مبارک میں اگر بالفرض رنج تھا بھی تو وہ زائل ہوگیا تھا، اور
دونوں باہم راضی خوشی ہوگئے تھے۔

مگر کوئی شیعہ منافق پیشہ حضرت سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کو بھی نعوذ باللہ
منافق سمجھے، اور یوں کہے کہ یہ راضی ہوجانا فقط ظاہرداری کے لئے ہوگا۔ تو یہ بات علاحدہ
ہے، پر یہ بات شیعوں ہی کے سمجھنے کی ہے، کیونکہ المرء یقیس علی نفسہ جیسے وہ خود ہیں ایسے
ہی بزرگان دین کو سمجھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے۔

کار پاکان را قیاس از خود مگیر ٭ گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

اور بایں ہمہ پھر کیا ہوتا ہے۔ شیعوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔
یہ ممکن نہیں۔

خدا و رسول راضی ہیں تو سیدہ کی ناراضی سے کچھ نقصان نہیں

اگر بالفرض والتقدیر بزعم شیعہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صدیق اکبر سے اس جہان سے ناخوش ہی گئی ہوں۔ تو درصورتیکہ خدا و رسول خوش ہوں۔ کچھ نقصان نہیں، اور جو کچھ نقصان تھا بھی، تو اس کی تدبیر اور اس کا بندوبست خود خداوند کریم نے لکھوکھا برس پہلے کر دیا۔ سورہ حجر میں فرماتے ہیں۔ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِيْنَ ۝ اس آیت میں متقیوں کے جنت میں داخل ہونے کی کیفیت بیان فرماتے ہیں مطلب یہ ہے "اور نکال ڈالی ہم نے جو کچھ ان کے دلوں میں خفگیاں تھیں، وہ بھائی ہو گئے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے" اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ متقیوں اور پرہیزگاروں میں آپس میں رنج بھی ہو جایا کرتے ہیں، اور وہ رنج انکو کچھ مضر نہیں ہوتے۔ بعنایت خداوندی جنت میں جانے کے حارج نہیں ہوتے، بلکہ جنتی ہونے کی وجہ سے وہ رنج خود ہی زائل ہو جاتے ہیں۔

سو اگر بالفرض بزعم شیعہ حضرت فاطمہؓ حضرت صدیق اکبر سے رنجیدہ ہی اس جہان سے گئیں ہوں، تب اس آیت بشارت آمیز نے صدیق اکبر اور ان کے ہوا خواہوں کی تسلی کر دی۔ اور شیعوں کی آنکھوں میں خاک ڈال دی، مگر شاید کوئی شیعی چپڑ پڑیوں میں سے تکرار کرے۔ کہ ہر چند اس آیت میں یہ بشارت ہے۔ جو مذکور ہے، لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اوروں ہی کے لئے یہ بشارت ہے جن سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ناخوش ہوں۔ ان کے لئے اس بشارت میں حصہ نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کی شان میں یوں ارشاد فرمایا ہے۔ اور یہ حدیث متفق علیہ طرفین ہے۔ اَلَا اِنَّ فَاطِمَةَ بَضْعَةٌ مِّنِّيْ يُؤْذِيْنِيْ مَا اٰذَاهَا وَيُرِيْبُنِيْ مَا رَابَهَا فَمَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِيْ یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے "کہ یاد رہے یہ بات کہ فاطمہ میرے بدن کا ٹکڑا ہے۔ جس سے اسے تکلیف ہو۔ اس سے مجھے بھی تکلیف ہو جس بات سے وہ گھبرائے۔ اس سے میں بھی گھبراتا ہوں۔ سو جو شخص اسے غصہ کرے گا۔ وہ مجھے غصہ کرے گا۔ فقط" اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ

وسلم کے غصہ کرنے والا کون ہوتا ہے۔

بضعۃ منی سے اشکال اور اس کے جوابات

سو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس حدیث میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پہلے ہی رعایت کر گئے ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے فَمَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِيْ جس کے یہ معنی ہیں کہ جو اسے غصہ کریگا۔ وہ مجھکو غصہ کرے گا، اور یوں نہیں فرمایا مَنْ غَضِبَتْ عَلَيْهِ غَضِبْتُ عَلَيْهِ یعنی جس پر وہ غصہ ہوں گی اس پر میں بھی غصہ ہوں گا، ظاہر ہے کہ کسی کو غصہ کر دینے کی یہ صورت ہے کہ دیدہ و دانستہ کسی بات یا کلام سے کوئی شخص اسے غصہ دلانے کا ارادہ کرے، سو کمال نادانی کی بات ہے کہ کوئی شخص صدیق اکبر کی طرف یہ بات منسوب کرے کہ انہوں نے بالقصد حضرت فاطمہ کو غصہ دلایا تھا، جو جانتے تھے، وہ تو جانتے ہی تھے۔ پر وہ جو نہ جانتے تھے، اب تو ان پر بھی واضح ہو گیا کہ صدیق اکبرؓ اس قصہ میں معذور تھے، اور با ایں ہمہ پھر عذر معذرت کیا کیا کچھ نہ کیا۔

روایات کو ٹٹولئے تو معلوم ہو جائے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مکرر یوں عرض کیا کہ وَاللّٰهِ يَا ابْنَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِنَّ قَرَابَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ اِلَيَّ اَنْ اَصِلَ مِنْ قَرَابَتِيْ۔ یعنی اللہ کی قسم اے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قرابت کے ساتھ صلہ کرنا، اور ان کی خدمت کرنا بہت ہی زیادہ محبوب ہے میرے نزدیک اپنے قرابتیوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے سے" اور جب ان کی طرف سے اغضاب ہی نہ ہوا یعنی انہوں نے بالقصد ان کو غصہ نہ دلایا۔ بلکہ حتی المقدور اس کا بچاؤ ہی کیا ہو، تو وہ پھر کس طرح اس وعید میں داخل ہوں گے اگر بالفرض کچھ ہوا بھی ہو تو اتنا ہوا ہو کہ حضرت فاطمہ بمقتضائے بشریت غصہ ہو گئی ہوں اس کو اگر ہم مان لیں۔ اور ان توجیہات کا جو مذکور ہو لیں۔ کچھ خیال نہ کریں، تو مثل بریں نیست کہ موافق وعدہ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ قیامت کو سینہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے وہ رنج نکالا جائے۔ اور دونوں میں سے کسی کو وہ آپس کی شکر رنجی مضر نہ ہو۔

بضعۃ منی کا شان ورود اور حضرت علی کا سیدہ کو بارہا غضبناک کرنا

اور اگر قطع نظر غصہ کرنے سے حضرت

فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا خود بخود غصہ ہو جانا بھی اس وعید میں داخل کر دیں تو شیعوں کو ہم سے زیادہ مشکل پڑے گی کیونکہ ابوبکر صدیق تو معصوم نہیں۔ اگر ان سے کوئی حرکت بیجا ہو جائے اور اس سبب سے کسی وعید میں شامل ہو جائیں۔ تو کچھ بعید نہیں، پر حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ تو شیعوں کے نزدیک معصوم تھے، ان سے جو بارہا مقدمات خانگی میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو رنج ہو گیا ہے۔ تو اس کا کیا سبب؟ بلکہ اس فرمانے کا الا ان فاطمہ بضعۃ منی یوذینی الخ سبب یہی ہوا تھا کہ حضرت زہراؓ اور اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں اس وجہ سے فی الجملہ ناچاقی ہو گئی تھی کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کا پیام بھیجا تھا، اس میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا روتی ہوئیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس تقریب سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بطور خطبہ یہ ارشاد فرمایا الا ان فاطمۃ بضعۃ الخ۔ سو اگر فقط حضرت فاطمہ زہرا کے غصہ ہو جانے کے باعث صدیق اکبر وعید مذکور میں داخل ہو جائیں، تو حضرت امیر پہلے داخل ہوں گے۔ کیونکہ اول تو خطبہ انہیں کے سمجھانے سنانے کو فرمایا تھا، دوسرے حضرت صدیق اکبر تو بوجہ ارشادات خداوندی اور ارشاد پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم فدک کے نہ دینے میں معذور تھے۔ اور پھر باینہمہ باشارہ حدیث مجاج یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر حکم خداوندی نہ ہوتا، تب بھی ان کے تہ دل میں یہی تمنا تھی، کہ فدک حضرت فاطمہؓ ہی کے پاس رہے لیکن حضرت علی نے جو ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کا ارادہ کیا تو انکو کیا دشواری تھی؟ اور پھر یہ ہی نہیں کہ تہ دل سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی کے موافق ہوں۔

علی ہذا القیاس ایک بار حضرت امیر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے رنجیدہ ہو کر گھر سے باہر تشریف لے آئے اور مسجد میں زمین ہی پر بدون تکیہ بچھونے کے سو گئے۔ جب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو اس قصہ کی خبر ہوئی، آپ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور پوچھا کہ تیرے چچا کا بیٹا یعنی علی مرتضےٰ کہاں ہیں؟ عرب میں ایسے موقع میں اکثر ایک دوسرے کو چچا کا بیٹا بولتے ہیں، خیر حضرت زہرا نے عرض کیا کہ مجھ سے

لڑ کے نکل گئے اور دوپہر کو بھی یہاں نہیں سوئے، اور یہ دونوں روایتیں کچھ سنیوں ہی کی کتابوں میں نہیں شیعوں کی کتابوں میں بھی موجود ہیں

پیغام نکاح کوئی گناہ نہ تھا مگر سیدہ کو بشریت کی وجہ سے غصہ آیا۔

باقی روایت اول سے سوائے مطلب پیش آمدہ کے ایک اور بات بھی نکلتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہ آخر بشر تھیں بمقتضائے بشریت غصہ آجاتا تھا۔ ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کا ارادہ کیا۔ تو انہوں نے موافق حکم خدا اور سول صلے اللہ علیہ وسلم کوئی گناہ یا کسی گناہ کا ارادہ نہ کیا تھا۔ پھر اب غصہ کی وجہ بجز مقتضائے بشریت اور کچھ نہیں۔ بلکہ دونوں روایتوں سے اتنی بات نکلتی ہے کہ معصوم کو بمقتضائے بشریت غصہ آجانا محال نہیں بلکہ بسا اوقات پیش آجاتا ہے۔ کیونکہ حضرت علی اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہما دونوں ہی معصوم تھے، پھر جو آپس میں رنج ہو جاتا تھا، تو قصور وار کسی کو بھی نہیں کہہ سکتے۔ بجز اس کے کہ بمقتضائے بشریت ایک کو دوسرے کی نسبت کچھ خیال فاسد دل میں آجائے۔ اور اس سبب سے بے اختیار غصہ چڑھ جائے، اور اس غصہ میں دوسرے کی معصومیت کا بھی لحاظ نہ رہے۔ اور کوئی صورت نہیں۔ سو اسے ہی ہم بمقتضائے بشریت کہتے ہیں۔

اسی طرح اگر حضرت فاطمہ کو صدیق اکبر پر بھی بمقتضائے بشریت غصہ آجائے اور ان کا کچھ قصور نہ ہو تو کیا دشواری ہے؟ اور کیوں انکار ہے۔ القصہ فقط بمقتضائے بشریت حضرت فاطمہ کے غصہ ہو جانے سے، بے اس کے کہ کوئی دیدہ و دانستہ بے وجہ ان کو غصہ دلا دے، آدمی وعید مذکور میں داخل نہیں ہو سکتا، علاوہ بریں سب جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بشریت کی وجہ سے حضرت ہارون پر جو ان کے بڑے بھائی تھے اور نبی مقرب تھے اغصہ ہوئے یہاں تک کہ سر اور ڈاڑھی کے بال پکڑ کر کھینچنے کی نوبت آئی اور یہ سب کو یقین ہے کہ حضرت ہارون علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام نے کچھ حضرت موسےٰ علیہ السلام کے غصہ کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ نبی کا بالقصد غصہ دلانا کفر ہے مگر تاہم حضرت موسےٰ علیہ السلام کے غصہ ہونے میں کچھ شک نہیں، پس اگر اتنے غصہ ہو جانے

کو یوں کہئے کہ یہ بھی اغضاب ہے یعنی انہیں کی طرف سے ہے تو نعوذ باللہ حضرت پاداں کو یوں کہنا پڑے کہ اس وقت کافر تھے

اس سے انصافاً معلوم ہو گیا کہ فقط بمقتضائے بشریت کوئی شخص کسی پر غصہ ہو جائے۔ تو اسے اغضاب نہیں کہتے، اور یہی قضیہ بعینہ حضرت صدیق اکبر اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا ہے کہ صدیق اکبر کی طرف سے اغضاب نہیں۔ فقط حضرت فاطمہ کی طرف سے اگر تھا تو غضب تھا۔ ہاں ہم کہتے ہوئے ڈرتے ہیں اغضاب ہوا ہے، تو بظاہر حضرت علی سے ہوا ہو گا کیونکہ وہ خاوند تھے ان کو اتنا ادب نہ ہو گا۔ جتنا ابوبکر صدیق کو ہو گا۔ علاوہ بریں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حضرت علی کو بوجہ معلوم سنا کر خطبہ کا پڑھنا جس میں لفظ اَغْضَبَهَا اس بات پر گونہ دلالت کرتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اغضاب پیش آیا ہو اور جب صدیق اکبر کی طرف سے اغضاب ہی نہیں۔ تو پھر ان کو وعید فمن اغضبها اغضبنی میں داخل سمجھنا اپنے آپ اس میں داخل ہونا ہے۔

کیونکہ عقیدہ باطل سے حضرت فاطمہ اور خود بدولت جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم بھی بیشک ناخوش اور رغصہ ہوتے ہیں تو اس صورت میں رسول اللہ صلے اللہ وسلم کو دو وجہ سے رنج اور غصہ ہو گا، ایک اپنے آپ ؟ دوسرا حضرت فاطمہ کے سبب سے، اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ یہ اغضاب ہے، فقط بمقتضائے بشریت ہی نہیں۔ اس سبب سے بالیقین معلوم ہوتا ہے کہ بدگویان صدیق اکبر بایں طور کہ وہ وعید فمن اغضبها میں داخل ہیں، آپ اس وعید میں داخل ہوتے ہیں، سو جو لوگ بدگویان مذکور میں سے اس دار دنیا سے چل دیئے، وہ تو چل دیئے، پر مولوی عمار علی صاحب وغیرہ باقیان شیعہ تو اپنا فکر کریں۔ اور اس عقیدہ بد سے باز آ کر توبہ استغفار سے تدارک مافات کریں آئندہ نہ مانیں تو وہ جانیں۔

ما نصیحت بجائے خود کردیم ⁂ روزگارے درین بسر بردیم
در نیاید بگوش اندر کس ⁂ بر رسولاں بلاغ باشد و بس

اب لازم یوں ہے کہ بس کیجئے کیونکہ کوئی بات مولوی صاحب کی خرافات میں

سے باقی نہیں رہی جس کا جواب شافی بفضلہ تعالےٰ اس رسالہ میں درج نہیں ہوا اس لئے ان کلمات طیبات پر ختم کرتا ہوں۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ وازواجہ واہل بیتہ وذریتہ اجمعین۔ والمرجو منک یا ارحم الراحمین ان تتقبل ہذہ الرسالۃ منی وتجعلہ وسیلۃ لی الی رضائک ورضاء رسولک صلی اللہ علیہ وسلم ورضاء اہل بیتہ ورضاء صاحبہ فی الغار سیدنا ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ ومن سواہ من اصحابہ صلی اللہ علیہ وسلم رضوان اللہ علیہم اجمعین وان تغفرلی وترحمنی بہذہ الاوراق فی الدنیا والآخرۃ مغفرۃ ورحمۃ تحیط بہا والدی وآبائی الماضیین وذریتی واقاربی واحبابی خصوصاً من امرنی بالقیام لہذا الامر العظیم برحمتک یا ارحم الراحمین

خلاصہ جواب طعن فدک

جو صاحب مذہب تشیع کی حمایت کریں اور بوجہ ہبہ فدک یا میراث فدک اول الخلفاء کی شکایت کریں۔ تو ان کو درصورت دعوے ہبہ یہی تین مقدموں کا اثبات لازم ہے۔ اور درصورت ادعائے میراث بھی تین باتوں کی تحقیق واجب، ہبہ کی صورت میں تو اول مملوک نبوی ہونا فدک کا، دوسرے وقوع ہبہ۔ تیسرے۔۔۔ حصول قبض، علے ہذا القیاس درصورت میراث اول مملوک نبوی ہونا فدک کا۔ دوسرے زوال حیات سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم اور انقطاع تعلق روح پر فتوح حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، جو جسم اطہر سے حاصل تھا۔ تیسرے عموم خطاب یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین یہاں تک کہ حضرت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم بھی داخل زمرہ مخاطبین ہوں، اور یہ خطاب مثل دیگر اشخاص مومنین امت آپکو بھی شامل ہو لیکن واقفان فن مناظرہ اور دانشوران فنون دانشمندی پر واضح ہو گا کہ اہل سنت کو جو اس مقدمہ میں مدعا علیہ ہیں قبل استماع دلیل دعوے فقط لانسلم اعنی محض انکار اور عدم تسلیم ہی کافی ہے۔ دونوں دعوؤں کے تینوں مقدموں میں سے

اگر ایک مقدمہ کو بھی تسلیم نہ کریں، تو نہ خود مورد طعن ہو سکیں، اور نہ طعن مذکور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر واقع ہو سکے۔ چہ جائیکہ تینوں مقدموں کو نہ مانیں؟ اور اگر مقدمات ثلثہ مذکورہ کو بدلائل واضحہ باطل کردیں، یا ان کے نقائض کو بدلائل قوی ثابت کردیں، تو پھر تو میدان ان سے کون لے سکتا ہے؟

ناظران ہدیۃ الشیعہ پر مخفی نہ رہے گا۔ کہ ہبہ کے تین مقدموں میں سے آخر کے دو مقدمے تاہنوز اہل تشیع سے ثابت نہ ہوئے، بلکہ موافق اصول اہلسنت ان کی نقیض ثابت ہے، اور میراث کے دعوے کے لئے جو تین مقدمے موقوف علیہ ہیں ان میں سے دوسرے مقدمہ کا ابطال اگرچہ بظاہر دشوار ہے، پر اس ہیچمدان نے اس باب خاص میں ایک رسالہ مسمی بآب حیات لکھا ہے۔ جس کی ضخامت پانچ چھ جز سے کم نہ ہوگی، اور انشاء اللہ اگر منشی محمد حیات صاحب کی عنایت ہے، تو وہ بھی قریب ہی مطبوع ہو کر مطبوع طبائع ہوتا ہے۔ اس کے دیکھنے کے بعد امید خدا سے یوں ہے کہ شیعوں میں سے بھی جو صاحب انصاف پرست ہوں۔ حق بول اٹھیں، ورنہ اہل حق یعنی اہل سنت کا تو کام یہی ہے کہ حق کو حق مانیں۔ اور باطل کو باطل جانیں۔

رہا اول مقدمہ ہبہ اور میراث کا، اور تیسرا مقدمہ میراث کا، ان کا ابطال اور ان کی نقیضوں کا اثبات رسالہ ہدیۃ الشیعہ میں بتفصیل تمام مرقوم ہے، خصوصًا مقدمہ اولی ہبہ و میراث کا بطلان تو ایسا واضح ہے کہ بجز تیرہ درون کورباطن اسمیں اور کوئی متامل نہ ہوگا، یہی وجہ ہوئی کہ ۱۲ میں جو مرکز دائرہ تشیع نصیر الدین طوسی ثانی نور اللہ شوستری مکانی مفتی محمد قلی کے قرۃ العین مولوی حامد حسین جو اثنا سفر لدھیانہ وارد میرٹھ ہوئے اور میر مہدی علی فرزند ارجمند عمر دراز علی خان کے مکان پر تشریف لائے، اور یہ پریشان روزگار جو بوجہ پابندی علاقہ مطبع مجتبائی وہاں ان دنوں شب و روز گذارتا تھا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کچھ اس قسم کا مذکور آیا، تو مولوی صاحب موصوف کو کچھ جواب نہ آیا۔ واللہ لا یھدی القوم الظلمین۔ فقط

تمت

ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء

تالیف

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

مع ترجمہ

مولانا اشتیاق احمد۔ مولانا محمد عبدالشکور فاروقی لکھنویؒ

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کتاب کے مقدمہ میں فرمایا ہے، کہ اس زمانہ میں بدعتِ تشیع آشکار ہو گئی ہے اور عام لوگوں کے دل اُن کے (پیدا کردہ) شبہات سے متاثر ہو گئے ہیں اور اس ملک کے اکثر لوگ خلفاء راشدینؓ کی خلافت کے ثبوت میں شک کرنے لگے ہیں۔ (حالانکہ) ان بزرگوں کی خلافت اصولِ دین میں سے ایک اصل ہے۔ جب تک لوگ اس اصل کو مضبوط نہ پکڑیں گے کوئی مسئلہ مسائلِ شریعت سے مضبوط نہ ہوگا۔ جو شخص اس اصل کے توڑنے کی کوشش کرتا ہے وہ فی الحقیقت تمام فنونِ دینیہ کو مٹانا چاہتا ہے۔

اس کتاب میں مقامِ خلافت خلفائے راشدینؓ کے فضائل و مناقب، تفضیل حضرات شیخینؓ، صحابہ کرامؓ کے مراتب خلفاءِ راشدینؓ کے کارنامے نیز امورِ خلافت سے متعلق تمام اہم اور معرکۃ الآراء مسائل پر مدلل بحث ہے

یہ کتاب حضرات خلفائے راشدینؓ کی بہترین سیرت اور بہترین تاریخ ہونے کے علاوہ بہت سے دینی علوم و معارف کا خزانہ ہے۔ اور اپنے موضوع میں بے نظیر ہے۔

ادارہ نے اس کتاب کے شایان شان معیاری کتابت و طباعت کا اہتمام کیا ہے۔ ایک کالم میں اصل متن فارسی اور اس کے مقابل اردو ترجمہ درج ہے۔

۴ حصوں میں۔ قیمت مکمل سیٹ ۔ ۱۶۰ روپے

ملنے کا پتہ: **نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور**

مکتبہ نعمانیہ، اردو بازار گوجرانوالہ

آفتابِ ہدایت

رد

رفض و بدعت

مؤلفہ

شیرِ اسلام رئیس المناظرین ابوالفضل

مولانا محمد کرم الدین صاحب دبیر

آٹھویں بار چھپ کر منظرِ عام پر آگئی

ردِّ شیعت میں لاجواب کتاب

رنگین ٹائیٹل۔ کاغذ سفید۔ صفحات ۳۸۴۔

قیمت اٹھارہ روپے ۔/۱۸

ملنے کا پتہ: **نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور**

مکتبہ نعمانیہ، اردو بازار گوجرانوالہ

نے فدک کو ان کے نام لکھ کر فدک کو ان کے حوالہ کر دیا۔

یہ روایت ہر چند، چند بار گذر چکی ہے۔ لیکن بحکم نقل مشہور ہُوَ الْمِسْكُ مَا كَرَّرْتَهُ يَتَضَوَّعُ یعنی مشک کو جتنا گھسو، یا جتنی بار لگا ؤ زیادہ ہی زیادہ خوشبو دے گا، بار بار اس روایت کے نقل کرنے کو جی چاہتا ہے، یہ بھی ایک حضرت فاطمہ زہرا سیدۃ النساء کی کرامت ہے کہ حق نے تہمت رنج ناحق سے شیعوں ہی کے منہ سے ان کو بری کر دیا ادھر صدیق اکبر کی نیک نیتی کو ماننا چاہیئے، کہ کیسے طوفان سے ان کو بچا لیا۔ اور شیعوں ہی کے منہ سے ان کے سب اعتراضوں کا جواب دلوا دیا۔ اب کسی شیعہ مذہب کا منہ نہیں، کہ بہ نسبت صدیق اکبر بوجہ غصب فدک اہلسنت سے نالشی ہو۔ اس روایت نے شیعوں کے سب دعوؤں کو ڈھس مس کر دیا، ہبہ کا ہو، یا میراث کا، وصیت کا یا کسی اور وجہ کا، بہر حال خداوند ذو الجلال نے شان وكفى الله المومنين القتال دکھا دی۔

اور اگر بالفرض بفرض محال یہ روایت شیعوں کی ایسی معتبر کتابوں میں نہ ہوتی۔ تب دوسری دستاویز حضرت صدیق اکبر کے بری الذمہ ہونے کی موجود ہے۔

مجاج السالکین میں جو عمدہ کتب فرقہ امامیہ ہے۔ اور نیز اور کتابوں میں یہ روایت موجود ہے۔ اور اسی کے لکھنے کا وعدہ بہت دور سے ہم کرتے چلے آتے ہیں، سو آج بفضلہ تعالیٰ اس کا وقت آ پہنچا لِكُلِّ اَمْرٍ مَرْهُوْنٌ بِوَقْتِهٖ خیر یہ روایت قابل مطالعہ ہے۔

اِنَّ اَبَا بَكْرٍ لَمَّا رَاٰى اِنَّ فَاطِمَةَ انْقَبَضَتْ عَنْهُ وَهَجَرَتْهُ وَلَمْ تَتَكَلَّمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِيْ اَمْرِ فَدَكَ كَبُرَ ذٰلِكَ عِنْدَهٗ فَاَرَادَ اِسْتِرْضَاءَهَا فَاَتَاهَا فَقَالَ لَهَا صَدَقْتِ يَا ابْنَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا ادَّعَيْتِ وَلٰكِنِّيْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْسِمُهَا فَيُعْطِي الْفُقَرَاءَ وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ بَعْدَ اَنْ يُؤْتِيَ مِنْهَا قُوْتَكُمْ وَالصَّانِعِيْنَ بِهَا فَقَالَتْ اِفْعَلْ فِيْهَا كَمَا كَانَ اَبِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُ فِيْهَا فَقَالَ ذٰلِكَ اللّٰهُ عَلَيَّ اَنْ اَفْعَلَ مَا كَانَ يَفْعَلُ اَبُوْكِ فَقَالَتْ وَاللّٰهِ لَتَفْعَلَنَّ فَقَالَ وَاللّٰهِ لَاَفْعَلَنَّ ذٰلِكَ فَقَالَتِ

اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ فَرَضِيَتْ بِذٰلِكَ وَاَخَذَتِ الْعَهْدَ وَكَانَ اَبُوْ بَكْرٍ يُعْطِيْهِمْ مِنْهَا قُوْتَهُمْ وَيَقْسِمُ الْبَاقِيَ فَيُعْطِي الْفُقَرَاءَ وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ۔

حاصل اس روایت کا یہ ہے۔ کہ جب ابوبکر نے دیکھا کہ حضرت فاطمہ ان سے کشیدہ خاطر ہو گئیں، اور ان کو چھوڑ بیٹھیں اور پھر فدک کے مقابلہ میں کچھ گفتگو نہ کی، تو یہ بات انہیں دشوار معلوم ہوئی۔ سو ان کے راضی کرنے کا ارادہ کیا۔ ان کے پاس حاضر ہو کر یہ عرض کیا کہ اے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی، تم اپنے دعوے میں سچی ہو، تم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہبہ کر دیا ہوگا۔ مگر میں کیا کروں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو میں نے یوں دیکھا ہے کہ اس کی آمدنی کو تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اور تمہارے کھانے پینے کا خرچ اور محصلوں کی مزدوری دیکر جو کچھ بچتا تھا۔ فقیروں مسکینوں کو دیا کرتے تھے۔ اس پر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اچھا تم بھی وہی کیے جاؤ جس طرح میرے والد بزرگوار سید الابرار محمد مختار صلے اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے، انہوں نے کہا اس بات پر تم مجھ سے قسم لے لو میں وہی کرتا رہوں گا جو تمہارے والد بزرگوار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے، اس پر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے قسم سے پوچھا۔ کیا تم سچ ہی اس طرح کرو گے؟ صدیق اکبر نے قسم کھا کر عرض کی، میں یہی کروں گا جواب ٹھہرا ہے۔ اس پر حضرت فاطمہ نے یوں کہا کہ الٰہی تو گواہ رہیو۔ سو اس بات پر راضی ہو گئیں۔ اور صدیق اکبر سے عہد لے لیا۔ سو صدیق اکبر انہیں اس میں سے ان کے کھانے پینے کا خرچ دیکر باقی کو فقراء اور مساکین اور مسافروں کو تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ (انتہیٰ)"

بسلسلہ برات صدیق روایت کے چند فائدے اس روایت سے چند فائدے ہوئے ایک تو یہ کہ صدیق اکبر نے حضرت فاطمہ زہرا کو دعوے ہبہ میں جھوٹا نہیں سمجھا، پر یوں سمجھ کر کہ ہبہ بے قبض موجب ملک نہیں ہوتا چنانچہ متفق علیہ شیعہ و سنی ہے؛ اور اس کی تحقیق سابقاً گذر چکی ہے، دینے سے عذر کیا۔ سو اگر بالفرض والتقدیر روایت ہبہ صحیح بھی ہو جائے تو شیعوں کا یہ تاسف کہ صدیق اکبر نے حضرت فاطمہؓ کو جھوٹا سمجھا